UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224242

UNIVERSAL
LIBRARY

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۲ — جلد ۳۱

نظرے خوش گذرے

غزل		منشی ممتاز علی آہ امیٹھوی	۴
منطق شہادت		پروفیسر عتیق ولی الرحمن ایم اے	۵
عاشق کی التجا	(نظم)	جلیل قدوائی بی اے (علیگ)	۲۶
زنانِ شرق کی بیداری		"تلامذی"	۳۱
پیغامِ بہار	(نظم)	مرزا جعفر علیخاں اثر بی اے	۳۳
جہیز	(افسانہ)	جلیل احمد قدوائی بی اے (علیگ)	۳۴
ارشاد جگر		مولوی علی سکندر جگر مرادآبادی	۴۹
جذباتِ سلیم		مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی	۵۰
آپ بیتی	(ڈراما مسلسل)	مرزا جعفر علیخاں اثر بی اے	۵۱
غزل		حضرت سفدر مرزا پوری	۵۹
سفر حجاز کی مختصر روداد			۶۰
تنقیدیں			۶۵
پچھلے مہینے کے رسالے			۷۲
اردو رسائل کے خاص مضامین			۷۷

ضرورت الناظر کے پچھلے پرچے درجوائی عنایت دسمبر سنہ ۲۵ء کی ضرورت ہیں۔
جو صاحب فروخت کرنا چاہیں اطلاع دیں۔

منیجر الناظر

مطبوعاتِ جدیدہ

شعر الہند جلد دوم

(از مولانا عبد السلام ندوی)

جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ اب یہ کتاب مکمل ہو گئی ہے۔ جن شائقین نے پہلے نہ طلب کی ہو وہ بھی اب منگائیں۔ قیمت جلد اول للعہ، جلد دوم للعہ،

آئینۂ حقیقت نما

(از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

اس لاجواب کتاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے گیارہ سو سال کے تعلقات باہمی پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات کو دلائل و شہادت نمایاں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے بجائے بہت زیادہ محبت و مروت ملحوظ رکھی۔ اور اسوقت جو ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بدگمانیاں نظر آتی ہیں یہ محض غلط تاریخوں کے رواج سے پیدا ہوئی ہیں۔ تاریخی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کے لیے انشاء اللہ یہ کتاب بمنزلۂ تریاق ثابت ہوگی۔ قیمت جلد اول عہ،

حقیقتِ اسلام

نواب سر امین جنگ بہادر ایم اے صدر المہام بیغمی حضور نظام نے کچھ خیالات اپنے صاحبزادوں کی رہنمائی کیلئے اسوقت تلمبند کیے تھے جبکہ وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور انگریزی میں عرصہ ہوا چھپ گئے تھے اب اُن کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ انھوں نے موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اُس کی صداقت ظاہر کی ہے۔ قیمت عہ،

فطرتِ اطفال

ایک انگریز فلسفی اور ماہر نفسیات کی کتاب "دی سائنٹفک ٹریننگ آف چلڈرن" کا اردو ترجمہ جس سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں بہت مدد ملیگی۔ از مولوی حامد حسن قادری ایڈیٹر اخبار سعید کانپور۔ قیمت ۸ر

منیجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۱۳ — اگست سنہ ۱۹۲۶ء

نظرِ خوش گذرے

سر ایلگزنڈر مڈیمین ہوم ممبر گورنمنٹ ہند نے لیجسلیٹو اسمبلی میں فرقہ وار فسادات کے متعلق جو بیان پیش کیا اُس سے ظاہر ہوا کہ گذشتہ تین سال کے اندر ان جھگڑوں کے بدولت دو سو ساٹھ جانیں تلف ہوئیں اور تین ہزار سے زائد اشخاص زخمی ہوئے۔ مالی نقصانات اور زیر باریوں کا اس بیان میں کوئی ذکر نہیں ورنہ غالباً اُنکی تعداد کروروں روپیہ تک پہونچتی۔

اس اتلافِ جان اور بربادیِ سرمایہ سے ہندوؤں یا مسلمانوں کو کچھ فائدہ بھی ہوا؟ بظاہر شدھی اور سنگھٹن یا تبلیغ و تنظیم کے کارکنوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو نفع کی کوئی صورت بتا سکے ہاں ملکی آزادی کی جد و جہد میں خلل پڑ گیا، سرفروشان و جاں نثاران ملک و قوم کی قدر و منزلت میں فرق آگیا، وفاداران حکومت اور موالاتی رہنماؤں کی گرم بازاری ہوگئی اور دفتری اقتدار کی گرفت پھر مضبوط ہوگئی۔ اور غالباً یہی اس باہمی نزاع کا مقصود تھا۔

ارکین حکومت، اُنکے وفادار اور قومی سرداروں نے کامل تین سال تک اس خونیں تماشہ کو جاری رہنے دیا اور اب اپنی اپنی جگہ پر سب کوشاں ہیں کہ کسی طرح یہ لڑائی رُک جائے۔ ان کوششوں اور کوششوں سے زیادہ اُنکے متعلق تقریروں اور اعلانوں کو سُن سُن کر اتلاف شدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز ہے کہ ہندو مسلمانوں کی نزاع باہمی کو دفع کرنے کی جد وجہد کے لیے ایک جدید مجلس انڈین نیشنل یونین کے نام سے قائم کی جائے۔ ملک نے عموماً اس تجویز کا خوش آمدید کہا ہے۔ لیکن جنگلی صوبوں کے اُن سرداروں نے اس سے اختلاف کرنے اور جدا رہنے میں معلوم ہوتا ہے کہ باہم اتحاد کر لیا ہے، جنھیں اپنے فرقہ پسندانہ خیالات کی بنا پر آج ہر طرف سے عوام کا نفرین حاصل ہے۔ یہ بات کچھ زیادہ غیر متوقع نہیں ہو سکتی، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اتحاد کی جد وجہد کرنے والے سرداروں پر تو اس کا کوئی یاس انگیز اثر نہیں پڑتا۔

افسوس ہے کہ یہ تحریک بہت دیر میں شروع کی گئی، اور اب بھی جس مستعدی کی ضرورت ہے اُسکے آثار نہیں نظر آتے۔ اور اگر اہل احباب اسے پسند نہ کریں گے، لیکن اگر وہ اتنا ایثار گوارا کر سکیں کہ کونسل میں آئندہ داخلہ کی جد وجہد سے دست بردار ہو جائیں، تو اتحاد باہمی کی کوششوں میں کامیابی زیادہ یقینی ہو جائے گی۔

سندھ مسلمانوں کی لڑائی تو شاید اب ختم ہو جائے، مگر اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اس سے زیادہ خطرناک نتائج پیدا نہ کر دے۔ گذشتہ سال محض ایک فرضی اور بے بنیاد خبر نے قوم میں یہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ بمبئی اور لاہور میں باہم جھگڑا ہو گیا، اور لکھنؤ میں بھی اگر انتہائی احتیاط نہ کی جاتی تو پاسیوں کی لاٹھیوں سے خدا معلوم کتنے مسلمان زخمی اور شہید ہوتے۔ اور اب جبکہ واقعی جنۃ البقیع کے قبے ڈھا دیے گئے ہیں اور بڑے بڑے بزرگان قوم تک نجدیوں کے خلاف اظہار رائے کے لیے تیار ہیں، بتلا بھی جوش و خروش ظاہر کیا جائے کم ہوگا۔

جناب راجہ صاحب محمود آباد جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں بمقام دہلی مسلم لیگ کے اُس اجتماع سے سند چھین کر چلے آئے تھے جس میں سب سے پہلے نہایت صفائی کے ساتھ حکومت پر ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی سلطنت، خلیفۃ المسلمین اور مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانان ہند کے اصلی خیالات کیا ہیں؟ اور گذشتہ سات سال کے اندر قوم سے زائد حکومت کے دامن دولت سے وابستہ رہے، اب اپنے انگریز آقاؤں کی نیاز مندی سے فارغ ہو کر مسلمانوں کی قومی کشتی کے پھر ناخدا بننے کے متمنی ہیں۔ اور اس نزاع باہمی میں اُس فرقہ کے سالار قافلہ قرار پائے ہیں جو اینٹ اور گارے کی چند عمارتوں کی خاطر

یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس ملک کے اندر اپنے رُو بہ تنزل اقتدار کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے باقیماندہ اور بے بنیاد ایک مسلمان تاجدار پر یورش کرنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ صاحب سے اسکے سوا اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے، ایک دفعہ نہیں کئی بار آزمایش ہو چکی ہے اور ہر دفعہ آگ نے پتیل کو سونے سے الگ کر کے دکھا دیا۔ البتہ حیرت ہوتی ہے اُن لوگوں کی عقل و دانش پر جو آزمودہ را آزمودن جہل است کو نظر انداز کرتے ہیں، اور عبرت ہوتی ہے اُن لوگوں کی غیرت و حمیت پر جو بار بار ٹھوکریں کھانے کے باوجود اب تک ایک ایسے رئیس کو اپنا قبلۂ حاجات بنائے ہوئے ہیں جو خود مجبور و دست نگر ہے۔

مہاراجہ صاحب یا خدام الحرمین مجاہدین کو اسکی پرواہ کیوں ہونے لگی کہ اس کشمکش کا مجازی نجدی حکومت پر چاہے پرکاہ کے برابر اثر نہ ہو، لیکن خود ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا خون مسلمانوں کے ہاتھوں بہنے لگے گا۔ اس لیے اُن سے کچھ عرض کرنا فضول ہے۔ مسلمانوں کی ساری توقعات اُن سرفروش رہنمایانِ ملت سے وابستہ ہیں جنھوں نے ان راجاؤں اور رانکے پرجاؤں کے علی الرغم شیرِ برطانیہ کے آہنی پنجوں سے ترکی حکومت کو چھڑانے کی عظیم الشان جد و جہد کی رہنمائی کر کے تمام دنیا اسلام کو اپنا رہینِ منت بنا لیا ہے، امید ہے کہ وہ اس فتنہ کو اُبھرنے نہ دیں گے اور خواہ اُنھیں سلطان نجد کی ملوکیت سے کتنا شدید اختلاف ہی کیوں نہ ہو، لیکن اسکو کبھی ہوا نہ دیں گے کہ اصلاح کے طریقہ کو چھوڑ کر باہمی جنگ و جدل کا راستہ اختیار کیا جائے۔

حجاز کی مؤتمر اسلامی ختم ہو گئی۔ اُسکی مفصل روداد تو بعد میں شایع ہو گی، سردست اخبارِ اطلاعات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اُسکی بنا پر یہ پیشین گوئی کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ جو درخت اسوقت لگایا گیا ہے وہ انشاء اللہ ایک دن بارآور ہوگا اور اپنے ثمراتِ نیک سے تمام مسلمانوں کو متمتع کرے گا۔

مخالفین، خواہ وہ یورپ کے عیسائی ہوں یا ہندوستان کے مسلمان، مؤتمر کی کارروائیوں کو ناقابلِ اعتماد قرار دینگے اور طرح طرح سے اُس کا مضحکہ اُڑائیں گے، لیکن خدا کی مرضی ہے تو یہ مؤتمر اب سے چند سال بعد، خود اپنے نتائج کار سے ثابت کر دیگی کہ بلادِ اسلامی کے محترم مدبرین باہم یکجا ہوتے رہنا عظیم ترین فوائد کا موجب ہو۔ ہندوستان کے جملہ محترم نمایندے، علی الخصوص علی برادرز سزاوارِ صد تبریک و تحسین ہیں کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی اس پہلی بین الملی مجلس کو ہر طرح بہ بہاء بنانے میں اپنے دل و دماغ کی اعلیٰ ترین قوتوں کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے صرف کیا۔

فقیر رکنا للہ احسن الخالقین

ہندوستانی اکیڈمی کے بارہ میں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ اُسکی ادبی کمیٹی دو حصوں میں منقسم ہوگی جن میں سے ایک اُردو سے متعلق ہوگی اور دوسری ہندی سے۔ ہندو مسلمانوں کے موجودہ ناخوشگوار تعلقات اور ہندی اُردو کے قدیم قضیہ کے لحاظ سے یہ تقسیم بسا ضروری تھی۔ اور اگر اسکے ساتھ ہی یہ امر بھی ابتدا ہی میں طے پا جاتا کہ سوائے اُن رقوم کے جو مخصوص معطیوں سے کسی مخصوص غرض کے لیے وصول ہوں یا اکیڈمی کی مشترکہ تنظیم کے لیے درکار ہوں اکیڈمی کا عام فنڈ دونوں شعبوں پر کس نسبت سے صرف کیا جائیگا تو غالباً تصادم و اختلاف کا ایک بہت بڑا سبب دفع ہو سکتا ہے۔

اکیڈمی کی صدارت کے لیے سر شیخ بہادر سپرو کا نام جو تجویز ہوا ہے، یہ ہر نہج سے موزوں کہا جا سکتا ہے۔ ملک میں ایسے ممتاز ہندو مسلمان کم رہ گئے ہیں جن کی ناطرفداری پر دونوں فریق اعتماد کر سکتے ہوں اور اس صوبہ میں جو چند بزرگ ایسے ہیں اُن میں سپرو صاحب بلحاظ علمی قابلیت و ادبی ذوق کے ممتاز ہیں۔

وہ نالۂ بلبل کو سمجھے مرا افسانہ — گلگشت میں چال اُنکی کچھ اور ہے مستانہ
ہے دوست کی یاری میں غیروں سے بھی یارانہ — کیا ناز اُٹھایا ہے اے ہمتِ مردانہ
کیا شیشے ہیں کیا مینا کیا جام ہیں کیا ساغر — میخانہ سجا ساقی یا ہے یہ پریخانہ
مجھ سے نہ سنا اک دن روروکے مرا قصہ — غیروں سے وہ کہتے ہیں آپی مرا افسانہ
کچھ سوز محبت ہے کچھ حسن کا ساز اس میں — دل شمع سا روشن ہے ارمان ہے پروانہ
باتوں ہی میں ساقی کی سرشار ہے کل محفل — ہر بات ہے اک مینا ہر لفظ ہے پیمانہ
دُھن ہے کسی صورت سے مل جائے وہ ہرجائی — ہے اسکی تمنا میں ہر ایک سے یارانہ
رہ رہ کے مزا اُٹھا جھک جھک کے لیں آنکھیں — شرمیلی نگاہوں میں تھی لغزشِ مستانہ
اللہ کی یاد آتی رہتی تو کہاں رہتی — دل جو تھا خدا کا گھر اک بُت کا ہے کاشانہ
میں لیکے دلِ تشنہ میخانے میں آیا ہوں — اے ساقیِ دریا دل بھر دے مرا پیمانہ
اچھا نہ سنو صاحب میں بھی نہ کہونگا کچھ — اب میری خموشی سے سنتا مرا افسانہ
ہے حسن پرستی ہی کام اپنا سدا یارب — دل تونے دیا مجکو یا عشق کا پروانہ
کس جی سے دعا مانگوں ارمان نکل جائیں — دل کا سا ہیرا مگر تو ہو جائیگا ویرانہ

غیروں کو جو رحم آیا کچھ ذکر کیا میرؔ
کس ناز سے وہ بولے کون آہ! وہ دیوانہ

آہ

منطقِ شہادت[1]

ذیل کا مضمون نامکمل حالت میں رسالہ "شمع" آگرہ میں چھپ چکا ہے، لیکن اب پروفیسر صاحب نے تکمیل و نظرثانی کرکے الناظر میں اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا ہے۔ جو تشکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ سب ایڈیٹر

سر ولیم ہیملٹن نے معلوماتِ انسانی کو، وسائل علم کی بنا پر، دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی صورت تو وہ ہوتی ہے، جہاں ہم اپنی معلومات کے لیے اپنے حواس، یہ ظاہری ہوں یا باطنی، کے دست نگر ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری یہ تمام معلومات احضارات حواس کا نتیجہ اور ان سے ماخوذ ہوتی ہیں اور ادراکات اس قسم کی معلومات کی بہترین مثالیں ہیں۔ اگر میرے سامنے میز پر کتاب رکھی ہوئی ہو، تو اسکا علم مجھکو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ میں اپنی آنکھ کھول کر اسکی طرف دیکھوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کتاب کی تصویر، آنکھ بند کرکے، اپنے ذہن میں قائم کر لوں۔ لیکن کتاب کا یہ علم بھی اسکے ادراک پر موقوف ہے، کیونکہ تصویر گویا کسی اصل کی نقل ہوتی ہے، جب اصل ہی موجود نہ ہو، تو نقل، ظاہر ہے کہ غیر موجود ہوگی، اور یہ اصل ادراک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ حافظہ کی مدد سے اس کتاب کے مضمون کو یاد کرنے کی کوشش کروں۔ اس صورت میں بھی ہم ادراک کو نظر انداز نہیں کر سکتے، کیونکہ حافظہ گویا ایک خزانہ ہے، جس میں ہمارے گذشتہ تجربات محفوظ رہتے ہیں، اور بوقت ضرورت کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ جب گذشتہ تجربات ہی نہ ہونگے، تو خزانہ یقیناً خالی رہیگا۔ یہ گذشتہ تجربات ہمارے ادراکات ہیں۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ میں کتاب کا تصور قائم کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اسکے لیے مجھکو بہت سی کتابوں کا آپس میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے، لہذا یہاں بھی ادراک سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ کتاب کے علم کی یہ تمام صورتیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ فعلیتِ حواس پر موقوف ہیں۔ اسی حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ یہ علم تجربے کا نتیجہ ہے۔ بغیر تجربے کے یہ تمام علم ناممکن الحصول اور عدم محض ہوتا۔ یہی وجہ ہے، کہ اس قسم کے علم کو "تجربی شہودی" یا "تجربے کا" علم کہا جاتا ہے۔

---

[1] اس مضمون کا اکثر حصہ سر ولیم ہیملٹن کے لکچرز جلد چہارم سے ماخوذ ہے۔

لیکن ہمارا تمام علم تجربے تک محدود نہیں ہوتا۔ بعض معلومات ایسی بھی ہوتی ہیں، جو اس کی فعلیت کا نتیجہ نہیں ہوتیں، بلکہ برخلاف اسکے وہ ہمارے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے، کہ ان کے وجود کا علم ہمکو تجربے کے وقت ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تجربے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ تمام قوانین فطرت علم کی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بچہ، جو اپنے ہاتھ کی حرکات پر پوری طرح متصرف ہو، اپنی ناک پر کی مکھی کو اُڑانے کے لیے اپنا ہاتھ ہلاتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ مکھی کے بیٹھنے سے اُسکو ایک خاص قسم کا احساس حاصل ہوتا ہے۔ اب اُسکو خیال آتا ہے، کہ اس احساس کی کوئی نہ کوئی علت ہوگی، اور یہ کہ یہ احساس اُسوقت تک رفع نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ علت دُور نہ ہو جائے۔ اسی غایت کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہاتھ ہلاتا ہے۔ بعینہٖ یہی منشا ہے قانونِ علت ومعلول کا اس قانون کا علم تجربے کے موقع پر ہوا، لیکن یہ تجربے کا نتیجہ نہیں۔ اس قسم کے علم کو خالص، ذہنی، عقلی، یا حضوری کہتے ہیں، اور یہ علم کی دوسری قسم ہے۔ علم کی ان دونوں قسموں کی خصوصیاتِ امتیازی یہ ہیں، کہ تجربے سے ہم کو کلیات کا علم نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہمارا معلوم لازمی طور پر کوئی نہ کوئی فرد ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا علم واجبات کے درجے تک نہیں پہونچتا۔ برخلاف اسکے علم حضوری سے ہم کلیات تک پہونچ سکتے ہیں۔

گذشتہ تمام بحث میں ہم نے اپنے علم کے وسائل وذرائع کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اول تجربہ اور دوم عقل۔ اب تجربہ پھر دو قسموں پر منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے، کہ یہ خود میرا اپنا ذاتی تجربہ ہو، مثلاً یہ کہ میں خود اپنی آنکھ سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھوں۔ دوسری صورت یہ ہے، کہ یہ کسی اور کا تجربہ ہو، یعنی یہ کہ کوئی اور شخص مجھ سے آکر بیان کرے، کہ اُسنے وہ کتاب میز پر دیکھی تھی۔ ان میں سے صورت اول کو "ذاتی تجربہ" اور حالتِ دوم کو "غیر کا تجربہ" کہا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے، کہ تجربے کی ان دونوں قسموں سے ہم کو کتاب کا علم ہو سکتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے، کہ جس قدر اعتماد اور وثوق مجھ کو اپنے ذاتی تجربے پر ہوتا ہے، وہ غیر کے تجربے پر نہیں ہوتا۔ اگر ہم خود اپنی آنکھوں سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھتے ہیں، تو ہم اس علم میں شبہہ نہیں کرتے، حالانکہ بعض اوقات ہماری نگاہ ہم کو دھوکا بھی دیا کرتی ہے، لیکن اگر کوئی اور شخص آکر بیان کرے، کہ اُس نے وہ کتاب دیکھی تھی تو ہمکو شبہہ ہوتا ہے، کہ کہیں وہ جھوٹ نہ بول رہا ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا ذاتی تجربہ، غیر کے تجربے کے مقابلے میں، زیادہ واضح، زیادہ صاف اور زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح اس میں صداقت، یقین اور صحت کا بہت غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن غیر کا تجربہ ذاتی تجربہ پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے،

کہ اس میں جامعیت زیادہ ہوتی ہے، اور یہ کہ اسکے بغیر انسان اکثر ایسی معلومات سے بے بہرہ رہجاتا ہے جو اُسکے لیے بہت اہم اور ضروری ہیں - اسکا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق تجربی واقفیت حاصل کرنے میں ذاتی تجربہ اور غیر کا تجربہ، دونوں اپنی اپنی جگہ اہم اور فائق ہیں - ہم ان میں سے کسی ایک کو ترک کرکے دوسرے کو اختیار نہیں کرسکتے، اور اگر کرتے ہیں، تو صحت، صداقت اور جامعیت وافادیت کو قربان کرکے -

ہمارا ذاتی تجربہ لازماً منحصر ہوا کرتا ہے، ہمارے ذاتی آلاتِ حس کے تبیح پر - اگر ان آلات میں کسی قسم کا تبیح نہ ہو، تو ہم کو کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہوسکتا - دوسرے الفاظ میں اگر بچہ پیدائش ہی کے وقت سے بالکلیہ فاقد الحس ہے، تو ظاہر ہے کہ اسکی حالت کیا ہوگی - اُسکو کسی طرح کا کوئی تجربہ نہ ہوگا، اور اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسکی عمر اس دنیا میں بہت تھوڑی ہوگی - وجہ اسکی یہ ہے کہ یہی آلاتِ حس ہیں جن کے ذریعے سے ہم مفید و مضر میں تمیز کرتے ہیں - ہمارے یہ آلات حس بالعموم دو قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں - ایک قسم وہ ہے، جن کے تبیح کے لیے ضروری ہوتا ہے، کہ مبیح انکے مقارن ہو - یعنی یہ کہ جب تک مبیح انکے ساتھ مس نہیں کرتا، اُسوقت تک ان میں کسی قسم کا تبیح پیدا نہیں ہوتا، اور اس لیے انکے ذریعہ کسی قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا - زبان اور جلد اس قسم کے آلاتِ حس کی مثالیں ہیں - کسی چیز کا ذائقہ ہم کو اُسوقت تک معلوم نہیں ہوسکتا، جب تک ہم اُسکو زبان پر نہ رکھیں - اسی طرح کسی چیز کی سختی و نرمی، ہمواری و ناہمواری، گرمی یا سردی کا علم اُسوقت تک ناممکن ہے جبتک کہ وہ ہماری جلد کے ساتھ مس نہ کرے - اس قسم کے آلات حس کو مقارنہ کہا جاتا ہے - انکے مقابلہ میں بعض آلات حس ہوتے ہیں، کہ اُنکے تبیح کے لیے ضروری نہیں ہوتا، کہ مبیح اُنکو مس کرے - وہ دُور ہی سے اسکے اثر کو قبول کرلیتے ہیں، اور اس اثر پذیری کی وجہ سے ان میں تبیح شروع ہوجاتا ہے - آنکھ، ناک، اور کان آلات حس کی اس قسم میں داخل ہیں - کسی چیز کو دیکھنے کے لیے یہ لازمی نہیں ہوتا کہ وہ چیز ہماری آنکھوں کے ساتھ مس کرے - ایسی حالت میں ہم اُس چیز کو مطلقاً نہیں دیکھتے - اسی طرح ہم ایک میل کے فاصلہ پر بیٹھ کر آواز سُن سکتے ہیں اور بو سونگھ سکتے ہیں، اس دوسری قسم کو آلات بعیدہ کہتے ہیں -

ہم نے ابھی کہا ہے کہ ذاتی تجربہ کے لیے آلات حس کا تبیح لازمی ہے، اور یہ کہ یہ آلات دو قسم کے ہوتے ہیں، مقارنہ اور بعیدہ - اب ذرا غور و فکر سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ مقارنہ آلات حس کا دائرۂ عمل اس قدر محدود

ہے، کہ وہ بلحاظ ذرائع علم کے تقریباً بیکار ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ انکے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا اور ہو سکتا ہے، لیکن اس علم کی کمیت و مقدار یقیناً بہت تھوڑی ہوگی۔ اگر ہر چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہو، کہ اس کو آلاتِ حس سے متعلق کیا جائے، تو عمر بھر میں معدودے چند معلومات ہی حاصل ہوں۔ انکے مقابلہ میں آلاتِ بعیدہ کا دائرۂ عمل و اثر وسیع ہے، لیکن یہ بھی اتنا وسیع نہیں کہ انکے ذریعہ سے ہر قسم کی اور تمام معلومات حاصل ہو جائیں۔ آنکھ، ناک اور کان دُور کی اشیاء سے متبیح ہو سکتے ہیں، لیکن اگر میچ بہت زیادہ فاصلہ پر ہو تو یہ ذرائع بھی بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر علیگڈھ کی جوبلی کی رونق کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ وہاں کی تقریروں کو سُن سکتے ہیں۔ گویا اُسکے متعلق ہم کو کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔

پھر اسکے ساتھ اسکو بھی شامل کیجیے، کہ ہمارے آلاتِ حس کی فعلیت صرف زمانۂ حال تک محدود ہوتی ہے۔ ماضی و مستقبل انکے دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ گذشتہ و آیندہ واقعات کا بھی ہم کو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ کلام نہیں کہ ماضی کے واقعات بعینہٖ اس قسم کے ہوتے ہیں جن کا اگر ہم چاہیں تو اعادہ کر سکتے ہیں اور اس طرح انکو ذاتی تجربہ میں لا سکتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کا اکثر و بیشتر حصہ ایسا ہوتا ہے جس کا کسی ممکن طریقہ سے اعادہ و تجربہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں، کہ پانی دو مختلف گیسوں کے اجتماع سے بنتا ہے، لیکن ہیکلی کے دُمدار ستارے کو بچشم خود دیکھنا کس طرح ممکن ہے؟ تمام گذشتہ واقعات کا اعادہ ممکن بھی ہو تب بھی انکی تصدیق کا انکو دوہرانے کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی یکلخت رُک جائے۔

آلاتِ حس یا دوسرے الفاظ میں ذاتی تجربہ کے ذرائع کے ان نقائص کو بالکلیہ رفع کرنا ممکن نہیں اسمیں شک نہیں کہ جدید اختراعات کے طفیل ہم ہزاروں میل پر بیٹھکر کسی مغنی کا گانا سن سکتے اور اسکی شکل وغیرہ دیکھ سکتے ہیں لیکن اول تو اسکے لیے اس قدر بیش قیمت آلات کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر شخص مہیا نہیں کر سکتا، اور پھر یہ کہ ان تمام اختراعات و ایجادات کے باوصف اکثر باتیں ایسی رہ ہی جاتی ہیں جن کا ہمکو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں، کہ ان نقائص کا بالکلیہ رفع کیا جانا ممکن ہے، تب بھی دنیا میں قابل تحقیق باتیں اس قدر ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک کے ذاتی تجربہ کے لیے عمر نوح بھی کفایت نہ کریگی۔ معمولی بات ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کے متعلق بذاتِ خود واقفیت حاصل کرنی چاہے، تو اسکو کس قدر وقت درکار ہوگا۔ خشکی سیر و سیاحت کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی ہونگی جنکی طرف علیحدہ علیحدہ توجہ درکار ہوگی۔ اسی طرح اگر ہر چیز کا بذاتِ خود معائنہ کیا جائے، اور اس کی تحقیق

کی جائے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ کس قدر وقت صرف ہوگا۔ لیکن اس سے ہر شخص واقف ہے، کہ ہماری حیاتِ مستعار اس قدر قلیل المدت ہے، کہ یہ تمام باتیں حاصل ہونا ناممکن محض ہے۔ اسکی مصروفیتیں اس قدر کثرت ہیں، کہ اس قسم کی تمنا کرنا ہی حماقت کی نشانی ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے، کہ معلوماتِ انسانی مختلف شعبوں، جنکو عرف عام میں علوم کہتے ہیں، کی حدود اس قدر وسیع ہیں کہ کوئی شخص تنِ تنہا ان کو قطع نہیں کر سکتا۔ اُسکو یار و مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر علم کی تمام باتوں کو وہ کسی طریقہ سے بھی اپنے ذاتی تجربہ میں نہیں لا سکتا۔ اسکو اکثر مقدمات فرض کرنا پڑتے ہیں۔ انکی صداقت کا وہ اور علوم کو ضامن ٹھہراتا ہے۔ بعض نتائج وہ اس قسم کے چھوڑ جاتا ہے کہ اُنکی تصدیق یا تردید متاخرین کو کرنا پڑتی ہے۔

اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے، کہ افزائش و ترقی علم اُسوقت تک خواب و خیال ہے، جب تک کہ ہم اپنے ذاتی تجربہ کے ساتھ غیر کے تجربے کو بھی شامل نہ کریں۔ جو چیزیں کہ ہمارے آلاتِ حس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں اُنکے متعلق اَوروں سے استفسار کریں، اُنکے بیانات پر اعتبار کریں اپنی حیاتِ مستعار کی قلت مدت کو ملحوظ رکھ کر اوروں کو اپنا شریکِ کار بنائیں اور انکی معلومات سے استفادہ کریں۔ جن گذشتہ چیزوں اور باتوں کا ہم کو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا، یا جن کا اعادہ ناممکن ہے، انکے متعلق متقدمین کی تحریروں کو دلیلِ راہ بنائیں۔ مختصر یہ کہ ذاتی تجربہ کے نقائص کو غیر کے تجربہ سے رفع کریں، اور غیر ہی کے تجربہ سے اپنے تجربہ کی قلت کی تلافی کریں۔ یہی مطلب تھا ہمارے اس فقرہ کا کہ غیر کے تجربہ کے مقابلہ میں ذاتی تجربہ میں جامعیت کم ہوتی ہے، اور یہ جامعیت اس طرح پیدا ہوتی ہے، کہ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اوروں کو مطلع کریں، اور اسی طرح اور لوگ اپنے اپنے ذاتی تجربہ سے ہمکو آگاہ کریں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس اطلاع دہی کے ذرائع نہیں، اگر ہم اوروں کو اپنے تجربہ سے مطلع کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اگر ہم سب مل کر معلومات فراہم نہ کریں، تو ہمارا علم ترقی نہیں کر سکتا، نہ اُس میں کسی زیادتی کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے ہم میں یہ قابلیتِ اطلاع دہی بحد وافر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اوروں کے تجربہ سے استفادہ کر سکتے ہیں، اور ہمارے تجربہ سے یہ استفادہ اُن بیانات کے ذریعہ سے ہوتا ہے، جو ہم اپنے ذاتی تجربہ کے متعلق دیتے ہیں۔ ان ہی بیانات کو وسیع معنوں میں شہادت کہا جاتا ہے۔ ایک شخص اگر علیگڈھ جوبلی کے حالات بیان کرتا ہے یعنی اُن تمام باتوں کا ذکر کرتا ہے، جو اُسنے وہاں دیکھیں یا سنیں، دوسرے الفاظ میں وہ اپنے ذاتی تجربہ کے متعلق بیانات دیتا ہے، اور اُنکے ذریعہ سے ہمکو وہاں کے حالات سے مطلع کرتا ہے۔

وسیع معنوں میں اسے شہادت کہا جائیگا، اور بیان دینے والے کو شاہد۔
لیکن محدود معنوں میں شہادت ایسے بیان کو کہتے ہیں، جس سے ہم کچھ منتج کر سکیں۔ اس استنتاج کے لیے ہم کو اُس بیان کو صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا یہ استنتاج بہت سی شکلیں اختیار کر سکتا ہے، یعنی یہ سادہ بھی ہو سکتا ہے اور ملتف بھی، یقینی بھی اور فرضی بھی۔ یہ کسی قسم کا ہو، بیان اسکو مبنی کیا جاتا ہے، وہ سننے والے کے نزدیک شہادت ہی ہوگا۔ میرا ایک دوست میرے پاس آکر کہتا ہے کہ اُسنے زید کو بازار میں دیکھا ہے۔ میرے نزدیک یہ شہادت ہے اس امر کی کہ زید واقعی اس شہر میں موجود تھا۔ ممکن ہے، بعد میں یہ ثابت ہو، کہ میرے دوست نے شناخت کرنے میں غلطی کی، اور یہ کہ جس شخص کو اُس نے دیکھا تھا، وہ زید نہ تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس بیان کو شہادت ہی کہیں گے۔ اسی بیان سے میں اور نتائج بھی اخذ کر سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ زید کی ہماری کی خبر غلط ہے، کیونکہ اگر وہ بیمار ہوتا تو بازار میں دکھائی نہ دیتا، یا یہ کہ اُس نے اپنا مجوزہ سفر ملتوی کر دیا۔ اسی طرح اخبار میں ایک خبر دیکھتا ہوں کہ موتمر اسلامی میں مولانا محمد علی نے "اپنی مخصوص عربی میں تقریر کی"۔ یہ بیان شہادت ہے اس بات کی کہ مولانا موصوف اسوقت حجاز میں ہیں۔ ہو سکتا ہے، کہ میرا یہ نتیجہ غلط ہو، اور مولانا محترم وہاں مقیم نہ ہوں، بلکہ انگریزوں کی ولایت جاتے ہوئے، راستہ میں ٹھہر کر وہاں تقریر کی ہو، اور آگے بڑھ گئے ہوں۔ لیکن اس غلط استنتاج سے اس بیان کے شہادت ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کے متعلق بہت سی شہادتیں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان تمام شہادتوں کا آپس میں مقابلہ کرتے ہیں، اور پھر اس کی سمت کو معلوم کرتے ہیں۔

بعینہٖ یہی کیفیت ہمارے ذاتی تجربہ کی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ہم یہ فرض نہیں کرتے کہ ہمارا بیان صحیح ہے، البتہ یہ کہ ہمارا مشاہدہ غلطی سے بری ہے، اور یہ کہ حواس سے صحیح صحیح واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہمارا مشاہدہ بعد میں غلط ثابت ہو۔ یہی علم جو ہم کو اپنے حواس سے حاصل ہوتا ہے، اوروں کے لیے شہادت کا کام دیتا ہے۔ یا اسی بات کے متعلق ہم اوروں کی شہادت کو شامل کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ میں ایک شخص کو پہاڑ کے دامن میں بیہوش پڑا دیکھتا ہوں۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ وہ اوپر سے گر پڑا ہے۔ یہ بیان میرے لیے شہادت ہے، کیونکہ اسی پر میرا نتیجہ مبنی ہے۔ جب میں اُسکا ذکر اوروں سے کرتا ہوں، تو میرا بیان اوروں کے لیے شہادت بنجاتا ہے۔ اسکے ساتھ یہ ضروری ہے، کہ سننے والے مجھ کو معتبر سمجھتے ہوں۔ پھر وہ بھی میری اس شہادت سے نتائج

اخذ کرسکتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کسی جاں بلب مریض کو دیکھنے آتا ہے، وہ اس مریض کی حالت کو خود دیکھتا ہے، اور دوسروں کے بیانات سنتا ہے۔ اب وہ ڈاکٹر خود اپنے مشاہدہ اور اوروں کے بیانات پر اپنے نتائج کو مبنی کرتا ہے۔ اُسکا اپنا مشاہدہ اور اوروں کے بیانات اسکے شہادات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ شہادت کی ضرورت ہم کو بالعموم اُسوقت پڑتی ہے، جب وہ بات جو اُس میں بیان کی گئی ہے، خود ہمارے مشاہدہ میں نہ آئی ہو یا نہ آسکتی ہو، اگر ہم خود علیگڈھ کی جوبلی میں شریک ہوے ہیں، تو ہم اوروں سے اسکے حالات سننے کے خواہشمند نہ ہونگے۔ اس سے یہ ظاہر ہے، کہ ہمارے استدلالات دوسروں کے مشاہدات پر نہ مبنی ہوتے ہیں، اور نہ ہونے چاہییں، کیونکہ انکی صداقت کا ثبوت ہر شخص دے سکتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ شہادت ہمیشہ تجربات ہی کے متعلق ہوتی ہے، شرط صرف یہ ہے، کہ یہ ذاتی تجربات کی حدود سے خارج ہوں۔ اس لحاظ سے اب ہم شہادت کی محدود ترین معنوں میں اس طرح تعریف کرسکتے ہیں۔ کہ یہ کسی تجربہ کی اطلاع دہی ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ شہادت مشاہدہ کیے گئے منظر کی وہ اطلاع ہے، جو اُن لوگوں کو دی جاتی ہے، جن کے ذاتی تجربے اس منظر کو معلوم نہ کرسکتے تھے۔ جس منظر یا بات کے متعلق شہادت دی جائے اُسکو اصطلاحاً واقعہ کہتے ہیں، اور شہادت کی صحت کو تاریخی یقینیت۔

شہادت دو قسم کی ہوتی ہے، بلا واسطہ اور بالواسطہ۔ بلا واسطہ اسکو اُسوقت کہا جاتا ہے، جب اس واقعہ کا، جس کے متعلق شہادت جاری ہے، خود شاہد نے مشاہدہ کیا ہو۔ بالواسطہ اُس حالت میں ہوتی ہے، جب وہ واقعہ جس کو شاہد بیان کر رہا ہے، خود اُسکے اپنے مشاہدہ میں نہ آیا ہو، بلکہ اوروں کی شہادت پر اُسنے اسکو تسلیم کیا ہو، مثلاً میں خود علیگڈھ جوبلی میں شریک ہوں، اور وہاں سے واپس آکر میں خود اپنے مشاہدات بیان کروں۔ میرے یہ تمام بیانات بلا واسطہ شہادت میں شمار ہونگے۔ لیکن اگر میں خود وہاں کی تقاریب میں حصہ نہ لوں، بلکہ کسی اور کی کہی سُنی بیان کروں تو یہ شہادت بالواسطہ ہوگی۔ بلا واسطہ شہادت کو عینی اور بالواسطہ کو اُذنی بھی کہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ عینی شہادت ہمیشہ اُذنی شہادت پر فائق ہوتی ہے۔ عینی شہادت میں یقین کا درجہ اُذنی شہادت کے مقابلہ میں بڑا ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہم ہر موقعہ پر بلا واسطہ شہادت کو عینی اور بالواسطہ کو اُذنی نہیں کہہ سکتے۔ بالواسطہ شہادت میں، جس شخص کی شہادت پر ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، اُسکو سنا من کہتے ہیں۔ مثلاً علیگڈھ جوبلی سے واپس آکر میں وہاں کے حالات زید سے بیان کرتا ہوں، اور زید عمر سے۔ اب زید کی یہ شہادت بالواسطہ ہوگی، اور میں،

جسکی شہادت پر اُسنے یہ تمام واقعات عمر سے بیان کیے ہیں، ضامن ہوں۔ اب ضامن خود بلا واسطہ یا بالواسطہ شاہد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ عمر زید کی زبانی واقعات جوبلی سُن کر خالد سے بیان کرے۔ اس صورت میں زید ضامن ہوگا، اور اُسکی شہادت ظاہر ہے کہ بالواسطہ ہے بلا واسطہ نہیں، کیونکہ وہ خود جوبلی میں شریک نہ ہوا تھا، بلکہ مجھ سے سُن کر اُسنے تمام باتیں بیان کی ہیں، ضامن اگر بالواسطہ شاہد ہو، تو شاہد متوسطہ، یا منقول عنہ کہلاتا ہے۔ پھر بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں قسم کی شہادتیں جزئی ہوتی ہیں، مکمل اور مناسب ہوتی ہیں، یا ناقص۔ شہادت کی ان قسموں کی تشریح ضروری نہیں۔ پھر مستقیم ہوتی ہیں، یا غیر مستقیم مستقیم یہ اُسوقت ہوتی ہیں، جب اُن سے سوائے واقعہ کی اطلاع دہی کے اور کچھ مقصود نہ ہو، مثلاً علیگڈھ جوبلی کے حالات صرف اس لیے بیان کیے جائیں، کہ لوگوں کو اُن سے واقفیت ہو جائے۔ غیر مستقیم انکو اُس حالت میں کہتے ہیں، جب اس اطلاعدہی کی غایت کچھ اور ہو۔ مثلاً علیگڈھ جوبلی کے حالات اس لیے بیان کیے جائیں۔ کہ عوام کو مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کی مسرفانہ راہ روش، اور دیگر فضولیات سے آگاہی ہو۔ یہاں ہماری شہادت کی غایت محض واقعات کی اطلاع دہی نہ تھی، بلکہ اسکے علاوہ کچھ اور۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا، وہ گویا اصل بحث کا دیباچہ تھا۔ عنوان میں ہم نے اس بات کا اعلان کیا ہے، کہ ہم شہادت پر منطقی نقطۂ نظر سے بحث کرینگے۔ اس لحاظ سے ہمارا اصلی کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ دکھائیں کہ شہادت کس وقت، کن حالات میں، اور کن شرائط کے ایفا کے بعد قابل اعتبار اور لایق وثوق یا صحیح ہوتی ہے۔ وجہ اسکی ظاہر ہے، کہ منطق میں اُن اصول وقوانین سے بحث ہوتی ہے، جن کا اتباع صحت وسلامتی فکر کے لیے ضروری ہے۔ لہذا ہمارے اس مضمون کا اصلی موضوع اُن شرائط کو بیان کرنا ہے، جن کے ذریعہ سے ہم شہادت کی جانچ کر سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں اُن اصول پر بھی بحث ہوگی، جن سے شاہد کا امتحان ہو سکتا ہے۔

سہولتِ تفہیم کے لیے ہم اپنے موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصہ میں عام شہادت کی قابلیتِ اعتبار پر بحث ہوگی، اور دوسرے میں بلا واسطہ اور بالواسطہ شہادت پر علیحدہ علیحدہ غور ہوگا۔ حصہ اول پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک خاص شہادت لائقِ اعتبار ہے یا نہیں، تو ہم کو اس مسئلہ میں ہر دو مختلف حیثیتوں سے نگاہ کرنی چاہیے۔ اول تو یہ دیکھنا چاہیے، کہ جس واقعہ کے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، وہ کہاں تک ممکن الوقوع ہے۔ پھر یہ معلوم کرنا لازمی ہے، کہ شاہد کس حد تک ثقہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں عام شہادت کی بحث

دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلے کو مشہود سے اور دوسرے کو شاہد سے تعلق ہے۔ ان میں سے پہلے کے مطابق امر زیر تحقیق یہ ہوتا ہے، کہ مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کے شرائط کیا ہیں؟ اور دوسرے کا سوال یہ ہوتا ہے، کہ شاہد کے لحاظ سے شہادت کن کن حالتوں میں لائق اعتبار ہوتی ہے۔ اب ہم اپنی تقسیم کے مطابق اور اسی ترتیب سے انکا تذکرہ کریں گے۔

مشہود، یا وہ واقعہ جسکے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کو معلوم کرنے کے لیے پہلی شرط تو یہ ہے، کہ وہ اطلاقاً اور اضافاً دونوں حیثیتوں سے ممکن الوقوع ہو۔ اس بیان میں اطلاقی امکان وقوع اور اضافی امکان وقوع تشریح طلب ہیں۔ ایک واقعہ کو اطلاقاً یا بنفسہ ممکن الوقوع اُسوقت کہا جاتا ہے، جب یہ منطقی قوانین فکر کے منافر و مخالف نہ ہو۔ ایک شخص آکر شہادت دیتا ہے، کہ اُسنے ایک ایسا پرندہ دیکھا ہے، جو ایک ہی وقت میں سفید بھی تھا اور سیاہ بھی۔ اب منطق کے قانون اجتماع نقیضین کا دعوے یہ ہے، کہ ایک ہی چیز کا ایک ہی وقت میں ب اور غیر ب ہونا ناممکن ہے۔ چونکہ یہ واقعہ منطق کے اس قانون کے خلاف ہے اس واسطے اسکو اطلاقاً ناممکن الوقوع کہا جائیگا۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ ایک ہی پرندے کا ایک ہی وقت میں بالکل سفید و سیاہ ہونا ناممکن ہے، تو یہ شہادت بھی بیکار ہوگئی، کیونکہ مشہود اطلاقاً ناممکن الوقوع ہے۔ اسکے مقابلہ میں اضافاً ممکن الوقوع اُس واقعہ کو کہا جاتا ہے، جو داخلی یا خارجی ادراک کا معروض بن سکے، جو حواس یا شعور ذات پر اثر آفریں ہو سکے، اور اسی اثر کی وجہ سے اسکا علم ہو سکے۔ اس حیثیت سے جن اشیاء کا ہمکو ادراک ہو سکتا ہے (یہ اشیا بلحاظ زمان و مکان کہیں ہوں) وہ اضافاً ممکن الوقوع کہلائیں گی۔ اسی طرح جن اشیا کی تصویر تخیل میں قائم کی جا سکتی ہے، وہ بھی اسی فہرست میں شامل ہونگی۔ لیکن جن اشیا کا نہ ادراک ہو سکتا ہے، اور نہ اُنکی تصویر قائم کی جا سکتی ہے، اضافاً ناممکن الوقوع کہلائیں گی۔ ان اشیاء کے متعلق تمام شہادت بالکل لایعنی اور ناقابل اعتبار ہوگی۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ جس شہادت کا مشہود بنفسہ، یا حواسی قوا کی معروض کی حیثیت سے، ناممکن ہو، اُسکو بلا تامل رد کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ایک چیز کی محالیت کا فیصلہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے، ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے، کہ وہ چیز بحیثیت محسوس کے محال ہو، یا یہ کہ عالم مادی کے قوانین و نوامیس کے مطابق اُسکا ادراک ناممکن ہو، اس قسم کی محالیت طبعی محالیت کہلاتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں ایک اور حالت یہ ہو سکتی ہے، کہ اُس کا ادراک فطری یا ما فوق فطری، طریقوں میں سے کسی سے بھی ممکن نہ ہو۔ اس قسم کی محالیت کو الہیاتی

محالیت کہتے ہیں۔ لیکن کسی چیز کی طبیعی محالیت کو ثابت کرنے کے لیے صرف یہ ہی دکھانا کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس چیز کے وجود کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ اس کا وجود بظاہر قوانین فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ برعکس اسکے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پہلے ایک عالمگیر اور اٹل قانون فطرت کے وجود کو ثابت کیا جائے۔ اب اگر وہ چیز طبیعی طور پر ممکن ثابت ہو جائے، تو وہ قانون فطرت خود بخود مسترد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح الٰہیاتی محالیت کو ظاہر کرنے کے لیے صرف یہی دکھانا کافی نہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق اس چیز کی توجیہ نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ ایک خاص قانونِ فطرت اسکے مخالف ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا لازمی ہے، کہ ایک مافوق فطری ذات بھی اسکی تکوین و تخلیق کا باعث نہیں ہو سکتی، اور یہ کہ اسکے وجود کو تسلیم کرنا کسی نہ کسی اصول کے منافی ہے۔ جب ان اصول کے مطابق کسی چیز کی طبیعی یا الٰہیاتی محالیت ثابت ہو جائے، تو اُسکے متعلق تمام شہادت کو بلا تردد رد کیا جا سکتا ہے۔

مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیتِ اعتبار کو قائم کرنے کے لیے اسکے اطلاقاً ممکن الوقوع ثابت ہونے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہونا چاہیے، کہ وہ اضافاً بھی ممکن الوقوع ہے۔ امکان کی یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی غائب ہونے کی صورت میں ناقص اور بیکار ہو جاتی ہے۔ اضافی امکان سے ہماری مراد یہ ہے کہ اُس چیز کی لازمی اور ضروری صفات میں کسی قسم کا تناقض نہ ہو (یہ تو ظاہر ہے، کہ اس چیز کے متعلق تمام غور و فکر صرف ان ہی صفات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے)۔ اسکے ساتھ ہی اسکو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے، کہ جن صفات کو شہادت میں بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی تناقض سے بری ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ ایک شہادت من حیث الشہادت، اگر تناقض بیانات کا مجموعہ ہے، تو اسکو قابلِ اعتبار نہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ ہر وہ چیز جو خود اپنی تنقیض کرے، منطقی حیثیت سے بالکل بیکار ہوتی ہے۔ اسکو معلوم کرنے کے لیے صرف یہ دیکھنا کافی ہوتا ہے، کہ یہ شہادت خود اپنی تنقیض تو نہیں کرتی۔ کیونکہ ممکن ہے، کہ یہ تناقض شاہد کی رائے سے پیدا ہوا ہو۔ اس قسم کے تناقض کو نظر انداز کرنے سے شہادت کی قابلیت اعتبار میں کسی قسم کا کوئی فتور و نقص واقع نہیں ہوتا۔ اسلیے اسکو نہ مسترد کیا جا سکتا ہے اور نہ اسکی تکذیب لازم آتی ہے۔ ایک چیز کے وجود کی شہادت کو صرف اس لیے رد کر دینا یقیناً غلطی ہے، کہ شاہد نے اسکی علت کے متعلق خود اپنی رائے ظاہر کی۔ مثلاً ایک شخص آکر بیان کرتا ہے، کہ فلاں مقام پر زمین شق ہو گئی ہے اسکے ساتھ ہی وہ یہ بیان کرتا ہے، کہ ایک شخص کے سر پر جن سوار تھا۔ ایک عامل نے اپنے عمل سے

اس جن کو اُتارا، اور وہ جن اُس زمین کو پھاڑ کر غائب ہوگیا - اب اس شہادت کو صرف اسوجہ سے بیکار اور ناقص سمجھنا، کہ یہ تعلیل و توجیہ ناقص ہے، یقیناً غلطی ہے، کیونکہ زمین کا شق ہونا صحیح ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ اسکی وجہ وہ نہ ہو، جو شاہد نے بیان کی - دوسرے الفاظ میں شہادت کی جانچ کرتے وقت نفس مشہود اور اسکے متعلق شاہد کی رائے کو نہایت احتیاط سے علیحدہ کرنا بہت ضروری ہے - ایسا نہ کرنے سے ممکن ہے، کہ غلط شہادت صحیح ہوجائے، اور صحیح غلط - شہادت کے اس نقص کو صرف اس طرح معلوم کیا جاسکتا ہے، کہ اسکے تناقض بیان کو معلوم کیا جائے -

یہاں تک ہم نے اپنے آپ کو صرف مشہود تک محدود رکھا ہے - اب فرض کیا جائے، کہ مشہود اطلاقاً و اضافاً دونوں طرح ممکن الوقوع ہے، اس میں نہ طبیعی محالیت پائی جاتی ہے نہ الہیاتی لیکن شہادت کی صحت کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا - ایک شخص آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں مقام پر بلوہ ہوگیا ہے - بلوے کا ہونا ناممکن الوقوع نہیں - اس کا وجود کسی قسم کی محالیت کو بھی مستلزم نہیں، لیکن کیا یہ ممکن نہیں، کہ اس شخص نے آکر جھوٹ بولا ہو؟ بلوے کا ہونا ممکن الوقوع سہی، لیکن اسکے امکان وقوع سے یہ کیسے لازم آتا ہے، کہ اس شخص کی شہادت بھی صحیح ہے؟ کیا ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایسی شہادتوں سے اکثر سابقہ نہیں پڑتا، جنکا مشہود ممکن الوقوع ہے، لیکن باوجود اسکے شہادت بیکار ہے - اس کا مطلب یہ ہے، کہ کسی شہادت کی جانچ کرتے وقت پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مشہود ناممکن تو نہیں، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ ناممکن ہے، تو شہادت کی غلطی میں کوئی شبہہ باقی ہی نہیں رہتا - اگر اس کا امکان ثابت ہو، تو پھر دوسرا سوال یہ ہونا چاہیے، کہ شاہد کہاں تک معتبر ہے؟ اُسکے قول کا کس حد تک اعتبار کیا جاسکتا ہے؟

شہادت کی ماہیت کو جن الفاظ میں ہم نے پیچھے کہیں بیان کیا ہے، اُن پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ دراصل دو اجزاء سے مرکب ہوتی ہے - ہم نے کہا ہے، کہ ایک واقعہ کو کسی ایسے شخص سے بیان کرنے کو شہادت کہتے ہیں، جو اس واقعہ کا بذات خود تجربہ نہ کرسکتا ہو - اب ظاہر ہے کہ اگر میں کوئی واقعہ کسی شخص سے بیان کروں، تو لازمی ہے، کہ وہ پہلے میرے مشاہدہ میں آئے - اور اگر میری شہادت بالواسطہ ہے، تو اُس کا کسی اور کے مشاہدہ میں آنا لازمی ہے - جب تک خود مجھ کو، یا میرے منقول عنہ کو، اسکا مشاہدہ نہ ہو، میں یا وہ اسکے متعلق کوئی بیان نہیں دے سکتا - اسی تمام تقریر کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے، کہ شہادت اصل میں مرکب ہوتی ہے مشاہدہ اور اُس مشاہدہ کی اطلاع دہی سے - یہی اسکے غیر منفک اور لازمی

اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک بھی غائب ہو، تو شہادت بھی کالعدم ہو جاتی ہے۔ جب یہ مسلم ہے، تو یہ بھی ظاہر ہے کہ قابل اعتبار شاہد وہی ہو سکتا ہے، جس میں یہ دونوں قابلیتیں بدرجہ اتم موجود ہوں یعنی یہ کہ اُس میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت ہو، اور اُس مشاہدہ کو مناسب طور پر بیان کرنے کی اہلیت۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ جو کچھ بیان کرے صدق دل اور خلوص نیت سے بیان کرے۔ اس میں مبالغہ آمیزی نہ کرے۔ جہاں تک ممکن ہو اُسکو واقعہ کے مطابق بیان کرے، یعنے جھوٹ کو اُس میں دخل نہ ہونے دے۔ مختصراً یہ کہ شاہد قابل اعتبار وہی ہو سکتا ہے جسمیں تین صفات پائی جائیں، اول قابلیت مشاہدہ، دوم اطلاع دہی کی اہلیت، اور سوم دیانتداری یا صداقت یا خلوص نیت۔ ایک شاہد واقعہ مشہودہ کے مشاہدہ کا اہل بھی ہے، اُسکی اطلاع بھی مناسب اور موزوں طریقہ سے کر سکتا ہے، لیکن شہادت میں اگر وہ اپنی طرف سے باتیں شامل کرتا جاتا ہے، یا کسی وجہ سے اصل واقعہ کو مسخ کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ شہادت بیکار ہو جائیگی۔ اسی طرح ایک شخص نہایت دیانتدار اور حق گو ہے، لیکن مشاہدہ کی قابلیت نہیں رکھتا، تب بھی بداہتہً اسکی شہادت قابل اعتبار نہ ہوگی۔ پھر اگر اُس میں مشاہدہ کی قابلیت بھی ہے اور دیانتداری بھی، لیکن ہاتھ میں قلم یا منہ میں زبان نہیں رکھتا، تب بھی شہادت ناقص ہو جائیگی۔ راسٹر اینیسی ناقص شہادت کی زندہ مثال ہے۔ اسکے پاس ذی علم اور لائق نامہ نگاروں کی بہتات بھی ہے، مشاہدہ کرنے کی سہولت بھی حاصل ہے، اسکے آدمی ہر جگہ صف اول میں نظر آتے ہیں واقعات عالم کو معلوم کرنے کے تمام ذرائع بھی مہیا ہیں، غرض اسکے ذو اہلیت ہونے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، لیکن اسکے تاروں کی جو وقعت آج کل، کم از کم ہندوستان میں ہے، وہ ہر ایک پر روشن ہے۔ کیوں؟ صرف اسلیے کہ اہلیت تو موجود ہے، لیکن صداقت اور دیانت مفقود ہے۔ اسکی شہادت پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک شخص ہے، کہ جس نے تمام عمر کبھی جھوٹ نہیں بولا، واقعات کو بیان کرنے میں وہ ہمیشہ بہت محتاط رہتا ہے، اسکی ایمانداری، دیانتداری اور پرہیزگاری تمام عالم کے نزدیک مسلم ہے، لیکن اثر بات سے اسکو مس نہیں، اگر یہ شخص لارڈ کارزن سے قبل تو تن خامن کی قبر پر پہنچ جاتا، اور وہاں کے حالات بیان کرتا، تو کوئی شخص اسکو معتبر نہ سمجھتا۔ صرف اس لیے کہ وہ ذو اہلیت نہیں۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے، کہ شاہد کی یہ دونوں، یا تینوں صفات، یعنی اہلیت مشاہدہ و اطلاع دہی، اور صداقت و دیانتداری منطقی حیثیت سے لازمی ہیں، ان میں سے ایک کے غائب ہو جانے سے شاہد اعتبار کے درجہ سے گر جاتا ہے

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان دونوں صفات میں سے کسی کو دوسری کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا ہوگا، کہ اکثر الکثیر صداقت کے ساتھ اقل القلیل اہلیت کا ہونا بعید از قیاس و حقیقت نہیں۔ اسی طرح کثیر ترین اہلیت کے دوش بدوش قلیل ترین صداقت کا ہونا بھی ناممکن نہیں۔ ہم ایک کو دوسرے پر مبنی نہیں کر سکتے۔ لیکن بالعموم اگر ایک شخص کی صداقت غیر مشتبہ ہے، تو اسکی اہلیت بھی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک صادق القول شخص کبھی ایسی بات نہ کرے گا جو اُسکو پوری طرح یاد نہ ہو، یا جسکے مشاہدہ کرنے میں اُس نے اپنی پوری توجہ صرف نہ کی ہو، یا جس کا مشاہدہ کرنے کا وہ اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ ہمارے اس قول سے یہ مراد نہ لینی چاہیے کہ صادق القول شخص لازماً ہر قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہوتا ہے۔ برگسان کتنا بھی حق گو کیوں نہ ہو، اُسکو کسی طرح بھی کیمیاوی مشاہدات کا اہل نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری مراد صرف یہ ہے کہ برگسان اپنی صداقت و دیانتداری کی وجہ سے لوگوں کو اس دھوکے میں نہ ڈالیگا کہ وہ کیمیادان بھی ہے، اور اسلیے وہ اسکے واقعات و مظاہر کا صحیح مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا کر سکتا ہے، تو جس بات پر اُسنے پورا غور نہیں کیا، یا جس بات کو وہ یاد نہ رکھ سکا، اُسکو اپنی طرف سے جوڑ کر بیان نہ کریگا۔ اسی واسطے ہم روزمرہ زندگی میں ایک صادق مگر نا اہل کی شہادت کو کاذب، مگر اہل کی شہادت کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ جس واقعہ کے متعلق صرف ایک ہی شہادت میسر آ سکتی ہے، وہاں ہم شاہد کی صداقت کو اُسکی اہلیت کا ضامن گردانتے ہیں۔ اگر ہم کو اسکی شہادت کا یقین ہوتا ہے، تو ہم کو یہ بھی اطمینان ہوتا ہے، کہ وہ اپنی نا قابلیت یا نا اہلیت کو چھپائے گا نہیں۔ اسی واسطے ہم اُسکی شہادت کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیتے ہیں۔

ہم نے ابھی کہا ہے، کہ شہادت قابل اعتبار اُسوقت ہوتی ہے جب شاہد میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت ہو، اور اُسکو موزوں و مناسب طور پر بیان کرنے کی اہلیت۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس واقعہ کا صحیح صحیح مشاہدہ کر سکتا ہو، اور صحت کے ساتھ اُسکو بیان بھی کر سکتا ہو۔ اس قابلیت و اہلیت کے لیے سب سے پہلی شرط تو یہ ہے، کہ وہ شخص معلومات انسانی کے اس شعبہ سے پوری پوری واقفیت رکھتا ہو جس سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ اگر وہ واقعہ کیمیا سے تعلق رکھتا ہے، تو شاہد کا ماہر کیمیا ہونا ضروری ہے۔ اس مہارت کی عدم موجودگی میں شہادت معتبر نہ ہوگی، خواہ شاہد کی صداقت کسی قدر مسلم کیوں نہ ہو۔ اسی طرح نفسیاتی واقعہ کو جس خوبی، عمدگی، تفصیل اور کمال کے ساتھ ماہر نفسیات بیان کریگا اور کوئی

شخص نہیں کر سکتا۔ قانونی عدالتوں میں ارسنیک کے مقدمات میں چوٹ چپیٹ کے متعلق سوائے ڈاکٹر کی شہادت کے اور کوئی شہادت قبول نہیں ہوتی۔ رسم الخط کی شناخت کے لیے ڈاکٹر کی رائے نہیں بلکہ رسم الخط کے ماہر کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح زہر کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے کیمیکل گزائنر کی طرف رجوع کی جاتی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کے سب اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسکے ماہر ہیں جس سے وہ واقعہ متعلق ہے دوسرے الفاظ میں ان ماہرین کے علاوہ کوئی اور شخص اس خاص چیز کے مشاہدہ کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ پھر یہاں بھی ہر ایک ڈاکٹر، یا ہر ایک ماہر رسم الخط، یا ہر ایک کیمیکل ایگزامنر برابر نہیں سمجھا جاتا۔ باوجود اس کے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن سے واقف ہے۔ یہ عدم مساوات نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ بعض ڈاکٹر علیٰ وجہ کمال مشاہدہ نہیں کر سکتے، یا اُس مشاہدہ کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے، یا اُس مشاہدہ کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے۔ ان ڈاکٹروں کی شہادت ناقص سمجھی جاتی ہے۔ ہاں جن ڈاکٹروں کی قابلیتِ مشاہدہ و صلاحیتِ اطلاع دہی بہت سے موقعوں پر مستحسن ہو چکی ہے، اُنکی شہادت میں شبہہ نہیں کیا جاتا۔ جس قدر پختہ کار اور قابل یہ ڈاکٹر ہوتا ہے، اُسی قدر زیادہ معتبر اُسکی شہادت مانی جاتی ہے، اور اگر وہ واقعہ جسکا وہ شاہد ہے، بالکل معمولی اور عام ہے، تو اُسکی شہادت کو الہام کا درجۂ یقین حاصل ہوتا ہے۔ پھر اسکے ساتھ ہم کو اس بات کی بھی تحقیق کرنی چاہیے کہ جن حالات میں شاہد نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے، وہ ایسے تو نہ تھے جنکی وجہ سے اس کا مشاہدہ، یا اُس مشاہدہ کا بیان غلط ہو گیا ہو۔ قانونی شہادتوں میں "سلامتی ہوش و حواس" اور بلوغت کی شرط اسی طرح لگائی جاتی ہے، کہ اگر ہوش و حواس درست نہ ہوں، یا شاہد بالغ العمر نہ ہو، تو اول تو مشاہدہ ہی درست نہ ہوگا، اور اگر مشاہدہ درست ہو بھی گیا، تو اُسکا بیان یقیناً صاف اور صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ اس قسم کے حالات ہیں جن میں مشاہدہ، یا اسکے بیان، کی درستی و صحت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے، اور اسی اشتباہ کی وجہ سے اس شہادت کو قبول نہیں کیا جاتا۔

منطقیوں نے مشاہدہ میں غلطی کے دو ممکن ذرائع بیان کیے ہیں۔ پہلی صورت کو وہ اصطلاحاً مغالطہ عدم مشاہدہ کہتے ہیں، اور دوسری کو مغالطۂ سوءِ مشاہدہ۔ عدم مشاہدہ کی پھر دو صورتیں ہو جاتی ہیں۔ انکی توضیح مثالوں سے ہوگی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، جس شخص کا ذکر ہوتا ہے، وہ معاً آ موجود ہوتا ہے، اور جس شے کو ہم خواب میں دیکھتے ہیں، وہ شے دوسرے ہی روز وقوع میں آ جاتی ہے۔ ایک ہی نوع کی بہت سی مثالوں کی بنا پر بعض لوگ خوابوں کو سچا سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اکثر اشخاص کو نجومیوں اور رمالوں سے آئندہ کے حالات دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے اور

صرف ان شالوں کو لیکر جن میں انکی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی، نجوم و رمل پر ایمان لے آتے ہیں۔ اسی قسم کی اور صورتوں میں ہوتا یہ ہے، کہ وہ بات محض اتفاق سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اُن مثالوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن میں وہ بات ثابت نہ ہوئی تھی۔ صرف امثال موجبہ پر غور کرنے اور امثال سالبہ و مخالفہ کو نظر انداز کر نے سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے

امثال مخالفہ کو نظر انداز کا فطری میلان اس وقت اور بھی قوی ہوتا ہے، جب امثال موجبہ کسی ایسے مسئلہ کی مثالیں ہوں، جسکو پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا ہو، یا جو شہادت ان مثالوں سے حاصل ہوتی ہو، اُسکی تائید میں تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ کے جذبات شامل ہوں۔ مثلاً عوام الناس نے سحر اور عملیات کے اثر اور چڑیلوں اور بھوتوں کے وجود کو تسلیم کر رکھا ہے، تو تمام ایسی روایات، جن سے ان اشیا کے اثر، یا وجود، کی تصدیق ہوتی ہے، نہایت شوق اور اعتبار سے سُنی جاتی ہیں، اور برخلاف اسکے ہزاروں ایسی مثالیں جہاں سحر کا کچھ اثر نہیں ہوا، یا بھوت اور چڑیلوں کی کی بابت، جو روایات ہوتی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہیں، اکثر تو نظر انداز کر دی جاتی ہیں، اور اگر اُن پر غور کیا جاتا ہے، تو دل کو اس طرح سمجھا لیا جاتا ہے کہ شاید ان موقعوں پر کسی اور اعلیٰ اور قوی تر علت نے سحر کے اثر کو زائل کر دیا ہو۔

اسکے علاوہ تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ جذبات اکثر اپنے معارض مثالوں کا مشاہدہ ہی نہیں کرنے دیتے۔ مثلاً عاشق اپنے معشوق میں، اور والدین اپنے بچوں میں سوائے حُسن و خوبی کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ اسی طرح ایک متعصب شخص کو اپنے مذہب میں سوائے خوبیوں کے، اور دوسروں کے مذہب میں سوائے بُرائیوں کے، اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ان تمام صورتوں میں مشاہدہ بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ تعصب وغیرہ کی وجہ سے اصلیت مسخ ہو جاتی ہے، اور ہر ایک چیز اپنی من مانی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

پھر تعصب وغیرہ جذبات کا صرف یہی اثر نہیں ہوتا، کہ امثال مخالفہ نظر انداز کر دی جاتی ہیں، بلکہ انکی وجہ سے لوگ ایسے اقوال و مسائل تسلیم کر لیتے ہیں، کہ اگر انکا تجربہ کیا جائے، تو بالکل بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ گیلیلیو کے زمانہ تک ہر شخص یہ مانتا چلا آرہا تھا، کہ گرنے والے اجسام اور زمین تک پہونچنے کی مدت میں نسبت معکوس ہوتی ہے۔ یعنی پانچ سیر کا وزن ایک سیر وزن کے مقابلہ میں ایک خمس مدت میں زمین تک پہونچے گا۔ اس قول کی صحت کی جانچ کے لیے ایک سادہ سا تجربہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن کسی نے یہ تکلیف نہ اُٹھائی اور ان مسائل کو بلا چون و چرا مانتے چلے آئے۔

فطرتِ انسانی کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ اکثر کسی واقعہ کی چند نمایاں اور اول ہی اول ظاہر ہونے والی امثال کو دیکھ لیتا ہے، اور ان ہی کی بنا پر کلیہ قائم کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی قوم، یا پیشہ، یا جماعت کے چند اشخاص میں چند مخصوص خصائل دیکھ لیتے ہیں، تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم یہ ایمان لے آتے ہیں کہ تمام قوم، پیشہ، یا جماعت میں یہ خصائل پائے جائیں گے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی غیر ملک میں سفر کرتا ہے، تو اکثر اسکو پہلے پہل گاڑیانوں، قلیوں اور بھٹیاروں سے کام پڑتا ہے، اور وہ سیاح ان ہی لوگوں کے خصائل پر استدلال کر کے تمام قوم کو متدین یا غیر متدین، خوش خلق یا بدخلق قرار دے لیتا ہے۔

یہ تمام مذکورہ صورتیں مغالطہ عدم مشاہدہ کی اُس قسم سے تعلق رکھتی ہیں جس میں بعض امثال کو غور اور بعض کو نظر انداز کر کے ایک خاص نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اسی مغالطہ کی ایک قسم یہ ہوتی ہے کہ ہم کسی ایک مثال کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، لیکن ہر ایک مثال میں ہمارا مشاہدہ غلط ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں نقص مثالوں کی تعداد میں نہیں، بلکہ اُن کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ ایسی حالتوں میں ہوتا یہ ہے، کہ چند ایسے ضروری عوارض کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جنکو واقعہ زیرِ مشاہدہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان ضروری عوارض کو نظر انداز کر کے استدلال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈگبی نے زخموں کے علاج کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا، کہ جس ہتھیار سے زخم پہونچا تھا، اس پر ایک سفوف چھڑک کر اور مرہم لگا کر دو تین دفعہ صاف کیا جاتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اس زخم کو روئی وغیرہ رکھ کر مضبوط باندھ دیا جاتا تھا۔ اور سات دن کے بعد جب کھولا جاتا تھا، تو وہ زخم بالکل مندمل ملتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی مثالوں کے مشاہدہ کے بعد عام خیال یہ قائم ہوا تھا، کہ وہ اندمال زخم پہونچانے والے ہتھیار پر مرہم لگانے کا نتیجہ تھا، لیکن حقیقت میں زخم کے اچھا ہونے کا سبب یہ تھا کہ سات دن زخم مضبوط بندھا رہا تھا، اور اس وجہ سے باہر کی ہوا نہ لگی تھی۔

پھر مشاہدہ میں غلطی کی وجہ ایک اور یہ ہوتی ہے، کہ جس چیز کو ہم مشاہدہ کہتے ہیں، وہ اصل میں مشاہدہ نہیں ہوتا، بلکہ استدلال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم شام کے وقت باہر نکلتے ہیں، اور دیکھتے ہیں، کہ سڑکوں پر دو رویہ پولیس کے سنتری کھڑے ہیں، تمام بازار سجے ہوئے ہیں، تمام دوکانیں اور مکان آئینہ بند ہیں۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں، فوج کے گورے نہایت اہتمام و انہماک کے ساتھ ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ ان تمام حالات کو دیکھ کر جب ہم گھر واپس آتے ہیں، تو بیان کرتے ہیں، کہ آج گورنر کی سواری نکلنے والی ہے۔ ہمارا مشاہدہ سواری کا نہ تھا، بلکہ اُس انتظام و اہتمام کا تھا، جو اُس سواری کے لیے ہو رہا تھا۔ لیکن چونکہ ہمنے ہمیشہ اس قسم کے انتظام کو سواری کے لیے ہوتے

دیکھا ہے، اس لیے شہادت ہم نے انتظام کی نہ دی، بلکہ سواری کی دی، اور یہ شہادت ظاہر ہے، کہ مشاہدہ پر مبنی نہ تھی، بلکہ اُس نتیجہ پر موقوف تھی، جو ہم نے اُس انتظام کو دیکھ کر اخذ کیا تھا۔ ان حالات میں شہادت کا غلط ثابت ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ممکن ہے کہ گورنر کی سواری نہ نکلی ہو، بلکہ کسی اور مصلحت سے یہ انتظام کیا گیا ہو۔

یہ سچ ہے، کہ مشاہدہ کے ان نقائص کو شہادت میں معلوم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، لیکن اگر شاہد نے گذشتہ موقعوں پر اپنے آپ کو ہر قسم، یا ایک خاص قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے کا اہل ثابت کیا ہے، تو ہم کو یہ اطمینان ہو جانا چاہیے، کہ وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکیگا، اور اس طرح اسکے مشاہدہ میں نہ تو اشتمال مخالفہ وسالبہ کو نظر انداز کیا گیا ہوگا، نہ واقعہ زیر مشاہدہ کے بعض ضروری عوارض کو ترک کیا گیا ہوگا، اور نہ یہ اصلی وواقعی مشاہدہ کا نتیجہ ہوگا۔ یہی مطلب ہے ہمارے اس قول کا کہ شاہد میں اہلیت ہونی چاہیے۔

یہاں تک صرف مشاہدہ کرنے اور اُسکو بیان کرنے سے بحث تھی، لیکن اسکے ساتھ جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، یہ بھی ضروری ہے، کہ شاہد دیانتدار اور صادق ہو۔ مشکل یہ ہے، کہ ہم کو اسکی ان صفات کا پوری طرح یقین نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس یقین کا پڑنے سے بڑا غالبہ ہو سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے، کہ اگرچہ ہم کو شاہد کے کیرکٹر اور اُسکی عادات وخصائل سے اس قدر مکمل واقفیت ہے کہ ہم اسکی صداقت پر اعتماد کر سکتے ہیں، لیکن دل کا حال سوائے عالم الغیب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں اکثر طاقتیں ایسی ہیں، جو بڑے سے بڑے متدین اور متقی شخص کو صراط مستقیم سے منحرف کر سکتی ہیں۔ عادات کا طبیعت ثانیہ ہونا مسلم، لیکن جب ان طاقتوں کے زیر اثر طبیعت اولیہ بدل جاتی ہے، تو طبیعت ثانیہ تو یقیناً خارج از بحث ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوریوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان ہی کمزوریوں میں سے کوئی ایک بروے کار آکر انسان کے ارادوں کو کچھ کا کچھ کر دیتی ہے۔ لیکن ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں شہادت پر نا چار روناگزیر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ ہم شاہد کے خلوص نیت پر اعتبار کرتے ہیں، اگرچہ بعض کو ہم مسترد بھی کر دیتے ہیں۔ شاہد کی دیانتداری اور صداقت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک طریقہ تو ہم یہ اختیار کر سکتے ہیں، کہ اُسکی گذشتہ زندگی کے حالات پر غور کریں، اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں، کہ وہ صداقت دیانتداری کو محبوب رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھتا ہے، تو ہم کو اس خاص موقعہ پر بھی اسکی صداقت کا ایک حد تک یقین ہونا چاہیے۔ لیکن کیا فطرت انسانی کا یہ ایک معمولی اور عام مظہر نہیں، کہ ایک شخص اپنا

اعتبار بڑھانے کے لیے کچھ مدت تک تو نہایت دیانتدار رہتا ہے، اور جب اعتبار بڑھ جاتا ہے، اور ساکھ قائم ہو جاتی ہے، تو ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے، کہ گذشتہ دیانتداری سے جو نقصان ہوا تھا، اُسکو مع سُود کے وصول کر لیتا ہے۔ اس بنا پر کسی کی عادتِ صداقت پر بھروسا نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس دُنیا میں رہنا، اور اپنے ہمجنسوں سے معاملہ نہ رکھنا، یا اُن سے قطع تعلق کر لینا، بقول ارسطو کے، یا تو فرشتوں سے ممکن ہے، یا وحوش سے، انسانوں سے ممکن نہیں۔ اب اگر اپنا ہمجنس سے تعلق رکھنا بھی ضروری ہے، اور یہ تعلق بغیر اعتبار و اعتماد کے قائم نہیں رہ سکتا، پھر یہ اعتماد و اعتبار نتیجہ ہوا کرتا ہے عادات کا، کیونکہ عادات ہی کو دیکھ کر انکا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ عام خیال کے مطابق انسان اپنی عادات کا غلام ہوا کرتا ہے۔ ہر کیف باوجود ان تمام نقائص کے شاہد کی صداقت کو معلوم کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہمارے پاس ہے، تو عادات ہیں۔ ہاں اپنی تسلی کے لیے یہ کر سکتے ہیں، کہ اسکے ساتھ اسپر غور کر لیں، کہ شہادت دینے کے وقت کوئی ایسا محرک عمل تو نہیں کر رہا تھا، جسکے زیر اثر اُس نے اپنی عادت کو ترک کر دیا ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی محرک ہے، تو عادت یقیناً ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ اپنی جان کس جانور کو پیاری نہیں ہوتی۔ ممکن ہے، کہ وہ شاہد جو راست گوئی کا عادی ہے، کسی مستبد اور ظالم حاکم کے سامنے شہادت دے رہا ہو۔ ایسی حالت میں یہ بعید نہیں، کہ وہ محض جان بچانے کے لیے، یا تکلیف و تعذیب سے محفوظ رہنے کی غرض سے، جھوٹ بول جائے، اور اس طرح غلط شہادت دیدے۔ حاکمان پولیس کے روبرو جو شہادتیں گذرتی ہیں، وہ اس خاص صورت کی بہترین مثالیں ہیں۔ پھر بلدوں کے مقدمات میں "سرکاری گواہوں" کی شہادت اسی لیے ناقص سمجھی جاتی ہے، کہ وہ قید و بند کی مصیبت سے نجات پانے کی امید میں غلط بیانی اور دروغگوئی کر سکتے اور کرتے ہیں۔ اطمینان مزید کے لیے ان پر جرح کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ اگر ان سوالات کے دوران میں کہیں اُسکی تناقض بیانی منکشف ہو جاتی ہے، تو محض اس تناقض کی وجہ سے اُسکی شہادت پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ شہادت اگر سچی ہوتی تو یہ تناقض ناممکن تھا۔

مختصر یہ کہ شاہد کی صداقت و دیانتداری کو معلوم کرنے کا پہلا ذریعہ تو یہ ہے، کہ ہم اسکے کیرکٹر کی اچھی طرح جانچ کریں۔ دوم یہ کہ ایسے محرکات کی عدم موجودگی کو ثابت کریں جنکے زیر اثر وہ شخص دیدہ و دانستہ دروغ گوئی پر مجبور ہوتا، سوم یہ کہ جرح کے سوالات کر کے یہ دیکھیں، کہ اس میں کسی قسم کا تناقض تو نہیں پایا جاتا۔ لیکن اسکو نہ بھولنا چاہیے، کہ ان تینوں ذرائع سے ہمکو شاہد کی صداقت، دیانتداری اور خلوص نیت کا پورا پورا یقین نہیں ہو سکتا، البتہ یقین کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

یہاں تک ذکر تھا اُس شاہد کا جو دیدہ و دانستہ جھوٹ بولتا ہے - یہ جھوٹ جلب منفعت کے لیے ہو، یا دفع مضرت کے لیے، یا کسی اور غرض سے - لیکن بعض شہادتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن میں وہ اپنی طرف سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کرتا، حالانکہ یہ شہادت بالکل، یا تقریباً غلط ہوتی ہے - دوسرے الفاظ میں اسکی دروغگوئی شعوری نہیں، بلکہ غیر شعوری ہوتی ہے - بعض طبیعتیں مبالغہ پسند ہوتی ہیں، وہ اسی مبالغہ پسندی کی وجہ سے ذرا سی بات کو افسانہ کر دیتی ہیں - نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے، کہ اصلیت بالکل مسخ ہو جاتی ہے - بعض اپنے تجربات و مشاہدات کی تفریط کی تلافی استدلال و تخیل کی افراط سے کرتے ہیں - بچوں کے بیانات میں تخیل کی رنگ آمیزی بکثرت ہوتی ہے بعض اشخاص محض اپنی شہرت اور عظمت بڑھانے کے خیال سے من گڑھت قصے بیان کر جاتے ہیں - یہ بھی عموماً ہوتا ہے، کہ واقعہ کی دلکشی اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اُس میں اپنی طرف سے بہت سی باتیں شامل کر دی جاتی ہیں - شاہد بزعم خود تمام واقعات صحیح صحیح اور بلا کم و کاست بیان کرتا ہے، لیکن یہ اثرات برابر کام کیے چلے جاتے ہیں -

انکے ساتھ اس حقیقت کو بھی شامل کر لینا چاہیے، کہ ہمارا حافظہ بہت فریب دہ ہوتا ہے - اکثر اوقات تو ایک واقعہ کی بہت سی باتیں ہمکو یاد نہیں رہتیں - بعض اوقات اس واقعہ کو بیان کرنے میں ایسی باتیں شامل کر دی جاتی ہیں، جنکو اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ واقعات کی ترتیب مختلف ہو جاتی ہے، جس ترتیب میں کہ وہ مشاہدہ میں آئے، وہ یاد نہیں رہتی - نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انکو بیان کرنے میں انکی ترتیب بالکل من گڑھت ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اس اختلافِ ترتیب سے شہادت میں کچھ فرق نہیں آتا، لیکن بعض واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں، جن میں ترتیب بہت ضروری ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تین مختلف قسموں کے نقائص پیدا ہو سکتے ہیں :- (۱) متعلق باتوں کا ترک کر دینا (۲) غیر متعلق باتوں کا شامل کر دینا اور (۳) ترتیب کا مختلف ہو جانا - پھر جس طرح وقت گذرتا جاتا ہے اسی طرح ان نقائص کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے - یہی وجہ ہے، کہ سائنس کے تمام اختبارات میں تاکید کی جاتی ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ کیا جائے، اُسکو فوراً تحریر میں ضبط کر لیا جائے، تاکہ ذہول کی وجہ سے کوئی بات چھوٹ نہ جائے - لیکن خرابی یہ ہے، کہ ہر شہادت میں یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی - وہ لوگ، جن کی تحریرات آجکل کی تاریخ کا سنگ بنیاد ہیں، ہر وقت کاغذ پنسل نہ لیے پھرتے تھے - تحریری کاغذات ہمیشہ حافظہ کی مدد سے مرتب کیے جاتے ہیں - لہذا ظاہر ہے، کہ واقعہ کا جس قدر حصہ فراموشی کی نذر ہو جاتا ہے، اُسکو اپنی طرف سے پورا کیا جاتا ہے، اور اُس میں استدلال و تخیل سے مدد لی جاتی ہے - ناموافق اور

تا ہموار باتیں نکال کر ایک مسلسل قصہ گھڑ لیا جاتا ہے، جو بظاہر اصلی تجربہ کی ہو بہو نقل نظر آتا ہے جسقدر وقت گذرتا جاتا ہے، اُسی قدر غلبہ اس تعمیری کام کا ہوتا جاتا ہے۔ ضعیف العمر اشخاص کا حافظہ خصوصیت کے ساتھ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ دہلی کے غدر اور حیدرآباد کی موسیٰ ندی کی طغیانی کے چشمدید حالات بیان کرنے والوں کی شہادت کو اسی وجہ سے ذرا احتیاط سے صحیح تسلیم کرنا چاہیے۔ اکثر واقعات جن کو وہ بیان کرتے ہیں "ایجاداتِ بندہ" ہوتے ہیں، اور وقت یہ ہے، کہ انکو اصلیت سے علیحدہ کرنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ قلیل عرصہ کا بھی اگرچہ یہی حال ہے، لیکن اس میں غلطی کا احتمال کم ہوتا ہے۔ لہذا شاہد کی شہادت کی جانچ کرتے وقت، ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیے، کہ وہ بلحاظ زمانہ، اس واقعہ کے کس قدر قریب تھا، اور یہ کہ اُس نے کتنے عرصہ کے بعد اس کو تحریر میں منسلک کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسکا حافظہ کہاں تک قابل اعتماد تھا پھر نفس شہادت کے نقد و نظر سے ہم تخمینی حد تک یہ کہہ سکتے ہیں، کہ فلاں حصہ نسیان کے نذر ہو گیا، فلاں استدلال کا نتیجہ ہے اور فلاں تخیل کا۔ وغیرہ تعصب، بغض، محبت، وغیرہ کے جذبات کے زیر اثر شہادت میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، انکی طرف ہم پیچھے کہیں اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اُسی شاہد کی شہادت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، جو ان تمام باتوں سے بری ہو۔ یہی وجہ ہے، کہ ایک غیر جانبدار اور بے غرض کی شہادت، غرضی شخص کی شہادت پر، من حیث الشہادت، فائق سمجھی جاتی ہے۔

اگر یہ شہادت تحریری ہے، تو اس میں مصنف کی انشا پردازی کی گنجایش رکھنی بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ محض انشا پردازی کے زور میں آکر نادانستہ طور پر غلط بیانی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ تشابیہ و استعارے، پُرشکوہ الفاظ، چست بندشیں، نئی نئی تراکیب، اور اسی قبیل کی اور چیزیں انشا پردازی کی جان ہیں، اور یہی اصلیت کو مسخ کرنے میں نمایاں حصہ لیتی ہیں۔ تاریخی ناولوں، یا نظموں کا رتبہ بطور سند کے، تاریخی کتب کے برابر نہیں ہوتا، وجہ یہی ہے کہ مقدم الذکر میں محض زیب داستان کے لیے بہت سی بیکار باتیں شامل کر لی جاتی ہیں، اور مؤخر الذکر میں ضرورت شعری کی وجہ سے اصلی واقعہ میں تغیر و تبدل کر لیا جاتا ہے۔ آزاد مرحوم کی دربار اکبری اور آبِ حیات، اور شرر کے تمام تاریخی ناول اس قسم کی شہادتوں کی زندہ اور عمدہ مثالیں ہیں۔ بلحاظ انشا پردازی ان کا رتبہ خواہ کچھ ہی ہو، لیکن بحیثیت تاریخی شہادت کے یہ بالکل بیکار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ زبان جسکے ذریعہ سے مشاہدہ کی اطلاع دہی کی جاتی ہے، غلطی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ ہو سکتا ہے، کہ مشاہدہ صحیح ہو لیکن اسکو بیان کرنے میں اصلیت کا بدل جانا ناممکن نہیں۔

جب شاہد کی ان دونوں صفات، یعنی دیانتداری اور اہلیت، کی طرف سے ہمکو اطمینان ہو جائے تو شہادت بھی قابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ ان دونوں صفات کے باوجود، اگر وہ واقعہ، جسکے متعلق شہادت دی جارہی ہے، عام اور روزمرہ تجربہ کے خلاف ہے، تو شہادت غلط ہے۔ اسی خیال کی بنا پر ہیوم نے معجزات کو ناقابل ثبوت قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے، کہ یہ تمام معمولی قوانین فطرت کے خلاف ہوتے ہیں، اور ہم کو انکے مشابہ واقعات کا اس سے قبل تجربہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اُنکے متعلق ہر قسم کی شہادت قابل اعتبار نہیں، حالانکہ وہ لوگ، جو اُنکی شہادت دیتے ہیں، اُسکے نزدیک پوری طرح اور بالکل معتبر ہیں۔ لیکن ہیوم کا یہ خیال غلط ہے۔ برخلاف اسکے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جہاں شاہد کا اعتبار مسلم اور ناقابل انکار ہے، وہاں صرف اس سبب سے کہ وہ واقعہ غیر معمولی اور عجیب ہے، شہادت اور پُرزور ہو جاتی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ انکے محض ایسا ہونے ہی سے صادق القول اور ذی عقل انسان انکی طرف اور زیادہ توجہ کریں گے اور اس طرح اپنے مشاہدات کو اور زیادہ صحت کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اب عام شہادت کی قابلیتِ اعتبار کی گذشتہ تمام بحث کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ ایک شہادت اُسوقت قابلِ وثوق ہوتی ہے، جب اُسکے مشہود و شاہد میں خاص خاص صفات پائی جائیں۔ مشہود کے لیے ضروری ہے، کہ وہ تجربہ کی اعلیٰ قوت، یعنی فہم، کے معروض کی حیثیت سے اطلاقاً اور تجربہ کے ادنیٰ قواء، یعنی حواس اور شعورِ ذات، کے معروض کی حیثیت سے، اضافاً ممکن ہو۔ جب یہ ثابت ہو جائے، تو شہادت، من حیث الشہادت، بیکار نہیں ہوتی۔ شاہد کے لیے صداقت اور اہلیت لازمی ہے۔ اسکی صداقت اُسوقت تک غیر مشتبہ ہوتی ہے، جب تک کہ ہمارے پاس اُس میں شبہہ کرنے کے کافی وجوہ نہ ہوں، یا جب خود فریبی کا عام امکان اسکی بنا ہو۔ شاہد کی اہلیت اُسوقت مسلم ہوتی ہے، جب مشاہدہ کرنے، اور اُس مشاہدہ کی اطلاع دہی، کی صلاحیت کے خلاف کچھ شکایت نہ ہو۔ عام شہادت کی قابلیت اعتبار پر اس تمام بحث کے بعد اب ہم اسکی مخصوص قسموں، یعنی بالواسطہ اور بلاواسطہ، کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ہم نے اس سے قبل اس شہادت کو بلاواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ، جسکے متعلق شہادت دی جارہی ہے، خود راوی یا ناقل کا ذاتی تجربہ ہو۔ وہیں ہم نے یہ بھی کہا تھا، کہ بلاواسطہ شہادت بالواسطہ شہادت کے مقابلہ میں زیادہ مرجح اور زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ اب گذشتہ بحث سے ظاہر ہے، کہ بلاواسطہ شہادت کی قابلیتِ اعتبار میں اُسوقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، جب شاہد و مشہود

میں وہ تمام شرائط و صفات پائی جائیں، جن کا اوراق ماقبل میں ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلا واسطہ شہادت اُسوقت معتبر کہی جا سکتی ہے، جب اول شاہد میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت زیادہ ہو۔ اس شہادت کی قابلیت اعتبار ہمیشہ شاہد کے مشاہدہ کرنے کی قابلیت کی نسبت سے ہوتی ہے۔ جس قدر زیادہ یہ قابلیت مشاہدہ ہوتی ہے، اُسی قدر زیادہ معتبر وہ شہادت ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ کامل و مکمل مشاہدہ کرنے کے راستہ میں رُکاوٹیں کم ہوں۔ یہاں قابلیت اعتبار اور مشاہدہ کرنے کے راستہ میں نسبت معکوس ہوا کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ جس قدر کم یہ رُکاوٹیں ہوتی ہیں اُسی قدر زیادہ معتبر وہ شہادت ہوتی ہے۔ یہ شاذ ہی ہوتا ہے، کہ شہادت صرف ایک حادثہ، یا ایک فرد کی حدود مشاہدہ کے اندر حادثات کے ایک سلسلہ تک محدود ہو۔ اکثر یہ ہوتا ہے، کہ جن واقعات کے متعلق شہادت دی جاتی ہے، انکو بسبب ترک، یا بوجہ وسعت، ایک شخص پوری طرح مشاہدہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایک مورخ کسی معاصرہ کے چشمدید واقعات بیان کرتا ہے، اب اگر ہم صرف اُسی ایک شخص پر بھروسہ کریں، تو ظاہر ہے، کہ یہ تمام بیان بالکل غیر مسلسل اور جزئی ہوگا، کیونکہ اسکے لیے یہ ناممکن ہے، کہ وہ ایک ہی وقت میں حملہ کی تمام تفاصیل کا مشاہدہ کرے۔ ہو سکتا ہے، کہ اسکے فرائض کی ادائگی نے اسکو اتنی مہلت ہی نہ دی ہو، کہ وہ ہر جگہ پھرے، اور آنکھوں دیکھی باتیں بیان کرے۔ اسکے علاوہ بعض باتیں ایسی ہو جاتی ہیں، جو اُسوقت نظر نہیں آتیں، مثلاً قائدین کی روزانہ مشاورت۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے، کہ ہر ایک شخص کسی واقعہ کی تمام اہم باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے عینی، یا بلا واسطہ شہادت کو خاص طور پر پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ تحقیق کرنا پڑتا ہے، کہ شاہد نے اپنے آپ کو کہاں تک ان تمام نقائص سے بچایا ہے۔

بلا واسطہ شہادت کے معتبر ہونے کی تیسری شرط یہ ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے، وہ پوری طرح اور صحت کے ساتھ یاد بھی رکھا گیا ہو۔ غلطی کے اس راستہ پر ہم اس سے قبل تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ یہ اس قسم کی دلدل ہے، کہ جس سے بمشکل کوئی شخص بچ سکتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کوئی شخص کمر تک، یا اس سے بھی زیادہ اس میں پھنسا ہوتا ہے، اور کسی کا صرف پانوں آلودہ ہوتا ہے، لیکن اس دلدل کے اثرات و نشانات ہر شخص پر پائے جانے لازمی ہیں بفرض محال اگر کوئی شخص ایسا مل بھی جائے تو اُسکی شہادت اُسوقت لایق یقین نہیں ہوتی، جب تک کہ وہ اپنے محفوظ مشاہدہ کو معقول اور غیر مبہم علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنے پر قادر نہ ہو، اور یہی چوتھی شرط ہے۔ ظاہر ہے، کہ دوسرے اشخاص اس مشاہدہ سے صرف اس صورت میں استفادہ کر سکتے ہیں، کہ انکو اسکی اطلاع ہو جائے۔ اگر یہ اطلاع مبہم

اور محل علامات کے ذریعے سے کی گئی ہے، تو اسکا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص اس سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں شہادت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

لیکن شہادت کے معتبر ہونے کی یہ شرائط پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب ہم بالراست نہیں دے سکتے۔ پہلے کہیں ہم نے کہا ہے، کہ ہم انکو صرف شاہد کی صفات و خصائل کی بنا پر منتج کر سکتے ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ شہادت کی صحت کا صحیح اندازہ شاہد کی ذاتی سیرت کے تنقیدی علم سے ہو سکتا ہے۔ اسکی عقلی اور اخلاقی صفات، اور اسکے سوانح حیات ہمارے اس علم کے ماخذ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر شاہد کی دیانتداری اور خلوص نیت قطعی اور ناقابل شک ہے، تو بلا واسطہ شہادت بے شبہہ بالواسطہ شہادت پر مرجح ہوگی۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ یہ شہادت صرف اس غرض سے دی جاتی ہے، کہ اُس واقعہ کی قطعیت ثابت ہو جائے، اور اس شاہد کی اہلیت پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ برخلاف اسکے اگر شاہد کی صداقت و ایمانداری مشکوک فیہ ہے، یا اگر یہ مشتبہ ہے، بالواسطہ شہادت بلا واسطہ شہادت کے مقابلہ میں زیادہ قاطع اور قوی ہوگی، اس لیے، کہ واقعۂ مشہودہ کو ثابت کرنا اس قسم کی شہادت کی غایت نہیں۔ اسکی غایت کچھ اور ہی ہوا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اس واقعہ کی تکذیب کرنا اس شاہد کی نیت کا جزو نہیں ہوتا۔ اسکے مقابلہ میں اگر شاہد کی اہلیت و صداقت دونوں مسلم ہوں، تو ایک واقعہ کے متعلق ایک شاہد، یا بہت سے شاہدوں کا ہونا بالکل غیر اہم ہے کیونکہ اس حالت میں ایک ہی شاہد کی شہادت کافی و قطعی ہوتی ہے اور اگر یہ دونوں صفات مشکوک ہوں تو جسقدر زیادہ شاہدوں کا اسپر اتفاق ہوگا اُسی قدر زیادہ قابل اعتبار شہادت ہوگی لیکن اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق تمام شہادتیں ہوں، تو یا تو سب کی سب ایک دوسری سے متفق ہوں گی، یا مختلف۔ اگر تمام شاہد متفق ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی صداقت و اہلیت مسلم و ناقابل شک ہے، تو وہ شہادت سب سے زیادہ قابل اعتبار ہوگی۔ لیکن اگر شاہدوں کا آپس میں اختلاف ہو، تو دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا انکا تخالف سلبی ہوگا، یا ایجابی۔ تخالف سلبی اُسوقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد کسی ایسے واقعہ کو بیان کرنے سے صریحاً پہلوتہی کرے، جسکو اوروں نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے، مثلاً کسی لڑائی کے متعلق بہت سی شہادتیں ہیں، ایک شاہد بیان کرتا ہے، کہ لڑائی میں بادشاہ مقتول ہوا۔ دوسرا شاہد شاہ کے قتل ہونے کا ذکر تک نہیں کرتا۔ اب دونوں میں یہ تخالف سلبی ہوگا۔ اسکے مقابلہ میں ایجابی تخالف اُسوقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد دوسرے کے بیان کی صریحی تردید کرے، مثلاً اُوپر کی مثال میں دوسرا شاہد نہایت شد و مد کے ساتھ قتل شاہ سے انکار کرتے۔ جب شہادتوں میں

محض سلبی ہو، تو اس خاموشی کے بہت سے اسباب فرض کیے جا سکتے ہیں۔ لہذا محض اس خاموشی کی وجہ سے اس واقعہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ لیکن جب یہ ثابت ہو جائے، کہ جس شاہد نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا وہ اسکے وقوع پذیر ہونے سے بیخبر نہ تھا، اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے، کہ وہ اسکو نظر انداز کرنے سے فعل انسانی کی ممکن صورتوں سے انکار نہیں کرتا، تو صرف ایک ہی شاہد کی خاموشی سے، باقی تمام شاہدوں کی قابلیت اعتبار کم ہو جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں تو صرف اسی وجہ سے انکی شہادتیں بالکل غیر معتبر ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ تخالف ایجابی ہے، تو اسکی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ظاہری اور بیّن تناقض محض خاموشی کی بنا پر عدم تصدیق کے مقابلہ میں، بالعموم اور بنفسہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اب ایجابی تخالف کی پھر دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اسکو رفع کیا جا سکتا ہے، یا یہ بالکل ناقابل رفع ہوتا ہے۔ مقدم الذکر صورت میں شہادت کی قابلیت اعتبار میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شاہدوں کے تخالف کی توجیہ ان حالات سے کی جا سکتی ہے، جو شہادت کی تشریح کر سکتے ہیں، بغیر اسکے کہ اسکو غلط ثابت کریں۔ لیکن موخر الذکر حالت میں ہر ایک شہادت دوسری شہادت کو عیب ناک اور غیر معتبر بناتی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اس قسم کی متناقض شہادتوں میں اگر باہمی تناقض ہے، تو یہ دونوں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے ایک کا غلط ہونا لازمی ہے۔ اگر ان میں باہمی تضاد ہے، تو ممکن ہے، کہ دونوں غلط ہوں۔ جب صورتِ حالات ایسی ہو، تو متخالف شہادتوں کی زیادہ یا کم قابلیت کا سوال رہ جاتا ہے۔ اگر دونوں شاہد مساوی طور پر معتبر ہوں، تو دونوں شہادتوں کو مسترد کر دینا اولیٰ و افضل ہے۔ اگر دونوں، لحاظ معتبر ہونے کے مساوی نہ ہوں، تو جو شاہد زیادہ قابل اعتبار ہے، اسکی شہادت بھی زیادہ معتبر سمجھی جائے گی، اور دوسرے کی غلط۔ اگر ایک شاہد معتبر ہو، اور دوسرا بالکل غیر معتبر، تو ظاہر ہے، کہ غیر معتبر کی شہادت بالکل بیکار ہے۔

یہاں تک بلا واسطہ شہادت سے بحث تھی۔ یاد ہوگا، کہ ہم نے پیچھے اس شہادت کو بالواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ جسکے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، خود شاہد کا تجربہ نہ ہو، بلکہ کسی اور شخص کا ہو۔ اس نوعیت کی شہادت کی قابلیت اعتبار مبنی ہوتی ہے اس بات پر، کہ بلا واسطہ اور بالواسطہ، دونوں، شاہدوں کی اطلاع معتبر ہے۔ اب بلا واسطہ شاہد کی اطلاع کے معتبر ہونے کو ہم خود معلوم کر سکتے ہیں۔ یعنی اسکی دیانتداری اور قابلیت کے متعلق اپنی آنکھ کے بنا پر ہمکا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم کو پوری طرح واقفیت ہے۔ کہ وہ راستباز ہے، اور یہ کہ اس خاص واقعہ کے مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہے، تو اسکی شہادت بالکل معتبر کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے، کہ یہ شہادت ہر جگہ اور ہر شاہد کے متعلق میسر نہیں آتی۔ ایسی صورت میں

ہم اس شہادت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، ایسے موقعوں پر بالواسطہ شاہد بلا واسطہ شاہد کے معتبر ہونے کا ضامن ہوتا ہے، کیونکہ بالواسطہ شاہد میں بلا واسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار کو جانچنے اور اسکی اطلاع کو بلا کم و کاست ابلاغ کرنے میں دیانتداری کو معلوم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کسی ایسی شہادت کا راوی و ناقل بننا پسند نہیں کرتا، اور نہ کریگا، جسکا شاہد کسی حیثیت سے ناقص ہو۔ لیکن جب بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں شاہدوں کی ثقاہت کافی طور پر ثابت ہو چکی ہو، تو قابلیتِ اعتبار کے لحاظ سے دونوں نوع کی شہادتیں مساوی ہوتی ہیں۔ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں، کہ اگر خود بالواسطہ شاہد بلا واسطہ شاہد کی شہادت کو جانچنے کا اہل ہے، تو اسکی شہادت سے بلا واسطہ شاہد کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے، کہ بلا واسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار تو ناقابل انکار ہے، لیکن اس شہادت کا دوسرا راوی یا ناقل معتبر نہیں۔ اس حالت میں بالواسطہ شہادت بلحاظ استناد کے بلا واسطہ شہادت کے مقابلہ میں کمتر ہوتی ہے اور استناد کی یہ کمتری اسی نسبت سے ہوتی ہے جو دونوں شاہدوں کی قابلیت اعتبار میں ہے۔ بالواسطہ شاہد بلحاظ مکان و زمان قریب ہوتے ہیں یا بعید۔ پھر ان میں سے ہر ایک یا تو اپنی شہادت کے لیے کسی اور پر موقوف ہوتا ہے، یا غیر موقوف۔ بالعموم زمانۂ قریبہ کے شاہد زمانۂ بعیدہ کے شاہدوں کے مقابلہ میں، اور غیر موقوف شاہد موقوف شاہدوں کی نسبت، زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ زمانۂ بعیدہ کے شاہد اس صورت میں ناقابل اعتبار ہوتے ہیں، جب انکے اور اصل شاہد کے درمیان شاہدوں یا راویوں کا سلسلہ معدوم ہو یا ناقص ہو۔ موقوف شاہد اسوقت بلحاظ استناد کمتر ہوتے ہیں، جب وہ بات، جس پر انکی شہادت موقوف ہے، غلط ہو، یا ابھی تک ثابت نہ ہوئی ہو۔ بلا واسطہ شہادتوں کی طرح، بالواسطہ شہادتیں بھی کبھی مستقیم ہوتی ہیں اور کبھی غیر مستقیم۔ اسی طرح جب بہت سے بالواسطہ شاہد ہوں، تو انکی شہادت یا تو متفق ہوتی ہے یا متخالف۔ دونوں صورتوں میں شاہدوں کی قابلیت اعتبار انھیں اصول سے جانچی جاتی ہے جن کا ذکر بلا واسطہ شہادت کے ضمن میں ہوا ہے۔

بہت سے بالواسطہ شاہد، اگر ہمعصر ہیں، تو ان کی شہادت کو افواہ کہتے ہیں۔ اور اگر ہمعصر نہ ہوں، بلکہ بلحاظ زمان متعاقب ہوں، تو ان کی شہادت روایت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں کے لیے مشترکہ شرط یہ ہے، کہ ان کا کوئی مسلّم بلا واسطہ شاہد نہ ہو۔ پھر اگر جس بات کی افواہ ہو، یا جو بات روایت کی جائے، اُس کی تکذیب نسبتہً آسان، اور اس لیے نسبتہً ممکن ہو، تو انکی قابلیتِ اعتبار بھی اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تقریری شہادت کا ذکر ہوا ہے، لیکن شہادت دینے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں

لیکہ اکثر اور بیشتر شہادتیں تحریری ہوتی ہیں۔ اُن کو جانچنے کے اصول ذرا مختلف ہیں، جن کا ذکر اگلی بحث میں ہوگا۔

معتضد ولی الرحمٰن ایم اے
معلم فلسفہ، جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

عاشق کی التجا

اس عاشق بیتاب کو غم میں سسکتا چھوڑ کر
میرے دل صد چاک کو یوں ہی تڑپتا چھوڑ کر
سچ مچ چلی جائے گی تو؟ کیا پھر نہیں آئے گی تو؟
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

اور آہ، کیا تو جائے گی؟ اُس دل کو تنہا چھوڑ کر
جس کی ہے تجھ سے زندگی تجھ بن ہے جو شمع سحر
جو تجھ پہ ہے ہر دم فدا پڑھتا ہے جو کلمہ ترا
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

ہے آنکھ میں جلوہ ترا اور دل کو تجھ سے کام ہے
اس سر میں ہے سودا ترا اور لب پہ تیرا نام ہے
تیری قسم مجھ کو کہیں بھاتا نہیں کوئی حسیں
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

ہاں مان جا میرا کہا بیکار کیوں بدنام ہو
میرے غم و اندوہ کا کیوں تجھ پہ کچھ الزام ہو
میری وفا کو جان کر اپنی حیا کو مان کر
کہدے نہیں کہدے نہیں!

جلیل قدوائی (علیگ)

زمانِ شرق کی ہمہ گیر بیداری

اس مضمون کو آئے ہوئے بہت عرصہ ہوا، مگر تلف ہو جانے کے باعث اس قدر دیر از وقت شایع ہو رہا ہے، جس کے لیے ہم مُلّا صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔

سب ایڈیٹر

زمین کے وہ وسعت آباد حصے جو افریقہ و ایشیا کے دو براعظموں پر منقسم ہیں، اور جنھیں براعظم یورپ و امریکہ کے مقابل "مشرق" کہتے ہیں، آج سے صدیوں پہلے انسانی آبادی کے "نیم وحشی" اور "غیر متمدن" حصے سمجھے جاتے تھے، لیکن اس امر واقع سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ عین اُسوقت جبکہ مغرب کی موجودہ تہذیب و شائستگی اور اُسکی ہمہ گیر رفعت و ترقی، اُسکی جہالت و بربریت کے تاریک ترین پردوں میں پوشیدہ تھی، یہی مشرق تھا جو انسانی تہذیب و ترقی، معاش و معاد، اور جہانگیری و جہانبانی کی درخشاں روایات کا جلوہ بردار بنا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا کہ مشرق کا یہی نور افگن و ضیا بار آفتاب جمود و پیخبری اور جہل و نادانی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اور ایک بڑھتی ہوئی تاریکی نے اسکی تمام افق تابانیوں کو گھیر لیا۔ شاید مشرقی زوال و بربادی کا یہ قدرتی لازمہ تھا کہ مغرب کی سوتی ہوئی قومیں نئی اور محیر العقول بیداریوں کے ساتھ اُٹھیں، اور انھوں نے مشرق کی تمام پچھلی تابناک روایات کو چھین لیا، اور نہ صرف یہی، بلکہ اُنھوں نے جرأت و اولوالعزمی اور ذہنی تفوق کے ساتھ مشرق کی تمام ارضی وسعتوں کو فاتحانہ اقدام کے ساتھ روند ڈالا۔ اب مشرق دنیا کے اُن مقہور و مفتوح حصص ارضی میں شمار ہونے لگا جن کی عظمت و سطوت پر خدائے جلال و جلیل کا قہر و غضب نازل ہو کر اُنھیں کسی ذلیل ترین مخلوق کے زیر نگیں کر دیتا ہے۔ پس مشرق کا یہی وہ زوال تھا جسکے ساتھ اُس نے اپنی نکبت و غلامی کی کئی صدیاں گذار دیں۔ اور کوئی نہیں تھا، جو آج سے چند سال پہلے مشرق کے کھوئے ہوئے عروج و اقبال کے از سر نو جلوہ گر ہونے کی پیشگوئی کر سکتا۔ لیکن اسے نظام عالم کا ایک قدرتی انقلاب کہیے، کہ ۱۹۱۵ء کا وہ زمانہ آگیا جبکہ مغربی نظام اقتدار کی اُستوار بنیادیں جنبش میں آنے لگیں، اور ۱۹۱۷-۱۹۱۸ء میں ایک نئی ہوا چلی آیا جسنے یورپ کی کبھی نہ فنا ہونے والی متحدہ قوت کو "ورڈن" کی پہاڑیوں میں ٹکرا کر پاش پاش

کر دیا اور "لجیم" "سرویا" "رومانیہ" و "مانٹی نگرو" اور "روس وشمالی فرانس" کا وہ عظیم الشان جرمن فاتح جنرل فیلڈ مارشل وان ہنڈنبرگ، جسکی قہرمانی کمانڈ نے دنیائے امن و عافیت کو لرزہ براندام کر دیا تھا، ایک مایوس و حرماں نصیب انسان کی طرح برلن واپس ہو گیا، "وائنا و ہنگری" کے اندرونی خلفشار نے خاندان ہیپسبرگ کا خاتمہ کر کے جمہوری نظام حکومت کا علم بلند کر دیا، اور برلن سے وہ انسانِ اعظم قیصر ولیم جو ہلاکو اور چنگیز خانی قوتوں کا مالک بنا ہوا تھا، سوئٹزرلینڈ کی تاریکیوں میں بند کر دیا گیا، اور اس طرح مغرب کی یہ غلغلہ انداز باہم آویزی ختم و تمام ہو گئی جو "جنگ فرنگ" کے نام سے نمودار ہوئی تھی۔

اب حادثۂ فرنگ جہاں بہت سی ہلاکت باریاں اپنے ساتھ لایا تھا، وہاں وہ ایک دوسرے خطۂ ارضی کے دوبارہ عروج و ارتقاء کے لیے حیرت انگیز اثرات بھی اپنے پیچھے چھوڑتا گیا، اور جنگ مذکور کے یہ وہ بقیہ اثرات تھے جنکے ذروں سے آج مشرق کا پھر وہی آفتاب طلوع کرتا دکھائی دے رہا ہے جو صدیوں سے گہن میں آچکا تھا۔

آپ غور کیجیے کہ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے مشرقی اقوام کے عروج و کامرانی اور انکی دوبارہ سربلندی و سرفرازی کا تصور بھی ایک مضحکہ خیز عقیدہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ غلط ہے کہ مشرق کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں، اور وہ ایک کبھی دُور نہ ہونے والی گراں خوابی کا شکار ہو چکی تھیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ مشرق عروج و ترقی اور کمال و سرفرازی کی ان تمام وہبی قوتوں کو اپنے آغوش میں تربیت کر رہا تھا البتہ انکا ظہور ایک غیر معمولی حادثہ کا منتظر تھا۔ لہٰذا حادثۂ فرنگ نے بیک جنبش اُن تمام پردہ پوش بیداریوں کو بے نقاب کر دیا جنکی جلوہ ریزیوں سے آج اُفق مشرق جگمگاتا نظر آتا ہے اور مشرق کی انھی غیر متوقع بیداریوں میں وہ ایک لطیف بیداری بھی جلوہ فرما ہے جسے مشرق کی صنف نازک سے تعلق ہے۔ اور آج مشرقی دماغ زنان شرق کی موجودہ بڑھتی ہوئی رَو میں انسانی عظمت و برتری کی وہ تکمیل دیکھ رہے ہیں جو صنفِ نازک ہی کے ساتھ مخصوص و متعلق ہے۔ اور وہ لوگ اب حیرت زدہ نہیں ہیں جو عورت کو حیاتِ اجتماعی کا ایک غیر ضروری جزء تصور کرتے تھے۔ وہ دیکھ رہے ہیں اور حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ مشرق کے ہر حصۂ ملک میں عورت مرد کے ہمدوش و ہمرکاب حیات انسانی کے تمام شعبوں میں اپنی اُن خداداد قوتوں سے سرگرم عمل ہے، جو آج سے پہلے صرف مرد کا مخصوص ورثہ سمجھی جاتی تھیں۔

اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زنانِ شرق نے صرف دو اڑھائی سالہ فرصت اور اپنے موجودہ محدود دائرۂ عمل میں کن مافوق الادراک کارناموں کا اظہار کیا، میں مشرق کے ہر ملک کی نسوانی بیداری کا ایک خلاصہ پیش کرتا ہوں:

خواتینِ ترکی عہدِ رفتہ میں تو شاید عورت کی ترقی اور اُسکا منتہائے کمال چند خانگی اور معاشرتی کارگذاریوں اور ذمہ داریوں تک محدود تھا، لیکن عہدِ حاضر میں "تہذیب و تمدن" "سیاست و جہاں بانی"، اور سب سے آخر ملکی و قومی مدافعت کے خوں ریز و جرأت آزما فرائض کا بوجھ بھی اس نازک ترین ہستی کے ناتوان کاندھوں پر ڈال دیا گیا ہے، لہٰذا مذکورہ امور و ذمہ داریوں کی حیرت انگیز تکمیل و بجاآوری میں جو مرتبہ ترکی خواتین کو حاصل ہے وہ مشرق کی کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں، اور میں اپنے انتہائی غور و مطالعہ کے بعد یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ بہ اعتبارِ عمل مشرقی ممالک میں عورتوں کا جو کارکن طبقہ سب میں اوّلیت کا فخر حاصل کر چکا ہے وہ "زنانِ ترکی" ہیں۔

میں ترکی عورتوں کے عہدِ بیداری کی کسی قدیم ترین تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا، بلکہ یہ دکھلانے کے لیے کہ خواتینِ ترکی ہی زنانِ شرق کی موجودہ بیداری کی نقیب و رہنما ہیں، اُنکے اُس تاریخی مظاہرہ سے ابتدا کرتا ہوں، جبکہ وہ ۱۹۱۲ء کی مشہور جنگِ بلقان کی خونتابہ فشانیوں میں ملک و ملت کے حفظ و دفاع کی خاطر میدانِ عمل میں گام زن ہوئیں اور ترکی قوم کی یہ وہ صاحبِ عزم و ثبات بیٹیاں تھیں جو عہدِ حمیدی میں تعلیم و تربیت اور تہذیب و عملیت کے جواہر سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ جنگِ بلقان میں جب ترکی تہذیب و قومیت پر ریاستہائے بلقان نے متحدہ اور تباہ کن حملہ کیا تو ترکی عورتیں قومی مدافعت کے لیے مردانہ وار میدانِ عمل میں آگئیں، اور اُنھوں نے داخلی انتظامات کے ساتھ ساتھ میدانِ کارزار میں مردوں کی امداد کے لیے جماعتیں اور انجمنیں قائم کیں، اور ایک ایسا متحدہ نظامِ عمل وضع کیا جس کی ترتیب و تنظیم میں مردانہ اصولِ کار کی تمام تر تکمیل کی گئی تھی، ان جماعتوں کی سرگروہ خاتون وہی خالدہ خانم تھیں جن کے لیے صدرِ اعظم دولتِ عثمانی انگورہ حسین رؤف بے نے ایک موقع پر کہا تھا کہ:-

"مشرق نے کئی صدی کے بعد ایک عورت پیدا کی ہے، اور وہ خالدہ ادیب خانم ہیں"

خالدہ ادیب خانم "اسوقت" عثمانیہ زنانہ کالج" کی پروفیسر ادبیات و السنۂ مغرب تھیں۔ وہ اس سے پہلے ترکی میں حسبِ ذیل انجمنوں کی بنیاد رکھ چکی تھیں:- جمعیۃ اصلاح رسوم۔

جمعیۃ تبلیغ تعلیم - جمعیۃ پرورش اطفال، جمعیۃ امداد و اصلاح بیوگان و یتامیٰ، جمعیۃ حقوق نسواں، اب جو ملک و وطن پر حملہ ہوا، تو انھوں نے عورتوں کے ذریعہ ناموس وطن کی حفاظت اور اپنی قومی آزادی کی بقا کے لیے ذیل کی نسوانی جماعتیں بنائیں:-

(۱) انجمن تبلیغ و اشاعت - جو اندرون ملک تقریروں اور مظاہروں کے ذریعہ جنگی روح کو بیدار کرتی تھی - اس جمعیۃ کی صدر سیدہ فہیمہ نزہت خانم تھیں، جو عثمانیہ یونیورسٹی سے فن تاریخ میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کر چکی تھیں، اور اسوقت ترکی اخبار "عالم نسواں" کی ایڈیٹر تھیں، اسی جماعت کی ایک شاخ اہل قلم خواتین پر مشتمل تھی، جو تحریر کے ذریعہ تمام دنیا سے استمداد کرتی تھی -

(۲) انجمن خدام جنگ - اس جماعت میں وہ عورتیں شریک تھیں جو مجروحین کی خدمات انجام دیتی تھیں، اور اس مجلس کی صدر کلثوم خانم تھیں، جو سینٹ پیٹرس برگ یونیورسٹی کی اعلےٰ گریجویٹ تھیں -

(۳) انجمن باربرداری و متفرقات - اس جماعت کے متعلق متفرق خدمات تھیں، اور اسکی صدر فاطمہ خانم تھیں - جنھوں نے معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، اور اخبار عالم نسواں کی نائب مدیر تھیں -

(۴) انجمن تلمیذات عثمانی - یہ جماعت مدارس نسوانیہ کی طالبات پر مشتمل تھی، جو علاوہ متفرق خدمات کے مردوں کو میدان جنگ کے لیے ابھارتی تھی، ان لڑکیوں کی انجمن کی صدر سیدہ نقیہ خانم تھیں جو انسپکٹر تعلیمات نسواں رہ چکی تھیں

مذکورہ انجمنوں نے ترکی قوم کی جو خدمات انجام دیں اور ملک و ملت کو جن مصائب و خطرات سے بچایا، انکی تفصیلات سے قطع نظر ترکی خواتین کے ایک ایسے تاریخی جلسہ کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جسکے حاضرین میں صرف عورتوں کی تعداد چھ ہزار تھی، اس جلسہ میں ترکی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ، پروفیسر، ایڈیٹر، اور لیکچرار عورتوں کی ایک کافی تعداد موجود تھی، جو ترکی عورتوں کی تمدنی اور قومی بیداری کی تصدیق کرتی تھی - ان میں نگار خانم مشہور ترکستانی شاعرہ جنکا ایک دیوان خاکسار راقم الحروف کے پاس موجود ہے، امیرہ نعمت خانم، حلیمہ سعدی خانم، جمیلہ محمود خانم، اور فہیمہ نزہت خانم ایڈیٹر عالم نسواں خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان فضیلت پناہ ترکی خواتین کے ان کارناموں کو اگر میں یہاں نقل کر دوں، جن سے "عثمانی سرکاری رپورٹیں" اور بعض ترکی مطبوعات بھرے پڑے ہیں، تو ہیجان و ولولہ انگیزی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا، لیکن جلسہ مذکور میں فہیمہ نزہت خانم ایڈیٹر عالم نسواں

کی ایک ایسی تقریر کے چند الفاظ پیش کرتا ہوں جسکا ایک ایک فقرہ حیات و کامرانی، اور مصائب کے وقت جرأت و شہامت، اور مردہ دلوں کی گرمی کے لیے اپنے اندر سیکڑوں شعلہ سامانیاں لیے ہوئے ہے۔ عثمانی قوم کی یہ صاحبِ علم و تاریخ خاتون جلسۂ عام میں مردوں اور عورتوں کو مخاطب کرکے اپنی قومی حمیت اور تاریخی معلومات کے جواہر ریزے اس طرح بکھیرتی ہے:

"تم میں سے ہر فرد جانتا ہے کہ ہمارے اجداد نے یورپ کی چالیس ملین آبادی پر حکمرانی کا جھنڈا اُڑایا ہے، تم اگر توپ و تفنگ بھی سوال کروگے کہ جنگ و نبرد آزمائی کے ابطال و اقطاب کون ہیں؟ تو وہ جواب دیں گے "عثمانی" جن کی خارا شگاف تلواریں دشمنوں کے سینوں میں اترنے کے لیے میانوں کی تنگ دامانی میں تڑپتی رہتی تھیں۔

جاؤ۔ وائنا کے قلعوں کی سیر کرو، ایشیا میں گشت لگاؤ، تمھیں ہر جگہ اپنے آبا و اجداد کے مناقب منقوش نظر آئیں گے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تاریخ بولتی ہے عثمانیوں کی شجاعت کی تابناک شہادت ہے۔ اگر شاہ سویڈن شارل دوازدہم اپنی قبر سے اُٹھکر آسکتا تو وہ اسوقت بھی تمھارے سامنے سرخمیدہ ہوکر عثمانی عظمتوں کا اعتراف کرتا۔ ہم تاریخی مسلم الثبوت شجاعوں کی اولاد ہیں جن پر دشمن حملہ کرنے میں اب بھی سہم جاتے ہیں۔ باوجودیکہ کعبۃ اللہ کی خدمت اور شام و بغداد، بلادِ عرب اور ناطولیہ ہمارے زیر امارت ہیں، لیکن پھر بھی تمھارے دل بیقرار اور مُنہ اُترے ہوئے ہیں، اے غیور عثمانیو۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن تمھارے اس ہراس سے فائدہ اُٹھائے۔ لہذا تم اُس پر ثابت کردو کہ ہمارے چہروں پر ہراس و بے خوفی کے اثرات نہیں، بلکہ ہمارے آبا و اجداد کے خون کا عکس ہے جسنے ہمارے چہروں کو سرخ بنا دیا ہے۔

اُٹھو۔ اور ایک مرتبہ بلغاری بزدلوں کو پھر بتلادو کہ ہم اُن غیور عثمانیوں کی اولاد ہیں جنھوں نے مغرب کی تمام عظمتوں کو بیزانطائن میں دفن کردیا تھا۔" (مقتبس از الشعب مصر القاہرہ۔ ۷ فروری ۱۹۱۲ء)

ترکی خواتین کا عہد اول ختم ہوگیا۔ ۴۔ اگست ۱۹۱۴ء کو یورپ کی وہ ہولناک جنگ شروع ہوئی، جسکے برہم کن اثرات سے آج بھی دنیا کو رستگاری نصیب نہیں۔ لیکن جنگ مذکورہ کی ان تمام ہلاکت بار آویزشوں نے ترکی خواتین کی علمیت کو متاثر نہیں کیا، بلکہ وہ اسی حادثہ میں تعلیم و معاش کے شعبوں میں مصروف رہیں، اُنکی تمام انجمنیں اُسی اطمینان سے کام لیتی رہیں۔ جس وقت جرمنی نے اعلان جنگ کیا اور انکی ٹڈی دل فوجوں کے اقدام سے مملکت بلجیم کا چپہ چپہ دہل رہا تھا،

ترکی خواتین ایک سو کی تعداد میں جرمن درس گاہوں میں ترکی حکومت کے وظائف سے تعلیم پا رہی تھیں۔ سینٹ پیٹرسبرگ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ترکی خواتین کی تعداد (۱۴۰) تھی۔ وہ سیاسی مراعات کے حصول میں قدرے کامیابی حاصل کر چکی تھیں۔ نوجوان ترکی پارٹی کے بیدار مغز رہنما نسوانی تعلیم کے لیے حوصلہ افزا جدوجہد سے کام لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ جس وقت ۱۹۱۶ء میں عراقی حدود میں ترکی و انگریزی معرکہ آرائی ہوئی تو ترکی عورتوں کی ایک ذی حوصلہ جماعت میدانِ جہاد میں نکل آئی، اُنکی تمام اصلاحی مجلسیں دفاعِ وطن کی خدمات میں مصروف ہوگئیں، اُنھوں نے دنیائے تہذیب میں اپنی حیرت انگیز خدمات سے نہایت بیدار کن اثرات پیدا کیے، اُسوقت بھی ترکی خواتین کی مشہور قائدہ خالدہ ادیب خانم وزارتِ جنگ کا ہاتھ بٹانے میں مصروف تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں ممدوحہ نے ترکی فوجوں میں جذباتِ جہاد پیدا کرنے کے لیے ایک معرکۃ الآرا ناول لکھا۔ جو وزارت جنگ کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں شایع ہو کر فوجوں میں تقسیم کیا گیا، اور جس وقت برطانی فوجوں نے مقام غازہ کی ترکی خندقوں کو فتح کیا، تو اُن میں اس ناول کے سیکڑوں نسخے پائے گئے تھے۔

اب ۱۹۱۹ء میں اتحادی فوجوں نے ترکی حکومت کے دارالصدر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور ایشیائے کوچک کا زرخیز علاقہ یونان کے قبضہ میں دیدیا گیا جسکے اثر سے انگورہ میں ترکی احرار کی تحریک وطنی کا آغاز ہوا، اور ترکی خواتین جوق جوق حفظِ وطن کے لیے میدان عمل میں پھر گامزن نظر آنے لگیں، مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی خواتین کی بیداری اور حبِ وطن کے جذبات سے کام لیکر جسوقت میدانِ جنگ میں ترکی خواتین کو شرکتِ عمل کی دعوت دی تو خالدہ خانم ہی سب سے پیش پیش نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر اپریل ۱۹۲۰ء والی پہلی انگورہ وزارت میں وزیر تعلیمات مقرر ہوئیں اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں وہ مشہور یونانی حملہ میں خواتین کے ایک جرار لشکر کے ساتھ انگورہ کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں خدمات انجام دیتی رہیں۔ اناطولیہ میں ترکی زنانہ لشکروں کی تحریک پر تمام عورتیں شریکِ جہاد ہوئیں، جن میں میجر عائشہ خانم، لفٹنٹ فاطمہ خانم اور کمانڈر انچیف خالدہ خانم کی نبرد آزمائی کی تہلکہ انداز شہرت ابدالاباد تک قائم رہیگی۔ یہ بہادر ترکی عورتیں اس وطنی جہاد میں اسّی ہزار کی تعداد میں شریک ہوئی تھیں، اور آخر اگست ۱۹۲۲ء میں مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے سمرنا پر جو تاریخی حملہ کیا، اُنکے لشکروں کے عقب میں یہ زنانے لشکر بڑی مستعدی سے مصروف پائے گئے۔ ان میدانی مجاہدات کے ساتھ ہی جو صاحب فضل و کمال خواتین حکومت انگورہ کے دوسرے محاکم انتظامی میں کام کر رہی تھیں اُنکی تعداد حسب ذیل تھی:

۱-	محکمۂ تعلیمات عامہ	۷۳۵
۲-	شفاخانے	۱۴۷۹۳
۳-	محکمہ ٹیلیگراف	۳۰۱
۴-	باربرداری	۹۵۹
۵-	متفرق دفاتر	۵۸۴۳

(مقتبس از خواتین انگورہ۔ مطبوعہ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ۔ صفحہ ۹)

تحریک انگورہ کے بعد عین اس حالت میں جبکہ کامل دس سال کی متواتر معرکہ آرائیوں کے بعد بھی ابھی ترکی فوجوں نے ہتھیار نہیں پھینکے تھے، ذی حوصلہ ترکی خواتین، تمدنی، معاشی، علمی و مالی اصلاحات میں مردوں سے آگے سرگرم عمل نظر آنے لگیں۔ فیلڈ مارشل مصطفےٰ کمال پاشا کی کارکن مگر حد سے زیادہ باریک بین و بیدار مغز جماعت نے ترکی خواتین کے نئے عمل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں مراعات و ترقی کے تمام وسائل بہم پہونچائے۔ ۱۷- فروری ۱۹۲۳ء کو سمرنا میں ترکی خواتین کی علمی و اصلاحی سرگرمی کا وہ زبردست مظاہرہ ہوا جسکی عملیت اور ردود اد پر شرق کے بڑے بڑے مدبرین عش عش کر اٹھے۔ سمرنا میں فیلڈ مارشل کا نظم قرہ کر پاشا فاتح آرمینیا ترکی کی صدارت میں اقتصادی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جسکے متعدد دور تین دن تک تجاویز و لوائح عمل مرتب کرتے رہے۔ اس کانفرنس میں ترکی خواتین نے جو زبردست حصہ لیا اُسکا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ اس میں ترکی خواتین کی تنہا نمایندہ عورتوں کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ ان نمایندہ عورتوں نے اقتصاد و معاد کے اہم شعبوں کے لیے (۱۳) مسودے اور (۱۷) تجاویز پیش کیں۔ شادی سے لیکر طلاق و تعدد ازدواج تعلیم، حفظان صحت، سیاسیات اور پرورش اطفال کے مہتم بالشان سائل حل کیے گئے۔

۱۹۲۴ء میں قسطنطنیہ کے مشہور لیکچر ہال (ترک اوجاغی) میں ترکی خواتین کا دوسرا مظاہرہ ہوا، جہاں نسوانی امور خانہ داری کی تنظیم و اصلاح اور فرائض کی ترمیم و تشکیل کے لیے ترکی خواتین کی وہ عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ترکی حکومت کے بڑے بڑے وزراء، ایڈیٹر، مصور، اور عوام کے نمایندے موجود تھے، اس کانفرنس میں ترکی عورتوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور اس عظیم الشان کانفرنس کی صدر علامہ نزہت محی الدین خانم تھیں، انکی زیر صدارت متعدد مسائل پیش کیے گئے، جن میں سے بعض یہ تھے:

(۱) امور خانہ داری کی تنظیم

(۲) مرد و عورت کے فرائض کی تقسیم
(۳) نسوانی حقوق و مطالبات کی تعیین
(۴) حق تلفیوں پر احتجاج
(۵) تعدد و طلاق کی اصلاح
(۶) زنانہ جرائد و رسائل کا اجراء

ان عظیم و مہتم بالشان مسائل کے حل کے لیے ترکی خواتین کی جو کمیٹی اس کانفرنس نے مقرر و منتخب کی تھی، اور جس نے بڑی قابلیت سے ان امور کا حل قوانین و ضوابط کی صورت میں مرتب کیے کانفرنس کے عام اجلاس میں پیش کیا وہ یہ تھیں :-

خالدہ ادیب خانم وزیر تعلیمات انگورہ، صبیحہ زکریا خانم، فقیہ خانم، عزیزہ خانم، زہیدہ محی الدین خانم، کانفرنس مذکور میں حسب ذیل خواتین خاص طور پر قابل ذکر و تعارف ہیں۔ بیگم حکمت خانم، تکمت خانم مشہور ترکی صحافی ڈاکٹر احمد احسان بے ایڈیٹر "ثروت و فنون" کی صاحبزادی ہیں جنھوں نے زنانہ امریکن کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے "ثروت و فنون" ترکی زبان کا وہ مجلۂ علمیہ ہے، جسکی دیدہ زیبی اور معارف پژوہی میں ہندوستان کا ایک پرچہ بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ "ثروت فنون" کے باصرہ نواز تین پرچے راقم الحروف کو مارچ ۱۹۲۳ء میں بمقام بمبئی اپنے ایک ترکی دوست سے حاصل ہوئے تھے جو لحاظ مضامین و طباعت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ صبیحہ زکریا خانم جو واشنگٹن کالج کی اعلیٰ گریجویٹ ہیں۔ عزیزہ قبرسی خانم، جو مصطفےٰ پاشا کی صاحبزادی اور زنانہ ٹریننگ کالج کی پرنسپل ہیں۔ نازلی وکیہ خانم آپ فرانسیسی زبان کی ادیب اور زبردست مقررہ ہیں۔ آپ کے والد وکی شمسی بے کسی زمانہ میں پیرس میں ترکی سفیر مختار رہ چکے ہیں۔ سعدی خلیل خانم، جو ہز ایکسیلنسی خلیل ادہم پاشا ڈائرکٹر جنرل شاہی عجائب خانہ کی صاحبزادی ہیں۔

یہ تو وہ حالات تھے جو ترکی خواتین کی ذاتی عملیت اور کوششوں سے متعلق تھے، اب ترکی حکومت اپنی عورتوں کو تہذیب و ترقی کے جو مدارج طے کرا رہی ہے، اُسکی تفصیل یہ ہے کہ ملک میں کثیر التعداد زنانہ درس گاہیں قائم کی گئی ہیں۔ تمام زنانہ مدارس میں فرنچ، انگریزی، جرمنی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں فرنچ و انگریزی لازمی ہے۔ فنون لطیفہ کے متعلق اسکولوں کے ساتھ ایک زنانہ ٹریننگ کالج بھی ہے، جسکی تمام عہدہ دار ترکی عورتیں ہیں جنھوں نے یورپ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ زنانہ ہائی اسکولس میں جو نظام رائج ہے اُس کا ایک حصہ یہ ہے :

علم حفظان صحت، تربیت اطفال، امور خانہ داری، تاریخ علم الاجتماع، علم الاقتصاد، سیاسیات و مذہبیات[1]۔

ترکی خواتین کی علمی و سیاسی بیداری کے یہ وہ مختصر حالات ہیں جنھوں نے اس قلیل عرصہ میں مشرق کی تمام عورتوں میں قومیت اور عملیت کی ایک نئی روح پیدا کردی ہے، اور آج جو شرق کے ہر گوشہ سے نسوانی تحریکات کی آواز سنائی دیتی ہے وہ انھیں بیدار مغز اور روشن خیال ترکی عورتوں کے عمل کی صدائے بازگشت ہے

خواتین روس مملکت روس مشرق کی وہ عظیم الشان حکومت ہے، جسکے متعلق کبھی یہ مشہور تھا کہ اسکی حدود میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا، ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے اسکے شاہنشاہی اقتدار کو ملیا میٹ کرکے ایک نئے قومی دور کا آغاز کیا۔ جس کا بانی کامریڈ لینن تھا۔ عہد انقلاب سے قبل روسی قوم کی حالت ایک غلام اور ماتحت قوم سے کچھ زیادہ نہ تھی، جو شاہی خاندان کی مستبدانہ پالیسی کے تحت زوال و نزول کی عمیق غار میں پڑی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ باوجودیکہ روسی مہاعتوں میں "کاساک" ایسی زندہ اور جنگجو قوم کے افراد ترقی کی طرف بڑی میلان رکھتے تھے، مصلحین روس قومی اصلاح و ترقی کے لیے سرگرم عمل تھے، مختلف الخیال جماعتوں میں وحدت پیدا کی جارہی تھی، اسلامی آبادی میں خصوصیت سے تنظیم و ترقی کے اثرات موجود تھے، جو سینٹ پٹرسبرگ کی استبدادی طاقت کے خلاف متعدد مظاہرے کرچکی تھی، لیکن روسی مہاعتوں کی یہ تمام جدوجہد "زاریت" کی جابرانہ پالیسی کی شکار ہورہی تھی، اور کوئی نہیں تھا جو قومیت اور بیداری کے لیے ان مستبدانہ حدود سے آگے قدم بڑھاتا، لیکن وقت آیا کہ قدرت نے ان تمام اندرونی پیچیدیوں اور مغلوب قوتوں کے لیے ایک راستہ پیدا کردیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب آسٹریا نے سرویہ پر حملہ آور ہونے کا اعلان کیا، تو زار کی گورنمنٹ نے سرویہ کی حمایت میں اپنی فوجوں کو گلیشیا میں جنگ آزما ہونے کا حکم دیدیا، اُدھر آسٹریا کی حمایت میں جرمن اپنی فوجوں کے ساتھ روسی فوجوں پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس حادثہ سے زار کی عشرت پسند زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی، البتہ روسی قوم میں حفظ وطن و قومی استقلال کا ایک طاقتور جذبہ پیدا ہوا جو اُسکی آنے والی ترقی کا پیش خیمہ تھا۔ پس انھیں حوادث و حالات کے ساتھ خواتین اُٹھیں اور اُنھوں نے

[1] ان حالات میں سے بعض کے لیے دیکھو۔ وطن قسطنطنیہ، شہباز قسطنطنیہ، تاریخ دنیا سی۔ المرأۃ الجدیدۃ، بیروت۔ المقتطف مصر۔

سب سے پہلے وطنی مدافعت کے فرض کو ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ ماسکو و رُمانسک، ریگا، وانگا سے جوق جوق میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے لگیں جنکی ہراول کا سک خواتین تھیں۔ خواتین روس نے ملکی مدافعت کے لیے جو مردانہ وار اور خونریز مظاہرہ کیا اُس نے روسی مردوں میں غیرت وحبِ وطن کے جذبات کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ان جہاد رو روسی عورتوں نے میدان جنگ کے متعدد مواقع پر اپنی جاں نثاری کے ثبوت دیے، جن میں اگسٹوو کا میدان قتال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ عورتیں میدان جنگ کے سوا محکمۂ باربرداری، ٹیلیفون، اور جاسوسی کے فرائض میں بیحد کارآمد ثابت ہوئیں۔ جن روسی عورتوں نے زنانہ لشکروں کو میدانِ جنگ میں لڑایا اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، ہیلن چوبہ، ٹامل آفسکیہ، یہ مشرقی پروشیا کی زنانہ فوجوں کی کمانڈ رتھی اور اسکے تین زخم کاری لگے تھے۔ اسکا نو۔ یہ ماسکو کے ایک کمانڈ افسر کی بیوی تھی، جو کونٹر رجمنٹ کی کمانڈ کر رہی تھی۔

روسی خواتین کی مردانہ وار کارگذاریوں کے ساتھ روس کی وہ مسلمان خواتین ہیں جن کی بیداری اور جد وجہد کا لطیف ترین پہلو اُن کا ملکی اور اصلاحی معاملات میں دخیل ہونا ہے۔ گو روسی مسلم خواتین کی بیداری نہایت قدیم ہے اور مفتی موسیٰ جار اللہ اور مفتی عالم جان ایسے مسلمان مصلحین اور زعماء کی جد وجہد نے روسی خواتین اسلام کے لیے ترقی وتمدن اور تعلیم وتہذیب کی تمام راہیں پہلے ہی صاف کر دی تھیں، لیکن زاریت کے تباہ کن اثرات نے انھیں عملی مواقع سے روک دیا تھا۔ آخر ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے ان عورتوں کو سرگرمی کا ایک ہمت آزما موقع بہم پہونچایا، اور وہ نہایت جوش کے ساتھ میدان عمل میں اُتر آئیں۔ پٹروگراڈ، وارسا، بخارا، طفلس، کوہ قاف، کریمیا اور یورال میں ایک نسوانی تحریک کا آغاز ہوا، جسکا مقام اتحاد ۱۹۲۱ء میں علاقہ ماوراء النہر قرار پایا تھا جہاں روسی مسلم خواتین کی ایک متحدہ کانفرنس منعقد ہوئی جسنے مسلم خواتین کی اصلاحی، تعلیمی، اور معاشی زندگی کے تمام حالات کو منتظم کرنے کے لیے ضوابط بنائے۔ اس کانفرنس کے سب سے اہم مقاصد میں اشاعتِ تعلیم کا مقصد نہایت ممتاز و نمایاں تھا۔ اس کانفرنس نے جو رزولیوشن حکومت مرکزیہ کے پاس ارسال کیے وہ یہ تھے۔

(۱) تعدد ازدواج کی کمی کے اسباب

(۲) کم عمری کی شادی کا انسداد

(۳) شادی کے مواقع پر مضر مراسم کا انسداد

یہ تجاویز روس کو اطلاعاً بھیجی گئی تھیں اور انکے نفاذ و اجراء اور عمل کے لیے خود ان عورتوں نے متعدد کمیٹیاں بنائی تھیں۔ ان کمیٹیوں میں سب سے نمایاں اور کارکن کمیٹیاں داغستان، آذربائیجان، کریمیا، اور کوہ قاف کی تھیں، جنکا صدر مقام سفراپول تھا۔ ان کمیٹیوں نے تعلیم کا نہایت زبردست پروپیگنڈا کیا، جسکی وجہ سے تمام اسکول اور کالج لڑکیوں سے پُر نظر آنے لگے ۱۹۱۷ء میں ماسکو کانگریس میں مسلم خواتین کی نمایندہ جماعت کی تعداد ۲۵۵ تھی۔

آج روسی مسلم خواتین کی مذکورہ بیداری کو فروغ دینے والی اور رہنما مسلم خواتین یہ ہیں: الہٰیہ اسمٰعیل مضفر لقی ایڈیٹر ترجمان حقیقت، صدر انجمن اصلاح خواتین روس، بیگم عائشہ اسکوداغانم صدر جمعیۃ تہذیب نسواں، داغستان بیگم دل آرا بگا کوداغانم، بیگم الیاسہ ٹکمار داغانم۔ ان حالات کے ساتھ آج روسی قوم کی عورتیں ملکی و اصلاحی معاملات سے لیکر امور خانہ داری تک کے تمام مسائل میں مردوں کے دوش بدوش مصروف عمل نظر آرہی ہیں، اور گو مخالفین بالشویک اس امر کو ثابت کرنے میں کوشاں ہیں کہ بالشویک حکومت "عورت" کے حقوق کو نہایت بیدردی سے پامال کر رہی ہے، لیکن حالات اس کے سراسر خلاف ہیں بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ طبعی ارتقاء کی زبردست رَو خواتین روس کے ان بیدار کن حالات کو ایک دن دنیا کے سامنے بے نقاب کرکے رہیگی[1]

خواتین مصر ممالک مشرق میں مملکت مصر تہذیب و تمدن، فنون و معارف، اور نظم و سیاست کی نہایت قدیم روایات کی حامل حکومت ہے، لیکن جبوقت سے مصری قوم کی گردن میں انگریزی غلامی کا جُوا ڈالدیا گیا، اور اُس کی قومی خصوصیات فنا ہونے لگیں۔ اُسکے سیاسی و ملکی حقوق سلب کیے جانے لگے۔ اُس نے جنگ یورپ میں انگریزوں کی امداد کیلیے دس لاکھ قومی نوجوان میدان جنگ کی بھینٹ چڑھا دیے، لیکن ان تمام قربانیوں کا بدلہ یہ ملا کہ حقوق طلبی کے جائز اور آئینی مظاہرات مارشل لا اور مشین گنوں کے فیر سے روکدیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان مصری ملک کی غلامی کی لعنت کو یکسر فنا کردینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے اور اُنکے ساتھ اُن کی مجاہد و اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی میدان عمل میں آگئیں۔ مصر کی یہ وہ عورتیں تھیں جو باعتبار تعلیم و تہذیب تمام مشرقی ممالک میں دوسرا درجہ رکھتی ہیں۔ مصری عورتوں نے اپنی انجمنوں کی بنیاد رکھی استوار کیں، اخبارات و رسائل جاری کیے، تحریر و تقریر سے ملکی نوجوانوں کو ملکی آزادی کے لیے اُبھارا، انگریزوں سے مقاطعہ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے انتہا مستعدی سے کام لیا، متعدد وفود

[1] ان حالات کے اقتباس کے لیے دیکھو اسٹیٹسمین کلکتہ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۷ء البرید کانپور مورخہ یکم دسمبر ۱۹۲۲ء المرأۃ الجدیدہ بیروت مارچ ۱۹۲۶ء

کے ذریعہ اُنھوں نے ملکی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ غرض ایک عام بیداری تھی جو مصری ہر تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ عورت میں نمودپذیر نظر آنے لگی۔ مصلحین نے ایک صدر انجمن نسواں کی بنیاد ڈالی اور اسکی جو متعدد شاخیں ملک میں اسوقت بھی مصروف عمل ہیں اُنکی تعداد (۱۱) ہے۔ انھوں نے تعلیم و تربیت کے لیے اپنی ہزاروں لڑکیاں اسکولوں میں داخل کرائیں، جسکے متعلق مصری حکومت کے سرکاری اعداد یہ ہیں: ابتدائی اسکولوں میں (۴۶۵۸۲) سرکاری اسکولوں میں (۷۶۹۰) صوبوں کی پرائیوٹ مجالس کے اسکولوں میں (۷۵۹۲) لڑکیاں زیر تعلیم ہیں[۵]۔

مصری خواتین نے اپنی فضیلت و روشن خیالی کا سب سے بڑا ثبوت اُسوقت دیا جبکہ ۱۹۲۳ء میں اُنکا ایک زنانہ وفد اٹلی کی مشہور زنانہ کانفرنس میں شریک ہوا، جہاں مصری خواتین نے مغربی خواتین کو مشرقی عالم نسواں کی روزافزوں ترقی اور حیرت انگیز بیداری کے اعتراف پر مجبور کرتے ہوئے تمام مغربی خواتین کے اُن شکوک کو رفع کیا جو اُنھیں مشرقی عورتوں کے متعلق عرصہ سے متفکر بنائے ہوئے تھے۔

مملکت مصر کے سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں اسوقت جس قدر لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اُن میں ½ قانون، فلسفہ، معاشیات، مذہب و تاریخ، اور صحافیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں، کثرت عورتیں ایڈیٹر اور ناول نگار ہیں، جو اعلیٰ اخبارات و رسائل کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں، اُنھوں نے ملکی آزادی کے لیے اکثر خونبار قربانیاں بھی پیش کی ہیں، اُنھوں نے انگریزی فوجوں اور توپ خانوں کی موجودگی میں تمام ملکی مظاہرات میں حصہ لیا، اُن میں سے متعدد خواتین اسوقت بھی سیاسی محاکم میں کام کر رہی ہیں، اور وہ کسی طرح دنیا کی مہذب ترین خواتین سے پیچھے نہیں ہیں، اور اُن میں ڈاکٹر، ایڈیٹر، قانون داں، فلسفی، مورخ اور شاعر، غرض سب ہی کچھ موجود ہیں جو مصری مطبوعات و صحائف ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مصری خواتین کی موجودہ سرگرمیوں اور کامیاب بیداری کی روح رواں حسب ذیل خواتین ہیں: بیگم صفیہ زغلول خانم، بیگم ہدیٰ شعراوی خانم، آنشمی، بیگم نازلیہ خانم، بیگم بہاوالدین وغیرہ۔ .....

یہ ممتاز مصری خواتین ہیں، جو انگریزی، فرانسیسی، ترکی، اور جرمنی زبانوں کی ماہر اور بعض مصری یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہیں۔ یہ معزز خواتین اپنے قلم اور اپنے دماغ کی بہترین اور قابل تحسین قوتوں سے مصری خواتین کی اصلاح و ترقی میں ہمہ تن مصروف رہتی ہیں۔

---

۵ ... مجلہ معارف جلد ۱۰ عدد ۲ جولائی ۱۹۲۴ء

بیگم صفیہ زغلول خانم، حضرۃ سعد اللہ زغلول وزیر اعظم اور قائد اعظم مصر کی اہلیہ ہیں۔ آپ اپنے موقر شوہر کے ساتھ عرصے سے مصری خواتین کی رہنمائی فرما رہی ہیں، وہ عربی، فرنچ اور ترکی زبانوں کی ماہر ہیں۔

بیگم ہدیٰ شعراوی خانم مشہور شعراوی پاشا کی بیوی ہیں، جو عربی، فرنچ، انگریزی اور ترکی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتی ہیں۔ اور متحدہ مملکت مصر کی مرکزی جمعیۃ نسواں کی صدر ہیں۔

آنسہ می۔ مصر کی ممتاز ترین اخبار نویس و ناولسٹ خاتون، جو عربی، انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالوی، روسی، ترکی، یونانی اور عبرانی زبانوں پر کامل عبور رکھنے والی جادو نگار خاتون ہے۔

"ملا رموزی"

پیغام بہار

صبا سے چلے ہیں یہ گلشن گلشن
پیام بہار دے رہی ہے
دل کھینچ رہی ہے اپنی جانب
پھولوں سے لپک رہی ہیں شاخیں
رقصاں ہے نسیم بر گِ گل پر
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
کیا سیر چمن کو تم گئے تھے؟
غصے میں بھرا ہے چپ ہے کوئی
مانوس قفس ہوا ہے اسیرو!
بہتر نہیں دل سے کوئی رہبر

خونی جگران چاک دامن
داغوں کی جھلک دلوں کی الجھن
نرگس کی نگہ زبان سوسن
خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن
شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن
مستی میں چھوا صبا نے دامن
ہے بلبل و گل میں آج ان بن
یا اس سے خفا وہ اس سے بدظن
منزل گہ برق ہے نشیمن
بڑھ کر نہیں دل سے کوئی رہزن

دلکش نہ ہو کیوں کلام اثر کا
اک فن ہے مگر مناثر فن

اثر لکھنوی

جہیز

چیکوف کی چوتھی کہانی

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مکانات دیکھے ہیں، چھوٹے اور بڑے، نئے اور پرانے، پتھر کے اور لکڑی کے، لیکن ایک مکان کی یاد خصوصیت کے ساتھ میرے دل میں باقی ہے، اصل میں وہ کوئی بڑی بھاری عمارت نہ تھی، وہ ایک معمولی مختصر، ایک منزلہ مکان تھا، اُس میں تین کھڑکیاں تھیں، اپنی ظاہری صورت میں وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ضعیف العمر خمیدہ قامت عورت سر پر ایک ٹوپی پہنے کھڑی ہو۔ اُسکی سفید دیواروں اور اُسکی کھپریل کی چھتوں پر کائی جم گئی تھی، وہ چاروں طرف درختوں، سبز جھاڑیوں، اور مختلف قسم کے پھولوں کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا جو اُسکے موجودہ رہنے والوں کے بزرگوں نے لگائے تھے۔ اُسکے وسیع صحن کے سامنے ہی ایک راستہ ہے جس پر کوئی گاڑی نہیں چلتی اور بہت کم راہگیر آتے جاتے دیکھے گئے ہیں۔

اس چھوٹے مکان کی کُنڈیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں، اسکے رہنے والے سورج کی روشنی کی پروا نہیں کرتے ۔ روشنی اُنکے لیے بیکار ہے۔ کھڑکیاں کبھی نہیں کھلتیں، کیونکہ اُنھیں تازہ ہوا کا شوق نہیں، جو لوگ اپنی زندگی پھول اور سبزہ کے درمیان گذارتے ہیں اُنھیں فطرت کے مناظر سے دلچسپی نہیں ہوتی، یہ صرف سیاح اور اہل دل ہیں جنھیں خدا نے حُسن فطرت کے مطالعہ کے لیے آنکھ دی ہے، باقی انسان ایسے حُسن کے وجود سے بےخبر ہیں، لوگ اُس چیز کی قدر نہیں کرتے جو اُنھیں افراط سے ملتی ہے۔ "جو ہمیں حاصل ہے ہم اُسے جمع کرنے کی فکر نہیں کرتے" اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اُس چیز سے محبت نہیں ہوتی۔

یہ چھوٹا مکان سبز درختوں کی جنتِ ارضی کے درمیان جن کی شاخوں پر آزاد و مسرور چڑیوں کے گھونسلے ہیں واقع ہے، لیکن مکان کے اندر .... افسوس .... اگرمیوں میں یہ ہر طرف سے بند، رُندھا ہوا، جکڑا ہوا رہتا ہے، جاڑوں میں ترکی حماموں کی طرح گرم۔ کہیں نام کو ہوا نہیں اور افسردگی، وحشت! .....

پہلے پہل اس مکان سے میری واقفیت اُسوقت ہوئی جب بہت عرصہ گذرا میں اپنے

کاروبار کے سلسلہ میں یہاں آیا، میں کرنل کے پاس جو اس مکان کا مالک تھا اُسکی بیوی اور لڑکی کے پاس ایک خط لایا تھا، اپنی پہلی آمد مجھے خوب یاد ہے، دراصل اُسکا بھولنا ناممکن ہے۔

ایک چالیس برس کی نسیف و کمزور عورت کا تصور کرو جو حیرت و خوف کی نظروں سے تمھیں دیکھ رہی ہو، تم گھر میں داخل ہو رہے ہو، یہاں پہلے پہل آئے ہو، نووارد ہو، "ایک نوجوان آدمی" ہو، اُسے خوفزدہ بنانے اور گھبرا دینے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے، تمھارے پاس کوئی خنجر نہیں کوئی پستول نہیں، کوئی بندوق نہیں، تم خندہ پیشانی سے مسکراتے بھی ہو مگر وہ ڈرے جا رہی ہے۔

"کس سے خطاب کرنے کی عزت و مسرت حاصل کر رہی ہوں؟" عورت کانپتی ہوئی آواز میں پوچھتی ہے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور آنے کا سبب بتایا۔

اب خوف اور حیرت کی جگہ جھٹ ایک پُرمسرت اور تیز لہجہ میں "اچھا!" بولی اور اپنی آنکھیں چھت کی طرف اُٹھا دیں، اس "اچھا!" کی آواز بازگشت ہال سے کمرہ میں آئی، کمرے سے باورچیخانہ میں گئی، باورچیخانہ سے کوٹھری میں پہونچی، اور ذرا دیر میں پورا مکان "اچھا!" کی مختلف الآواز صداؤں سے گونجنے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے اپنے کو ڈرائنگ روم میں ایک بڑی، ملائم اور گرم کرسی پر بیٹھا چاروں طرف "اچھا!" کی صدائے بازگشت سے گھرا ہوا پایا، کمرہ میں برسات کی اور گیری کی کمال کے جوتوں کی جو ایک مدوال میں لپٹے ہوئے میرے پاس ہی کرسی پر رکھے تھے بُو آ رہی تھی، کھڑکیوں پر تن زیب کے پردے تھے اور پردوں پر بے حس و حرکت مکھیاں، دیوار پر کسی باوری کی روغنی تصویر لٹک رہی تھی، جسکے شیشہ کا ایک کونا ٹوٹ گیا تھا، اسکے برابر برابر گھر کے بزرگوں اور پُرکھوں کی تصویریں تھیں، میز پر کچھ بڑی بڑی سوئیاں، دھاگے کی ایک گرہی اور آدھا بُنا ہوا موزہ، اور چند کاغذی نمونے، دوسرے کمرے میں دو خوفزدہ و متحیر بڈھی عورتیں فرش پر سے اسی قسم کے کچھ نمونے اُٹھا رہی تھیں،

"آپ معاف کریں گے، ہم بہت میلے ہیں" چھوٹی عورت نے کہا

مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں جہاں اب بھی نمونے اکٹھا کیے جا رہے تھے، خجالت آمیز، دزدیدہ نظروں سے دیکھتی جاتی تھی، دروازہ بھی شرمندہ و خجل معلوم ہوتا تھا، ایک انچ دو انچ کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔

"کیا بات ہے؟" چھوٹی عورت نے دروازہ کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا،
اندر سے ایک عورت کی آواز نے فرنچ میں کچھ کہا،
نیم فرنچ اور نیم روسی زبان میں جواب دیا گیا،
"ہم فرنچ اچھی بول لیتے ہیں" چھوٹی عورت کی خوشی سے تمتماتی ہوئی آنکھوں میں میں نے پڑھا
اسکے بعد دروازہ کھلا اور انیس برس کی ایک لانبی، پتلی لڑکی کو میں نے دیکھا وہ تن زیب
کی پوشاک پہنے تھی، اُسکی کمر میں ایک سنہری پیٹی تھی جس میں ایک خوشنما پنکھیا جھول رہی تھی،
وہ داخل ہوئی، اُس نے ایک کرسی بچھائی، اُسکے چہرہ کا رنگ اُڑنے لگا، پہلے اُسکی لانبی ناک
جس پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے سرخ ہوئی، پھر اُسکی آنکھیں اور پیشانی چمک پڑیں۔
"میری لڑکی ہے" عورت نے مجھ سے کہا "اور منچکا! یہ ایک نوجوان آدمی ہے جو آیا ہے" وغیرہ
میرا تعارف کرایا گیا، کاغذی نوٹوں کی تعداد پر میں نے تعجب ظاہر کیا، ماں اور بیٹی نے اپنی
نگاہیں جھکا لیں،
"یہاں ایک میلہ تھا، اسنشن کے مقام پر" ماں نے کہا "ہمیشہ اس میلہ میں ہم مال خریدتے ہیں
اور سال بھر تک کام کرتے ہیں یہاں تک کہ دوسرے سال پھر میلہ کا وقت آجاتا ہے، دوسروں کی
بنائی ہوئی چیزیں ہم نہیں خریدتے، میرے شوہر کی تنخواہ زیادہ نہیں ہے اور عیش کی زندگی ہم کہاں سے
بسر کریں، ہر چیز خود بنا لیتے ہیں"
"لیکن اتنے اقسام کی چیزیں کون پہنے گا؟ تم تو صرف دو ہی ہو؟"
"آہ ..... پہننے کا خیال کسے ہے یہ جہیز کے لیے ہیں"
"اماں! یہ کیا کہتی ہو" بیٹی نے کہا اور وہ زرد پڑ گئی "یہ نہ معلوم کیا سمجھتے ہونگے سچ سمجھتے ہونگے!
میرا ارادہ شادی کا نہیں ہے، میں کبھی شادی نہ کروں گی!"
اُس نے یہ کہا تو لیکن "شادی" کے لفظ پر اُسکی آنکھیں چمک پڑیں۔
چائے، بسکٹ، مکھن اور جام لائے گئے، سات بجے ہم نے کھانا کھایا، چھ دو تھے،
میں کھانا کھا رہا تھا کہ پاس کے کمرے سے میں نے ایک زور کی انگڑائی سُنی، دروازہ کی طرف تعجب
سے دیکھا، مرد ہی کی انگڑائی ہو سکتی تھی،
"یہ میرے شوہر کے بھائی ہیں" چھوٹی عورت نے میرے تعجب کو دیکھ کر کہا "سال بھر سے ہمارے
ہی پاس رہتے ہیں، کسی سے نہیں ملتے، ملتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ غائقاہ جانے والے ہیں،

نوکری میں انکے ساتھ بے انصافی کی گئی، اس مایوسی نے انکے دماغ پر بہت اثر ڈالا ہے"

کھانے کے بعد چھوٹی عورت نے کپڑے دکھائے جن پر اُنکے شوہر کے بھائی نے کام بنایا تھا، منچکا نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی شرم ہٹا دی اور مجھے تمباکو کی تھیلی دکھائی جو اُس نے اپنے باپ کے لیے بنائی تھی، میرے مصنوعی تعجب اور حیرت کو دیکھ کر اُسکے چہرے پر ایک سرخی آگئی اور اُس نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا، ماں اُچھل پڑی اور مجھے اُسکے ساتھ اُسکے کمرے میں جانے کی دعوت دی، وہاں مجھے پانچ بڑے ٹرنک اور کچھ چھوٹے ٹرنک اور صندوق دکھائے گئے۔

"یہ اِن کا جہیز ہے" اُسکی ماں نے آہستہ سے کہا "سب ہم نے ہی بنایا ہے"

ان صندوقوں کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنے دونوں مہربان میزبانوں سے رخصت چاہی، اُنھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں وقتاً فوقتاً اُن کے یہاں پھر آتا رہوں گا۔

ایسا کچھ ہوا کہ میں اپنا یہ وعدہ پورا کر سکا، اپنی پہلی آمد کے سات برس بعد مجھے اس قصبہ میں ایک مقدمہ کی شہادت کے سلسلہ میں پھر آنا پڑا، اس مکان میں داخل ہوا تو میں نے وہی طمانیت خیز "اچھا!" کی آواز اپنے چاروں طرف پھیلتی ہوئی سُنی، اُنھوں نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا..... خیر، مجھے پہلی نظر میں پہچان لینے کے اُنکے پاس معقول وجوہ ہونگے، میری پہلی آمد اُن کی خاموش و پُرسکون زندگی میں ایک مخصوص اہمیت رکھتی تھی اور جب اہم واقعات کم ہوتے ہیں تو وہ عرصہ تک یاد رکھے جاتے ہیں۔

میں ڈرائنگ روم میں پہونچا، ماں جو پہلے کے بہ نسبت زیادہ کمزور ہوگئی تھی اور جسکے بال سفید پڑنے لگے تھے، فرش پر رینگ رہی تھی، وہ کوئی نیلی چیز کاٹ رہی تھی، اُسکی بیٹی صوفے پر بیٹھی کپڑا کاڑھنے میں مشغول تھی۔

پہلے کی طرح وہاں ہلکی ہلکی نمی کی بُو تھی، کاغذ کے مختلف قسم کے نمونے تھے، وہ تصویر بھی تھی جسکا شیشہ ٹوٹ گیا تھا، مگر کچھ تبدیلی ضرور تھی، پادری کی تصویر کے پاس کرنل کی ایک تصویر لٹک رہی تھی، دونوں عورتیں ماتمی لباس میں تھیں، کرنل کی ترقی ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی اُس کا انتقال ہوگیا تھا،

پچھلے واقعات دوہرائے گئے..... بیوہ نے آنسو بہائے۔

"ہمارا بہت بڑا نقصان ہوگیا" اُس نے کہا "آپ کو معلوم ہے، میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اب دنیا میں ہم اکیلے ہیں، اپنے سوا ہمارا کوئی نہیں، میرے شوہر کے بھائی زندہ ہیں، مگر اُنکی بابت

میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکتی، انھیں خانقاہ والوں نے نہیں لیا، کیونکہ ــــ کیونکہ وہ شراب بہت پینے لگے ہیں، اور اب اس مایوسی کی وجہ سے انھوں نے اور کثرت سے پینا شروع کر دی ہے سوچتی ہوں، کہ ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں، اور شکایت کروں، کیا بتاؤں، ایک سے زائد دفعہ ہمارے صندوقوں کے قفل توڑ چکے ہیں ..... منچکا کا جہیز انھوں نے فقیروں کو بانٹ دیا، دو صندوق تو بالکل خالی کر دیے، یہی حال رہا، تو میری منچکا کا تمام جہیز غائب ہو جائے گا۔"

"اماں، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟" پریشان ہو کر منچکا نے کہا "یہ سمجھیں گے .... یہ نہ معلوم کیا سمجھیں گے .... میں شادی نہیں کروں گی ــــ کبھی نہیں"

منچکا نے اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھا دیں جن میں امید و آرزو کی جھلک تھی، صاف معلوم ہوتا تھا، کہ اُسے اپنی باتوں کا یقین نہیں ہے۔ ایک چھوٹے قد کا آدمی جسکے سر کے بال غائب تھے، چوہے کی طرح آہستہ آہستہ سامنے سے گذر گیا، اسکے شوہر کا بھائی ہوگا، میں نے خیال کیا۔

میں نے ماں اور بیٹی دونوں پر ایک ساتھ نظر ڈالی، وہ بہت بدل گئی تھیں، ماں کے بال سفید ہو گئے تھے، لیکن بیٹی اس طرح مرجھا گئی تھی کہ اُسکی ماں اُس کی صرف چار پانچ برس بڑی بہن معلوم ہوتی تھی

"میں ڈپٹی صاحب کے پاس جانا چاہتی ہوں" ماں نے مجھ سے کہا، اُسے یاد نہ رہا کہ وہ مجھ سے یہ کہہ چکی ہے" ۔ شکایت کروں گی، وہ اب ہماری ہر چیز پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں، جو چیز ہم بتاتے ہیں، وہ اُسے خیرات کر دیتے ہیں، کہتے ہیں ثواب ملے گا، میری منچکا بغیر جہیز کے رہی جاتی ہے"

منچکا کے چہرہ کا رنگ پھر فق ہو گیا مگر اُس نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔

"اب سب سامان پھر جمع کرنا ہوگا، اللہ جانے کہاں سے آئے گا، ہم چھوٹی اوقات کے آدمی ہیں، دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے"

"دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے" منچکا نے دوہرایا

ایک سال گذر گیا اور قسمت نے مجھے ایک مرتبہ پھر اس مکان میں لا ڈالا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے میں نے بڈھی عورت کو دیکھا، ایک سیاہ لباس میں لپٹی ہوئی وہ ایک صوفے پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی، اُسکے پاس اُسکے شوہر کا بھائی ایک پیلا کوٹ پہنے بیٹھا تھا، مجھے دیکھ کر وہ اُچھل پڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"آپ کیا بنا رہی ہیں؟" تھوڑی دیر بعد میں نے اُس سے پوچھا۔

"شلوکہ ہے، بن جائے تو پادری کے پاس لے جاؤں گی، نہیں تو یہ اسے لے بھاگیں گے

اب سب چیزیں پادری ہی کے یہاں رکھتی ہوں" اُس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔
اور اپنی لڑکی کی تصویر دیکھ کر جو سامنے میز پر رکھی تھی، اُس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:
"ہم دنیا میں اکیلے ہیں"
اور اُسکی بیٹی کہاں گئی؟ منچکا کہاں گئی؟ میں نے یہ اُس سے نہیں پوچھا، میں نے بڈھی ماں سے جو نئے ماتمی لباس میں تھی پوچھنے کی جرأت نہ کی، جب تک میں کمرے میں رہا، اور جب میں جانے کے لیے اُٹھا، منچکا مجھ سے ملنے نہیں آئی، میں نے اُسکی آواز نہیں سُنی، نہ اُسکے قدموں کی نرم آہٹ ....
میں سمجھ گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

جلیل قدوائی (علیگ)

ارشادِ جگر

نظر میں ہیچ ہے گلشن تمام دُنیا کا
نہ پوچھ حوصلہ مرغانِ رشتہ بر پا کا

اثر ہے جس میں کہ ہر موجِ کار فرما کا
وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

نجات روح کو ملتی نہیں ہے نفس سے آہ!
بنا ہوا ہے یہ مجنوں، حجاب لیلا کا

ہر ایک ذرّہ سے نکلے تڑپ کے برقِ جمال
کوئی بنے تو طلبگار حُسنِ معنیٰ کا

خدا ہی رحم کرے اُس کی تشنہ کامی پر
سراب پر جسے کامل یقیں ہو دریا کا

وہ اک فریبِ تصور، یہ اک طلسمِ نظر
یہ حاصل ہے کُل اے شیخ دین و دُنیا کا

رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں
مگر ہے قطرہ پہ فرض احترام دریا کا

لیے ہے محشرِ صد اضطراب پہلو میں
سکون بھی تو مرے قلبِ ناشکیبا کا

سمجھتے ہیں جسے ہم دل وہ اک مرکب ہے
امید و آرزو و حسرت و تمنا کا

کہاں میں خاک کا پُتلا کہاں یہ نفسِ لطیف
فریب تھا دلِ بیدار و چشمِ بینا کا

ہر ایک قطرہ انا البحر کہ اُٹھے گا مزور
یہی جو رنگ رہا استحالۂ معنیٰ کا

جگر مرادآبادی

جذباتِ سلیم

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نہاں دامن کی کلیوں میں گلستاں کو

اُڑایا چٹکیوں میں میرے ذرہ نے بیاباں کو
مرے قطرہ نے پانی کر دیا ہر موجِ طوفاں کو

دیے ہیں کھول دفترِ زندگی کے تیرے غمزوں نے
دیا تھا چھیڑ یہ کس نے تری چشمِ سخنداں کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یارب موجِ طوفاں کو

یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو لیکا یک قلبِ مضطر نے
کہ میری لَے نے رقصاں کر دیا سارے نیستاں کو

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہر درخشاں کو

نکرتی تو اگر پروا وقت اے الفت مسیحائی
لپیٹا تھا کفن میں عقل نے جذباتِ انساں کو

مرے گوہر کو ڈھالا کس صدف نے اپنے سانچے میں
کہ میری آب ہر دم سینچتی ہے ابرِ نیساں کو

ترے دل میں ہے تاریکی تو پھر لاکھوں ستارے بھی
نہ روشن کر سکیں گے اے جواں تیرے شبستاں کو

ہر اک افسردہ دل میں پھونک دی نکا روحِ بیداری
ذرا کر وٹ بدلنے دو مرے خوابیدہ ارماں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں
مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

محبت کی کشش کی داستاں پوچھو زلیخا سے
نکالا چاہِ کنعاں سے اسی نے ماہِ کنعاں کو

تری صنعت پہ ہیں اے موسمِ گل کیوں نہ حیراں ہوں
پہنایا ہے لباسِ رنگ میں کس حسنِ عریاں کو

بھرا افسردگی سے ہے جو کنجِ آشیاں میرا
فلک پر ڈھونڈھتی ہیں میری آنکھیں برقِ خنداں کو

مجازی حُسن کے پھولوں کو حیرت سے رہا تکتا
نہ سمجھا میں حقیقت کے تبسمہائے پنہاں کو

بہاریں بوسہ دیں خاکِ لحد کو تیری اے سعدی
ترے خونِ جگر نے کر دیا رنگیں گلستاں کو

بہت منصور ہیں جو دار پر چڑھنے کے شایق ہیں
بہت یوسف ہیں اب جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں زنداں کو

مری بیکار ہستی ہے تری زینت کا سرمایہ
بنا کر دیکھ زلفِ اپنی، مرے بختِ پریشاں کو

دکھاتا ہوں نظارے اپنے دل کو دین و دنیا کے
کھلونے دے کے بہلاتا ہوں میں اس طفلِ ناداں کو

جھجکتا ہے اگر جلوت سے خلوت میں بے پردہ
تھپک کر میں سُلا دیتا ہوں ساری بزمِ امکاں کو

مری پرواز فکر اے فقر ہو اتنی بلندی پر
کہ دونوں خوشی سے خاک میں تختِ سلیماں کو

میں اُس حسنِ لطافت بیز کا شیدا ہوں اے زاہد
سمجھ کر گردِ دامن سے جھاڑے باغِ رضواں کو

کلیم طور سینا ہوں۔ بدِ بیضا ہے دل میرا
منور کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

آیولینتھی

[ایک ڈراما]

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

دوسرا منظر

[اِ دشاہ رینی، ابن یحییٰ اور برٹرانڈ چوبدار وغیرہ سے داخل ہوتے ہیں، ایلمرک اور مارتھا پہلے سے موجود ہیں]

رینی - مارتھا! میں تیرے پاس نیک نفس ابن یحییٰ کو لایا ہوں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آج ہی وہ ایک مرتبہ اور یہاں آچکے ہیں۔ کیا حال ہے؟

مارتھا - خداوند! ہر کام حضور کی مرضی کے مطابق ہوا

رینی - جو کچھ حکیم صاحب نے ہدایتیں کی تھیں اُنکی تعمیل کی گئی؟ کوئی بات چھوٹی تو نہیں؟ آیولینتھی کی آنکھوں پر ہر شب سوتے وقت پٹی باندھی گئی؟

مارتھا - جی حضور!

رینی (ابن یحییٰ سے مخاطب ہوکر) یہ ایک خطرناک امتحان تھا۔ تعجب ہے کہ یہ زحمت اُس نے برداشت کی۔ لیکن یہ حُسن اتفاق کہ حال ہی میں مکھی نے اُسکی کنپٹی میں کاٹ لیا، اس سے ہمیں ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ یقیناً ننھی مکھی کو دھوکا ہوا۔ اس دشتما دنیا میں جو آیولینتھی کی پرداختہ ہے اور جہاں وہ ایک پھول کی طرح پھولوں میں نشو ونما پاتی ہے، مکھی اس شوخ رنگ کے خنگونہ کو دیکھ کر چوندھیا گئی اور سمجھی کہ گلاب کی کلی سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ معاف کرو۔ اپنی ہی لڑکی کے متعلق اس قسم کی گفتگو گناہ ہے۔ خیر۔ تمھیں فکر ہوگی کہ اپنی محنت کا نتیجہ دیکھو۔ آیولینتھی کے پاس جاؤ۔ برٹرانڈ! مارتھا! حکیم صاحب کو اندر لیجاؤ شاید انھیں تمھاری ضرورت ہو۔

[ابن یحییٰ مکان کے اندر برٹرانڈ اور مارتھا کے ہمراہ داخل ہوتا ہے]

کیوں ایلمرک، اس خاموش و پُرسکون وادی کو دیکھ کر تمھیں اچنبھا تو نہیں ہوا؟ یہ ایک مختصر سی بہشت ہے۔

ایلمرک - بیشک خداوند!

رینی - حُسن و علم و فن میں جو کچھ محبوب ترین ہے یہاں موجود ہے۔ کاش میں ایسا خوش نصیب ہوتا کہ اپنی زندگی انکے درمیان بسر کرسکتا اور ٹھنڈے دل سے نیپلس اور لوریں اور اس طولانی نزاع کو جو دو ڈیوک سے درپیش ہے ہمیشہ کے واسطے بھول جاتا۔

ایلمرک - حضور، اُسکا تو تصفیہ ہوچکا عنقریب کاؤنٹ ٹرٹشان قدم رنجہ فرمائیں گے اور ان تمام

جھگڑوں کا خاتمہ صلح و آشتی پر ہو جائے گا۔
رینی - مجھے بھی یہی اُمید ہے اور اس امید کو روز بروز تقویت ہوتی جاتی ہے۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ میں جیوفری آف آرچ کا منتظر ہوں۔ وہ ٹرشان کے قلعہ میں عرصہ تک مقیم رہ چکے ہیں۔ اور کاؤنٹ کو کبت، شاعری اور موسیقی کی تعلیم دی ہے۔ جیوفری مجھ سے کہتے تھے کہ نوجوان کاؤنٹ کو شاعری سے خاص مناسبت ہے۔ اسکا مذاق شستہ و متین ہے۔ تخئیل میں جدت اور خیالات میں بلندی ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرے سامنے ایک گیت گایا تھا جو ٹرشان کا موزوں کیا ہوا تھا۔ اُس کا موضوع بھی عمدہ تھا بندشیں بھی چست و خوبصورت تھیں انصاف مقتضی ہے کہ میں اُسکے کمال شاعری کا اعتراف کروں۔ حالانکہ وہ مجھ سے برسرِ پرخاش ہے اور موقع پا جائے تو تورین کو غصب کرلے۔ لیکن خاموش رہو، میں نے ایک آواز سُنی۔

[دروازہ کے پاس جاکر دیکھتا ہے]

دیکھو! ابن یحییٰ نے اُسے جگا دیا، آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں باتیں کر رہی ہے۔ ابن یحییٰ غور سے اُسکی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے وہ طلسمی نقش پھر اُسکے سینہ پر رکھ دیا اور وہ پھر سو گئی۔

ایلمرک - عجیب و غریب عمل ہے!

رینی - نہایت حیرت خیز! اس مراقش کے حکیم کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ وہ آرہا ہے۔ ایلمرک مجھے تنہا چھوڑ دو۔ لیکن سنو! تم محل میں جاؤ، میں یہیں ٹھہروں گا۔ جسوقت ٹرشان کا خط آئے فوراً لیکر یہیں حاضر ہو۔

ایلمرک - رخصت! خداوند!

[ایلمرک باہر جاتا ہے اور ابن یحییٰ دوسرے دروازہ سے داخل ہوتا ہے]

رینی - کہو ابن یحییٰ۔ کیا تم فاختہ کی طرح زیتون کی شاخ لائے ہو[1]؟ تم فکرمند ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا نتیجہ نکالوں؟

ابن یحییٰ - مجھے صحت کی قوی اُمید ہے۔

رینی - کیا یہ سچ ہے؟ تم فرشتۂ آسمانی ہو جو میری مدد کو بھیجا گیا۔ تمھارا سیاہ چہرہ شاہ مراقش کی طرح جو ہمارے عیسٰی مسیح کے گہوارہ کے سامنے سجدہ میں جھکا تھا اُس ستارے کا پیش خیمہ ہے جو میری تاریک راتوں کو منور کردے گا۔ یحییٰ مجھے بتاؤ کہ تم نے اپنی امیدوں کو کس بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اب تم کیا صلاح دیتے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ میں بیتاب ہوں بولو! حال ہی میں میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں تحریر تھا کہ آنکھ کی اکثر بیماریاں قدح کرنے سے اچھی ہو جاتی ہیں۔ میرے ابن یحییٰ۔ تم ایسا ہرگز نہ کرنا! تم جانتے ہو کہ آنکھ کیسی نازک چیز ہے۔

---

[1] اشارہ ہے طوفان نوح کی طرف۔ فاختہ شاخ زیتون لائی تھی جس سے امید ہوئی تھی کہ ساحل قریب ہے۔

کیا تمھارا دل ایسا پتھر کا ہو جائے گا کہ میری آیولینتھی کی آنکھوں کو نشتر فولاد سے چھوؤ؟ کیا تم یہ اندیشہ نہ کروگے کہ اُنکی نیلگوں گہرائیوں کی رعنائی کو صدمہ پہونچ جائیگا؟ کیا تم دیکھتے نہیں کہ باوجود اس اندوہ والم کے یہ گہرے اور سیاہ پشمے کس قدر ضو فشاں ہیں۔ آہ! اُسکی آنکھیں! کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایسے نورانی دائروں پر رات کی تاریکی چھا جائے۔

ابن یحییٰ - اس قدر مضطرب نہ ہو جیے۔ اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ نشتر وغیرہ اگر میں استعمال کروں بھی تو زیادہ مفید ثابت نہ ہوں گے۔

رینی - تو پھر تم نے کیا طے کیا ہے؟

ابن یحییٰ - اے رحمدل بادشاہ! میں صافی کا خواستگار ہوں۔ میرا علاج میرے پیشہ کا ایک راز ہے، اور اُسکے افشاے کوئی فائدہ متصور نہیں ہے یہ آن واحد میں شکل پذیر نہیں ہوا ہے بلکہ برسوں راتوں کو جاگ جاگ کر اس پر دماغ سوزی کیگئی ہے اب وہ موقع آگیا ہے کہ اگر خدا کی مرضی ہوئی تو مجھے کامیابی ہوگی۔ اور یہ کامیابی یا تو آج ہی رونما ہوگی یا کبھی نہیں!

رینی - آج ہی! یہ کیونکر؟

ابن یحییٰ - غروب آفتاب کے بعد جسوقت شفق پھولے اور صرف اتنی دھیمی روشنی ہو جسے اُسکی آنکھیں جو عادی نہیں ہیں بلا خطرہ برداشت کرسکیں میں اپنے علاج کی آزمایش کروں گا۔

رینی - آہ ابن یحییٰ میں تیری التجا کرتا ہوں کہ آج نہیں - ہر روز نہیں بلکہ ہر ساعت میں نے بڑے اشتیاق سے اس لمحہ کا انتظار کیا ہے لیکن جب وقت آگیا تو میرا دل ڈوبا جاتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اور تعویق ہو۔ ابن یحییٰ خیال کرو کہ کس قدر خطرہ ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ممکن ہے کہ میری تمام نازپروردہ آرزوؤں کا خاتمہ ہو جائے تم سوچ میں پڑ گئے۔ کیا توقف کروگے؟

ابن یحییٰ - التوا نا ممکن ہے۔

رینی - تو یہ بتا دو کہ کوئی خوف تو نہیں ہے؟ کیا نتیجہ میں کوئی شبہہ تو نہیں ہے؟ تم نے خاموش ستاروں کے ذریعہ سے ساعت دیکھی تھی۔ تمھارا علم اُن پر بھی حاوی ہے، کیا جواب ملا؟ ابن یحییٰ مجھے بتا دو۔ جو نقشہ تم نے بنایا اُس سے فال نیک نکلتی ہے؟

ابن یحییٰ - جی ہاں۔ یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ ستارے نیکی کی طرف مائل تو ہیں لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ بالکل موافق ہیں۔ اُن کا اثر انسان کی قسمت پر ضرور ہوتا ہے مگر فطرت اُنکی غلام نہیں ہے۔ تاہم آپ مطمئن رہیں اس بنا پر مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ایک اور رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔

رینی - رکاوٹ؟

ابن یحییٰ - ہاں سرکار! اور میرا خیال ہے کہ آپ اس گتھی کو سلجھانے میں میری مدد نہ کرسکیں گے۔ قبل

اسکے کہ میں اپنا عمل شروع کروں آبو لنیقی کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ نابینا ہے۔

رینی۔ نہیں ابن یحییٰ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

ابن یحییٰ۔ ایسا ہونا چاہیے ورنہ میرا فن بیکار ہے۔

رینی۔ نہیں نہیں۔ آہ! ہرگز نہیں۔ تم مجھے اس وحشیانہ ظلم پر مجبور نہ کرو گے۔ اور ایک جھٹکے میں غفلت کے اس پردے کو چاک نہ کرو گے جو اسکی طمانیت کا موجب ہے۔ اسکی نازک روح پر اس مہیب صداقت کا یکایک نہیں بلکہ بتدریج اظہار ہونا چاہیے۔ اور اگر اسکے بعد صحت نہ ہوئی تو کیا تم بھول گئے کہ کس ہوشیاری سے جسکو سننے والا ہو ورنہ کرے گا ہمنے سالہا سال اس دردناک حقیقت کو اس سے پوشیدہ رکھا ہے۔ تمھارے ہی مشورہ سے ایسا ہوا اور تمھیں نے بتایا کہ یہ دشوار مرحلہ کس طرح طے کرنا چاہیے۔ کیا جو عالیشان عمارت تم نے اٹھائی اسے چشم زدن میں ڈھا دو گے؟ بتاؤ کیوں؟ آہ کیوں!

ابن یحییٰ۔ اگر آپ متوجہ ہو کر سماعت فرمائیں تو وجہ عرض کروں۔ غالباً آپ کا خیال ہوگا کہ بصارت کا آلہ آنکھ ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ آنکھ صرف ذریعہ ہے۔ قوت بینائی کا سرچشمہ روح ہے اور وہ نازک اعصاب جنکا اجتماع آنکھ کے گرد ہوتا ہے، دماغ کے پوشیدہ خزانہ میں بنتے ہیں۔ آبو لنیقی کو اپنی حالت کا احساس ہونا چاہیے۔ اولاً اسکی اندرونی آنکھیں کھولنا چاہیے، قبل اسکے کہ اسکی ظاہری آنکھوں پر نور کی بارش ہو اسکی روح میں روشنی کی احتیاج پیدا ہونا چاہیے تاکہ وہ روشنی کی منتظر ہو، آرزومند ہو، کیونکہ انسان کو وہ چیز کبھی عطا نہیں ہوتی جس کا وہ متمنی نہ ہو۔ اسکی روح کی تہ میں ایک خواہش اور اسکے حصول کا ارادہ پیدا ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر فن شاعری کو لیجیے جسکے واسطے تمام عمر یہ دو برس مشہور ہے۔ یہ ایک عطیۂ فطرت ہے۔ مگر کیا ہر انسان کو مل جاتا ہے؟ نہیں، صرف وہ اسکے مستحق ہو پاتے ہیں جنکے سینوں میں خواب کی طرح ایک درخشاں دنیائے شعر آباد ہوتی ہے جسکے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور انکی تشنگی کبھی نہیں بجھتی۔

رینی۔ اچھے ابن یحییٰ۔ میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتا۔ میرا علم اتنا وسیع نہیں۔ لیکن رحم کی آواز میرے دل میں گونج رہی ہے اور تمھارے دلائل کو غرق کیے دیتی ہے۔ تم جو کہتے ہو ناممکن ہے اور میں ہرگز اسے منظور نہیں کر سکتا۔

ابن یحییٰ۔ آپ کی مرضی۔ میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں اور اگر میرے مشورہ پر عمل نہیں ہوتا تو میری موجودگی یہاں بیکار ہے، لہٰذا اللہ نگہبان! بندہ اپنی خانقاہ کو واپس جاتا ہے۔ اگر آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا تو میں وہیں ملوں گا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر غور کیجیے۔ اگر آفتاب ان پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گیا تو پھر میرا تمام علم و فن کام نہیں آسکتا۔ (چور دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

رینی - آہ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ میں نے اس امید کو کس قدر گراں خریدا، اور اب ممکن ہے کہ وہ ایک لمحہ میں فنا ہو جائے۔ کیا میں اُسکی شگفتگی کو اُس سے چھین لوں؟ اور اُسکے بھلے تکلیف دہ یاس دیدوں۔ اُسکے شباب کو آہستہ آہستہ کھلاتے دیکھوں یہاں تک کہ وہ خشک ہو کر نوحۂ خزاں میں منتقل ہو جائے؟ نہیں! یہ ابن یحییٰ کی ہٹ ہے۔ وہ یقیناً رام ہو جائے گا۔ میں چین نہ لوں گا جب تک وہ میری بات نہ مانے گا اور میری مرضی کے موافق کاربند نہ ہو گا۔

[رینی بھی باہر چلا جاتا ہے۔ ویسے ہی مارتھا اور بڑبرانڈ داخل ہوتے ہیں]

مارتھا۔ بادشاہ سلامت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصہ میں ہیں۔ ابن یحییٰ کا بھی پتہ نہیں۔ یہ ماجرا کیا ہے؟

بڑبرانڈ۔ خدا جانے کیا ہے۔ میں یہی ڈرتا ہوں کہ کہیں عین وقت پر ابن یحییٰ کو ناکامی نہ ہو۔

مارتھا۔ خدا نہ کرے۔

بڑبرانڈ۔ کاش ایسا ہی ہو، لیکن میں اُس شخص کے سوچ بچار اور اسکے تیوروں کو پسند نہیں کرتا، اور بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ اُسکو ایسی عجیب و غریب قدرت ہے کہ میں ڈرتا ہی رہتا ہوں۔ دیکھو لڑکی اُس کوچ پر اس طرح لیٹی ہوئی ہے گویا اُس میں دم ہی نہیں، مگر اُسکے ہاتھ کے ایک اشارہ سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا سو رہی ہے۔ اسکا نتیجہ اچھا نظر نہیں آتا۔

مارتھا۔ اطمینان رکھو! تمھارا خوف بیجا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ جہاں اُسکے سونے کا وقت ختم ہوا اور ابن یحییٰ نے طلسمی نقش اُسکے سینے سے اُٹھایا تو وہ ہشاش بشاش اور صحیح و تندرست ہو جاتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ غیر معمولی نیند اُسے رات کی نیند سے زیادہ قوت و فرحت بخشتی ہے۔ اور اُسکے حواسوں کو جلا دیتی ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب وہ جاگتی ہے تو اُسکی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے۔ گویا روشنی کی چند شعاعوں کو سوتے میں چپکے سے داخل ہونے کا راستہ مل گیا۔ میرے نزدیک تو یہ اچھی علامت ہے بڑبرانڈ۔ ممکن ہے کہ تمھارا ہی خیال درست ہو۔ یہ وقت گذرنے پر معلوم ہو جائے گا۔ آؤ چلیں، ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ دیکھیں مالیوں نے کیا کیا۔ اب آیو لینتھی کے پاس چلو وہ سو رہی ہے اور ہماری واپسی تک نہیں جاگے گی۔

[پشت مکان کی طرف چلے جاتے ہیں]

تیسرا منظر

[لڑسٹان اور جیوفری دونوں ایک ایک سنار لیے ہوئے آتے ہیں۔]

جیوفری (چور دروازہ کے سامنے ٹھہر کر) ذرا ہوشیاری سے قدم بڑھاؤ۔ یہاں آدھی رات

کی تاریکی ہے۔

ٹرسٹاں۔ آگے بڑھو، گرد دیکھو تو یہاں ایک دروازہ ہے!

جیوفری۔ دروازہ!

ٹرسٹاں۔ صبر کرو! سُنگنی لگی ہے۔ لے لو کھل گئی ارے، یہ کیا نظر آتا ہے؟

(دونوں داخل ہوتے ہیں)

جیوفری۔ اللہ اللہ! کیسی عمدہ خوشبو کا جھونکا آیا!

ٹرسٹاں۔ باغ! اور اس کو ہستانی ویرانے میں! کس سلیقہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اور کس قدر خوشنما ہے! دیکھو تو!

جیوفری۔ میرے تو ہوش اُڑ گئے!

ٹرسٹاں۔ وہ کون شخص ہے جو اس مسحور کرنے والے خطہ کا مالک ہے۔ تم گرد و نواح سے خوب واقف ہو اور قریب ہی رہتے ہو۔

جیوفری۔ مجھے مطلق علم نہیں۔ یہ بہشت کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ گرم ممالک کا ایسا باغ ہے اور پھول ہر طرف نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ اُن سرو بلند کھجوروں کو تو دیکھو!

ٹرسٹاں۔ انکے پس پشت محل ہے۔ کس قدر خوبصورت! اور تقریباً نصف چنبیلی اور گلاب کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں رہتا کون ہے؟

جیوفری۔ ایک متنفس بھی دکھائی نہیں دیتا۔ شاید کسی مبارک رات میں جبکہ ڈائنا نے ایک رئیس سے اپنے اپائنٹمنٹ کیلئے وقت کی یہ ایک معرض وجود میں آیا، تاکہ ان چٹانوں میں اُنکی سرمست خوشیوں کا پردہ پوش ہو جائے۔ لیکن یہاں کے باشندے فرار ہو گئے!

ٹرسٹاں۔ نہیں، یہاں انسان کی صناعی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہاتھ خوبصورت اور نازک ہیں۔ دیکھو اُس روش پر پانوں کے تازہ نشان ہیں۔

جیوفری۔ تم سچ کہتے ہو۔ ایک چھوٹا اور نفیس نقش قدم۔ آؤ اور آگے بڑھیں۔ اسی کے ذریعہ سے پتہ لگائیں۔ اس طرح ہم بھٹک نہیں سکتے، وہ محل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ٹرسٹاں۔ ہمیں انتظار کرو جب تک کوئی شخص نہ آئے۔ تہذیب مقتضی نہیں کہ یوں دلیرانہ داخل ہوں۔ یہی کون اچھی بات تھی کہ یہاں تک بلا اجازت چلے آئے۔

جیوفری۔ تمہاری خوشی۔ خدا کرے قسمت ہمارا ساتھ نہ چھوڑے۔ میں اپنی تہذیب پر جبر اور کسی کے آنے کا صبر کے ساتھ انتظار کروں گا۔ ابھی تک تو ستارہ موافق ہے۔ کیوں ٹرسٹاں تم نے کچھ غور کیا کہ یہ سب واقعات کس طرح ظہور میں آئے۔ ہم دونوں خانقاہ کے قریب بلا مقصد ٹہلتے اور گیت گا گا کر وقت گزار رہے تھے کہ میں نے شاہ رینی کو جاتے دیکھا۔ وہ قرطبہ کے حکیم سے سرگرم گفتگو تھا۔ اسلیے کہ اُسکی نظر ہم پر نہ پڑے، تم مجھے اپنے ساتھ کھینچ لائے۔ چٹان اور جھاڑ جھنکاڑ طے کرتے ہوئے

دامن کوہ میں پہونچے، اور اتفاق سے یہ پوشیدہ راستہ مل گیا، جو عجب حکمت سے وضع کیا گیا ہے۔ تھوڑی دور تو ہم اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے چلے، اسکے بعد وہ دروازہ دکھائی دیا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ رینی سے تم نے احتراز کیوں کیا۔ تم تو اُس سے ملنے ہی کی غرض سے آئے تھے اور مجھ سے وعدہ تھا کہ کل دوران ملاقات میں تمھارے ہمراہ رہوں اور تم ..... اس واقعہ کو عالم جانتا ہے۔ اور اُسکی لڑکی سے تمھاری نسبت بھی قرار پا چکی ہے۔

ٹرسٹان - نسبت! ہاں لوگ کہتے ہیں۔ لیکن میں مشکل سے نو برس کا تھا جب منگنی ہوئی۔ جنگ موقوف ہوکر جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، اُسوقت میرے والد نے برگنڈی کے ذریعہ سے شرائط طے کیے۔ لیکن جیوفری، اب میں سن تمیز کو پہونچا ہوں اور چونکہ اس معاہدہ نے باوجودیکہ ہنگام فتح کیا گیا تھا، میرے اکثر حقوق سے مجھے محروم کر دیا ہے، لہذا اس شادی کو میں نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں میں اپنی خوشی سے نہیں آیا، اور میری مرضی کے خلاف یہ ناگوار کام ہوگا۔

جیوفری - بادشاہ رینی کی خاطر مجھے اسکا افسوس ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس شادی کے وعدہ سے وہ کس قدر خوش ہے، اور ہر وقت اسکا تذکرہ رہتا ہے۔

ٹرسٹان - وہ خوش ہوا کرے۔ کیا تم نے اُسکی لڑکی کو دیکھا ہے؟

جیوفری - نہیں۔ کسی بعید ہسپانوی خانقاہ میں اُسکی تعلیم و تربیت ہوئی ہے، اور اب وہ تم سے تعارف پیدا کرنے کے لیے بُلائی گئی ہے۔ لیکن مہربان من، ان باتوں میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم کہاں ہیں؟ اور زبردستی داخل ہوئے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ مقام بہت دلکش ہے سوال یہ ہے کہ کیا اسی آسانی سے ہم یہاں سے جا بھی سکتے ہیں؟

ٹرسٹان - اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں۔

جیوفری - پس یہ بھی دریافت ہونا چاہیے کہ اس محل کے باشندے کون ہیں؟ دروازہ پر خود حملہ کرو یا مجھے اجازت دو۔

ٹرسٹان - مجھی کو جانے دو۔ اگر یہاں کوئی عفریت برسرِ حکومت ہے، تو انصاف یہی چاہتا ہے کہ پہلے میں خطرہ کا مقابلہ کروں۔ کیونکہ میں ہی تھیں یہاں تمھارے خلاف نشانہ لے آیا۔ (دروازہ پر دستک دیتا ہے) کوئی نہیں آتا۔

جیوفری - دیکھو دروازہ کھلتا بھی ہے۔

ٹرسٹان - اندر سے بند ہے۔

جیوفری - اور زور دو، ممکن ہے کہ کھل جائے۔

ٹرسٹان - یوں ہی سہی۔ (دروازہ کھل جاتا ہے) ارے جیوفری! عجب شکل نظر آرہی ہے۔

جیوفری - کوئی ارواح ہے؟

ٹرسٹان - کیا! ارواح! شاید ایسا ہی ہو مگر ایسی روح جو خود روشن ہے، اور پیام نور پہونچاتی ہے۔

جیوفری - (اندر جھانک کر) ایک خوبصورت لڑکی ایک نفیس کوچ پر لیٹی ہے - بیشک وہ سو رہی ہے -

ٹرسٹان - سو رہی ہے اور اسکی دھیمی سانس میں خاموش ترنم ہے اور گلابی ہونٹوں پر خفیف تبسم گویا وہ ہماری حیرت کو خواب میں دیکھ رہی ہے -

جیوفری - ٹرسٹان، آؤ یہاں سے بھاگیں - یہ جادو بھرا نظارہ میری روح میں تاطم پیدا کر رہا ہے - اور اس قدر دلفریب ہے کہ سحر کے سوا کوئی اصلیت نہیں ہو سکتی - کیسی جادوگر کا محل ہے - آؤ چلیں - آؤ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ طلسمی سانپ ہم کو ڈس لینگے - ٹرسٹان تم ابھی سے مبہوت ہو گئے - زمین نے تمھارے قدم تھام لیے ہیں اور تمھاری آنکھوں کی گردش بند ہو گئی ہے تم اُسکی طرف گھور رہے ہو - آؤ ٹرسٹان آؤ -

ٹرسٹان - جیوفری آہستہ بولو - ممکن ہے کہ خفیف ترین جنبش اُسے بیدار کر دے - میرے نزدیک اس قابل پرستش سکوت کو توڑنا گناہ ہے جو اُسکی نیند نے ہر شے پر طاری کر دیا ہے -

جیوفری - آفریں! آفریں!

ٹرسٹان - خاموش! اب ایک لفظ بھی نہ بولو - یہ جگہ مقدس ہے - (دروازہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے) خفا نہ ہونا کہ دراندازی اور نامحرم نگاہوں نے تجھے تیری خواب گاہ میں دیکھا -

جیوفری - اُٹھو! میں تمھارے واسطے کانپ رہا ہوں - تم پر جادو چل گیا - یہ منظر محض دھوکہ کی ٹٹی ہے - میرے ساتھ آؤ -

ٹرسٹان - میں مجبور ہوں -

جیوفری - اچھا تو سنگ مرمر کے میل کی طرح زمین میں تو نہ گڑے جاؤ - مرد بنو - اگر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتے، تو اپنے دل ہی پر قابو رکھو، اور یہ دریافت کرو کہ یہ خوبصورت مخلوق کون ہے اسے جگاؤ!

ٹرسٹان - نہیں! یہ ایک گناہ عظیم ہوگا -

جیوفری - اگر تم نہیں جگاتے تو میں جگاتا ہوں - (داخل ہوتا ہے)

ٹرسٹان (اپنے آپ سے) لے لو! گستاخ شخص! اُسے پکار رہا ہے، اُسکا ہاتھ پکڑ لیا -

جیوفری (دوڑتا ہوا باہر نکلتا ہے) بھاگو! بھاگو! وہ جاگ نہیں سکتی - کسی سیاہ دل جادوگر کے منتروں نے اُسکے حواسوں کو جکڑ دیا ہے - آؤ! میں خوف کے مارے کانپ رہا ہوں - ہم ایسے مقدس مکان میں گستاخانہ داخل ہوئے - شاید اسکی سزا موت ہو!

ٹرسٹان مقدس مقام! یہ سچ ہے لیکن یہاں موت نہیں، بلکہ حیات تقسیم ہوتی ہے - خیر کچھ حرج نہیں! آؤ اس جگہ سے روانہ ہو جائیں جہاں ہمیں داخل نہ ہونا چاہیے تھا - وہ سو رہی ہے - اور یہ شیوہ مردانگی نہیں کہ ہم یہاں ٹھہرے رہیں!

جیوفری - آؤ چلیں -
ٹرسٹان - لیکن ٹھہرو، جاتے جاتے ایک نظر اور دیکھ لوں دم بھر کو اُسکے قریب جا کر اُسکے خط و خال کو اپنے حافظہ کی لوح پر نقش کر لوں (دیکھتا ہے)
جیوفری - دیکھو وہ جھکا اور اُسکے ہاتھ کو بوسہ دیا، کس طرح اُسکی طرف دیکھ رہا ہے - اے لو اُسکے گلے سے ایک فیتہ کھول لیا - خدا کا شکر ہے کہ آہا
ٹرسٹان (آتا ہے) اب اُسکا سراپا میرے دل پر نقش ہو گیا اور کبھی نہیں مٹ سکتا - آؤ چلیں، اور اس جادو سے پناہ مانگیں - تاہم میں نے عہد کیا ہے کہ یہاں دو بارہ آؤں گا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ میری قسم سنکر لطف آمیز طریقہ سے مسکرائی تھی اور خواب میں میرے ارادوں کو برکت دی تھی - دیکھو جیوفری میں یہ زیور لے آیا ہوں یہ کوئی قیمتی جواہر ہے جو اُسکے سینہ پر رکھا ہوا تھا جس طرح "حبشی" کا لڑکا مصر و شِ خواب "سال" کی عبا کا ایک ٹکڑا لے گیا تھا تاکہ یہ ثابت ہو کہ بادشاہ کی زندگی اُسکی مٹھی میں تھی اُسی طرح یہ جواہر اس بات کا شاہد ہوگا کہ میں یہاں آیا تھا اور اپنی زندگی اُس کی مٹھی میں دیکر چلا گیا درانحالیکہ وہ محو خواب تھی - آؤ - جیوفری!

[دونوں چور دروازہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں، اِدھر آبِ لنتھی مکان کے دروازہ پر آتی ہے]

(باقی)

اثر لکھنوی

غزل

شکوہ کرتے ہو کہ ملتا نہیں پیکاں میرا
تم نے کب دل سے نکالا کوئی ارماں میرا

وطن آوارہ ہوں کوئی نہیں پُرساں میرا
یاس سے تکتی ہے منہ شام غریباں میرا

اس قدر ہوں میں شہیدانِ وفا میں ممتاز
نام لکھا ہے سرِ گورِ غریباں میرا

کام آئی مرے وحشت میں مری جامہ دری
اپنے دامن میں لیے ہیں وہ گریباں میرا

قیدِ ہستی میں کبھی پاؤں کو پھیلا نہ سکے
وسعتِ دل سے بہت تنگ ہے زنداں میرا

پردہ داریِ شبِ ہجر جنوں میں بھی رہی
صبح کے بھیس میں نکلا ہے گریباں میرا

دل میں سو رنج یہاں، غنچہ و بس اک پھول کا غم
سامنا کرتی ہے کیا بلبلِ نالاں میرا

مجھ کو کیا اہلِ ہنر یاد کریں گے صفدر
بعد میرے جو چھپا بھی کبھی دیواں میرا

صفدر مرزا پوری

سفر حجاز کی مختصر روداد

(سلسلۂ ادنا مطبوعہ ۱۹۲۵ء)

پورا ایک سال گذرا کہ روداد کے اوراق نذر ناظرین نہیں ہو سکے، جسکے لیے نادم اور عذر خواہ ہوں۔ اور اب اس طرح تلافی کرنا چاہتا ہوں کہ اس شمارہ ہی میں روداد مکمل ہو جائے۔ اسکے بعد احباب کی خواہش ہوگی تو ساری روداد کتابی صورت میں انشاء اللہ علیحدہ شائع کردی جائیگی۔ ظفر الملک

ساتویں منزل

۸۔ جولائی کو مدینہ منورہ سے قافلہ روانہ ہوا تھا، جس راہ سے آنا ہوا تھا اُسکے بجائے قافلہ نے دوسری راہ اختیار کی۔ جب تک وادیٔ شہر کے قریب قافلہ رہا، دور سے مدینہ منورہ کی عمارتیں، مسجد نبوی کے مینار اور روضۂ اطہر کا سبز گنبد نظر فروز ہوتا رہا تا آنکہ مغرب آئی ایک ایک کرکے سب نشانات نظر سے اوجھل ہوگئے۔ جس راستہ پر قافلہ جا رہا تھا، ناہموار اور پتھریلا تھا، کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ مسلسل چڑھائی تھی شتر میں بیٹھنا زیادہ آرام دہ نہیں معلوم ہوا لیکن تازہ دم اونٹ ذرا تیز رفتاری سے چل رہے تھے اور ضعف کا اثر بھی بہت کچھ موجود تھا۔ لہذا نمازیں بھی شتر ہی پر پڑھی گئیں۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد طے ہوگئی اور عشا کے وقت بیر الماشی پہونچ گئے۔

دوشنبہ ۹ جولائی بیر الماشی کا پانی مدینہ منورہ کی طرح نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا، ہوا بھی یہاں خوب ٹھنڈی چل رہی تھی، جسکی وجہ سے تمازت آفتاب سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی۔ کنوئیں سے کچھ فاصلہ پر خرمے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ بازار بہت مختصر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عارضی طور پر محض قافلہ کی آمد سنکر کچھ دوکاندار جمع ہوگئے ہیں، کیونکہ سبزی ترکاری، ترپوز، خربوزہ اور گوشت کے سوا یہاں کچھ نہیں بکتا تھا۔ قریب ہی ایک قلعہ کی عمارت بنی ہوئی تھی جو بالکل اُجڑا ہوا سا تھا۔ دوپہر کو عصر کے قریب قافلہ یہاں سے اُٹھا۔ اب راستہ ہموار اور ریتیلا تھا۔ گو دونوں جانب قریب قریب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ عصر کے وقت نماز کے لیے اُترا،

عینک شندف پر رکھدی تھی اسلیے نماز کے بعد اپنے شندف کو نہ پہچان سکا اور آگے نکل گیا، دور تک چلتا رہا اور ہر شندف کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کمزور پہلے ہی سے تھا، دیر تک پیدل چلنے کی وجہ سے بہت خستہ ہوگیا۔ ایک بدوسے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرا اونٹ قافلہ کی جس ٹکڑی میں ہے وہ پیچھے ہے۔ لہذا وہیں رک گیا۔ کچھ دیر میں شندف ملا تو اس پر سوار ہوا۔ خشکی سے حد درجہ طبیعت نڈھال ہوگئی تھی۔ مگر اس راہ میں چوروں کی کثرت ہے اس لیے عادت کے خلاف قافلہ کے ساتھ مشعلیں روشن رہیں اور بدو برابر شور کرتے رہے اور ہوشیار رہو، جاگتے رہو، کا شور مچاتے رہے۔ جسکی وجہ سے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ تھوڑی ہی رات سے ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، جیسے جیسے رات بڑھتی گئی ہوا سرد ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ رضائی اوڑھنے پر بھی سردی معلوم ہو رہی تھی۔ اوڑھنے کا مزید سامان ساتھ نہ تھا اس لیے بہت تکلیف پہونچی۔ اور سردی سے بخار آگیا۔ قافلہ رات ہی میں غائر پہونچ گیا تھا، جلدی جلدی شندف اُتارا اور اوڑھ لپیٹ کر سو رہا۔ منزل پر کچھ سردی کم تھی۔ کرب کی وجہ سے نیند اچھی طرح نہیں آئی، لیکن تمام جسم میں درد تھا جسکی وجہ سے ہلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ نماز فجر کے بعد پھر سونے کے خیال سے لیٹا اور تقریباً ۹ بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

شنبہ ۱۰۔ جولائی — صبح کو کھانا پکانے کا وقت تھا، ضرورت تھی کہ حاجی شبراتی صاحب کو ضروری سامان بازار سے لاکر دیا جاتا، مگر میری خرابی طبیعت پر لحاظ کرکے اُن غریب نے سارا کام خود ہی کرلیا۔ اور جب کھانا تیار کرچکے تو مجھے بھی اُٹھایا۔ میں نے پہلے تو تھوڑا سا خمیرہ بنفشہ کھایا۔ اسکے کچھ دیر بعد کھانا، مگر منہ کا مزا خراب تھا اس لیے اچھی طرح کھانا نہ کھایا گیا۔

بیر الماشی پر تو کچھ دینا نہیں پڑا تھا، مگر یہاں ۵ قرش چوکیداری کے دینا پڑے۔ غائر سے روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ سے پیدل اُترنا پڑے گا، کیونکہ راستہ بہت پیچیدہ اور خطرناک ہے، اونٹ سواریاں لیکر نہیں چل سکتے۔ میں بہت نحیف ہو رہا تھا اسلیے مجھے اس میں تامل ہوا۔ مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ عورتیں تک شندفوں پر نہیں بٹھائی گئیں۔ آگے آگے اونٹ اور پیچھے پیچھے حجاج۔ تھوڑی راہ طے ہوئی تھی کہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ لاچار ہوکر حمال نے ایک خالی اونٹ پر مجھے بٹھا دیا۔ مگر تھوڑی ہی دور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک موڑ پر ایک اونٹ گرا پڑا تھا، جسے بدوؤں نے وہیں ذبح کرڈالا تاکہ راستہ سے لاش ہٹا کر نیچے کھڈ میں ڈال دیں۔ شتربان نے یہ حالت دیکھا کر مجھے اُتر پڑنے کی خواہش کی، مجبوراً مجکو پھر اُترنا پڑا۔ اونٹ پر چڑھتے وقت

میں نے اپنی سلیپر حاجی شبراتی کو دیدی تھی، کیونکہ اُنکا جوتہ شنذف پر رہ گیا تھا اور ننگے پاؤں چلنے میں اُنھیں تکلیف ہو رہی تھی، اب خود مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمازتِ آفتاب سے پتھریلی زمین تپ رہی تھی، ..... تلوے بھُنے جاتے تھے، مگر مجبوری تھی۔ حاجی شبراتی شنذف کے ہمراہ آگے جا چکے تھے۔ ہزار خرابی و تکلیف یہ راستہ طے ہوا۔ اُترا ختم ہو جانے اور ہموار راستہ آجانے کے بعد بھی کسی سبب سے اونٹ نہیں رُکے۔ یہاں تک کہ کچھ دور آگے چل کر میں ماندگی کے باعث گر پڑا۔ میری بیچارگی کو دیکھ کر ایک بدو کو رحم آیا اور اُس نے میرے جمال سے جا کر اطلاع کی تب کہیں شنذف پر سوار ہونے کی نوبت آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں منزل پر پہونچ گئے۔ خستگی کی وجہ سے رات بھر غفلت کی نیند آئی۔

چہارشنبہ ۱۱۔ جولائی — بیرالاشہب میں قافلہ پورے چوبیس گھنٹے رہا۔ پژمردگی اور کمزوری کے باعث میں تو دن بھر شنذف کی آڑ میں لیٹا رہا۔ بیچارے حاجی شبراتی سارا کام کرتے رہے۔ پانی یہاں بھی نہایت اچھا تھا۔ اگرچہ فائر کی سی سردی نہ تھی۔ عصر کے وقت قافلہ روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی مقام پر شب میں قافلہ بہت دیر تک رُکا رہا۔ میں شنذف سے اُترا نہیں مگر لیٹے لیٹے بدوؤں سے دریافت کیا کہ قافلہ کیوں رُکا کھڑا ہے۔ کوئی معقول جواب تو نہ ملا، لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ جن قبائل نے پہلے راستہ کا ٹیکس وصول کیا تھا اُنھیں میں سے کسی نے روکا ہوگا۔ اور جب اُنھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ جاتے وقت معقول رقوم دی جا چکی ہیں، تب قافلہ کو آگے بڑھنے دیا۔ راستہ میں رُکے رہنے کی وجہ سے خواہ مخواہ منزل کھوٹی ہوئی اور بیر حسانی پہونچتے پہونچتے آفتاب نکل آیا تھا۔

پنجشنبہ ۱۲ جولائی — بیر حسانی سے مکہ معظمہ تک اُسی راہ سے واپسی ہوئی جس راستہ سے قافلہ آیا تھا،

تا پنجشنبہ ۱۹۔ جولائی — اور جسے سلطانی راستہ کہا جاتا ہے۔ جاتے وقت گرمی بہت تھی۔ مگر واپسی میں گرمی بہت کم رہی اور ٹھنڈی ہوائیں برابر چلتی رہیں جس سے اندازہ ہوا کہ موسم میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ ورنہ احرام بند ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی۔ طبیعت کی کمزوری کے باعث میں عموماً منزلوں پر لیٹا رہتا، اور سارا کام کاج حاجی شبراتی کیا کرتے۔ ضعف کے دفعیہ کی غرض سے میں نے کھچڑی کھانا موقوف کر دی تھی، بلکہ ہر منزل پر گوشت لیکر شوربہ تیار کر آتا تھا۔ شوربہ کے مسلسل استعمال سے ضعف میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ راستہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مشورہ میں سابقہ تجربہ کے خلاف میٹھے پانی کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر

برساتی پانی جمع ہے وہیں سے مشکیزے بھر لاتے ہیں - اس پانی کی قیمت ضرورزائد تھی -

مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت راستہ جس قدر دیر میں دشواری سے طے ہوا تھا، واپسی میں اُسی قدر جلد اور آسانی سے تمام ہوا - موسم بھی نسبتاً خوشگوار تھا، اور باوجود یکہ حاجی شبراتی کے سوا کوئی اور رفیق سفر نہ تھا، طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہونچی - ہمارا جمال محسن بھی بہت شریف اور نیک تھا، اگرچہ اُسکا نوجوان لڑکا کبھی کبھی تقاضائے غرور بنائے شرارت سبب پریشانی سمجھا جاتا تھا، لیکن جہاں باپ کو بیٹے کی غفلت یا شرارت کا حال معلوم ہوتا وہ بیچارہ فوراً رفع شکایت کی کوشش کرتا - مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد جب اپنے مقام پر اطمینان سے بیٹھ کر اُس سامان کی جانچ کی جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی شبراتی کے کچھ کپڑے غائب ہیں - جمال اپنا بقیہ کرایہ لینے کے لیے آیا تو اُس سے کہا گیا، اور اگرچہ اُسکو اور اُسکے لڑکے کو کپڑوں کی تلاش میں بہت کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور سوائے ایک کے سب چیزیں مل بھی گئیں، پھر بھی وہ غریب اس بات پر نادم و متاسف رہا کہ ایک کپڑا ضایع ہوگیا - اور جب اُسکو بقیہ اُجرت دی گئی تو بہت خوش ہوا، اور مزید بخشش کا قطعاً کوئی مطالبہ نہیں کیا - تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کی وحشت اور تیزی شہر میں داخل ہونے کے بعد بہت کچھ قابو میں آجاتی ہے - جمال کا لڑکا جو راہ میں بہت شوخ و شریر نظر آتا تھا، مکہ معظمہ پہونچکر علم و اطاعت شعاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا - اس تبدیلی کا باعث غالباً حکومت کے تعزیری قوانین قرار دیے جا سکتے ہیں، جنکی وجہ سے ذرا سی شکایت پر فوراً گرفتاری ہو جاتی ہے -

آٹھویں منزل

۱۹ - جولائی کو ظہر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - احباب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب قوافل مدینہ منورہ سے واپس آئے اور شریف صاحب تک شکایت پہونچی کہ راستہ میں حجاج سے بہت روپیہ بدوقبائل نے لیا ہے، تو اُنھوں نے اکثر حجاج کو بُلا کر نصف رقم واپس دیدی - میرے لیے بھی لوطہ مجیدیاں وصول کرلی گئی تھیں جو شفقتی میر عبدالعزیز صاحب سے مل گئیں -

مبدالقادر مطوف کے بیٹے حسن سکندر بھی اس اثنا میں آگئے تھے اُن سے معلوم ہوا کہ چچی صاحبہ، اُنکی صاحبزادی اور عزیزی انور علی سلمہ خلف اصغر نشی اظہر علی صاحب مرحوم و مغفور بھی آگئے ہیں - اور حرم شریف کے قریب ہی مقیم ہیں - یہ سب لوگ میرے ہمراہ آنیوالے تھے، مگر

بعض اسباب سے رُک گئے تھے اور عید بعد وطن سے روانہ ہوئے - عصر کے بعد میں ان لوگوں سے جا کر ملا، اور شام کو بعد مغرب طواف وسعی سے فراغت کر کے سر کے بال ترشوائے اور احرام اُتارا۔

دوسرے روز جناب مولانا محمد سعید صاحب کے یہاں جا کر ہندوستان کی آئی ہوئی ڈاک وصول کی - بعد نماز جمعہ حکیم موسیٰ سے مل کر کچھ دوا لی، کیونکہ بخار اگرچہ اب نہ تھا مگر نزلہ کا زور باقی تھا۔ پھر عبد الستار عبد الجبار کی کوٹھی پر جا کر حاجی شیرانی کو اُس تحریری حوالہ کی بنا پر جو وہ مدینہ منورہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے روپیہ دلایا - اور گھر آ کر اخبار ہمدم کے پرچے اور الناظر پڑھتا رہا - خطوط لکھنے کے ارادہ سے سویرے ہی ناشتہ وغیرہ سے فراغت کر کے بیٹھا تھا کہ حاجی برہان الدین صاحب تاجر ادویہ لکھنؤ آ گئے، جو معہ نذیر حسین صاحب تاجر پارچہ اور مولوی عبد الرشید صاحب فرنگی محلی کے قریب کے ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے - اُنکی میعت میں حکیم موسیٰ کے یہاں گیا اور اُن سے کچھ اور دوا لی۔ اور وہاں سے رباط بھوپال جا کر الطاف حسین صاحب سے ملا، اور علی میاں صاحب کا خط جو مدینہ منورہ سے لایا تھا، اُنکو دیا - پھر محی صاحب کے یہاں حاضری دیتا ہوا مکان واپس آیا، اور بعد نماز ظہر خطوط لکھے - شام کو بازار جا کر مجیدیاں وغیرہ بھنائیں، کیونکہ دوسرے دن حج کے لیے منا جانا تھا -

مکہ معظمہ میں رویت کے مشتبہ رہنے کی وجہ سے تعین تاریخ میں دقت پیش آئی، اور جب بالآخر یہ طے پا گیا کہ ۲۳ - جولائی دوشنبہ کو حج ہوگا، تو اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اطمینان سے پورا ایک دن منیٰ میں بسر کر سکیں -

---

رسید کتب

۱ - وقار حیات	آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ	قیمت	۵ر
۲ - التربیۃ الاستقلالیہ	ایضاً	"	۶ر
۳ - شعر الہند حصہ دوم	دار المصنفین اعظم گڈھ	"	۱۱ر
۴ - آئینۂ حقیقت نما	مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	"	۶ر
۵ - مثنوی مطلع الانوار (فارسی) -	مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ	"	۳ر
۶ - بدھ اور اُسکا مت	رائے بہادر پنڈت شیونرائن بشیم ایڈوکیٹ لاہور		
۷ - رحمۃ للعالمین	مولوی حبیب حسن ردولوی	"	۸ر
۸ - بچوں کا قاعدہ	مولوی سجاد مرزا ایم اے (کنٹب)	"	۴ر

تنقیدیں

تاریخ نجد۔ از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری۔ سلطان ابن سعود نے حجاز پر جب سے چڑھائی کی ہے لوگوں کو نجد اور اہل نجد کے حالات سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اسی عام دلچسپی کے لحاظ سے یہ نہایت بامو قع کتاب شایع ہوئی ہے جسکے مطالعہ سے جزیرۃ العرب کے اس نہایت اہم جزو کے ضروری حالات سے لوگوں کو آگاہی ہو جائے گی۔ اور عام طور پر جو بے سر و پا باتیں نجدیوں یا وہابیوں کے عقائد سے متعلق مخالفین نے مشہور کر دی ہیں اُنکا ازالہ ہو جائے گا۔ اس مختصر تاریخ میں نجد کے مختلف حصوں کے جغرافی حالات اور اہل نجد کی عام معاشرت لکھنے کے بعد وہابیوں کی مذہبی تحریک اور آل سعود کے حکمرانوں کے مختصر کارنامے درج کیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہابی فرقہ کے عقائد و خیالات ایسے خطرناک نہیں ہیں جیسے کہ عام طور پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔ بلکہ وہابی عام اہل سنت کی طرح ائمہ اربعہؒ کو مانتے اور جزئیات فقہ میں امام احمد حنبلؒ کے اتباع کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ خود محمد بن عبدالوہاب بانی فرقۂ وہابیہ نے جو خط عراق کے ایک عالم عبدالرحمٰن بن عبداللہ سویدی بغدادی کے نام لکھا ہے اُس میں اپنے عقائد کو یوں واضح کیا ہے:۔

"بحمداللہ میں متبع سلف ہوں نہ کہ مبتدع۔ میرا دین وہی ہے جو اہل سنت و جماعت یعنی سلف صالح مثلاً ائمہ اربعہ اور اُنکے تابعین کا تھا۔ میں نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔ اولیاء و صلحاء مدفون کے پکارنے اور اُن سے امداد مانگنے کو منع کیا، اُنکی قبروں پر نذر و نیاز چڑھانے اور سجدہ وغیرہ کرنے سے روکا، کیونکہ یہ سب حقوق اللہ کے ہیں، جو نہ کسی نبی مرسل کو حاصل ہیں نہ کسی فرشتہ مقرب کو۔

یہی وہ تعلیم ہے جو تمام انبیاء اول سے آخر تک دیتے چلے آئے ہیں اور اسی پر اہل سنت و جماعت قائم ہیں ..... میں نے اپنے متبعین پر لازم کیا ہے کہ وہ نماز با جماعت پڑھیں، زکوٰۃ وغیرہ فرایض ادا کریں، منہیات و منکرات، ریا کاری و شراب خواری وغیرہ سے بچیں۔" (ص ۵۵-۵۶)

بعض روساء کو اُن سے اختلاف تھا اور اُنھوں نے عوام کو اُنکے خلاف بھڑکانے کے لیے طرح طرح کی باتیں مشہور کی تھیں جنکا ذکر اسی خط میں یوں کیا گیا ہے:۔

"منجملہ ان کے (افترا پردازیوں کے) ایک یہ بھی ہے، جو آپ نے اپنے خط میں لکھی ہے کہ میں سوائے اپنے متبعین کے سب کو کافر کہتا ہوں اور انکے نکاحوں کو صحیح نہیں سمجھتا۔ تعجب ہے کہ کیونکر کسی عاقل کے دماغ میں یہ بات سما سکتی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کہے گا۔ میں اس قول سے اللہ کو شاہد گردان کر اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ تو وہی کہے گا جسکی عقل مختل ہو۔ اہل غرض سے اللہ کی پناہ۔

ایسے ہی لوگوں نے مجھپر یہ تہمت لگائی کہ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے قدرت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کے قبہ کو گرا دیتا۔ دلائل الخیرات کا جلانا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے منع کرنا بھی میری طرف منسوب کرنا خواہ کسی لفظ میں ہو سراسر کذب و بہتان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تکفیر کی بابت جو آپ نے ذکر کیا ہے، تو میں صرف اُس شخص کو کافر سمجھتا ہوں جو جان بوجھ کر دین حق سے روگردانی کرے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لعن کرے یا انکی تعلیمات کی طرف آنے سے لوگوں کو روکے۔ یہی لوگ میرے نزدیک کافر ہیں لیکن امت کا بڑا حصہ بحمداللہ ایسا نہیں ہے۔" (ص ۵۵ و ۵۶)

ایک دوسرے خط سے جو علماء قصیم کے نام ہے، شیخ کے عقائد کی مزید صراحت یوں ہوتی ہے :-

"میں اللہ کو شاہد قرار دیکر کہتا ہوں کہ میرا وہی عقیدہ ہے جو فرقۂ ناجیہ اہل سنت و جماعت کا ہے یعنی اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ بعث بعد الموت اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔ صفات الٰہیہ کو بلا تحریف و تعطیل کے اُسی طرح مانتا ہوں جس طرح وہ کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں۔ نہ انکی نفی کرتا ہوں، نہ اُنکے الفاظ میں تحریف، اور نہ انکو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہوں۔

* * * * * * * *

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہی اولین شافع ہوں گے اور اسکے منکر کو گمراہ و بدعتی سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ شفاعت بعد اذن و رضائے الٰہی ہوگی اور کوئی شفاعت مشرکین کے کام نہ آئے گی ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتا ہوں، اور کسی شخص کو اُسوقت تک مومن نہیں سمجھتا جب تک کہ اُنکی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق، پھر عمر فاروق، پھر عثمان

ذی النورین، پھر علی مرتضیٰ، پھر بقیہ عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم کو سمجھتا ہوں۔ انکے بعد اہل بدر اور پھر تمام صحابہ کو .....

ابن سحیم نے میرے اوپر جو الزامات لگائے ہیں، مثلاً یہ کہ میں مذاہب اربعہ کی کتب کو باطل سمجھتا ہوں، یا یہ کہ چھ سو برس سے امت اسلامیہ میرے نزدیک گمراہی میں ہے، یا میں مجتہد یا تقلید سے خارج ہوں، یا علماء کے اختلاف کو بجائے رحمت کے نقمت کہتا ہوں، یا جو لوگ صالحین سے توسل کریں انکو یا بصیری (صاحب قصیدۂ بردہ) کو "یا اکرام الخلق" والے شعر کی وجہ سے کافر سمجھتا ہوں، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر یا اولاد کے لیے والدین کی قبروں کی زیارت کو حرام جانتا ہوں، یا غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے والے یا ابن الفارض اور ابن عربی کو کافر قرار دیتا ہوں، یا دلائل الخیرات کو جلا دیتا ہوں اور روض الریاحین کو روض الشیاطین کہتا ہوں، ان سب کا جواب صرف یہ ہے کہ سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

رہی یہ بات کہ میں کہتا ہوں کہ کسی شخص کا اسلام کامل نہیں ہو سکتا جبتک کہ وہ کلمۂ طیبہ کے معنی نہ سمجھے، یا تقرب لغیر اللہ کے لیے نذر ماننا کفر اور ذبیحہ حرام ہے۔ یہ مسائل حق ہیں میں انکا قائل ہوں اور ان پر کتاب و سنت سے پختہ دلائل رکھتا ہوں۔" (ص ۵۶ و ۵۷)

اقتباسات بالا سے عیاں ہو جاتا ہے کہ جو عقائد عام طور پر وہابیوں سے منسوب کیے جاتے ہیں، یہ درحقیقت وہ باتیں ہیں جو انکے دشمنوں اور مخالفوں نے انکے زور و قوت کو گھٹانے کے لیے مشہور کر دی تھیں۔ ورنہ فی الاصل وہ اہل حدیث یا غیر مقلدوں کے مانند بھی دین میں مشدد نہیں۔ حالانکہ اس زمانہ میں جو خرابیاں رائج ہیں انکے لحاظ سے اسی قسم کے تشدد کی ضرورت ہے۔

نجد کی حکومت مختلف امراء کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۱۵۹ھ سے ۱۲۳۴ھ تک آل سعود قابض رہے، اسکے بعد سے ۱۳۱۹ھ تک آل رشید متصرف رہے۔ ۱۳۲۰ھ سے موجودہ سلطان عبد العزیز ابن سعود حکمراں ہیں جنھوں نے رفتہ رفتہ تمام قرب و جوار کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا، تا آنکہ اب خاص عرب میں امام یمن کے سوا انکا کوئی حریف نہیں رہا۔

اہل نجد کی عام معاشرت (ص ۱۳۱ لغایۃ ص ۱۵۱) اور حکومت نجد کے حالات (ص ۱۹ لغایۃ ص ۲۹) کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس چودھویں صدی میں اگر کسی کو اسلام کے ابتدائی عہد کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ نجد میں جا کر دیکھے۔

کتاب بہت مختصر ہے، ابتدائی تاریخ بالکل نظر انداز کر دی گئی ہے اور ترتیب کے لحاظ سے بھی تاریخ کے بجائے نجد اور نجدیوں کے متعلق چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں فرقہ وہابیہ کو

پہلی مرتبہ صورت میں پیش کرنے کی نمایاں کوشش کی گئی ہے۔ اور اسی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کتابت وطباعت متوسط درجہ کی۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ ظ

فغانِ آرزو جناب انورحسین صاحب آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان ہے، جو چھوٹی تقطیع کے ۲۹۵ صفحات پر ادبی پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ شروع میں وحشی اکبر صاحب اخگر کا ایک مختصر مقدمہ ہے اسکے بعد آرزو صاحب کی تصویر ہے۔ پھر اصل دیوان شروع ہوتا ہے آخر میں "چہل چراغ" کے عنوان سے آپ کی چالیس رباعیات ہیں اور "دل صد پارہ" کے عنوان سے متفرق اشعار۔ آرزو صاحب کا شمار لکھنؤ کے اچھا کہنے والوں میں ہوتا ہے، اور اُن کی پاک سلیس اور شیریں زبان پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ زبان لکھنے کا دعوے اکثر کیا گیا ہے، لیکن عام بازاری محاورات کو نظم کر دینا زبان دانی نہیں ہے۔ آرزو صاحب کی زبان ان آلایشوں سے پاک ہے۔ اُنکی زبان کی سادگی، گھلاوٹ اور نرمی سے لکھنؤ کا نام روشن ہے۔

بحیثیت مجموعی دیوان بہت امید افزا ہے، گو یہ سچ ہے کہ زیادہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جو اوسط درجہ کے ہیں، اور بلند وعمدہ اشعار کی تعداد کم ہے، لیکن جو اشعار عمدہ ہیں وہ بہت عمدہ ہیں۔ جس طرح علیگڈھ کالج اپنی پچاس سالہ حیات میں اپنی طرز معاشرت اور ایک مخصوص شان بہت کم بدل سکا، اسی طرح لکھنؤ اسکول کی شاعری اپنے قدیم رنگ پر قائم ہے اور خارجی اثرات سے بہت کم متاثر ہوئی ہے۔ آرزو صاحب کے یہاں بھی یہ لکھنؤ کا رنگ شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے گو جہاں کہیں اُنھوں نے پامال اور فرسودہ مضامین لکھے ہیں، اپنے انداز بیان اور ندرت ادا سے اُنھیں عام سطح سے اُٹھا لیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

چارہ گر فکر دوا چھوڑ کے ہیں محو دعا ۔۔۔ ہو گیا حال کچھ ایسا کہ گماں اور ہے اب
گرتے ہی اشک میں بیدل سے ہو گئے اہم ۔۔۔ یہ اور کوئی شے تھی قطرہ نہ تھا لہو کا

بعض اشعار بہت ہی اچھے ہیں:

کیا حالتِ بسمل پہ ہو گشت بہ دندان ۔۔۔ اب کاہے کو ہوگا اثر تیر ادا یاد
اپنا جو بنانا ہے تو او دشمنِ ایماں ۔۔۔ اتنا بھی نہ کر ظلم کہ آجائے خدا یاد
ہاں ہاں یہی ہے شانِ حجاب اے کلیم طور ۔۔۔ پردے اُٹھیں ہزار مگر سامنا نہ ہو
کہتے کہتے حالِ ضبطِ عشق آنسو گر پڑے ۔۔۔ ہائے وہ دعوے کہ بے تردید خود باطل ہوا
فروغِ حسن کی بنیاد بھی ہے آتشِ عشق ۔۔۔ کہ شمع سوختہ تن ہو کے جاں گداز ہوئی

انتہائی ندرتِ بیان کا ذائقہ چکھنا ہو، تو ذیل کے اشعار سے دل بہلائیے:۔

بیٹھے بیٹھے اُسکی باتیں یاد آنا خود بخود دل ہی دل میں سوچنا، پھر مسکرانا خود بخود
دیکھ اس قدر لپٹ کے نہ چل لے ہوائے آب دامن سے پھول باغِ تمنا کے گر پڑے

ذیل کے اشعار کی مخصوص لطافت اور ایک خاص طرح کی ندرت آپ کو کہیں اور نہ ملے گی:-

بنا لیں سوزِ نہاں کو اُبھار کر شعلہ بیانِ حال کو ہے اک زبان کی حاجت
چھٹے جو تم سے زمانے کو ہم نے یوں چھوڑا کہ چاند تک نہیں دیکھا کسی مہینے سے

یہ سنتے ہی جھلا کر بار تھا وہ پردے کے کچھ ہے بھی پس پردہ یا پردا ہی پردا ہے
ادا سے بل تو دیوں پر بلانا بجا کہ کے مسکرانا شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے انکو بھی کچھ گلا ہے

یہ شاعری نہیں، معصوری ہے، اعجاز ہے۔ آخری مصرعہ کا طرزِ ادا کس قدر دلفریب ہے۔

آرزو صاحب کو پڑی بحروں میں بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے، غالباً انکی خصوصیت اور تمام خصوصیات پر بھاری ہے، ملاحظہ ہو:-

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ، جو کہنا نہ تھا وہ کہہ جانا
ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا مانندِ چراغ اک سوختہ تن گہ ہنستا تھا گہ روتا تھا
وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا تھیں آنکھیں بند زمانے کی یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا

"یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا" یہ اکثر بلاغت کی جان ہے۔

پوچھو نہ بس اب وہ رازِ نہاں مت سے جو دلیں یہاں کہنے میں اُلجھ جاتی ہے زباں لکھنے میں قلم تھراتا ہے
حیراں ہو نہ لے قاصدِ اسپرِ پیام ہے شکووں کا دفتر کہدے مری جانب سے جا کر جی اب تو بہت گھبراتا ہے

"جی اب تو بہت گھبراتا ہے" اس جانِ بلاغت فقرہ میں بلاشبہ "شکووں کا دفتر" پنہاں ہے، رموزِ محبت کی صحیح نکتہ دانی آرزو پر ختم ہے!

ذیل کے اشعار میں اُستادِ سخن میر کا انداز ملاحظہ فرمائیے:-

سامان کیے دن بھر میں ہم اور چھوڑ کے وقتِ شام چلے سنسان ہے گھر سونا بستر، دکھ جھیل کے بے آرام چلے
گھر کیا ہے مسافر خانہ ہے گردش میں مدام زمانہ ہے اک روز یہاں سے جانا ہے یا صبح چلے یا شام چلے

ان محاسن کے باوجود "فغانِ آرزو" کا تاریک رخ چھپایا نہیں جا سکتا۔ افسوس ہے اب بھی ایسے اشعار کہنے والے موجود ہیں:-

سلے کر رہا ہوں راہِ عدم لیکے اُلٹی سانس جاتا اُسی طرف ہے جدھر کی ہوا نہ ہو

ذیل کے اشعار پڑھ کر کسی بدمست نیم برہنہ شاہد بازاری کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے:-

بھری جوانی اُمنگ کے دن لڑیں نگاہیں کہ فیصلہ ہے بخیر انجام ہو الٰہی یہ دل کا پہلا معاملہ ہے
بادۂ ہوش کُشتہ ساغر تمکیں توڑا ہے تم نے یہ کس مست کی انگڑائی نے

یہ شعر کس قدر یہ مزہ ثقیل اور کمزور ہے :-

جان چھوڑ اب اے گراں جانی خدا کو اسلے جینے جی مُردہ کی بو آنے لگی بیمار سے

لیکن جیسا ہم اوپر کہ آئے ہیں ایسے اشعار کی تعداد کم ہے اور باوجود تلاش ہمیں بدرنگ و بدنما اشعار اس سے زیادہ نہ مل سکے - کتاب کی قیمت ۴ر اور المناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

گلشن حیات - مولفہ معین الدین احمد قیس رضوی - مولانا شاد عظیم آبادی مُلک کے مسلم الثبوت اُستادوں میں ہیں، جن کی تمام زندگی اُردو علم و ادب کی خدمت میں گذری ہے، اور جو اپنی کبر سالی کے باوجود اب تک ملک کے جرائد کو اپنے پُر لطف اور اُستادانہ کلام سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔ صوبہ بہار میں اُردو کی ترویج کو اس زمانہ میں جس قدر تقویت پہونچی اُس میں بہت بڑا حصہ آپ ہی کا ہے، سید معین الدین احمد قیس نے یہ کتاب آپکے اور آپ کے شاگردوں کے حالات پر لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت شاد کی سوانح نگاری اور اُنکے کلام کی تنقید کا فرض باحسن وجوہ ادا نہیں کیا واقعات کی صحت اور اُنکے جمع کرنے میں محنت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، کم از کم یہ کتاب اس زمانہ کی تو معلوم نہیں ہوتی - مولف صاحب شاید بھول گئے کہ وہ حضرت شاد کی سوانحعمری لکھ رہے ہیں، نہ کہ کوئی ناول یا کہانیوں کی کتاب، اور یہ تو اُن کا خیال ہی خیال ہے کہ کتاب ہذا اپنے موضوع و مبحث کا پہلا خاکہ ہے۔

پہلے مولف نے سر فخر الدین صاحب وزیر تعلیمات بہار کے نام نامی کے ساتھ اس کتاب کو معنون کیا ہے، اسکے بعد "عرض حال" میں بھولے پن سے "پبلک اور گورنمنٹ" کی ادب نوازی کے متعلق بہت خوش فہمی سے کام لیکر کتاب کی قدر افزائی کی التجا کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز اس دلچسپ خطیبانہ عبارت سے ہوتا ہے :-

"زبان و ملن کے شیدائیو! نظم سخن کے نکتہ شناسو!! میں تو کوئی ایسا سخنور شیوہ زباں ہی ہوں کہ کسی صنف کمال کی طرف منسوب کیا جا سکوں؟ (!) اور نہ کوئی اعلیٰ درجہ کا ادیب و انشا پرداز ہوں کہ محفل ادبائے روزگار میں بار پا سکوں، اکسکجج زباں، ژولیدہ بیاں کی تحریر میں کشش و دل آویزی کہاں، کہ آپ جیسے سنجیدہ خیالوں اور سخن شناسوں کو اپنی طرف کھینچ لے سکے، ہیہات جو! ....."

کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا "فسانہ عجائب" اور "باغ و بہار" کی سرزمین کی سیر ہو رہی ہے :-

۱- اس حکایت کا گو حرف حرف ہا کارگر اس مختصر کتاب میں اُسکا بیان فیلے دشوار ہے ؎

جو سنے اُسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے — یہ فسانہ زلفِ دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

۲- تو پھر اس کہانی کا سنانا ؎ سورج کو چراغ ہے دکھانا ۔

۳- وہ صحت سے عاری اور غلط العوام کے ساتھ بازاری ہے ۔

ایک جگہ مولف نے حضرت شاد کو اس جملہ کا مرتکب بتایا ہے "شعر کی معیار یہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو" دورِ حاضر میں شعر کی قحط سالی (!) کا دوسری جگہوں رونا رویا ہے اب تو یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ شاعر کا وجود صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح اُڑ رہا ہے"۔

حضرت شاد "اس دورِ سخن کے میر" تو تھے لیکن یہ خبر شاید ادبی حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی کہ وہ مرثیہ گوئی میں مواف کے نزدیک میر انیس کے ہم پایہ ہیں، اور ایک بمثیل ناولسٹ کی حیثیت سے انکی انگلستان و فرانس دونوں ملکوں کے اخباروں نے بجد تعریفیں لکھیں"۔

شاگردوں کے ذکر میں مؤلف نے کسی کو حتی کہ حضرت یاس عظیم آبادی کو بھی اس قابل نہ سمجھا کہ ایک یا ڈیڑھ صفحہ سے زائد جگہ دیتے، ہاں اپنے حالات کے لکھنے میں سات صفحے سے زائد صرف کرکے اس شکایت کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

حضرت شاد کے انتخاب کلام سے جو کتاب کے آخر میں درج ہے ذیل کے اشعار بہت لطیف ہیں:-

شب کو مری چشمِ حسرت کا سب درد و دکھ اُسنے کہہ جانا — دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے انکار کر جانا

مانا کہ فضا موسم سعی ملنے کی ہیں اک آس تو ہے — دیدار تو ہولے دیدۂ تر بہنا ہے اگر تو بہہ جانا

شب کو وہ ہتھیلی سے اُنکا شرما کے چھپانا آنکھوں کو — پرچھی کا ادا کی چل جانا، اُس تیر نگہ کا رہ جانا

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہیے — منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں — حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

انھیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانوں میں رندوں کو — انھیں شعروں کو سکیش نغمۂ مستانہ کہتے ہیں

بسے ہیں کیسے کیسے ذی شرف گورِ غریباں میں — بڑے بیدرد ہیں بستی کو جو ویرانہ کہتے ہیں

ہوا در در لیے پھرتی ہے اب تو میری مٹی کو — یہ ہے وہ خاک جو اکدن ترے قدموں پہ ڈالی تھی

کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی ہے - ۱۶۴ صفحات - حضرت مولف سے لودی کٹرہ، پٹنہ کے پتہ پر بہم میں مل سکتی ہے ۔

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف رسالہ معارف، اعظم گڈھ کے جولائی نمبر میں فلسفۂ اخلاق" کے زیر تحت مسئلہ جبر و قدر پر نٹشے کے حسب ذیل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں :۔

"ہم اپنے ناکافی و ناقص تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر "افعال" کے مابین صاف فاصل قائم کرکے ایک کو دوسرے سے ممتاز کر لیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ افعال انسانی واقعات کا کوئی غیر مربوط سلسلہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک چشمۂ رواں کی طرح مسلسل اور مربوط ہیں، موجودہ افعال کی قدر و قیمت سابق اور آیندہ افعال سے الگ ہو کر نہیں کی جا سکتی یعنی قدرت و اختیار کے قائل قبل سے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ افعال انسانی کی کوئی اجتماعی حیثیت نہیں ہوتی اور ہر فعل دوسرے فعل سے علحدہ اور ممتاز ہوتا ہے، اور نٹشے کہتا ہے کہ یہ تسلیم کرنا ہی سرے سے غلط ہے، لہذا کسی فعل کی ذمہ داری اُسکے فاعل پر عائد کرنا اور سابق روایات اور ماحول کی خصوصیات کو نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا"

اس سلسلہ میں علمائے اسلام کا اختلاف آرا ملاحظہ ہو :۔

"علمائے اسلام بھی "مسئلۂ جبر و قدر" میں مختلف الرائے ہیں۔ جبریہ قائل ہیں کہ انسان مجبور اور بے بس ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے، وہ صرف خدا کی قوت و قدرت سے ہوتا ہے، انسانی ہاتھ کو کوئی دخل نہیں ہے، معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ انسان کو اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے، اور اسی پر اچھے کاموں کے واسطے ثواب اور بُرے کاموں کے واسطے عذاب ملتا ہے، اشعریہ نے "جبر و قدر" کے مابین ایک نئی راہ نکالی، یعنی انسان کو "کسب" کی قوت حاصل ہے، لیکن یہ قوت اور اس قوت کے نتائج دونوں، خدا کی مخلوق ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تینوں اقوال میں کوئی نہ کوئی مصلحت نظر آئے گی، جبریہ نے خداوند کریم کی عظمت و جلال کو مدنظر رکھ کر اُسے تمام جزو و کل کا خود ہی خالق قرار دیا۔ معتزلہ کی نظر حکمت پر پڑی، اور انھوں نے افعال کی نسبت بندوں کی طرف کر دی تاکہ خدائے پاک کی ذات محتج الصفات افعال قبیحہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ اشعریہ نے ان دونوں خیالوں کو مجتمع کرکے خدائے عزوجل کو حکمت و عظمت دونوں کا مجموعہ قرار دیا"

دوسرا مسئلہ "امتیاز خیر و شر" ہے، نٹشے کا خیال ہے کہ :۔

"ضمیر یا فطرت کسی فعل کو اچھا یا بُرا صرف اسلیے کہتی ہے، کہ زمانہ اسکو ایسا ہی کہتا آیا ہے، ضمیر و فطرت کا کام صرف نقل کرنا ہے، اختراع کرنا نہیں۔ نٹشے کے نزدیک ہر شے میں کوئی نہ کوئی خاصیت پنہاں ہوتی ہے، جس کے نتائج صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتے رہتے ہیں، یہ نتائج طبقۂ عوام کے لیے نفع و ضرر کے لحاظ سے اور طبقۂ خواص کے لیے "قوت و ضعف" کے لحاظ سے امتیاز خیر و شر کا باعث ہوتے ہیں"

علمائے اسلام اس مسئلہ پر یہ خیال رکھتے ہیں :۔

"علمائے اسلام بھی اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں، اشعریہ کا اعتقاد ہے کہ خیر و شر اور حسن و قبح

کی تفریق خدائی احکام پر موقوف ہے۔ بعض افعال اچھے ہیں کیونکہ خداوند کریم نے انکے کرنے کا حکم دیا ہے، اور بعض کام بُرے ہیں کیونکہ خدائے پاک نے اُنکے کرنے کو منع کیا ہے۔ معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ عقل خود اچھے اور بُرے، نیک اور بد کے درمیان تمیز کر لیتی ہے۔ سچ بولنا فعل نیک ہے، اس لیے نہیں کہ خدائے عزوجل نے اسکا حکم دیا ہے بلکہ اس لیے کہ عقل اُسے اچھا کہتی ہے۔ ڈاکہ ڈالنا بُرا ہے، نہ اس وجہ سے نہیں کہ خالق عزوجل نے اسکی ممانعت کی ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ عقل اسے ایک فعل قبیح سمجھتی ہے۔"

زمانہ جولائی نمبر میں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا نہایت دلچسپ مضمون "اودھ کے شاہی میلے" شایع ہوا ہے جو انداز بیان کی سادگی و دل کشی کے علاوہ نہایت پُر لطف معلومات سے لبریز ہے۔ خواجہ صاحب عرصے سے اودھ کے قدیم شاہی حالات، و واقعات لکھنے میں مشغول ہیں، اور اُنکے ذرائع معلومات نہایت معتبر اور وسیع ہیں۔ غلیش باغ جس کی موجودہ حالت دیکھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، نواب آصف الدولہ کے وقت میں "فردوس بروے زمین" تھا، جس کا نقشہ خواجہ صاحب ان دل کش الفاظ میں کھینچتے ہیں:۔

"اس باغ کی خدمت کے لیے ایک ہزار سات سو مالی مقرر تھا، جو دن رات وہیں رہتا تھا، مالیوں کے رہنے کے لیے جا بجا گڑیاں بنی ہوئی تھیں، جا بجا فوارے چھوٹ رہے تھے، کنوئیں سب سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ موتی جھیل نام وسط باغ میں ایک جھیل تھی جس میں ہمیشہ صاف اور شیریں پانی لبریز رہتا تھا، اکثر پیر اک وہاں پرنے آتے تھے، عالیشان مسجد اور پل کے دوسری طرف جو جھیل تھی جسکے قریب تمام سیوں کے درخت تھے، اور اس سے کچھ فاصلہ پر کھجوریہ بھی ایک جھیل کا نام ہے جس میں ایک تھوڑا بہت پانی رہتا ہے، اس جھیل کی تمام زمین کالی مٹی کی ہے اور یہاں کی مٹی برتنوں کے کام آتی ہے۔

اسکے علاوہ بہت سی ندیاں تھیں جو گرمی میں خشک ہو جاتی تھیں، آصف الدولہ کے زمانہ کا حال تو قلم نہیں کہ اس باغ پر کیا جوبن تھا، مسٹر اتنی برس تک کا نقشہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں سُنی سنائی کہتے ہیں کہ آصف الدولہ بہادر کے زمانہ میں یہ باغ گرمی کے موسم میں رشک کشمیر تھا۔ جو کوئی سفید پوش ہوا کھانے آتا تھا، سردی سے کانپنے لگتا تھا، اگر کوئی مسافر کسی درخت کے سایہ میں دوپہر کو سو جاتا تھا تو شام تک اسکی نیند نہ بھرتی، بندر جیسے سیانا حیوان ہے اُس نے ایسا آرام پایا کہ اسی باغ میں ڈیرا لگایا۔"

آگے چل کر نواب صاحب ممدوح کی رحمدلی اور نیک نفسی کا نقشہ پڑھ کر دل میں ایک عجیب حس پیدا ہوتی ہے:۔

"مالیوں نے شکایت کی کہ یوں تو ہم پرندوں کے واسطے کٹکے لگا دیتے ہیں تو پرندوں کے ہاتھ سے پھل محفوظ رہتے ہیں مگر کچھ دنوں سے بندر گھس آئے ہیں اور وہ کسی صورت سے باغ سے باہر نہیں جاتے سرکار سے بندوقیں ملیں تو انکو مار کر نکال دیں۔ حکم ہوا وہ باغ کی پناہ میں آئے ہیں انھیں نکالو نہیں، انکے لیے ہماری سرکار سے پھیکے ہوئے چنے مقرر ہو جائیں گے....."

میلوں کے سلسلہ میں علی گنج کے میلہ کا مختصر حال خوب ہے:۔

"علی گنج لکھنؤ کا محلہ ہے اور دریا کے پار شروع بیٹھ کے مہینے میں پیر کے روز ہنومان جی کا میلہ ہوتا ہے، مراد پانے والے پیدل ماں کرتے ہوئے یعنی زمین کو اپنے قد سے ناپتے ہوئے اپنے گھر سے مندر تک

زمین پر لیٹتے ہوئے اور اُٹھتے ہوئے، لنگوٹے والے کی جے پکارتے ہوئے آتے ہیں اور حسب توفیق نذر چڑھاتے ہیں۔"

جامعہ رسالہ جامعہ دہلی کے جولائی نمبر میں "مشرق و مغرب" کے عنوان سے وہ گفتگو شائع ہوئی ہے جو فلورنس میں ڈاکٹر ٹگور اور آلدے سورانی کے درمیان ہوئی، ایک حقیقی شاعر کی حیثیت سے اطالیہ کی حسین و خوشنما سرزمین سے متاثر ہو کر ڈاکٹر ٹگور نے اس حقیقت کا اقرار کیا کہ

"اطالیہ کی خوشنمائی روز بروز میری نظر میں کھبتی جاتی ہے، اور فلورنس مجھے اطالیہ کے سب شہروں میں زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے، لیکن مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی اگر میں عمر اور شہرت کا بار دوش پر لیکر اطالیہ نہ آتا، بلکہ کیٹس اور شیلے کی طرح نوگرفتار کی حیثیت سے زیارت کرنے نکلتا، شباب اس پیام کو بہتر سمجھتا جو اطالیہ کی شاعری دے رہی ہے۔"

اندیشہ ہے کہ اُردو کے بعض "نادان دوست" ٹگور کے دیگر روحانی نغموں کی طرح اس مرتبہ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، اسلیے ٹگور کے ذیل کے ولولہ خیز اور حوصلہ انگیز خیالات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے:۔

"میں اس لیے نہیں جیتا ہوں کہ مارا مارا پھروں اور مجمع میں خصوصاً اہل مغرب کے مجمع میں مجھ پر انگلیاں اُٹھیں، میری زندگی اور اُسکا پیغام داخلی ہے، سچی زندگی تمام و کمال داخلی ہوتی ہے، لوگ مجمع ہوتے ہیں کہ شاعر کو دیکھیں اور اُسکی باتیں سنیں، لیکن دیکھنے اور سننے کے بعد بھی وہ اُسے نہیں پہچانتے، کیونکہ شاعر پوشیدہ رہتا ہے، جتنا زیادہ شور ہوتا ہے، اور جتنا کثیر مجمع ہوتا ہے اُسی قدر گہرے پردے میں شاعر اپنی روح کی آڑ میں چھپ جاتا ہے اور لوگ اُسے نہیں پہچان سکتے ....."

آلدے سورانی کے اس سوال پر کہ ٹگور یورپ کے کن مصنفین کو پسند کرتے ہیں، اُنھوں نے روسی لٹریچر سے اپنی شدید عقیدت کا اظہار کیا جس میں سادگی، گھلاوٹ اور قلب کی تسکین ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر ٹگور نے صاف صاف کہا:۔

"تم لوگ آجکل پہلے سے زیادہ کھوٹے، خود سر اور سخت گیر ہو اور لڑائی کے بعد تمھاری ملک گیری کی ہوس اور نا اتفاقی میں ترقی ہو رہی ہے، لیکن تمھارے لیے اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ تم بے آہنگی کو زندگی کا ناگزیر اور اٹل قانون سمجھنے کی عادت ڈالو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم اندرونی بے آہنگی یعنی روح انسانی کی خانہ جنگی کو ضروری اور اچھا سمجھو، آج ایسے لوگ موجود ہیں جن کے خیال میں سچی زندگی اسی داخلی اندرونی تقیض، اسی خیالات، جذبات اور خواہشات کی گھمسان لڑائی کا نام ہے، یہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ تمثیلی زندگی خود اپنے سے اور دوسروں سے تقیض کا نام نہیں ہے، کیونکہ زندگی کا کام یہ ہے کہ وہ ہمارے نفس میں ہم آہنگی پیدا کرے اور امن و اتحاد کی روشنی سے دُنیا کو منور کر دے ....."

..... ایک دن تم پر یہ راز کھل جائے گا کہ خارجی منافع کی خواہش اور اُنکا اکٹھا کرنا بیحد اور خطرناک ہے، اور تمھیں اپنے گھروں اور اپنے دلوں کی تہذیب کے ضروری ہونے کا احساس ہونے لگے گا، اُسوقت تمھیں معلوم ہوگا کہ بہت سی چیزیں جنھیں تم قابل قدر سمجھتے تھے صدیوں کا گھورا ہیں اور اُسوقت

تم دل میں ٹھان لوگے کہ اس کوڑے کو جو تمھارے راستہ میں حائل اور تم پر بار ہے دم بھر میں صاف کرکے پھینک دو۔ اسوقت تم در اصل اندر اور باہر نئی خداداد زمین کے مالک ہو گے اس پر عمارت بناؤ گے، اور اس میں آنے والی نسل کے لیے بیج بوؤ گے، اُسوقت تم تہذیب کی ایک بلند سطح پر پہونچو گے اور اپنے اور دوسروں کے ساتھ ہمسائگی کا حق ادا کرنا سیکھو گے۔"

ہمایوں　"اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" کے عنوان سے میاں بشیر احمد نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا ہے جو معلومات اور مواد کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے، اس مضمون کی تیاری میں امیر علی، ڈریپر اور "تمدن عرب" وغیرہ سے مدد لی گئی ہے، جس کا حوالہ صاحب مضمون نے جا بجا دیدیا ہے آجکل کے مشغول اور کاروباری زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی آنکھیں یورپ کی خیرہ کن روشنی میں چوندھیا گئی ہیں، اور فرصت نہیں، کہ بڑی بڑی ضخیم کتابیں دیکھ کر حالات سے آگاہی حاصل کی جائے، ضرورت ہے کہ مستند کتابوں کے اوراق سے نکال کر مسلمانوں کے عروج و ترقی کے واقعات متفرق مضامین کی صورت میں نگاہوں کے سامنے لائے جائیں۔ لاہور کے پرچوں کے متعلق یہ خیال بالکل صحیح ہے، کہ وہ ملک کی دماغی نشوونما میں حصہ نہیں لیتے، وہ صرف تفریح اور تھکن دُور کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمایوں نے یہ مضمون نکال کر اس الزام کو رفع کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔

ولید اول کے زمانہ میں طارق و موسیٰ کے حملوں کے وقت اسپین کی جو قابل رحم حالت تھی، اُسکا نقشہ سر امیر علی نے نہایت تشریح سے کھینچا ہے، ذیل کے سطور میں بھی تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

"..... نوابوں اور امیروں اور پادریوں کے طبقے ہر قسم کے ٹیکس سے بری تھے، طبقۂ متوسط کی حالت قابل رحم تھی، صنعت و حرفت طرح طرح کے محصولوں کے تکلیف میں جکڑی ہوئی تھی اور تجارت محض نام کو باقی رہ گئی تھی، عتیق یا قدیم امرا نے ملک کو پڑتی پڑی جاگیروں کی صورت میں تقسیم کر رکھا تھا جہاں دنیا وی اور کلیسیائی لوگ خوب گلچھرے اُڑاتے تھے اور اپنے غلاموں اور کمینوں کی محنت و مشقت سے خانہ اُٹھا کر اُنھیں طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار کیا کرتے تھے، عام لوگ جہالت اور توہمات کے سخت پنجوں میں پھنسے ہوئے تعلیم سے عاری اور عقل و فہم سے کوسوں دُور پڑے تھے، یہودیوں کے ساتھ حد درجہ کی سختی کیجاتی تھی، بادشاہ اور اُمرا اور پادری سب اُنکی گردن پر سوار تھے اور اُنکی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنائے ہوئے تھے، غرض ہسپانیہ اور بالعموم یورپ کی حالت صدیوں سے اسی طور پر تھی تاریکیوں پر تاریکیوں اور ظلم و مکلت پر لاعلمی اور جہالت کے ہزاروں لاکھوں پردے پڑے ہوئے تھے۔ ....."

اسی نمبر میں مولانا سلیم پانی پتی کے "حیاتیات" کے عنوان سے متفرق اشعار ایک مستقل درس ہیں جن سے ہر وہ شخص جو خون میں حرارت رکھتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا:۔

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو　　نبض کے خون کے مانند اُچھلنا سیکھو
خاک میں اُن کو ملا دیتی ہے خود باد صبا　　قوتِ نشو و نما جب نہ رہے دانوں میں
زندہ رہنے کا اُنھیں حق نہیں دنیا میں سلیم　　گر ترقی کی اُمنگیں نہ ہوں انسانوں میں

نگار "سینما اور تعلیم" کے نام سے اس نمبر میں ایک مختصر مگر دلچسپ و پُر از معلومات مضمون شایع ہوا ہے، جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سینما سے جسے ہمارے یہاں "پیٹ بھروں کا مشغلہ" اور تضیع اوقات کا سبب سمجھا جاتا ہے، مغربی ممالک میں بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد اگر یہ ہے کہ لڑکوں میں ایک خاص وسیع النظری پیدا کرکے اُنکے کیرکٹر کو مستحکم و مضبوط بنایا جائے اور اُنکے دل و دماغ میں ایک خاص تڑپ پیدا کرکے اُنکو بنی نوع انسان کی ہمدردی کا درس دیا جائے تو سینما یقیناً ایک زبردست آلۂ تعلیم ہے۔ کتابی طالب علموں کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کو خیرباد کہنے کے بعد اُنھیں ایک عمر تک دنیاوی تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے، ایک ایسی چیز جسکی تلافی بصیرت تو ہوتی ہے مگر شاید وہ نہیں ہوتا، سینما اس مرض کا علاج ہے:

> یورپ و امریکہ کے ماہرین تعلیم و تربیت کا خیال ہے کہ "صور متحرکہ" تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اور اسی غرض کے لیے خاص خاص فلم تیار کرائے جاتے ہیں جو لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرسکیں، چنانچہ دنیا کے تمام مشہور حوادث و واقعات کے فلم تیار کراکر اسی اصول کی بنا پر ہے تاکہ ساری دنیا اُنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ظاہر ہے کہ دیکھنے سے جن حقیقتوں کا علم ہو سکتا ہے وہ صرف تقریر و تحریر سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ گویا اس طرح فلم سے صحیفۂ اخباری کا کام لیا جاتا ہے
>
> انگلستان کی وہ کمیٹی جو فلم کے احتساب کے لیے مقرر ہے اپنی رپورٹ میں ظاہر کرتی ہے کہ وہ صبا جو سینما دیکھتے ہیں اُنکی معلومات دوسرے ہم عمر طلبا سے جو سینما نہیں دیکھتے کہیں زیادہ وسیع و عمیق ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایسے طلبا کا امتحان لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُنکی معلومات صرف ایک موضوع پر حاوی نہیں، بلکہ جغرافیہ، آداب، علم ہیئت، صناعت، تاریخ، حالات اجتماعیہ، اور واقعات عالم ان سب پر اُنکو نگاہ تھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جو حقائق کتابوں کے ذریعہ سے اُنھیں حاصل ہوئے تھے وہ ایسے مستحکم طور پر دماغ میں راسخ نہ ہوئے تھے جیسے وہ حقائق جن کو اُنھوں نے سینما میں دیکھا تھا۔"

نظام الشائخ اس نمبر میں "قرآنی" کے عنوان سے محترمی مولانا عبد الماجد صاحب بی اے نے مسئلہ تنازع للبقا، مشرق و مغرب کے امتیاز کو یوں ظاہر کیا ہے:

> "انسان کی ترکیب میں محض جسم ہی شامل نہیں بلکہ اسکے علاوہ بھی ہے جسے روح کہتے ہیں اور جسم کی طرح ایک عالم روحانیات کا بھی ہے ..... مغرب نے جسم کی فضا میں پرورش پاکر ارتقا کا آخری مرتبہ "عقل" کو خیال کیا، مشرق نے روح کی تربیت سے فیض پاکر ارتقا کی آخری منزل "وحی" کو تسلیم کیا۔ عقل و دانش کے بہترین ثمرات ڈارون و نیوٹن، آئینس ٹائن و برگسان کے نظریات کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ وحی و الہام کی آخری منزل محمد رسول اللہ و ابراہیم خلیل اللہ کے پیامات کی صورت میں موجود ہے۔ عقل کی تعلیم ہے کہ جو کچھ ہو سب انسان کی ذات ہی کی بدولت ہے، وحی کہتی ہے کہ جو کچھ ہے سب خدا کا ہے، جہاں تک انسان کا تعلق ہے نہ تو کچھ بھی اپنا نہیں ہے، ایک کے سامنے صرف "میں" ہے دوسرے کے پیش نظر کل ہے، ایک کو اسکی خود غرضی نے خواہ مخواہ میں کتنا ہی ذلیل و رسوا کیا ہو، دوسرے کو اسکی فکر ہے کہ خیرات میں کتنا صرف کیا۔"

(اقتباس نقل کیا جا چکا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ ماجد صاحب کا یہ مضمون ۲۶ - جون ۱۹۲۵ء کے "سچ" سے بلا حوالہ دیے نظام الشائخ میں نقل کیا گیا ہے)۔

ع - ق

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(جولائی ۱۹۳۳ء)

رسالۂ دلگداز لکھنؤ

۱- سلطان عالم واجد علی شاہ

رسالہ معارف اعظم گڈھ

۱- مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ
۲- فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ
۳- فلسفۂ اخلاق
۴- حلب و دمشق کے قدیم اسلامی مدارس

رسالۂ زمانہ کانپور

۱- کربلا (ڈراما)
۲- اودھ کے شاہی میلے

رسالۂ ہمایوں لاہور

۱- بام کا اثر مغربی تہذیب پر
۲- بھنور کی ڈلمن (افسانہ)

رسالۂ نگار بھوپال

۱- کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے؟
۲- روہ کی
۳- سینما اور تعلیم

رسالۂ جامعہ دہلی

۱- ہندوستان کی معیشت زرعی
۲- اسلام اور تصوف اسلامی
۳- مشرق و مغرب
۴- گوری اماں (افسانہ)

رسالۂ نیرنگ خیال لاہور

۱- فنون لطیفہ
۲- سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
۳- شارحین غالب

رسالۂ نظام المشائخ دہلی

۱- جھوٹا دعوے
۲- قربانی

رسالۂ مرقع لکھنؤ

۱- زندگی کا اصلی مذہب
۲- لسان العصر اور شاد عظیم آبادی

آفتاب

ہندوستان کا ارزاں ترین ادبی صحیفہ

آفتاب مشرقی ہندوستان کا واحد مصور ادبی صحیفہ ہے۔ اس مین ہر ماہ علمی سنجیدہ مضامین رنگین افسانے بنگلہ اور انگریزی افسانون کے تراجم فکاہات اور لطائف شائع ہوتے ہیں۔ اگر آپ مشاہیر شعراء کا تازہ کلام دیکھنا چاہین تو آفتاب ملاحظہ فرمائیے آفتاب مین پرانے اور نئے مصورون کے شاہکار بالالتزام شائع ہوتے ہین۔ سہ رنگی تصاویر کی اشاعت کا خاص انتظام کیا گیا ہے آفتاب کی اشاعت سے محض ادب اردو کی خدمت مقصود ہے۔ اسلئے چندہ نہایت کم رکھا گیا ہے۔ کتابت وطباعت نہایت دلاویز حجم ۵۲ صفحات

چندہ سالانہ ۳ روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔ قیمت فی پرچہ ۴ر۔ ۵ر کے ٹکٹ آنے پر نمونہ روانہ کیا جاتا ہے۔

المشتہر:۔ منیجر رسالہ "آفتاب" نمبر ا۔ گنگا دھر بابو لین (بہو بازار) کلکتہ۔

ہر جگہ ایجنٹون کی ضرورت ہے

اردو کا ماہانہ رسالہ "شمع" آگرہ

بادشاہان اودھ اور انکے مشہور امرا اور لکھنؤ کے مایۂ ناز قدیم شعرا کی قلمی تصاویر عہد مغلیہ و عہد جدید کی مصوری کے بہترین نمونے جو آجتک کبھی شایع نہیں ہوے ہیں رسالہ شمع میں مسلسل شایع ہو رہے ہیں۔ شمع۔ تاریخی۔ علمی۔ ادبی اور سیاسی مضامین اور افسانوں کا ہندوستان میں سب سے زیادہ ضخیم ۱۱۲ صفحات کا رسالہ ہے اور جنوری ۱۹۲۵ء سے محمد حبیب صاحب (آکسن) پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور حسن عابد صاحب جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ آگرہ کی ادارت میں نہایت آب و تاب کے ساتھ جاری ہے شذرات اور تبصرے قابل دید ہوتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب۔ کاغذ بہتا اور قیمتی۔ سالانہ حجم ۱۴۰۰ صفحات اور کم از کم ۳۰ تصاویر۔ سالانہ چندہ صرف چھ روپیہ (۶ر) سرکار آصفیہ حیدرآباد نے شمع کو مدارس میں جاری فرمایا دیا ہے۔ الہ آباد۔ لکھنؤ۔ ڈھاکہ پنجاب اور کلکتہ کی یونیورسٹیوں و بہت سے کالجوں اور اسکولوں میں خریدا جاتا ہے۔ شمع کے ارزاں ہونے کی صرف یہ وجہ ہے کہ اس سے کوئی ذاتی نفع مقصود نہیں ہے محض علمی و ادبی خدمت کے شوق میں جاری کیا گیا ہے۔

چندہ سالانہ (۶ر) ششماہی (۳ر) نمونہ کا پرچہ (دو آنہ) ہوا بی حجم ۱۱۲ صفحہ مع تصاویر (نمونہ کا پرچہ کسی حالت میں واپس نہیں ہوگا)

منیجر شمع۔ شاہ گنج آگرہ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ — نمبر ۳

نظرے خوش گذرے ۱

تاریخ عرب		مولوی محمد خلیل الرحمٰن مترجم اخبار الاندلس	۵
اشعار نعت		مولوی محمد نجم حسن نگرامی بی اے ایل ایل بی	۲۰
روٹیوں کا نزاع		"شمع بے نور"	۲۱
میر انیس کی شاعری کا ایک بردست عنصر		مولوی غلام محی الدین قادری زور بی اے	۲۹
وارداتِ قلب		مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی بی اے (علیگ)	۴۴
بیانِ واقعہ		منشی رشید احمد ارشد تھانوی	۴۵
جذباتِ اثر		مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی اے	۵۲
شہید چلیپا	(فسانہ)	مسٹر سید حسن بی اے (علک)	۵۳
قیصر باغ		مولوی مسعود الرحمٰن ندوی	۵۸
بارگاہِ سخن	(نظم)	منشی شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی	۶۰
رباعیاتِ رواں		چودھری جگت موہن لال، رواں ایم اے	۶۱
سفر حجاز کی مختصر روداد			۶۲
تقیدیں			۶۸
پچھلے مہینے کے رسالے			۷۳
اردو رسائل کے خاص مضامین			۷۸

دیوان ولی۔ ولی اردو شاعری کا آدم کہا جاتا تھا۔ اسکا دیوان اب تک عام شائقین کی رسائی سے باہر تھا۔ کن کالج لے فارسی معلم عبدالباری صاحب نے شائع کیا ہے۔ شروع میں ۲۰ صفحہ کا دلچسپ مقدمہ ہے۔ شائقین اوبے فوراً منگالیں۔ قیمت عہ منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

نئی کتابیں

نظریۂ اضافیت

(تالیف پروفیسر سنہاج الدین - ایم ایس سی)

جرمنی کے نامور سائنسداں آئن اسٹائن نے سر اسحاق نیوٹن کے مشہور نظریہ تجاذب اجسام پر ترقی کرکے ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے جسے نظریۂ اضافیت ——— (Relativity Theory) کہتے ہیں۔ اور جسمیں تجاذب و کشش کے بغیر بھی اجسام میں حرکت کا پایا جانا ثابت کیا گیا ہے۔ پروفیسر سنہاج الدین صاحب نے اسی نظریہ کی توضیح و تشریح پر یہ لاجواب کتاب لکھی ہے۔ مقدمہ میں پروفیسر آئن اسٹائن موجد نظریۂ اضافیت کے مختصر حالات اور آخر میں انگریزی مصطلحات اور انکے تراجم کی ایک فہرست دیگئی ہے۔ کتاب پر بہت خوشنما انگریزی جلد ہے جسپر کتاب اور مصنف کا نام سنہرے حرفوں میں چھپا ہوا ہے۔ قیمت فیر مجلد للعہ مجلد للعہ

ہیئت جدید

(تالیف پروفیسر سنہاج الدین ایم ایس سی و پروفیسر برکت علی ایم اے) مصنف نظریۂ اضافیت نے پروفیسر برکت علی ایم اے کی مدد سے ہیئت جدیدہ پر تین ضخیم جلدیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بڑی خوبی اس کتاب میں یہ ہے کہ جا بجا ہیئت قدیم سے بھی مقابلہ کیا گیا ہے۔ قیمت حصہ اول حصہ دوم حصہ سوم

زینت آسمان

(تالیف پروفیسر برکت علی ایم اے و پروفیسر سنہاج الدین ایم ایس سی) ستاروں کی شناخت پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ستاروں کے بارہ نقشے ہیں اور ہر نقشے کے ساتھ خاص خاص ستاروں کے مختصر حالات بھی تلمبند کردیے ہیں کہ ستاروں کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہو۔ قیمت

روح تنقید

(تالیف سید غلام محی الدین قادری زور بی اے)

سید محی الدین زور نے جبکا ایک مضمون اسی پرچہ میں ملاحظہ سے گذر چکا فن تنقید پر یہ دلچسپ و مفید کتاب لکھی ہے، جسمیں مقاصد و اصول تنقید پر مشرقی و مغربی نقطہ ہائے نظر سے بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور نمونہ کے طور پر مثنوی سحر البیان پر تنقید بھی پیش کی گئی ہے تنقیدی مضامین لکھنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہوگی

طلسم تقدیر

مصنف روح تنقید کا ایک دلچسپ افسانہ ہے، جس میں شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری ایام کی ایک عبرت خیز داستان بیان ہوئی ہے۔ شروع میں عبدالغفار صاحب بی اے کے قلم سے فن افسانہ نویسی پر ایک مختصر مقدمہ بھی ہے۔ قیمت

(میجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۳۱ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

نظرے خوش گذرے

جنوری نمبر میں نئے انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ مضمون ایسا تجویز کیا گیا تھا کہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ توقع شاید بیجا نہ تھی کہ انشاپردازی کے عنوان سے زیادہ طبع آزمائی کرنے والے اہل قلم کی توجہ اس طرف مائل ہوگی۔ لیکن رقم انعام کی کمی یا کسی دوسرے سبب کے بدولت افسوس ہے کہ سوائے میرے دیرینہ کرم فرما جناب قاضی غلام امیر صاحب امیر بدایونی کے اور کسی صاحب نے اس مقابلہ کے لیے مضمون لکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ قاضی صاحب کا اس پیرانہ سالی میں اتنی جواں ہمتی ظاہر فرمانا غایت درجہ موجب امتنان ہے خصوصاً اس لیے کہ انعام کی رقم اُنکے ذوقِ نگارش کے لیے وجہِ تحریک نہیں ہوسکتی تھی۔

چونکہ اور کسی صاحب کا مضمون نہیں آیا اسلیے طباعت سے قبل اراکین مجلس انتخاب کی خدمت میں اظہار رائے کی غرض سے مضمون بھیجنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ انشاء اللہ الناظر کے آیندہ دو نمبروں میں یہ مضمون شایع ہو جائے گا۔ اور اگر اراکین کی رائے میں مضمون لائق انعام ہوگا تو قاضی صاحب کی خدمت میں الناظر کا نذرانہ روانہ کر دیا جائے گا۔

انعامی مقابلہ کا جو مقصد تھا وہ چونکہ اس طریقہ پر نہیں پورا ہوتا، اسلیے اب جب تک بہت کافی رقم کا انتظام نہ ہو جائے یہ سلسلہ جاری نہ رہے گا۔

حجاج کی واپسی نے مسلمانوں پر انتشار و تفریق کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور اگرچہ ڈاکٹر کچلو صاحب اور بعض دیگر اصحاب کوشش فرما رہے ہیں کہ ہمارے رہنماؤں کے درمیان کوئی ایسی صورت مفاہمت پیدا ہو جائے جس سے آپس کی یہ تفریق رفع ہو جائے، مگر اندیشہ ہے کہ اُنکی کوششیں زیادہ بار آور نہ ہوں گی۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ ہو، اُنکی یہ سعی لائق شکر گزاری ہے۔

ابھی تک ہندو لیڈروں کی اس نادانی پر ماتم کیا جاتا تھا کہ اُنکی بے بصیرتی سے ملکی کام برباد ہو گیا اور جو قوتیں جنگ آزادی پر صرف ہونا چاہیے تھیں وہ باہمی خانہ جنگی میں رائیگاں ہو رہی ہیں، مگر یہ کیا بدبختی ہے کہ جو لوگ اس مصیبت عظمیٰ پر غیروں کو ملامت کر رہے تھے اور باوجود انتہائی اشتعال کے صبر و سکون کے پیکر بنے ہوئے تھے وہ خود مسلمانوں کے اندر خانہ جنگی کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔

خدام الحرمین کی تعمیر جن عناصر سے ہوئی ہے اُن میں غالب حصہ اُنکا ہے جو ملکی آزادی کے خیال سے بے پروا اور حکومت سے ٹکرانے کو اپنی عافیت پسندی کے خلاف جانتے ہیں اس لیے اگر وہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کا سبب بنے تو کچھ زیادہ محل شکایت نہ تھا۔ لیکن خلافت کمیٹی کے رہنماؤں سے تو بدرجہا زائد تدبر و دانشمندی کی توقع کیجاتی تھی، مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ایک شدید قسم کی نزاع باہمی کا ذریعہ بنے جا رہے ہیں۔

حجاز کی مقدس سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا تعلق مسلّم ہے۔ اس سے بھی انکار کرنے کی ضرورت نہیں کہ نجدیوں نے مقابر و آثار کو اپنے عقائد مذہبی کے اتباع میں مسمار کر کے ہندوستان کے کثیر التعداد اشخاص کو متاثر کیا ہے اور یہ بھی مان لیا جا سکتا ہے کہ مناسب طریقہ پر وہاں کے حالات میں اصلاح کی کوشش ہر گونہ لائق ستایش ہے۔ لیکن اس سے آگے جانے کی کوشش صریح غلطی و کج رائی ہے جسکے صرف دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ خود اس ملک کے مسلمانوں میں نزاع قائم ہو کر ہماری مشکلات میں اضافہ کرتی رہے اور سرزمین مقدسۂ حجاز کے امن و امان کو برباد کر کے حجازیوں اور عربوں کو یورپ کی فرنگی قوموں کی حرص و آز کے جال میں پھنسا دے۔

خدام الحرمین والوں کے نزدیک ممکن ہے کہ حجاز کا موجو[illegible] اور اُسکی قوم دائرۂ اسلام سے خارج ہو، لیکن خلافت کمیٹی والے تو ایسے عقا[illegible] اس قسم کی خام خیالیوں کو جائز و پسندیدہ سمجھتے ہوں۔ پھر کیا ایک مسلم حکمراں [illegible] جنگ کیجائیگی کہ وہ مقابر و آثار کی شکست کو اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر ضروری جس[illegible] رائی کی بنا دیہ قرار

دی جائے گی کہ ابن سعود نے خاندان شریف کو نکال کر حجاز پر تسلط قائم کر لینے کے بعد وہاں خلفاے راشدینؓ کے نمونہ کی جمہوریت نہیں قائم کی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید

اور غالباً کسی مسلمان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا ہوگا کہ حضرت امام ہمامؓ سے زیادہ حریتِ دینی اور فداکاری ملت کا جذبہ کسی مسلمان میں ہوگا یا آج ہو سکتا ہے۔ پھر کیا کوئی اسکا دعویٰ کر سکتا ہے کہ حضرت امامؓ نے حضرت امیر معاویہؓ یا اُنکے بعد یزید ابن معاویہ کی خلافت و حکومت کو شکست کرنے کی کوئی کوشش فرمائی؟ اگر ملوکیت کے خلاف حضرت امام حسینؓ علمِ جہاد بلند کرتے اور خلفاے راشدینؓ کے نمونہ کی جمہوریت قائم کرنے کے لیے امت اسلامیہ کو دعوت شرکت دیتے تو کیا پہلی صدی ہجری کے مسلمان ایسے گئے گذرے تھے کہ خاندان رسالت کی اُس بزرگترین یادگار کی طلب دعوت کو اُسی طرح رد کر دیتے جس طرح گذشتہ محاربۂ عظیم کے زمانہ میں ترکی خلیفہ کی دعوت کو زمانۂ حال کے مسلمانوں نے ٹھکرا دیا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُنھیں جنگِ جمل کی افسوسناک داستان نہ بھولی تھی، اور وہ مسلمانوں کی خانہ جنگی کو اس سے بدرجہا بدتر جانتے تھے کہ ملوکیت کو توڑ کر پھر خلافت راشدہ کے نمونہ کی خلافت قائم کریں۔ اس لیے حضرت امامؓ شروع ہی میں اس خیال سے دست بردار ہو گئے تھے۔ پھر کیا ہمارے لیے حضرت امامؓ کے طرزِ عمل میں سوا اسکے کوئی درس عبرت نہیں کہ

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہمارے جن بزرگوں کی رائے میں خلافتِ راشدہ کے نمونہ کی جمہوریت کا قیام ممکن ہے اُن سے اختلاف رکھنے کے باوجود ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ انکو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وقت اور حالات کے مقتضیات کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ مثلاً ہندوستان کو اگر آزادیِ کامل میسر ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اُنکا اشارۂ چشم حجاز کی حکومت کو تہ و بالا کر دیتا۔ مگر موجودہ حالت میں تو صرف اس طرح یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے کہ سلطان ابن سعود کو اپنی مخلصانہ کوششوں سے اپنا گرویدہ بنایا جائے، انکے خیالات کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ خود ہمارے ان بزرگوں کی طرح اسے ایک مذہبی فریضہ تصور کر کے حجاز کی عنانِ حکومت موتمر اسلامی کے سپرد کر دیں۔

لیکن سلطان سے ان کو اپنے خیالات میں لینے اور انکو اپنا ہم خیال بنانے کی یہ صورت تو نہیں ہو سکتی کہ اُنکے خلاف جنگ و جہاد کا اعلان کر دیا جائے۔ اسکا تو صرف یہی نتیجہ ہوگا کہ آپ کے انکو آپ کے

خیال و آرا کے خلاف اور ضد بڑھے، اور اگر جیسا کہ آپ کا خیال ہے وہ حکومت و اقتدار کے ہوسمند اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے سلطنتیں قائم کرنے کے متمنی ہیں تو بہت ممکن ہے کہ حصول مدعا کی تمنا میں وہ انگریزوں یا فرانسیسیوں یا اور کسی مسیحی قوت سے ساز باز کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

سلطان ابن سعود نے سال گذشتہ کچھ وعدے کیے تھے جنکو پڑھ کر ہمارے بعض احباب اس دھوکہ میں آگئے کہ حجاز کو خانہ ان شریف کے قبضہ و تصرف سے نکالنے کے لیے آدمیوں اور روپیہ کی اُس قربانی کے بعد جو ہر معرکۂ جنگ کا لازمہ ہیں، سلطان نجد حکومتِ حجاز کو بزم میلاد کی شیرینی کی طرح لوگوں پر تقسیم کر دینگے۔ اور اگر اپنے بھولے پن یا غلط توقعات کی شکست پر یہ ساری برہمی ہے تو ہمارے بزرگوں اور دوستوں کو ابن سعود سے برسرپیکار ہونے کے بجائے خود اپنے تدبر اور فراست کو موردِ الزام قرار دینا چاہیے اور کم سے کم آیندہ کے لیے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ بادشاہوں کے وعدے اور ارادے ہمیشہ اپنے حالاتِ گرد و پیش کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔

مختلف خیال کے اصحاب نے حجاز کے موجودہ حالات کے بارہ میں ابتک جو اطلاعیں ہم پہونچائی ہیں، اُنکو پڑھنے کے بعد مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور اگر تدبر و خوش اسلوبی سے سلطان ابن سعود کے ساتھ استحاد عمل کیا جائے تو اسکی قوی امید ہے کہ حجاز کا نظم بنسبت ہر حیثیت سے قابل اطمینان ہو سکتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے واجب الاحترام بزرگوں کی جو تمنائیں ہیں، ایک بڑی حد تک وہ بھی بر آئیں۔ یعنی حجاز میں ایک ایسی پائدار اور خوش انتظام حکومت قائم ہو جائے جو ایک طرف اگر اغیار کی تمام روباہ بازیوں اور دخلاندازی کی کوششوں کا سدباب کر دے تو دوسری طرف حجاج و زائرین کے لیے وہ تمام ممکنہ آسانیاں فراہم کر دے جو از روے شریعت اسلام جائز اور مناسب ہوں۔

نجد کا بدوی سلطان مہذب فرنگیوں کا سا دل و دماغ اگرچہ نہیں رکھتا لیکن شریعت اسلامیہ کی تابعیت کرنے کی تمام اہلیتیں رکھتا ہے بشرطیکہ دنیاے اسلام کے بہترین دل و دماغ قرآن و حدیث کی روشنی میں اور مسلمانوں کے مصلحانہ طرز پر سلطان کو اپنے نیک مشوروں اور مفید تجاویز سے مدد دیتے رہیں اور اپنے معہودات ذہنی کی رو میں اس حقیقت کو نظرانداز نہ فرمائیں کہ

تو برلے وصل کردن آمدی ۔۔۔ نے برلے ۔۔۔ ی

۲۱۔ ستمبر ۱۹۲۶ء

لفز الملائکہ

تاریخِ عرب

وحشی اقوام، مثلاً تاتاری اور افریقی کا تو ذکر ہی کیا، کہ اُنکے یہاں "لٹریچر" نہیں ہوتا، مگر جو اقوام کہ تمدن کے منصۂ شہود پر آئی ہیں، مثلاً عرب اور یورپین، وہ اپنا کچھ نہ کچھ لٹریچر رکھتی تھیں۔ میں غلطی کر رہا ہوں، کیونکہ ان دونوں اقوام کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ کوئی چیز سینہ بہ سینہ تھی یا سینہ محفوظ۔ لٹریچر کا اطلاق اُس چیز پر کیا جاتا ہے کہ جو بقید تحریر ہو۔ ان دونوں کی یہ کیفیت بنتی لیکن اِلّا ماشاءاللہ۔ بہرحال اس قسم کی اقوام کی علمی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کی ترقی کا بنیادی پتھر تراجم ہوئے ہیں۔ میں نے بعض اقوام، مثلاً ہندی، مصری، یونانی، کا عمداً ذکر نہیں کیا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ از خود اکتساب کردہ تھا۔ ایسی شہادت کم از کم مجھے، معلوم نہیں ہوتی کہ انکے یہاں بھی تراجم ہوئے ہوں۔ لیکن ایک نے دوسرے سے بدیں تلمذ، ضرور فیض اُٹھایا۔ میں اسکو بھی تراجم ہی کی فہرست میں داخل و شامل کرتا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خواب گراں سے آنکھ کھلتی ہے تو وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُسکو یہ حیثیت تو حاصل ہے کہ سکندر مقدونی جیسے فاتح کے ساتھ ایک ہی تخت پر بیٹھ سکے، لیکن علمی حیثیت سے وہ ہیچمدانی میں ہے۔ اس احساس کے بعد وہ اپنے گرد و پیش کی اقوام پر نظر ڈالتی ہے اور جسکو اس میدان میں آگے بڑھا دیکھتی ہے اُسکو اپنا اُستاد بنا لیتی ہے؛ جس طرح عربوں نے یونان یا ہندوستان کو بنا لیا، اور اُنکے علوم کو اپنے یہاں منتقل کر لیا۔ بدقسمت ہوتے عرب اگر وہ اکتساب یونانی و سنسکرت پر قانع ہو بیٹھتے اور اپنی زبان کو مالا مال نہ کر لیتے۔

گھر میں رہتا ہوں جھونپڑے میں اور خواب دیکھ رہا ہوں محلوں کا۔ میں ایک مفتوح قوم کا فرد ہوں، اور جانتا ہوں کہ ایک لفظ "مفتوح" کی تفسیر دنیا بھر کی ذلت، بے شرمی، بدنامی وغیرہ وغیرہ ہے۔ اور ذکر کر رہا ہوں فاتحین کا۔ لیکن آخر کیا کیا جائے اُومیم۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے فاتح میرے نہیں ہیں، اسی لیے اُنکو میری زبان کے مرنے جینے کی چنداں پروا نہیں ہے۔ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے: ہندوستان زبانوں اور بولیوں کا محشر ہے۔ یہاں بھانت بھانت کی بولیاں ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں، ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ اُسی کا نغمہ دلکش ہے؛ اس پر ہمصفیر دں کا غوغا۔ گو اُردو یہ کہہ سکتی ہے کہ

تاک را سیراب سازد ابر باران در بہار تاک تاے میتواند شد چرا گوہر شود

اس صورت میں سرپرستی فاتح کا ذکر فضول ہے: لیکن اس کا کیا علاج کہ بغیر بادشاہ کی سرپرستی کے کسی علم و فن کا سرسبز ہونا، گو ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ مثلاً حیدرآباد کو دیکھیے۔ اگر کسی نے زبان اردو کی تاریخ لکھی، تو ناممکن ہے کہ حضور خسرو دکن خلد اللہ ملکہ وحشمتہ کا احسان نہ مانے۔ ہندوستان میں افراد نے اپنی سی بازو پر بھروسہ کرکے بہت کچھ کیا اور کر رہے ہیں: مگر آخر یہ حرکت مذبوحی ہی ہے، تاوقتیکہ اے بادشاہ وقت کی سرپرستی نہ ملے۔ الحمد للہ کہ اس حرکت میں خدائے تعالیٰ نے بہت کچھ برکت عطا فرمائی اور بذریعہ تراجم اچھی اچھی چیزیں نکل رہی ہیں۔ مگر مشکل اور صعب مشکل یہ درپیش ہے کہ ہمارے ملک میں ترجموں کی کوئی قدر نہیں، ترجمہ کرنا یہاں ایک ایسی سی ناشکور ہے کہ بیچارے مترجم کی دلشکنی تو ایک طرف اُسکو یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں کسی کتاب کا مترجم ہوں۔ یہ کہہ کر اُسے جو جاں گسل طعنے سننے پڑتے ہیں، وہ اُسی کا جی جانتا ہے۔ مثالوں کی حاجت نہیں: میں آپ بیتی عرض کرتا ہوں، کہ میں نے اتنا کے سفر یورپ میں ایک "قلمیافتہ" بزرگ کے سامنے، جو فی الجملہ اُردو کے خیرخواہ اور اُسکی حالت پر آہ سرد بھرنے والے تھے، ایک بہترین کتاب کے ترجمہ کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے زہرخند فرماکر انگریزی کا ایک ذو فقرتین فقرہ سرکردیا۔ جسکے معنی اُردو میں یہ ہوتے ہیں، کہ مترجم ہمیشہ دغاباز ہوتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ اسکے بعد غریب مترجم کو اسکے سوا چارہ نہیں کہ وہ ریل کے نیچے اپنا سر رکھدے مگر

این شعلہ ہند گرم خیز است اینجاست کہ آفتاب تیز است

یورپ میں، جو ہم سے صدیوں آگے بڑھا ہوا ہے، یہ کیفیت ہے کہ ایک خوش نصیب کسی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے: لوگ اُسکو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اخباروں میں اُس کا چرچا ہوتا ہے، رسالوں میں ریویو نکلتے ہیں، اعیان ملک اور عمائد سلطنت اُسکی قدر کرتے ہیں، بادشاہ کی طرف سے ذاتی قدر یہ ہوتی ہے کہ وہ نائٹ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ چند ہی روز میں مالامال ہوجاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کو اب ترجموں کی چنداں ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ عروج علمی کے زرین زینے یعنی ترجمہ و تالیف سے گذر چکا ہے اور اب تصنیف کے مقام امتیاز پر کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے۔ اور بالکل بجا بجا رہا ہے۔ ویدنی ہے میری بدقسمتی کہ میں قعر مذلت میں [illegible] ادبار میں گرا ہوا اُن لوگوں کو ذلیل سمجھ رہا ہوں جو ابھی زینہ تک نہ پاؤں رکھ چکے ہیں، [illegible] کہ ہمارے مقابلہ میں یورپ صدیوں بڑھا ہوا ہے، اُن تک پہونچنے میں [illegible] اس وقت

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسا راستہ اختیار کریں جس سے ہم منزل مقصود تک جلد از جلد پہونچ سکیں غور کرکے دیکھیے یہ راہ سوائے اسکے نہیں کہ ہم بالفعل ترجموں کے ہو رہیں

مصلحت بیں من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگزارند و سر طرۂ یارے گیرند

تالیف و تصنیف کا وقت پیچھے آتا ہے۔ پہلے مسالمتہ جمع کیجیے تو پھر محل بنانے کا فکر کیجیے۔

کیا یہ افسوسناک (بلکہ اگر مجھے مطعون نہ کیا جائے تو شرمناک) امر نہیں ہے کہ جو کام مسلمانوں کے کرنے کا ہے وہ عیسائی کرتے ہیں۔ پھر ستم یہ کہ اگر انکی محنت پر کوئی غریب محنت کرکے وہی چیز مسلمانوں کے گھروں تک پہونچاتا ہے تو بجائے اسکے کہ وہ قابل شکریہ ہو محض مترجمی کے جرم میں سزائے نا قدری پاتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کلیہ کا مستثنا بھی ضرور ہے۔ مگر ایسے خوش نصیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ عرب اور مسلمانوں کی تاریخ لکھنا ایشیا کے مسلمان کا کام ہے یا یورپ کے عیسائی کا؟ مسلمان موجد تاریخ کہلاتے ہیں لیکن زمانہ حال میں موسیو سیدیو وغیرہ "تاریخ عرب" لکھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم انکے مرہون منت نہ ہوں۔ مولوی حاجی ظفر الملک صاحب علوی اسکا ترجمہ کراتے اور دلکش شکل و صورت میں شایع فرماتے ہیں! کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کے ممنون احسان نہ ہوں۔ یہی ترجمہ اسوقت میرے زیر نظر ہے اور اسی پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے بااظہار کسر نفسی اس کا اعتراف ہے کہ مجھ جیسا خاک نشین صحرائے گمنامی اسکا اہل نہیں ہے کہ اتنی خطیر ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ لیکن جو حضرات دیوانہ و مجذوب لوگوں کی بڑ سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں وہ اگر مجھے بھی اسی زمرہ میں سمجھ لیں تو میں ان کا ممنون ہوں گا۔

تاریخ عرب کی شان یہ ہے کہ موسیو سیدیو نے اسے اپنی زبان (فرنچ) میں لکھا، اور علی پاشا مبارک سابق ناظم تعلیمات مصر نے اسکو عربی میں منتقل کیا۔ اب مولوی حاجی ظفر الملک صاحب علوی کی سعی سے عربی ڈھیلی ڈھالی عبا کو چھوڑ کر لکھنؤ کے تنگ و چست تن زیب آگرہ میں جلوہ گر ہوئی ہے ایک کہنے والے نے کہا کہ ترجمہ در ترجمہ میں کیا لطف ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہی جو مے دو آتشہ میں ہوتا ہے۔ جواب ملا کہ ہوش میں آؤ، کیا تمھارے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں کہ ایک بات ٹیلیفون میں خود نائل کی زبان سے سنو، اور وہی بات قاصد تم سے کہے۔ آخر اسی ہندوستان کے پنڈت برہم (صاحب گلزار نسیم) اس تمنا کو سینے میں لیے ہوئے نہیں مر گئے کہ "اپنے منہ سے جواب دیدے" لیکن اس جملہ معترضہ کو معنی آفرین حضرات کے سپرد کیجیے، اور ترجمہ کتاب کی طرف توجہ فرمائیے

علی پاشا کی عربی سے جناب مولوی عبد الغفور خاں صاحب رامپوری اور جناب مولوی محمد حلیم صاحب

انصاری رودولوی نے ترجمہ کیا ہے - میرے جیسے گمنام کی ایسی قسمت کہاں کہ جناب مقدم الاسم سے شرف ملازمت حاصل ہو، جناب مولوی محمد حلیم صاحب سے مجھے عزت نیاز حاصل ہے - ان دونوں بزرگواروں کا نام نامی ترجمہ کی کافی ضمانت تھی؛ حضرت حاجی صاحب کی احتیاط کو دیکھیے کہ علامی سید سلیمان صاحب ندوی سے صداقت نامہ لیکر مہر کرالی - اس صورت میں ترجمہ بہترین ترجمہ سمجھے جانے کے قابل ہے بدیں بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس -

میں نے اوپر یہ شکایت کی ہے کہ ترجموں کی قدر نہیں ہوتی، مگر الحمد للہ کہ جناب حاجی صاحب بہت خوش قسمت نکلے کم از کم مجھ سے تو کہیں زیادہ خوش نصیب نکلے کہ حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی سفارش اور مفتی محمد امین صاحب کی تائید سے حضور والیۂ بھوپال دامت اقبالہا کی سرپرستی نصیب ہوگئی - اگر ایک طرف میرے خیال کا بطلان ہوا، تو دوسری طرف میرا یہ قول صحیح نکلا کہ بغیر بادشاہ کی سرپرستی کے ترقی علم وفن معلوم - علیا حضرۃ نہایت غائر نظر رکھتی ہیں - اگر کتاب اور ترجمہ بہترین نہ ہوتا، تو مجھے شبہہ تھا کہ اُس بارگاہ عالیہ سے عطیۂ خاص مرحمت ہوجاتا - میں اگر تہی دامن رہا تو اسکی وجہ صاف ہے؛ تجھ سے کیا مند تھی اگر تو کسی قابل ہوتا -

کتاب کے شروع میں جناب مترجم عربی کا دیباچہ ہے؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بیس برس کی محنت وجاں فشانی کے بعد لکھی گئی ہے - ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کیوں اچھی نہ ہوگی - یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کتاب کی تصدیق وتوثیق کے لیے لکھا ہے، مگر میں جناب پاشا کی اس رائے سے ہرگز متفق نہیں ہوں کہ "اس کتاب سے اہل یورپ پر بہت بڑا اثر ہوا - اہل یورپ کے ذہنوں میں عربوں کی جو پرچھائیاں جمی ہوئی تھیں وہ دفعۃً کافور ہوگئیں" - مجھے حضرات یورپین سے تبادلۂ خیالات کا زبانی وتحریری اتفاق ہوا اور ہوتا رہتا ہے - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان گورے چٹے صاحبوں کی گلیم بخت سیاہ بنی جا چکی ہے - موسیو سیدیو کے انطباغ کے چھینٹوں سے تو کیا اثر ہوسکتا ہے، آب کوثر وتسنیم بھی اُسکو سفید نہیں کرسکتی - جب تک پادریوں، بالخصوص رومن کیتھولک کے دَم میں دم ہے اور "اُحمق درجہاں باقی ست" اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی اُنکے دل سے نہیں نکل سکتی - اسکے مختلف وجوہ ہیں - اقتضاء زمانہ موجودہ [illegible] مذہب دینی پس پردہ ہے اور ذہانت اور ہماری اہانت سب سے آگے آگے - لیکن اگر [illegible] سو برس تک ہمارا یورپ میں تفوق، شمشیر بازی اور جوتہ کاری (میرے گنوار [illegible] یا تخیل فقرہ کہتا ہوں تو صحیح کہتا ہوں) اس کا اصل باعث ہے - آپ کہیں [illegible] یہ احسان تو یورپ پر ہے

کہ ہم نے یورپ کو آدمیت کی طرف رہنمائی کی۔ لیکن پھر غور کیجیے: یہ کہتے ہوئے شاید آپ اسکو بھولتے ہیں کہ مفتوحین کی نگاہ میں چونکہ فاتحین کا سب سے بڑا جرم فتح کر لینا ہوتا ہے، اس لیے اُن پر فاتح جو احسان کرتا ہے وہ ملک نکل جانے کا کفارہ نہیں ہو سکتا، لہذا وہ احسان فراموش بھی ہوتے ہیں۔ تزک بابری پڑھیے۔ ہندوستان کی وہ حالت دیکھیے جو مغلوں کے حملہ کے وقت تھی۔ اور مقابلہ کیجیے اُس حالت کا جو بابر کے سپوتوں نے پیدا کر دی تھی؛ اور پھر اخوان وطن کا اپنے ساتھ سلوک دیکھیے۔ یہ بسبیل تذکرہ ہے اور برادرانہ شکایت۔ جامیان اتحاد ہندو و مسلم اسی کو لیکر مجھے مطعون نہ فرمائیں۔

فارسی کی ایک مثل مشہور ہے کہ "جبل گردد، جبلت برنگردد" اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ جو اقوام جس نسل سے تعلق رکھتی ہیں وہ اپنی خصوصیت کو ہزارہا برس گذرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑتے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جب ایک نسل میں دوسری نسل کا خون آ ملتا ہے تو گو ایک نسل کی خصوصیات کمزور ہو جائیں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ بالکل نکل جائیں۔ سامی اقوام کی خصوصیات یہ بتائی جاتی ہیں کہ "وہ قدامت پسند ہیں، ہمیشہ قدیم رسموں کے پابند رہنا چاہتے ہیں، اپنے خیالات کے پکے ہوتے ہیں، کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ دیندار ہوتے ہیں، تھوڑا و تعصب مذہبی میں بڑے بڑے کام کر گذرتے ہیں۔ فنون لطیفہ سے انھیں تعلق نہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا انھیں خیال نہیں آ سکتا۔" مگر قابل رشک ہیں عرب کہ جو کارنامے دوسروں، مثلاً ایرانیوں کے ہیں، وہ بھی انھیں سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک رحمت ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین کے طفیل میں نصیب ہوئی۔ ورنہ کہاں عرب کے بادیہ نشیں، اور کہاں دہلی کا "بہشت زمیں لال قلعہ" یوروپین کی لکھی ہوئی تاریخوں میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کی "تاریخ عرب" کل مسلمانوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ اسی طرح زیر نظر "تاریخ عرب" ہے۔

موسیو سیدیو نے عرب کا جغرافیہ بیان کرنے کے بعد تاریخ عرب قبل از اسلام بیان کی ہے حق یہ ہے کہ جہاں تک اختصار کام دے سکتا تھا اُنھوں نے حق ادا کر دیا ہے۔ عربوں کے اُنھوں نے تقریباً وہی خصائل بیان کیے ہیں، جو میں اوپر سامی اقوام کے ڈاکٹر پریس کی کتاب سے مختصراً بیان کر آیا ہوں، مگر جس بات نے کہ مجھے اُنکا ممنون کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کو سراپا عیب نہیں دیکھتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ (یعنی اعراب قبل از اسلام) حریت و آزادی کے دیوانے عزت نفس اور شرافت کے عاشق تھے۔ بلکہ سافرین اور درماندوں کی قوافع اور نہایت

کو تمام قوانین انسانیہ کا جامع قانون سمجھتے اور اس پر اپنی قوم میں بڑا فخر کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے حقوق کے ثبوت میں صرف اپنی تلوار پر بھروسہ کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ مصنف علام نے ذرا اور تفصیل سے کام نہیں لیا، ورنہ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے کہ فی الحقیقت یہ بادیہ نشین ایسے پاکیزہ لوگ تھے کہ جیسے بارش کی بوندیں۔ گو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن میں عیوب بھی تھے، اور وہ کون ہے جس میں عیب نہیں ہوتے۔ انکی خصوصیات پر اگر غور کیا جائے تو عجیب متضاد کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ لڑکیوں کو کھود کر گاڑ دیتے ہیں، اور دوسری طرف عورتوں کی حمایت میں اپنی جانیں دیدیتے ہیں۔ دنیا کی بعض اقوام، جو اپنے آپ میں سوائے خوبیوں کے کوئی نقص نہیں دیکھتیں، شی ویلری کو اپنا مال سمجھتی ہیں؛ حالانکہ یہ انھیں بادیہ نشیں اعراب (میں لفظ "اعراب" دانستہ کہہ رہا ہوں) کا مال مسروقہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اعراب قزاقی پیشہ نہ تھے۔ مگر انکی صفتِ مہمانداری کو بھی تو دیکھنا چاہیے کہ بادشاہ کا نخچیر ہرن ایک کے خیمہ میں جان بچا کر گھس آئے تو میزبان دے اپنی جان دینے پر تیار ہو جاتا ہے مگر اپنے ناخواندہ مہمان پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ آپ اُسے کہیں کہ جہالت ہے! میں کہوں گا کہ کرامت ہے۔ فرض کر لیجیے کہ یہ تجارت پیشہ قوم وحشی تھی، لیکن خدا کے لیے ایک ہی صفت افریقہ کے حبشیوں میں، امریکہ کے ریڈ انڈینس میں دکھلا دیجیے۔ ایک طرف یہ فرزندان فطرت اتنے آزاد ہیں کہ شہروں کو زندان اور شہریوں کو قیدی سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف یہی اپنے شیخ کے تابع فرمان نظر آتے ہیں، خواہ وہ بیٹھ پیچھے "لعنت اللہ علیک یا شیخ" ہی کہیں۔ میں نے ابھی اُنکے لیے لفظ "آزاد" کہا ہے۔ یہ تیرہ سو برس کا ذکر نہیں کرتا، آج کا مذکور ہے کہ اگر آزادی کے معنی آپ کو سمجھنے ہوں تو جائیے، کتاب بادیۂ عرب کا مطالعہ کیجیے مجھے خود یہ شرف نصیب نہیں ہوا، حاجی ظفر الملک جیسے بزرگوں کی زبان سے سنتا ہوں کہ یہ "ہری چگ" کمبل، بلکہ آسمان، کی چھت کے نیچے رہنے والا جب ننگی پیٹھ گھوڑے پر سوار ہو کر اور نیزہ ہاتھ میں لیکر نکلتا ہے تو ہمارے کنگ جارج کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ آہ! یہی آزادی تھی جسکی بیخ دنیا کو اسلام خراسانی کے ذریعہ سے اُکھڑوا یا گیا۔ اور جو کچھ کہیں گڑی دبی رہ گئی تھی اُسکو برابر کے ہاتھ جلوا ڈالنے کی تدبیر کی گئی، اور پھر۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ کیا خوب کہا ہے موسیو سید یو نے "جب" معاشرت بدویہ اور صحرائی زندگانی کو پسند کرتے رہے اُن میں ..... فرق نہیں بڑھ کر اسکے متعلق کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔

جناب مصنف نے عربی قبائل کا ذکر جس ماقبل و دل طریق سے کیا ہے وہ اُنھیں کا حصہ تھا، "عرب تابعہ للعرب" کے عنوان کے نیچے وہ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد جب بہت بڑھ گئی، تو یہ لوگ قبائل میں منقسم ہو کر کچھ تو بادیہ میں چلے گئے۔ خیموں میں رہنے سہنے کی بدوی عادت اختیار کرلی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بنو اسمٰعیل نے کبھی بدویوں کو اپنے قبیلہ میں شامل کیا ہو۔ اسی کے متصل وہ فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ حرم کے پتھر اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں کہیں قیام کرتے وہاں بیت اللہ کی عظمت کے لیے اُس کا طواف کیا کرتے تھے۔ بعد میں اسی دستور کی بدولت سے وہ پتھروں کی پرستش کرنے لگے۔" عربوں کی بت پرستی کی یہ توجیہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے عرب میں بت پرستی کا بانی ابن لحی تھا (اگر میں غلطی پر ہوں تو کوئی صاحب صحت فرمائیں) حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جرم میں اس شخص کو بہت برا فرمایا ہے جسکا حقیقت میں یہ شخص مستحق تھا۔ یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ یہ بلا بت پرستی بھی عجم ہی سے عرب میں گئی تھی۔ رفتہ رفتہ بڑے بڑے آدمیوں کے بُت بنے اور پوجنے لگے۔ یہ بُت کیا تھے اَن گڑھ پتھر تھے۔ اگر کہیں یہ ویسے ہی خوبصورت بُت ہوتے جیسے بُدھ مہاراج کے ہیں، یا آجکل جیسے النقل کالاصل ملکہ معظمہ یا مسٹر گلڈسٹن کے بُت ہوتے تو جو کیفیت ہوتی اسکے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان پتھروں کی توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی واقعہ کی یادگار میں پتھر گاڑے جاتے تھے وہ مرور زمانہ کے بعد پوجنے لگتے تھے۔ غرض جہاں تک میرا خیال ہے مصنف علام کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ لیکن یقیناً وہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے

آگے بڑھکر موسیو سید یو قبل اسلام کی تاریخ کے ذیل میں بادشاہان بابل و نینوا و روم و فارس کے حملوں اور آپس کی جنگوں، کامیابیوں اور ناکامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ حصہ نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اور اس قابل ہے کہ اسے بغور پڑھا اور یاد رکھا جائے۔ عکاظ کے میلہ میں جس طرح شعرا اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے اُسکی لفظی تصویر جو مصنف علام نے کھینچی ہے نہ معلوم وہ کہاں سے پائی۔ چونکہ یہ کتاب آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے اس میں قصائد معلقہ کی نسبت وہی فرسودہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "وہ بیش قیمت کپڑے پر طلائی حروف میں لکھے جاتے اور حفاظت سے پائی اور نسلاً بعد نسل باقی رہنے کے واسطے خانہ کعبہ کے دروازہ پر لٹکائے جاتے تھے۔"

عمان میں برہمنوں کے مذہب کا رائج ہونا ایک ایسی عجیب و غریب بات موسیو سید یو نے لکھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا کہ جناب مترجم (ڈاکٹر حاجی) نے اسکو حاشیہ میں لغو قرار دیا۔ یہ وہ غلطیاں ہیں جو یوروپین علما، اپنی ذہانت کے زور میں اکثر کر جاتے ہیں

مصنف علام نے ایک بحث یہ قرار دیا ہے کہ عرب کی آس پاس کی سلطنتیں، یوجہ کسریٰ و قیصر کی باہمی جنگ کے ضعیف ہو چکی تھیں۔ یہ صحیح ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ سلطنتیں، یگاں یگاں نئے اور ننگے عربوں کے مقابلہ میں بھی ضعیف تھیں۔ کیا یہ قدیم سلاطین اُس زمانہ کے آلات حرب سے مسلح نہ تھے، اور کیا اُنکی افواج قواعد حرب سے پوری واقف نہ تھیں؟ اگر ان باتوں پر غور کیا جائے تو یہ "ضعیف سلاطین" ہر طرح برہنہ اعراب کے مقابلہ میں ہاتھی اور چیونٹی کی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ دُور نہ جائیے، اسکو غور کر لیجیے کہ گو اسپین اسوقت عیسائی یورپ کی نسبت ضعیف ترین سلطنت ہے؛ مگر نہ اتنی کہ حضرت ابن عبدالکریم ایدہ اللہ منصورہ العزیز (امیر ریف) کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اگر اعراب اور اہالی ریف کے غلبہ کو اسلام کا معجزہ نہ سمجھا جائے، تو نظام کی خوبی اور ایک مقصد خاص کے لیے جان دیدینے کا کرشمہ تو ضرور ہے۔ اسی فقدان نظام اور ایک ہی نصب العین پر اتفاق نہ ہونا وہ چیز ہے کہ مسلمان اس پر جتنا رویں سیاہ کریں، مگر

غرفی اگر گریہ بسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

ضرورت ہے فعل کی، وہ کون کرے؟

مقالۂ دوم میں حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، قرآن مجید اور دین اسلام سے بحث کی گئی ہے، اور حق یہ ہے کہ بہت خوب بحث کی ہے۔ اس میں غلط فہمیاں ہیں تعصب نہیں۔ مصنف علام کے زلات کو حاشیہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اسکا علاج البتہ نہیں ہے کہ کتاب کے لکھے جانے سے زمانہ کئی برس ترقی کر چکا ہے، اور علماے فرنگ کو بہت کچھ نئے انکشافات ہو گئے ہیں۔ مگر بہرحال یہ قابل دید ہے؛ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان جناب مصنف کے شکر گذار نہ ہوں۔

مقالۂ ثالث ہے "فتوحات امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم" جہیں سے "تاریخ اسلام" شروع ہوتی ہے۔

"تاریخ عرب" کا اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ وہ بہت مختصر ہے۔ باوجود اسکے اگر اُس میں کوئی خوبی ہے تو یہی کہ وہ بہت مختصر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اگر کوئی تفصیل سے لکھنے بیٹھے تو بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں نہیں سما سکتی۔ موسیو سیدیو کا یہ کمال ہے کہ اُنھوں نے ایسا اقل و دل اختصار کیا ہے، کہ اس سے زیادہ بہتر، اختصار ناممکن تھا۔ گو اس سے بعض وقت [illegible] کارڈ سائز پر ایک بڑی فوج کا فوٹو لیکر دیکھیے، تو اُلجھن کی تصویر ہو گی۔ [illegible] کا قصہ اُنھوں نے صرف چار مختصر صفحوں میں ختم کر دیا ہے۔ اور اُس زمانہ باسری فضلوں [illegible]

کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ترتیب ہمیں اسلیے اجنبی معلوم ہوتی ہو کہ ہم اسکے عادی نہیں ہیں۔
امیر المومنین و امام المتقین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقشات کے متعلق ایک بات میرے ذہن ناقص میں ہے جسکو میں یہاں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں غلطی ہو تو امید وار ہوں کہ میری اصلاح کی جائے۔ اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں ایک مدت مدید سے منافقت چلی آتی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے نبوت کے لیے بنو ہاشم کو انتخاب فرمایا (واللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ) لیکن، اور بالخصوص مورخین یورپ کا یہ خیال ہے کہ بنو امیہ نے بادلِ ناخواستہ اس نبوت کو تسلیم کیا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، خلفائے اول و دوم (رضی اللہ عنہم اجمعین) بنو امیہ میں سے نہ تھے۔ خلیفۂ سوم (رضی اللہ عنہ) اس خاندان سے ہوئے۔ اُنھوں نے نادانستہ بنو امیہ کی پرورش فرمائی۔ خلیفۂ چہارم (رضی اللہ عنہ) کو بوجوہ یہ ناگوار ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ کو حضور امیر المومنین سے خاندانی وجوہ پر منافست پیدا ہوئی۔ حضرت امام المتقین حسن رضی اللہ عنہ کا قلع، واقعۂ کربلا، وغیرہ وغیرہ اسی منافست خاندانی کا نتیجہ ہے۔

مصنف علام نے یہ صحیح فرمایا ہے کہ "شوق جہاد" کے لیے بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہمارے یہاں ہیں؛ اور سرداران فوج حملوں سے پہلے مسلمانوں کو یہ بشارتیں سناتے تھے (الفاظ میرے ہیں اور مقصد مصنف کا) لیکن یہ بات مسلمانوں ہی کے جہاد کے لیے مخصوص نہیں ہے کہ وہ قال اللہ و قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سناتے ہیں، اور انجام کار اُسکو کرکے دکھلا دیتے ہیں۔ حیرت و مسرت ہے اُن پر جو غربائی امداد کو فوجکشی اور لاکھوں بندگان الٰہی کی خوں چشی و خوں چکانی کا بہانہ بناتے اور انجام کار اپنی جوع الارض کی شہوت کو پورا کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وہ حقیقی تہذیب پھیلانے کے لیے خالق کا حکم سناتے ہیں، اور یہ مخلوق کے بنائے ہوئے اقتصادی اصول کا وعظ کرکے مزدوروں کے خون سے سرمایہ داروں میں بدمضمی پیدا کرتے ہیں۔ انصاف پسند اسکے ہیں کہ صواب پر کون ہے اور ثواب کس کو ملنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کارناموں نے کتاب میں نسبتہً زیادہ جگہ لی ہے۔ اور فتوحات عمر (اعظم رضی اللہ عنہ) تو اسی قابل تھے کہ اُنھیں تفصیل سے بیان کیا جائے۔ لیکن پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ان فتوحات کی کیا ضرورت داعی ہوئی تھی۔ خدائی فوجداران یورپ نے اب یہ قرار دیا ہے کہ (حضرت) "خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) نے عربوں کی طبائع کو دیکھا تو خیال آیا کہ ان لڑاکوں کو اگر انکے مذاق کے موافق کام پر نہ لگایا گیا، تو ممکن ہے کہ یہ آپس میں

لڑ مریں، اور یوں اُس دین کو صدمہ پہونچے جسکا قائم رکھنا اُنکا فرض اولین ہے - اس لیے اُنھوں نے اور اُنکے بعد والوں نے روم و ایران پر ہلہ بول دیا" بات کام کی ہے، اس سے حضرت صدیق اکبرؓ کی دور اندیشی قابل داد بن گئی، اور دُور کی کوڑی بھی نکل آئی۔

اصول موسیو سیدیو کے بعد تصنیف فرمایا گیا ہے، اسی لیے اُنھوں نے اپنی تصویر میں یہ رنگ نہیں بھرا - ذرا غور سے دیکھیے تو حقیقت حال معلوم ہوتی ہے کہ عرب (شریف) کی آستینوں میں دو سانپ روم اور ایران، موجود تھے - عرب الافواج نے کعبہ شریف کو مسلمانوں کا مرکز قرار دیدیا تھا - چند ہی روز ہوئے تھے کہ اصحاب فیل اس پر حملہ کر چکے تھے، روم و ایران تو بہت ہی مہیب بلائیں تھیں - اس لیے مقدم تھا اس مرکز کو بچانا، دونوں طرف سے برابر کی دھمکیاں تھیں اور دونوں کی طرف سے پورا پورا اندیشہ - کعبہ کی حفاظت کے لیے اشد ضروری تھا کہ ان دونو کے خدشہ کو مٹا دیا جائے - کیونکہ ظاہر تھا کہ اگر یہ باقی رہے تو مسلمان اور دین اسلام باقی نہ رہیگا۔ چنانچہ سب سے پہلے یہی کرنا پڑا - اُدھر صقلیہ اور اُدھر لیبیا تک کی فتوحات کو ذرا غور سے دیکھیے اُسی کعبہ کو بچانے کی تدابیر کی شاخیں ہیں: باقی ہیچ - اب آپ موسیو سیدیو کی تفاصیل فتوحات کو پڑھیے تو آپ اور زیادہ لطف اُٹھائیں گے - مگر ذرا ٹھہریے؛ مجھے ان سر باز جاں نثاران اسلام سے اپنا مقابلہ کر لینے دیجیے - آج کعبہ کو کفار کے قدموں سے نجس کرانے میں سب سے پیش پیش میں ہوں اور حج کرنے والوں میں سب سے آگے آگے - میری تصویر علامہ سر اقبال کا ایک مصرعہ ہے کہ "بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ" (صلی اللہ علیہ وسلم) میری ہی سعی بازو سے

لگے بُتپرستی کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشت بنیادِ کلیسا بنگئی خاکِ حجاز

- میں ہوں کہ اس سودے پر نہ صرف نازاں، بلکہ شفاعتِ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا امیدوار - آہ گر از پس امروز شود فردائے - کون کہہ سکتا ہے کہ اُس صادق و مصدوق (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول صادق نہیں ہے کہ خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم -

صفحہ ۱۲۹ پر جناب مصنف نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ع [illegible] میں حضرت خالد (رض) کی جانب سے اُس زمانہ کے کچھ رنج تھا جب سے کہ اُنھوں نے [illegible] کر دیا تھا" یہ واقعہ بالکل غلط ہے یورپ کے مورخین اسی قسم کی سحر کاریاں کیا کر [illegible] کی للّٰہیت اور ایک مصنف الحین کی جانبازی سے اگر قطع نظر کر بھی لیا جائے، تو کیا اس [illegible] اظہار، اور اس کا لازمی نتیجہ اسلامی فرض میں اہمال نظام فوجی کا مناقی نہیں ہو سکتا؟ مصنف علام ابھی پانچ صفحہ پہلے

اس کا اعتراف کر آئے ہیں کہ عربوں میں نظام قائم ہو چکا تھا، حضرت سیف اللہ کا اُسی تن دہی سے اسلام کا ناصر رہنا اس قول کی تردید کے لیے کافی تھا۔ جناب مترجم نے اپنے حاشیہ میں اسکا دفعیہ کیا ہے۔ اس حاشیہ کے الفاظ سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ "حضرت عمرؓ نے دیکھا تھا کہ خالدؓ کو پیا پے فتوحات ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں خالدؓ کی عظمت ضرورت سے زیادہ جمتی جاتی ہے، جس سے اسلام میں ایک بڑا فتور پڑ جانے کا اندیشہ تھا، لہذا وہ معزول کر دیے گئے۔ جناب مترجم سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان والا کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہوں کہ آپ کو وہی خیال پیدا ہو جو مطلق العنان بادشاہ عباسیوں، یا دُور نہ جائیے، جہانگیر کو پیدا ہوا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی معزولی کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ وہ حملہ سخت کرتے ہیں، اور اُس میں جانوں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ (الفاظ میرے ہیں)

صفحہ ۱۳۰ پر جناب مصنف کے اس قول سے مجھے اختلاف ہے کہ یرموک کی لڑائی میں جو فوج ہرقل نے بھیجی تھی اُس میں مرتد جبلہ بن ایہم اس لیے شامل ہوا تھا کہ وہ اُس توہین کا بدلہ حضرت عمرؓ سے لے جو اُسکی ہو چکی تھی۔ ہمارے پاس تو اسکے ثبوت موجود ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے ارتداد پر قائم رہا، مگر اُسے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت ہی نہیں پڑی ورنہ وہ توبہ کرتا۔

صفحہ ۱۳۳ پر جناب مصنف فرماتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ نے بیت المال کے حساب و کتاب کے متعلق حضرت سیف اللہ پر الزام قائم کیا اور انکو امارت لشکر سے معزول کر دیا"۔ یہ واقعہ میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ مگر مجھے اپنی نا قابلیت کا اعتراف ہے۔ شاید کوئی اور صاحب اسکی تصحیح و تغلیط کر سکیں مصنف علام یہ نہیں فرماتے کہ اُن سے مطالبہ ہوا یا نہیں، یا آنکہ اُنکی جائداد ضبط کی گئی یا کیا ہوا۔ مگر اسی عبارت سے متصل ہی فرماتے ہیں کہ "حضرت خالدؓ نے اسکو برداشت کیا، یہاں تک کہ ۲۱ھ میں وفات پائی۔ اسوقت اُنکے ترکہ میں جو کچھ باقی رہا وہ صرف ایک گھوڑا اور کچھ ہتھیار اور ایک لونڈی تھی، باقی کچھ نہ تھا"۔ عبارت زیر خط سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت خالدؓ نے بیت المال کا روپیہ خورد برد کیا ہو۔ حضرت سیف اللہؓ کی وفات کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ نزع کے وقت آپ زار و قطار رو رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ "کیا موت کے ڈر سے روتے ہو؟" فرمایا کہ اس پر روتا ہوں کہ عورتوں کی طرح بستر پر مر رہا ہوں"۔ یعنی میدانِ جنگ میں شہید ہونا چاہیے تھا۔ کیا ایسے ہی لوگ تغلب کیا کرتے ہیں؟

صفحہ ۱۳۹ پر مصنف علام نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے نہر سوئز کھودنے اور نہر

کا ارادہ کیا تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مانع ہوئے کہ اس سے مکہ و مدینہ تک رومیوں کے لیے دروازہ کھل جائیگا۔ قطع نظر اسکے کہ اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اسلامی فتوحات کا تمام تر منشا یہ تھا کہ کسی طرح کعبہ شریف محفوظ رہے، آج دنیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیش بینی اور دور اندیشی کو براہ العین دیکھ رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امیر عبدالرحمن والی کابل کی یہ وصیت کہ "ملک میں ریل نہ بنانا" ایسی ہی دُور اندیشی پر مبنی نہیں ہے۔

غنیمت ہے کہ جناب مصنف نے کتبخانۂ اسکندریہ کے جلائے جانے کی مختصراً تردید کردی ہے، اس بیہودہ خیال کی اتنی تردیدیں ہوچکی ہیں کہ اب کوئی یوروپین بیباک دل یہ الزام مسلمانوں پر لگانے کی جرأت نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ موسیو سیدیو وہ پہلے آدمی ہوں جنھوں نے پہلی مرتبہ تردید کی ہے۔

صفحہ ۱۵۱ پر یہ واقعہ مجھے کچھ نیا سا معلوم ہوتا ہے کہ زیاد ابن ابیہ نے حضرت امیر معاویہؓ کی اس بدعت کی مخالفت کی تھی کہ خلافت کو اپنے خاندان میں موروثی کردیں۔ کم از کم مجھے اسکا علم نہیں۔ یہ مسلم کہ حضرت امیر معاویہؓ نے زیاد کو اپنے نسب میں شامل کرلیا تھا، اُدھر زیاد کی پولٹیکل اور زبان آوری کی قابلیت بھی مسلم، لیکن حضرت امیر معاویہ کے جیتے جی اُسکی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ "خلافِ رائے سلطاں" رائے رکھ سکتا۔

اس سوال کو چھوڑ دیے کہ بنو اُمیہ کو سلطنت جائز طریقہ سے حاصل ہوئی یا ناجائز طریقہ سے، میرا ادعا یہ خیال ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی کے ساتھ مسلمانوں نے انصاف نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اُسکے تاریک پہلو کو لیتے رہے۔ بلکہ حالت یقیناً اسی کی متقاضی تھی کہ حجاج ہی جیسا "گماشتۂ شدید" حاکم بنایا جاتا۔ یہ یقینی بات تھی کہ اگر اس شخص کا وجود نہ ہوتا تو بنو امیہ کی سلطنت شروع ہی شروع میں پارہ پارہ ہوگئی ہوتی۔ موسیو سیدیو سے یہ اُمید رکھنی تو فضول تھی کہ وہ حجاج کے متعلق تفصیل سے کام لیتے، مگر میں مسلمانوں کے نوجوانوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ حجاج کے متعلق وہ کنیدو کاوی سے کام لیں اور اُس غریب کی اصلی صورت نمایاں کردیں۔ بہت ممکن ہے کہ اُسکے سیاہ چہرہ پر کوئی نہ کوئی سفید دھبا نکل آئے۔

مجھے قدم قدم پر موسیو سیدیو کی اختصار پسندی کی شکایت ہے۔ شروع ہی سے اُنکا مقصد اختصار رہا ہے۔ وہ مجبور تھے کہ دریا کو کوزہ میں بند کریں۔ فتح اور فتنہ کے لیے اُنکے یہاں دو صفحوں سے زیادہ نہ نکل سکے۔ حالانکہ یہ واقعہ صدیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ واقعہ بجز فتح ملک اسپین ہوا۔ لیکن میں کسی ملک کے فتح ہونے کو اتنی اہمیت نہیں

دنیا جتنی کہ اُس ملک کو قبضہ میں رکھنے اور اُسکے نظم ونسق کو دیتا ہوں۔ مہذا وہ مسلمان کا فرنسبت ہے جو فاتح افریقیہ کے احسان کو نہ مانے؛ لیکن ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں اصلی محسن حضرت موسیٰ ابن نصیرؒ ہیں (اللھم برد مضجعہ) یہی اصلی فاتح ہیں اور یہی وہاں کے ناظم۔ ممالک کے فتوحات کے بعد فاتحین کی بڑی ضرورت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ کہیں آرام سے اپنے پیر پھیلا سکیں۔ اور جلب معیشت کے لیے کوئی نیا میدان پائیں۔ شاید اسی کو زمانہ حال میں کالونی زے شن کہتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی ضرورت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بناء فساد محض کالونی زے شن تھی۔ اس حکمت کو اُس زمانہ میں سب سے پہلے سمجھنے والے حضرت موسیٰؒ ہی تھے کہ مصر وایران وغیرہ باوجود اپنی وسعت کے مسلمانوں کے لیے تنگ ہے۔ اسکے لیے اُنھوں نے افریقیہ کو تاکا۔ اُسکو از سر نو فتح کیا، مسلمانوں کو یہاں آباد کیا۔ اصلی باشندوں کی اسلامی تعلیم کا انتظام کیا، عربوں کو تحریص وتشویق کی کہ وہ یہاں کی عورتوں سے نکاح کریں، یہیں کے ہو رہیں۔ اسی زہیرٹ افریقیہ کے وحشیوں کو آدمی بنایا، اور عربوں کو گونہ فراغ بالی نصیب ہوئی۔ حضرت موسیٰؒ کی اصلی عظمت تو اسی واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مصنف علام کو یہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑا۔

موسیو سید یو نے ذرا بھی تحقیق سے کام لیا ہوتا تو وہ فتح اسپین کے معاملہ میں وہی پرانا دُکھڑا نہ روتے کہ حضرت موسیٰؒ خلیفۂ وقت کے مقہور ہوئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ واقعہ ہی غلط ہے؛ اور نہ معلوم کس (عرب یا غیر عرب) مورخ کا تصنیف کردہ ہے۔ کیا وہی شخص مقہور ہو سکتا ہے جسکو وہی خلیفہ اپنے ساتھ حج کو لیجائے؟ کیا میرے سوا کوئی اور صاحب اسکے متعلق ریسرچ کریں گے؟ میں بوڑھا ہوں اس بار کو نہیں اُٹھا سکتا۔ اگر کوئی صاحب تکلیف فرمائیں تو احسان ہوگا۔ اسی ضمن میں حضرت طارق ابن زیاد رحمہ اللہ کی آخری زندگی کے متعلق تحقیق کرنا بھی ضروری ہے۔ گو واقعیت پر مبنی نہ ہو، مگر مجھے بالکل یقین ہے کہ فاتح اندلس کی حالت ہرگز ہرگز ایسی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پردۂ دنیا سے بالکل محو ہو جائیں؛ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مہم پر پھر نہ بھیجے گئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مٹھی بھر آدمیوں کو لیکر اتنے بڑے ملک کو فتح کرلے، اُسکے عظمت وجلال کے لیے بڑی سے بڑی مہم بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ اُسکا تذکرہ خاص طور پر کیا جائے۔ اگر یہ دونوں معاملے یوں ہی ڈھکے چھپے رہے اور اس روشن زمانہ میں بھی لوگ یوں ہی پرانے مورخین کی نمک حلالی پر وہی کہتے رہے تو ایک طرف ایک خلیفہ اور دوسری طرف حضرت موسیٰؒ جیسا پاک نفس فاتح وناظم قیامت تک کے لیے بدنام رہے گا۔ کیا غیرتمند مسلمان (اگر غیرت کا نہیں مسلمانوں میں نام ونشان

رہ گیا ہو) اسکو گوارا کرتے ہیں؟

موسیو سیدیو نے (صفحہ ۱۷۵) یہ ستم ڈھایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو خلیفہ کے ہاتھ، یا خلیفہ کے حکم سے قتل کرایا ہے۔ میں بیانگ دہل کہتا ہوں کہ یہ واقعہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ بنو امیہ بُرے تھے یا بھلے (اور شاید ان میں بُرائی کا عنصر غالب نکلے) مگر اتنے محسن کش نہ تھے جتنے بنو عباس، یا کم از کم موسیو سیدیو اُنکو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

بنو اُمیہ کی سلطنت کا قصہ "پیرے بود، پیرے داشت، گم شد، بازیافت" کے اصول پر جناب مصنف نے ختم کر دیا ہے؛ حالانکہ یہی سب سے بڑی مہتم بالشان سلطنت تھی۔ عباسیوں پر کرتے ہیں تو مامون الرشید کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں اور انکی تعریفیں کرتے ہیں۔ مگر ہم مسلمانوں، کے نزدیک اُن کی عظمت مسلّم؛ مگر اسکو کیا کیجیے کہ اُن کا وہاں وہی رتبہ ہے جو ہمارے ہندوستان میں اکبر کا کہ بانی عظمت اور قائم سلطنت ہوا۔ مامون الرشید ہی تھے کہ جنھوں نے غیر ملکیوں (ایرانیوں) کو سلطنت میں دخیل کیا۔ جسکا انجام یہ ہوا کہ عباسیوں کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ بنو امیہ ہزار برے ہوں مگر اُنھوں نے اس بدعت سیئہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ سمجھتے اور جانتے تھے کہ دوسرے کے ہاتھوں مرنے سے اپنوں کے ہاتھوں قتل ہونا بدرجہا بہتر ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی متقیانہ پالیسی کی وجہ سے سلطنت اسلامی کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی تھی، لیکن انکے بعد کے حاجداروں نے اس حالت کو بغیر پرانے ٹیکس بڑھانے اور نئے ٹیکس لگانے کے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ عباسیوں کی طرح یہ نہیں کیا کہ مال تو ایک طرف، جان بھی نکھموں کے سپرد کر دی۔ بنو امیہ میں ایسے ہوشدار پیدا ہوگئے کہ جنھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ابو عباس کچھ ایسے جال میں پھنسے کہ ان کی لاش ہی اُس سے نکلی۔

تاریخ عرب کے صفحات ۱۸۰ (لغایۃ ۱۹۵ واقعے قابل دید ہیں۔ ان میں خلفاء عباسیہ کا طریق حکمرانی اور اُنکے محاسل اعمال عامہ اور انتظامات اندرونی، صنعت و حرفت و فلاحت، فنون بدیعہ و صناعیہ اور شان و شوکت کو نہایت خوبصورتی سے مختصراً بیان کیا ہے۔

یہاں تک میں نے کتاب پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ اسکو [illegible] دیکھ کر کہا ہے کہ میر صاحب کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ

جو اس شور سے میر روتا رہے گا [illegible] ہے گا

اس لیے میں آئندہ موسیو سیدیو کی اخبار کی تنقید کروں گا۔

مختلف فرق مبتدعہ کی ترقی اور اُنکی کا فرما جرائی کے ذیل میں صفحہ ۲۰۰ پر کہا گیا ہے کہ "کچھ علماء مفتون العقل اور فلاسفہ اور صوفیہ پیدا ہوگئے جو بواسطہ اعدام جمیع شہوات نفسانی اپنی ارواح کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھا کرتے تھے۔ اُنکا مذہب بھی پھیلا، خصوصاً فارس و اطراف میں خوب جاری ہوا" یہ فقرے ایسے ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اور یقیناً اسکے محتاج ہیں کہ ان پر مترجمان اول و دوم میں سے کوئی حواشی لکھتا۔ مصنف نے بحیثیت مورخ اور عیسائی ہونے کے اپنے نزدیک جو کچھ لکھا صحیح لکھا۔ ..... میرا یہ منصب نہیں ہے کہ اس پر کچھ کہوں یا لکھوں، بجز اسکے کہ اس فقرہ کے بعض حصے غلط فہمی پھیلانے والے ہیں۔

علوئین کے متعلق جو زیادہ تفصیل نہیں ملتی اسکی شکایت حضرت حاجی مولانا ظفر الملک کو ہونی چاہیے؛ اس معاملہ میں وہ ہی احق ہیں۔

صفحہ ۲۳۴ میں ایک عنوان ہے "عربی حکومت کے زوال سے عربی تمدن زائل نہیں ہوا" اسکے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے وہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے، ثبوت کچھ نہیں۔ توضیحاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ممالک مفتوحہ، حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جو اُنکے زیر اثر رہتے رہے، یا جو اُن کے ہمسایہ تھے اُنکی زبان کو بدل کر عربی کر دیتے ہیں، یا اُن ممالک کی زبانوں پر اتنا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ نیم عربی ہو جاتی ہے۔ مثلاً افریقیہ اور ہندوستان کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اثر ہو قرآن مجید اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا؛ مگر اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ بالواسطہ یہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔ بعض مقامات پر عرب غیر ممالک کے تمدن پر بھی یہی اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن جو امر کہ زیادہ حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی مفتوحہ اقوام چند ہی روز میں اُنکی ایسے گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ اپنے دست و بازو بنجاتے ہیں۔ اور انکو اور ممالک فتح کر کے دیتے ہیں شاید اس کا باعث یہی ہوتا ہو کہ مفتوحین سے اُن کا سلوک اچھا ہو؛ لیکن خواہ مجھے تنگ خیال و واہمہ پرست کہا جائے میں تو یہ کہتا ہوں کہ عربی تمدن اگر زائل نہیں ہوتا تو یہ دلیل ہے اسلام کی صداقت کی، یا معجزہ ہے اسلام کا۔ اسکے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے مثلاً دو ایک باتیں لکھدی ہیں۔

مقالہ پنجم میں مصنف علام نے مسلمانوں کی قریباً ہزار برس کی کشش و کوشش کا خوب خلاصہ کیا ہے جو قابل دید ہے۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا وہ کافی سے زیادہ ہے؛ خلاصہ کلام یہ ہے کہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے

خاص کر اسلامی تاریخ کے طالب علم، جو خلاصے ڈھونڈھتے پھرا کرتے ہیں، اس سے بہت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کیا ہے، بقول انگریزی خوانوں کے یُوٹی ویو ہے۔

طباعت کی غلطیاں ایک مرض لاعلاج ہیں، اس کی تو کیا شکایت، مگر افسوس ہے کہ اسمار و رجال کے ناموں میں بہت غلطیاں ہیں، بالخصوص اندلس کی تاریخ میں۔ تعجب ہے کہ جناب مترجم اول نے اس سے اعتنا نہیں کیا۔ اور مترجم ثانی نے تو مطلق توجہ نہیں فرمائی۔ خدا کرے کہ دوسرے گمان کی جلد نوبت آئے اور ان غلطیوں کا ازالہ ہو جائے۔

محمد خلیل الرحمن

(مترجم اخبار الاندلس وغیرہ غیرہ)

اشعارِ نعت

پیامِ لطف و کرم کا پیامبر بھی کریم
شرف نصیب ہوا جسکے دم سے سُن شہود

وہ جسکے فیض سے روشن چراغِ طور ہُوا
وہ جسکی ذات ہے رونق فزائے بزم نمود

وہ جس نے قول و عمل سے دیا یہ درسِ لطیف
عبادتوں کا سزاوار ایک ہے معبود

"محمدؐ عربی کا بروے ہر دو سرا ست"
کسیکہ نیست غلامش بباد او نابود

"زباں بیاد خدایا یکس کا نام آیا"
ہوا جو نطق کو بوسہ زبان کا مقصود

بہر نفس ز غلاماں روان پاکش را
رسیدہ باد و رسد ہدیۂ سلام و درود

عبودیت کا ملا تھا جو خاص خلعت اُسے
کسی نے اُسکو بنایا نہ آج تک معبود

یہ خاص معجزہ قائم رہے قیامت تک
دعا ہے تجھ سے یہ اے خالق غفور و ودود

خدا کے حکم سے ثابت ہے اہل ایماں کو
ہے اتباعِ محمدؐ حیات کا مقصود

ہمیشہ اُسکی محبت سے دل رہیں معمور
جو یہ نہ ہو تو ہو عالم یہ مردن نابود

محبت اُسکی یہی ہے کہ ہو ہمیں بھی عزیز
ہر ایک بات جو نزدیک اُسکے تھی محمود

نصیب آنکھوں کی ٹھنڈک اُسے نماز میں تھی
سرورِ دل کا سا تھے اُسے رکوع و سجود

پسندِ خاطرِ مومن، پسند اُسکی، رہے
یہی ہے قبلۂ محمود

رضائے دوست سے باہر نہ آرزو ہو کوئی
یہی ہے سہل مقصود

م۔ احسن

روٹیوں کا نزاع

متحدہ[1] رومانی سلطنت کا آخری شاہنشاہ تھیوڈاسی[2] اس مرنے وقت ۳۹۵ء میں سلطنت اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر گیا[3] اس تقسیم کی رو سے مشرقی یا یونانی یا بزنطینی سلطنت جسکے اجزاء ایشیا میں ممالک بین روئے فرات، سواحل بحیرۂ اسود، اور ایشیائے کوچک۔ افریقہ ملک مصر اور یورپ میں آبنائے درد انیال سے لیکر لے کر بحیرۂ ایڈریاٹک[4] اور دریائے ڈینیوب تک کل ممالک تھے بڑے بیٹے آرکے ڈی[5] اس کو ملی جسکا پایۂ تخت قسطنطنیہ قرار پایا اور مغربی یا یونانی یا لاطینی[6] سلطنت، جس میں افریقہ میں ممالک ماورائے مصر، و یورپ میں اٹلی اسپین، فرانس، برطانیہ اور مغربی البانیا شامل تھے چھوٹے بیٹے ہونوری اس[7] کے حصہ میں آئی جس کا دارالحکومت روما[8] الکبریٰ (روما) ہی برقرار رہا۔ یہ حصے بخرے ایسی نحوس گھڑی میں ہوئے تھے کہ یونانی اور رومانی قصور مملکت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر انھیں متحد ہونا پھر بھی نصیب ہی نہ ہوا۔

اُس زمانے میں دین و دنیا اور مذہب و حکومت، آج کل کی طرح، ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے نہ تھے۔ بلکہ اُن کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ وہ مل جُل کر رہنا سہنا جانتے اور امداد و استمداد سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب تک چونکہ سلطنت کے کل اجزاء باہم گتھے اور ایک ہی نظام روا کے زیر نگیں تھے اس لیے ساری سلطنت کا مذہبی سردار ایک ہی شخص مانا جاتا تھا اور وہ روما الکبریٰ کا اُسقف (بشپ) تھا، جو کل جماعت اساقفہ میں ممتاز و معظم سمجھا جاتا تھا۔ اور اگرچہ قسطنطنیہ کا بطریق[9] مشرقی کلیسیا کا لاٹ پادری مانا گیا تھا تاہم دنیائے مسیحیت میں سرداری اور پیشوائی کی کرسی روما کے بشپ ہی کے لیے مخصوص و مسلم تھی، چنانچہ ۴۵۱ء میں

---

1. United Roman Empire
2. Theodosius
3. Eastern, Greek, or Byzantine
4. Adriatic sea
5. Arcadius
6. Western or Roman or Latin Empire
7. Honorius
8. Rome
9. Patriarch

جو مجلس کلیسیائی قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی اُس نے فیصلہ کر دیا تھا کہ اقتدار اور اثر کے اعتبار سے قسطنطنیہ کے بطریق کا درجہ روما کے بشپ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ لہٰذا جس طرح حکومتِ ملکی کا مرکز ایک تھا اُسی طرح حکومتِ مذہبی کا مرکز بھی ایک ہی رہا۔

لیکن ۳۹۵ء میں جب حکومت کے حصے ہو چکے تو ناممکن تھا کہ سجادۂ مذہب ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا۔ قسطنطنیہ کی دنیوی حکومت کا فرماں روا جب اپنے آپ کو روما کی دنیوی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اور اُن ممالک میں جو اُس کے لوائے تحکم کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنفیذِ احکام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا تو قسطنطنیہ کی دینی حکومت کا فرماں روا جبکہ وہ بھی اپنے آپ کو روما کی دینی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اُن ممالک میں جو اُسکی روائے تقدس کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنفیذ احکام کس طرح گوارا کر لیتا۔ چنانچہ جو مذہبی احکام روما کے بشپ کی پیشگاہ سے یونانی سلطنت کی قلمرو کے متعلق نافذ ہوے، قسطنطنیہ کے بطریق کی طرف سے پہلے اُن کی تعمیل میں بے توجہی پھر پہلوتہی اور اور اُسکے بعد علانیہ سرتابی کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تفوق و اقتدار کی ناگوار بحث چھڑی اور نہایت ہی شد و مد کے ساتھ چھڑی۔

روما کے بشپ کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ خداوند مسیح کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز و مقدس شاگرد پطرس کے تبلیغی صدر مقام روما کے لاٹ پادری اور پطرس ہی کے قائم کیے ہوے سب سے قدیم کنیسے کے پیش نماز ہونے کی حیثیت سے حقیقی معنی میں خلیفۃ المسیح کا سجادہ نشین، اور اس اعتبار سے مشرق و مغرب کی ساری کلیسیاؤں کا تنہا واجب الاحترام مقتدا اور رہنما ہے۔ اور اسی حیثیت و اعتبار سے دنیائے مسیحیت کی حدود کے اندر ہر اسود و احمر اور ابیض و اصفر مسیحی پر، عام اس سے کہ وہ علمی ہو یا عالم، اُسکی حکومت نافذ، اُسکا حکم رائج، اور اُسکا اتباع لازم ہے۔

اسکے جواب میں قسطنطنیہ کے بطریق کا یہ دعوے تھا [illegible] دن ہی سے مشرقی ممالک کا اسقف اعظم بنایا گیا ہے اور اُسکے حیطۂ اقتدار [illegible] دمشق اور اسکندریہ

(۱) [illegible]

جیسے قدیم شہروں میں خداوند مسیح کے شاگردوں کے قائم کیے ہوئے کنیسے، حتیٰ کہ ارض مقدس کا وہ محترم خطہ جس کا چپہ چپہ انبیائے سلف، خداوند مسیح اور اُسکے رسولوں کے متبرک مجاہد و مشاہد سے معمور ہے۔ اور اس اعتبار سے عظمت و اقتدار میں وہ روما کے بشپ سے بدرجہا اور بمراتب افضل و اعلیٰ ہے۔ لہذا بجائے اِسکے کہ اُسکا درجہ روما کے بشپ سے فروتر مانا جائے، مسیحی دنیا پر لازم ہے کہ ارض مقدس کے معابد و مشاہد کی حرمت کو پیش نظر رکھ کر، نہ صرف قسطنطنیہ کے بطریق کا درجہ اقتدار روما کے بشپ سے بالاتر قرار دے بلکہ یونانی سلطنت کی طرح کل رومانی سلطنت کو بھی بطریقی حدود میں شامل کر دے۔

اسکا جواب روما کے بشپ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ جس زمانے میں روما کی خاک مسیحی شُہداء کے خون سے لالہ زار بن رہی تھی اور اُس میں سے ربانی انوار و برکات کی شعاعیں نکل نکل کر عالم کو منور و متبرک کر رہی تھیں اُسوقت قسطنطنیہ کا وجود بھی نہ تھا اور اُسکی جگہ بزنطیوم[1] اپنے اوثان و اصنام اور اباطیل و اوہام کی ضلالت میں گرفتار ہو کر دنیا میں کفر پاشی کر رہا تھا۔ روما کا تقدس اس سے ظاہر ہے کہ وہاں قصر مسیحیت کی تعمیر اُس ملبے سے ہوئی جو بے دین رومی شاہنشاہوں ٹامی ٹس[2] اور ہیڈریان[3] کے مقدس یروشلیم[4] کو تباہ کرنے کے بعد روما میں آیا۔ یعنی جب آخر الذکر ظالم نے خداوند مسیح کے دفن مقدس کی جگہ یونانی دیوی وینس[5] کا بتخانہ تعمیر کرایا تو مسیحی رہبان و احبار کی جماعت ہجرت کر کے اسی شہر روما میں تو آئی تھی۔ وہ واجب الاحترام ولیہ یعنی سینٹ ہلینا[6] روما ہی کی مسیحی ملکہ تو تھی جس نے ارض مقدس کے مسمار شدہ معابد و مشاہد کی مرمت اور جدید مقابر و آثار کی تعمیر کرائی تھی اور جس کی آغوش تربیت میں مسیحیت کے سب سے پہلے ممد و محب شاہنشاہ قسطنطین[7] نے پرورش پا کر ۳۳۰ء میں شہر بزنطیوم کو مسمار کر کے اسکی جگہ شہر قسطنطنیہ کی بنیاد ڈالی، اور وہ روما کے آبائی مسیحیین کی روحانی تعلیمات سے فیضیاب پادری ہی تو تھا جو نو تعمیر قسطنطنیہ کا پہلا بطریق تھا۔

(1) Byzantium　(2) Titus　(3) Hadrian
(4) Jerusalem　(5) Venus　(6) St. Helena
(7) Constantine　(8) Eastern or Greek Church

یہ سلسلۂ بحث و نزاع ایک مدت تک جاری رہا جس میں ابتداءً متانت کے ساتھ منطقی، تاریخی، اور مذہبی استدلال سے کام لیا جاتا تھا، مگر اسکے بعد متانت و دیانت کو بالائے طاق رکھکر فریقین عالمانہ سوقیت ملایانہ سب وشتم اور فقیہانہ تکفیر و تفسیق پر اُتر آئے۔ یہ تلاطم دیکھ کر مسیحیت کے ارباب حل و عقد نے مناسب سمجھا کہ مجلس کلیسیائی پھر منعقد کرکے اس مسئلے کو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ۴۵۱ء میں مجلس کلیسیائی منعقد ہوئی جس میں مشرقی کلیسیا[1] کے با اثر مندوبین کی تعداد غالب تھی۔ اس میں فریقین کے دعاوی پر کامل غور و توجہ اور مسئلۂ اقتدار کے مالہ و ماعلیہ پر کافی فکر و نظر کے بعد قطعی فیصلہ کیا گیا کہ رومۃ القدیم (روما) اور رومۃ الحدیث (قسطنطنیہ) کے بشپ، دونوں ہر اعتبار سے مساوی عظمت و اقتدار کے مالک اور اپنے اپنے حدود اثر و عمل میں کامل الاختیار ہیں، اور ایک کو دوسرے پر کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے تقوّم و تفوق حاصل نہیں

مجلس کلیسیائی نے جو فیصلہ کر دیا تھا چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے اقتدار و اثر کی اس ناشدنی بحث کا تلاطم فوراً فرو ہو جاتا، اور دونوں تقدس مآب شخصیتیں اپنے اپنے مقام پر یہ کہکر خاموش ہو جاتیں کہ

تم اپنے گھر کے چاند ہو ہم اپنے گھر کے چاند

لیکن یہ مقولہ چاہے کسی وقت غلط بھی ہو جائے کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"، اسکی یہ مرحمہ شکل ہر وقت صحیح رہیگی کہ "دو ملّا در دنیائے نگنجند"۔ چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس بات کا سخت مدعی ہوا کہ فریق ثانی بجائے ماتحت قرار دیے جانے کے اُسکا ہمسر اور مساوی الاقتدار قرار دیا گیا۔ اسپر مستزاد یہ ہوا کہ اسی عرصہ میں روما کے بشپ کا اعزاز و اقتدار رومانی سلطنت میں حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اب وہ بجائے معمولی بشپ کے تقدس مآب پاپا[2] اعظم کہلایا جانے لگا۔ اس ترقی مدارج نے پرانی آگ پھر سلگادی جسے ایک طرف حسد اور دوسری طرف حرص کی ہوا نے خوب بھڑکایا، اور تکفیر و تفسیق کے شعلے پھر بلند ہو گئے۔ اس مرتبہ جن مسائل پر رسالہ ہذا میں شروع ہوئی اُن میں ایک مسئلہ خصومیت کے ساتھ پُر لطف، دلچسپ، بصیرت افروز [illegible] اسی لیے قابلِ گذارش ہے۔ مگر اُسکے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے جو،

---

(1) Eastern Church (2) His Holiness

عیسائیوں میں ایک نہایت مقدس اور متفق علیہ رسم "عشائے ربانی" ہے جسے انگریزی میں (۱) یوکے رسٹ اور لارڈز سپر (۲) اور ہولی کمیونی (۳) آن کہتے ہیں۔ اس رسم کی اصلیت متی (۴) مرقس (۵) اور لوقا (۶) کی انجیلوں کی رُو سے (نہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے) مفہوماً یہ ہے کہ جب حضرت مسیح آخر مرتبہ بیت المقدس میں تشریف لائے تو یہود یوں کی عید فطیر کا زمانہ تھا جس میں فسح (۷) کی قربانی ہوتی ہے۔ اس دفعہ حضرت کی طرف رجحان عام زیادہ دیکھ کر احبارِ یہود نے طے کر لیا کہ اب جس طرح ہو آپ کی جان ہی کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ جس رات کو صبح ہوتے فریسیوں (۸) اور فریسیوں (۹) نے آپ کو گرفتار کرانے کے اس جرم میں کہ آپ عوام کو مذہب یہود سے روگردانی اور حکومتِ وقت سے بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں، رومی گورنر پانطیوس پیلاطوس (۱۰) کی عدالت سے صلیب پر چڑھائے جانے کا حکم حاصل کیا اُسی رات کی شام کو حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں آپ نے روٹی کے ٹکڑے توڑ کر دیے اور فرمایا "لو کھاؤ یہ ابن آدم (یعنی خود مسیح) کے بدن کے ٹکڑے ہیں۔ پھر پانی (یا شراب) کا پیالہ دے کر فرمایا "لو پیو یہ ابن آدم کا خون ہے"۔ عیسائی اس واقعے کے اندر ایک دقیق روحانی رمز مضمر اور ایک عمیق ربانی راز مستتر سمجھتے ہیں اور انکی یاد میں عشائے ربانی کی رسم ادا کرتے ہیں جس میں پادری دعا خوانی کے بعد اُس روٹی اور شراب کو جو میز پر رکھی ہوتی ہے مقتدیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ راسخ ہے کہ یہ روٹی حضرت مسیح کے جسم کے اصلی گوشت میں، اور شراب اُنکے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس روٹی اور شراب میں کرامتاً سلب امراض اور طلبِ اغراض کی طاقت آجاتی ہے۔ تبدیل ہیئت کا یہ مسئلہ عیسائیوں کا ایک مہتم بالشان اور معرکۃ الآرا مسئلہ رہ چکا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یونانی اور رومانی کلیسیاؤں کا مابہ النزاع مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔ رومانی کلیسیا کے مذہب کے مطابق ضرور تھا کہ جو روٹی عشائے ربانی کے لیے پکائی جائے وہ تازہ گندھے ہوئے آٹے کی ہو، بخلاف اسکے یونانی کلیسا کے مذہب کی رو سے لازمی تھا کہ وہ روٹی تازہ گندھے آٹے

---

(۱) Eucharist (۲) Lords Supper
(۳) Holy Communion (۴) St Matthew
(۵) St Mark (۶) St Luke
(۷) Pass-over (۸) Pharisees
(۹) Doctrine of Transmigration (۱۰) Pontius Pilate

کی نہ ہو، بلکہ جب خمیر اُٹھ آئے تو پکائی جائے۔ بالفاظِ دیگر عشائے ربانی کے لیے رومی کلیسیا نے فطیری اور یونانی کلیسیا نے خمیری روٹی لازمی قرار دی تھی۔ جب روما کے پوپ اور قسطنطنیہ کے بطریق میں دوبارہ بحث شروع ہوئی تو دوسرے مسائل سے بڑھ کر یہی چھوٹا سا مسئلہ اُن مہمات المسائل میں قرار دیا گیا جن پر نجات اور شفاعت مسیح کا دار و مدار تھا۔ چنانچہ فطیری اور خمیری روٹی کی بحث کے متعلق رسالہ بازی نے مسیحی دنیا میں وہ قیامت بپا کر دی کہ ایک کلیسیا والے دوسرے کلیسیا والوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ فطیریے علانیہ خمیریوں کو کافر کہتے تھے اور خمیریے کھلم کھلا فطیریوں کو بیدین۔

۱۰۵۳ء میں قسطنطنیہ کے بطریق مائیکل کیرولاری اس[1] اور روما کے پوپ لیو نہم[2] میں آخری تحریری مناظرہ شروع ہوا، جو بڑھتے بڑھتے بہت جلد مشاتمہ تک پہونچ گیا۔ بطریق کی بحث کا پہلو یہ تھا کہ واقعۂ صلیب عید فطیر کے دوران میں ہوا جس میں یہودی فطیری روٹی کھایا کرتے ہیں، لہذا عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کے معنی یہ ہیں کہ خود خداوند مسیح نے شاگردوں کے ساتھ فطیری روٹی کھا کر ناپاک اور بے دین یہودیوں کی عید فطیر منائی۔ اور چونکہ اس سے خود خداوند کی ذات گرامی پر شبہ بالیہود کا ناپاک الزام عائد ہوتا ہے لہذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خداوند مسیح نے اپنے آخری کھانے میں فطیری روٹی استعمال کی، اور جو شخص عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کا حکم دے یا استعمال کرے، یا استعمال کو جائز قرار دے، یا جو شخص ایسے عقیدے، حکم، استعمال یا جواز کو کفر و ضلالت نہ جانے، وہ قطعی کافر، بے دین اور جہنمی ہے۔

۱۰۵۴ء میں پوپ صاحب کے سفیر قسطنطنیہ پہونچے۔ پہلے تو انھوں نے بطریق اعظم سے بحث کی۔ جب اس میں ناکام رہے تو سیدھے کنیسۂ ہیجیا سوفیا[3] میں پہونچے جو بحمد اللہ کہ قسطنطنیہ میں اسلام کی تشریف آوری کے بعد جامع ایا صوفیہ بن کر اس وقت تک مہبط انوار توحید ہے۔ یہاں انھوں نے قربان گاہ پر پوپ صاحب کا وہ دستخطی فرمان آویزاں کیا جس میں خمیری روٹیوں والے بطریق، اور اور اُس کے متبعین کو قطعی کافر اور ابدی جہنمی قرار دیا گیا۔ پھر قربان گاہ کے زینہ پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور بآواز بلند کہا۔۔

---

(۱) Michael Karularius

(۲) Leo.

(۳) Hagia Sophia

"مقدس باپ! مقدس بیٹے! اور مقدس روح القدس! اگر مردود خبیث مائی کیل اور اُسکے بے دین متبعین خمیری روٹی کے متعلق اپنے عقیدۂ کفریہ سے جلد توبہ نہ کریں تو اُن سب کی ناپاک روحیں قیامت تک شیطان اور اُس کی ذریات کے حوالے! اور اُن کا ٹھکانا ہاویہ کا درکِ اسفل! آمین

بطریق صاحب کیا تھوڑے تھے۔ اُنھوں نے جس وقت یہ واقعہ سُنا تو فوراً اپنی قوت سنبھال لیا اور اپنے جرنیلوں کی مدد سے پایۂ قلعے پر دھواں دھار کفر باری شروع کردی اور پایان کار ۱۶ جون ۱۰۵۴ء کی ہمیشہ یاد رہنے والی تاریخ کو فطیری روٹی کا حکم دینے والوں اور اُسکے جواز کا عقیدہ رکھنے اور استعمال کرنے والوں کے کفر وارتداد، اور دائرۂ مسیحیت سے قطعی اور کلی اخراج کا برسرِ منبر اعلان کرکے ہمیشہ کے لیے یونانی اور رومانی کلیسیاؤں کے درمیان تفریق کامل[1] کی دیوار آہنیں کھڑی کردی، جو تیرہویں چودھویں اور پندرہویں صدی کے مساعی اتحاد کے باوجود آج کے دن تک سربفلک موجود ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تفریق کے نتائج کی تفصیل لکھنے کے لیے مسیحیت کی آٹھ سو برس کی تاریخ کے صفحات مستعار مانگنے پڑیں گے۔ لہذا صرف ایک ہی واقعہ سُن لو کہ سلطان غازی محمد خان ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۵۳ء میں جب فتح قسطنطنیہ کا عزم بالجزم کرلیا تو مشرقی سلطنت[2] کے بوسیدہ مقبرے کے مجاور قسطنطین یازدہم[3] شہنشاہ قسطنطنیہ نے جہاں یورپ کے اور بادشاہوں سے مدد مانگی وہاں پوپ نکولس پنجم[4] کے آگے بھی ہاتھ پھیلائے۔ پوپ نے اپنے ندیم خاص کارڈی نل ایسیا ڈور[5] کو کچھ روپے اور سپاہی دیکر قسطنطنیہ بھیجا اور روانگی کے وقت مطلب کی بات چپکے سے کان میں کہدی کہ مشرقی کلیسیا کو مغربی کلیسیا میں جذب کرنے کی پوری کوشش کرے۔ جب کارڈی نل مذکور نے قسطنطنیہ پہونچکر لتیہ ہجا سو قباتیں مغربی طریقہ پر عبادت کی تو شرقی کلیسیا والے غیظ وغضب سے آگ بگولا ہوگئے اور صلاح لینے کے لیے ایک مشہور راہب جناڈی اوس[6] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُسنے کہا

---

(1) Eastern Empire (2) Schism
(3) Nicholas V (4) Constantine
(5) Gennadios (6) Cardinal Isador

کہ جو شخص اپنے (یونانی) مذہب کے مقابلہ میں فطیریوں کا ذرا بھی لحاظ پاس کرے، اُس پر خداوند مسیح کا سخت عذاب نازل ہوگا۔ یہ شہ پاکر قسطنطنیہ کے پادریوں، سپاہیوں، اور عام باشندوں نے بلوہ کر دیا، جس کا سرغنہ رکن حکومت گرانڈ ڈیوک نوٹارس[1] تھا۔ چنانچہ نوٹارس اور اُسکے بلوائی شرکاء علانیہ کہتے تھے کہ "سینٹ سوفیا کا گرجا، فطیری کُتّے کے بھونکنے (دعا پڑھنے) سے ناپاک ہوگیا۔ ہمیں اپنے معابد میں مسلمانوں کی پگڑیاں دیکھنی منظور، مگر رومانی پادریوں کی ٹوپیاں دیکھنی ہرگز گوارا نہیں" خدا کی شان، کہ کارڈی نل صاحب کی پگڑی اُچھلنے کے بعد، ہلال بھی بدرنہ ہونے پائے تھے کہ اسلامی پگڑی جس پر سُنہرا ہلال جگمگا رہا تھا سینٹ سوفیا کے اندر آموجود ہوئی!

تم نے دیکھ لیا کہ خمیری روٹی جیسی نرم چیز نے مسیحیت کے ایک ہزار سال کی عمر والے تناور درخت کو کیسا بیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا! اسکے بعد سے یہ دونوں ٹکڑے اپنی اپنی جگہ بڑھنے اور ہوا میں جھومنے لگے، اور ہر ایک میں سے پچاسوں ڈالیں نکل آئیں جو موٹی ہو ہو کر اصل درخت سے ہمسری کرنے لگیں۔ پراٹسٹنٹ[2] شاخ تو کہیں ۱۵۲۹ء کے موسم بہار میں جاکر پھوٹی ہے۔ اس میں سے اور نیز دوسری ڈالوں میں سے بعد کو بہت سی شاخیں نکلیں، جو اس وقت سرسبز شاداب، اور نئی نئی کلیوں اور کونپلوں، اور نئے نئے پھولوں اور پھلوں سے لدی ہوئی زمین پر جھوم رہی ہیں۔

کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالہا من قرار۔

تو تھے اُن لوگوں کے حالات جنکے متعلق فاغرینا بینہم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیمۃ کی وعید موجود ہے۔ لیکن اُس خیرالامم کے لیے جسے واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا اور ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا کے صاف اور صریح احکام مل چکے ہیں مقام صد عبرت اور باعث صد ہزار غیرت نہیں کہ فطیری اور روٹی کی طرح، چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنائے تفریق وتمزیق قرار دیکر اسنے آپ کو لہم عذاب عظیم یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ کا مصداق بنائے؟ الا

شمع بے نور"

---

(۱) Grand Ba...

میر انیس کی شاعری کا ایک زبردست عنصر

میر انیس کے کلام میں عورتوں کی نفسیات کے جو مرقعے پیش کیے گئے ہیں، اور انکے جذبات و خیالات کو جس زبان و اسلوب بیان کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے، وہی اُنکے کلام کا زیادہ قابل مطالعہ اور زیادہ بحث طلب عنصر ہے۔ موخرالذکر یعنی عورتوں کی گفتگو اور محاورات سے دیگر مرثیہ گو شعرا نے بھی بیانوں میں خاطر خواہ کام لیا ہے۔ لیکن میر انیس کے یہاں اسکو جو وقعت حاصل ہے، کسی اور کے کلام میں نہیں۔ سب سے پہلے تو اُنکے گھرانے کی زبان ہی ایسی تھی کہ اگر وہ اپنی تمام زندگی میں اس پر ہر وقت فخر کیا کرتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اور پھر اُنکا ذاتی شوق اور کوشش اسکی بنا پر اُنکے ہر مرثیہ میں فصیح سے فصیح زبان اور لطیف سے لطیف محاورہ کا التزام رہتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انکے خاندان ہی میں فطرت کی جانب سے عورتوں کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کے لیے ایک خاص قدرت ودیعت کر دی گئی تھی۔ انکے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی (سحر البیان) میں بدر منیر کی جو حالت پیش کی ہے، وہ بھی حد درجہ پاکیزہ ہے۔ برخلاف اسکے میر حسن سے قریبی زمانہ کے دوسرے شعرا کی مثنویوں میں جہاں کہیں عورت کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اہلیت اور پاکیزگی کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے۔

عورت کی نفسیات، مرد کی نفسی کیفیات سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ انتہا درجے کی حساس ہوتی ہے، لیکن ہر وقت صبر و استقلال سے کام لیتی ہے۔ بعض نزاکتوں کی طرف اُسکی طبیعت اس قدر سرعت کے ساتھ منتقل ہو جاتی ہے اور اُن سے متاثر ہونے لگتی ہے، کہ مرد انھیں بدقت تمام معلوم کر کے اُن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور جن باتوں کو وہ آسانی سے نہیں سمجھ جاتی، انھیں سمجھ جانے کے بعد اُن پر ایسی راسخ العمل ہو جاتی ہے کہ پھر جان دیدینا گوارا کر لیگی، مگر اپنا خیال پلٹا سکنے کے لیے ناممکن ہوگا۔

یہ باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک و ہر قوم کی عورت کو اپنی ماں کے ورثہ میں ہاتھ آتی ہیں لیکن بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جو ہر جگہ کی عورت میں مشترک نہیں ہوتیں۔ اس بارے میں سب سے زیادہ ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ عربستان، ہند، اور جاپان کی عورتوں کی طبیعت میں (متذکرۂ بالا صفات کو چھوڑ کر) بے حد اختلاف ہوگا۔ عورتیں تو خیر ایک محدود دنیا میں زندگی بسر کرتی ہیں، ان

ممالک کے مرد بھی نفسی کیفیات کے لحاظ سے آپس میں بے حد مختلف ہیں۔

اس روشن زمانہ میں جب تمام دنیا مختلف النوع ذرائع آمد و رفت کی آسانی کے باعث قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے دور دور کے ممالک ایک ہی شہر کے متفرق گلی کوچوں کی شکل میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں، اس بات کی ان تھک کوششیں ہو رہی ہیں کہ تمام دنیا کے مختلف میلانات کو ایک اور صرف ایک ہی نقطہ پر لاکر ٹھہرا لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس مقصد کے حصول کے لیے جو ذریعے اختیار کیے جا رہے ہیں، وہ ایک حد تک مفید ضرور ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے، جب تک کسی نہ کسی طریقہ سے تمام دنیا کی عورتوں کی طبیعت کو ایک نہ کر لیا جائے گا اس مقصد میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی۔

عربستان کی عورت ہندوستان کی عورت سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی مرد کے سامنے ایک چینی عورت کی نفسیات پیش کیجائے اور نہ بتایا جائے کہ "یہ ایک عورت ہے" تو وہ اس قسم کی فطرت والی ہستی کو ہرگز عورت نہ سمجھے گا۔ اسی طرح فرانس یا امریکہ والوں کے آگے ہندوستان کی پردہ نشینوں کی فطرت کا مرقع بغیر "ہندوستانی عورت" لکھے پیش ہو، تو وہ اسکو ایک عجیب اور نئی قسم کی مخلوق خیال کریں گے۔ مگر عورت خواہ کہیں کی ہو، جب مرد کے سامنے آجاتی ہے، اُسکے "دائرۂ پرستش" کا ایک مستقل مرکز اور تخیلات و جذبات کا ایک یقینی جولانگہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے جنس مقابل کے لیے (اگرچہ اُسکا ہر فرد ہم مزاج نہ سہی) ایک ایسا "نمونۂ سرمدی" چھوڑ جاتی ہے، جس سے متاثر ہوئے بغیر دنیا کا کوئی مرد نہیں رہ سکتا۔ اس کی مضراب ہستی مرد کے سازِ فطرت کے ہر تار کو چھیڑ جاتی ہے۔ وہ اسکی عقلی، اخلاقی اور روحانی، غرض ہر قسم کی قوتوں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو اُنکے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی انکی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے، اور یہ مغائرت اُنھیں ان ہستیوں اور پُرخلوص محبت سے روکے رکھتی، جو آج میر انیس کا کلام پڑھنے کے بعد حضرت زہراؑ، حضرت زینبؑ، حضرت بانوؑ، حضرت صغراؑ اور حضرت کلثومؑ وغیرہ کے متعلق خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ [illegible] دست مقناع کے لیے اس راز سے واقف ہو جانا ضروری تھا۔ اسی لیے میر [illegible] رتوں کو پیش کیا ہے اُن میں ایک حد تک ہندوستانی فطرت کو بھی شا [illegible] ں تک بین

کا تعلق ہے اُنکے مرثیوں کی جملہ عورتیں ہندی ہیں، رسم و رواج کے لحاظ سے یہ سب نصف ہندی ہیں اور نصف عرب۔ اور ان سے قطع نظر کرنے کے بعد جب حضرت زہراؑ اور حضرت زینبؑ کے کردار پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ بالکل عرب عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

مجموعۂ مراثی انیس جلد اول (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) کے سب سے پہلے مرثیہ میں حضرت فاطمہؑ کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ (جب دونوں بچے تھے) آنحضرت رسول خدا کے پاس کھیلتے کھیلتے پہونچ جاتے ہیں۔ امام حسینؑ نانا کو اپنے بھائی کا منہ اور اپنا گلا چومتے ہوئے دیکھ کر غصہ میں آجاتے ہیں کہ نانا نے ہمارا بھی منہ کیوں نہ چوما، اور روتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں۔ حضرت زہراؑ جب اپنے چھوٹے صاحبزادے کو روتا ہوا دیکھتی ہیں تو اُسوقت انکی جو کیفیت اور انکی زبان سے جو گفتگو ظاہر کی ہے وہ ایک حد تک ہندوستانی عورت کی فطرت اور خصوصیات سے متعلق ہے۔ چنانچہ ماں بچے سے کہتی ہیں:۔

ہے ہے حسینؑ! کیا ہوا تو کیوں ہے شکستہ دل؟
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا!
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا؟

میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دلربا! نہ رو — زہراؑ ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
سر میں نہ درد ہو کہیں لے سر اتار دو — بس بس نہ رو حسینؑ! برائے خدا نہ رو

کہتے کہتے آخرکار چادر سے منہ ڈھانپ کر خود بھی رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں:۔

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
کچھ میں، کچھ حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر گئے ہیں — گذری میں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رُلائیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمہیں لالچ کو منائیں — لو آؤ! جانے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسنؑ نے رُلایا برا کیا
پوچھوں گی کیا نہ میں مرے بچے نے کیا کیا؟

اور بچہ کا جب اپنی ماں سے کہنا ہے کہ نانا نے آج بھائی کا منہ چوما اور ہمارا نہیں، اس لیے ہم دونوں اپنی جان گنوا دیں گے نہ پانی پئیں گے اور نہ کھانا کھائیں گے۔ اس پر ماں کی زبان سے حسب ذیل محبت بھرے جملے نکلتے ہیں:

صدقے گئی کر دو نہ کلیجے کو میرے شق ہے ہے یہ کیا کیا مجھے ہوتا ہے اب قلق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے!
کاہے کو ماں جیے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

اسکے بعد ماجرا کو نانا کے پاس لیجانے اور وہاں کی گفتگو کا جو مرقع پیش کیا ہے اُس میں عربی کروار جھلک جاتا ہے۔ چنانچہ سُنہ کے نہ چھوٹنے کے متعلق کسی قسم کا شکوہ و شکایت کرنے کے بجائے حضرت فاطمہؑ (اپنے والدسے) کہتی ہیں:-

روٹھے تھے جو قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں سُنہ کے نہ چھوٹنے کا گلہ کرنے آئے ہیں

اور جب رسول خداؐ اثنائے گفتگو میں رونے لگتے ہیں تو یہ تاڑ جاتی ہیں، اور کہتی ہیں ؎

کیوں بابا جان خیر تو ہے اسکی جان کی فاقے میں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی

اور جب وہ حقیقتِ حال سے آگاہ فرماتے ہیں تو اپنے باپ کے برتے پر کہتی ہیں ؎

قدرت ہے سب طرح کی شہِ مشرقین کو حضرت سے لونگی اپنے حسن اور حسین کو

پھر غصہ میں آجاتی اور کہتی ہیں کہ "کیا انکو قتل کرنا آسان ہے؟ کیا اُس دن شیر حق کمر سے ذوالفقار نہیں کھولیں گے؟ کیا میں بال کھولے ہوئے باہر نہ نکل جاؤں گی؟ اور عرش عظیم کا پایہ نہ ہلاؤں گی؟" تو حضرت فرماتے ہیں کہ اُسوقت نہ میں ہوں گا نہ علیؑ نہ فاطمہؑ اور نہ حسنؑ۔ تو زہراؑ کہتی ہیں کہ

ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہوئے گا ہے ہے مرے حسینؑ کو پھر کون روئے گا

آخر کار مذہب اور بابا جان کی خاطر سینے پر پتھر رکھنا گوارا کر لیتی ہیں، لیکن محبت سے مجبور ہو کر بابا جان سے کہتی ہیں ؎

کیجے دعا کہ خالق اکبر مدد کرے اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

حضرت زہراؑ کا تو ایک ضمنی ذکر تھا۔ میر انیس نے حضرت زینبؑ اور حضرت صغراؑ کے نسائی کردار نہایت مکمل حالت میں پیش کیا ہے۔ ان ہی دونوں کے بیانات میں اُنھوں نے خواتین کی فطرت سے واقفیت کی پوری قدرت دکھادی ہے۔ حضرت صغراؑ کے کردار پر اب تک متعدد طریقوں سے روشنی ڈالی جا چکی ہے، اسلیے ہم اپنے اس مضمو[illegible] نظر کرکے صرف حضرت زینبؑ کی سیرت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انیس نے [illegible] مجموعہ مراثی انیس جلد اول (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) کے مرثیوں نمبر ۶ - [illegible] انکے کردار کو

خاص طور پر ظاہر کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان تمام مرثیوں کے متفرق بیانات کو ایک منضبط شکل میں پیش کرتے ہوئے انیس کی اس قسم کی صناعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت زینبؓ امام حسینؓ کی حقیقی بہن ہیں۔ انکو اپنے بھائی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں۔ مدینہ سے نکلتے وقت جب محلہ کی عورتیں آکر سمجھاتی ہیں کہ

گھر فاطمہؓ زہراؓ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

اور رنج و الم کا اظہار کرتی ہیں تو آپ فرماتی ہیں کہ صرف آپ لوگوں ہی کو اسکا رنج نہیں ہے بلکہ مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

میں فاقے کرکے بھی اماں کی تربت پر سے آجاتی لیکن کیا کروں بھائی کی طرف دیکھ کے میری چھاتی بھر آتی ہے، کیونکہ ظاہر میں تو اماں قبر میں سوتی نظر آتی ہیں لیکن جب کبھی خواب دیکھتی ہوں تو انھیں روتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ انھوں نے مجھے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ "حسینؑ کا نہ باپ رہے گا نہ ماں رہیگی اس لیے اسکے غم میں تو رفاقت کرنا" اب مجھے اُنکی وصیت رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ ؎

اُس دن مری تربت سے بھی مُنہ موڑیو زینب اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

گھر بھائی سے تھا، جب بھائی نہیں تو گھر بھی نہیں۔ اب خواہ رسّی سے ہاتھ بندھیں یا بلوہ میں سر کھلے۔ کچھ ہی ہو، زینب بھائی کے ہمراہ ہے اور اس کو پچ کے انجام سے بھی آگاہ ہے۔ غرض ایک محبت والی اور وفادار بہن اپنے بیمار و ناتوان شوہر کو مدینہ میں چھوڑ کر بھائی کی رفاقت کے لیے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتی ہے۔

کربلا پہونچنے کے بعد انتخاب قیام گاہ کے متعلق حضرت زینب اور حضرت عباس میں نہایت درد آمیز گفتگو ہوتی ہے۔ اسکے بعد اس فیاض عورت کے ایثار کا موقع آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کربلا میں حضرت امام حسین اپنی فوج کی تنظیم کرنے لگتے ہیں تو حضرت زینب کے صاحبزادوں کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ فوج کی علمبرداری ہمارا موروثی حق ہے۔ اسلیے دونو آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ "کیوں بھائی! علم لینے کے لیے ہم ماموں سے کہیں؟ اسلیے کہ ہم دونوں طرف سے حقدار ہیں۔ ہمارے دادا اور نانا دونوں علمدار تھے"۔ بڑا کہتا ہے کہ "نہار یہ عرض کرنے کا موقع نہیں، ماموں مالک و مختار ہیں، وہ جس کو چاہیں دیں، ہمارا بڑا عہدہ تو یہی ہے کہ ماموں پر فدا ہو جائیں، چپکے رہو اماں سُن کر کہیں خفا نہ ہو جائیں"۔

حضرت زینب پردے کے پیچھے سے یہ گفتگو سُن لیتی ہیں اور فضہ کے ذریعہ ان دونوں کو بُلا کر چھوٹے سے کہتی ہیں کہ "تم ابھی کیا باتیں کر رہے تھے۔

سمجھے نہ کہ مادر عقب پردہ کھڑی ہے گھر لُٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے علم نکلا ہے تمھارے تیور ہی اور ہو گئے ہیں۔ تمھارے سن ابھی کم ہیں، تمھارے قد ابھی چھوٹے ہیں۔ یہ کھیل نہیں، محمدؐ کا علم ہے! مانا یہ تمھارا حق ہے لیکن میں اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتی ہوں۔ یہ علم اُسی کو ملنا چاہیے ؎

بگڑوں گی گر کسی اسلوب کرو گے عباس سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے؟

دیکھو عباس کو علم ملتے ہی تم انھیں جا کر تہنیت علم دو ؎

کہنہ میں ایک نے بھی اگر سُن لیا یہ حال کہتی ہوں صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال

صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

اور تم اپنے ماموں کے قدموں پہ اپنے سر کو فدا کر دو۔ دیکھو! اگر قاسم و اکبر تم سے پہلے میدان میں زخمی ہوئے تو پھر تم میرے فرزند نہ ہیں تم دونوں کی ماں"۔

یہ ہے ایک عرب عورت کی فیاضی کہ اپنے بیٹوں کے مقابلہ میں اپنے بھائی کو ترجیح دیتی ہے! اور یہ ہے ایک بہادر عورت کا ایثار کہ اپنے بچوں کے موروثی حق سے اپنے چھوٹے بھائی کو سرفراز کرتی ہے!! یہی وہ مقام ہے جہاں میر انیس کی نسائی فطرت گہری واقفیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے!!!

حضرت زینب کا کردار بالکل عربی ہے، انیس نے صرف ایک حد تک انھیں ہندی نفسیات سے متعلق کیا ہے اور وہ بھی صرف بیٹوں میں، جہاں مجبوری تھی۔ کیونکہ بغیر اس عنصر کے مرثیہ گوئی کا مقصد (یعنی رونا اور رُلانا) فوت ہوا جاتا تھا۔ حضرت زینب کی عرب نفسیات اُسوقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے جب کربلا کے میدان میں تمام رفقاء شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں اور صرف گھر والے باقی رہ جاتے ہیں۔ حضرت زینب کو بُرا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک انکے بچوں کی لاشیں کیوں نہ آئیں؟ چنانچہ کے متعلق کہتی ہیں ؎

آتا ہے دم صبح سے یاں لاشہ پہ لاشہ لڑائی ہے تماشہ

پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا بیٹا مجھے یاد نہیں آتا

سکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے وہ سب ہی تو پیارے تھے حسین ابن علی کے؟

میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

جب صاحبزادے ماؤں سے بدقت تمام جنگ کی اجازت لیکر ماں سے رخصت ہونے آتے ہیں تو یہ خفا ہو جاتی ہیں کہ یہ دونوں اب تک کیوں نہ جنگ پر روانہ ہوئے اور ماؤں کے لیے کیوں نہ جانیں دیدیں چنانچہ انھیں ڈرپوک اور بے وفا سمجھ کر انکی طرف دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ :-

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی شمشیر غیرت کی ہے جا غیر تو ہو فدیۂ شبیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحب شمشیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو؟

آفت سہی لیکن نہ ہی جو ہمت نہ کریں گے یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے
فرزند حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں عباس علی خوں میں نہا لیں تو یہ جائیں
ہمشکل علی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ زور شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر خالی ابھی ہونے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر جرأت میں وہ حیدر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
جب کوئی نہ ہوئے گا تو یہ جنگ کریں گے
کیا عیب ہے؟ پہلے نہ مرے بعد مریں گے!

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈ لیتے بہانا کچھ منہ کا نوالا نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمہ میں آنا سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا!
ماں کو تو تھک کر چکے کہنے کی نظر میں میں مٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں کھولیں اسے باندھے ہیں جو تلوار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے؟
لڑنا ہے اس پہ کہ فوج ہے حیدر علی کے!

توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو تو کہدیں مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہدیں

تا کوفہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہدیں خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہدیں
چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں؟
کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں؟

عورت اکثر کسی بات کو صاف سیدھے طور پر نہیں بیان کرتی۔ خصوصاً جب وہ غصہ میں ہوتی ہے تو اپنے ہر مطلب کو طعن و تشنیع کے ذریعہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ اور صرف اسی ایک بات کو پیش نہیں کرتی جس سے وہ متاثر ہوئی ہے بلکہ اس سے متعلقہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے سناتی جاتی ہے۔ جب اسکے دل پر کوئی ٹھیس لگتی ہے تو پہلے زبان سے ظاہر کرنا تو کجا وہ حتی الامکان اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ اپنی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات اپنے بشرے سے بھی ظاہر نہ ہونے پائیں۔ لیکن جب کسی وجہ سے وہ پھوٹ پڑتی ہے تو اسکے محیط جذبات میں ایک ایسا تلاطم انگیز ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ غم و غصہ کے تیز و تند سیلاب اس کی آنکھوں اور زبان سے نکلے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور نہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں بہنے سے روک سکتی ہے۔ انیس اگر اس موقعہ پر نسائی فطرت کی اس خصوصیت کو نمایاں کرکے نہ دکھاتے تو انکی شاعری میں بہت بڑا نقص باقی رہ جاتا۔

حضرت زینب ایک عورت ہیں، اور خاص کر عرب کی عورت۔ ان کا جوش جسقدر بڑھا ہوا نظر آئے، کم ہے۔ اور اگر انکی زبان سے مسلسل ہمت افزا اور طعن آمیز جملے نکلتے جائیں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو اسوقت ہوتا جبکہ وہ ایسی نازک حالت میں بھی متاثر ہوئے بغیر رہتیں۔ بیگانوں کو شہادت کا مرتبہ حاصل کرتا ہوا دیکھ کر انکی رگِ حمیت جوش میں نہ آتی۔ اپنے بھائی، عزیز ترین بھائی کے بُرے وقت میں اپنے بچوں کو قربان کیے بغیر خاموش رہ جاتیں۔ یہ ایک عورت، عرب عورت اور بالخصوص خاندان رسالت مآب کی عورت کے لیے ناممکن تھا!! جسکی رگ رگ میں محبت و الفت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے ہوں، جسکی بات بات میں صداقت اور حمیت کے پھول جھڑتے ہوں، اور جسکے قدم قدم پر وفا منی اور ایثار کے نشان قائم ہوتے جاتے ہوں! اس [illegible] نے اپنی شاعری کو معراج کمال پر پہونچا دیا ہے۔ عورت کی اور پھر ایک عرب عورت سے بہتر مرقعہ دستیاب نہیں ہو سکتا!

ماں کا غصہ دیکھ کر دونوں صاحبزادوں کا نپ جاتے ہیں۔ ماجزی سے عرض

کرتے ہیں ؎

آزردہ نہ ہوں آپ ہمیں تھا یہی وسواس جب بڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرت عباس

جوڑے ہیں کبھی ہاتھ کبھی گر دپھرے ہیں
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اسوقت گرے ہیں

ایک مرثیہ میں دکھایا گیا ہے کہ صاحبزادے خود آکر اپنی والدہ کو اجازت جنگ کی خوشخبری نہیں سناتے بلکہ فضہ معلوم کرآتی ہے کہ "عون و محمد اب جنگ کو جارہے ہیں" تو حضرت زینب بجائے کسی قسم کی تشویش کے خدا کا شکر بجالاتی ہیں کہ اب میرا مطلب برآیا۔ وہ عام عورتوں کی طرح اُسوقت یہ آرزو نہیں کرتیں کہ میرے بچے جنگ سے زندہ بچ کرآئیں، بلکہ کہتی ہیں کہ "میرے بچوں کی عزت یارب! تیرے ہاتھ ہے، تو انکی مدد کر، کیونکہ وہ علیؑ کے نواسے ہیں، اور اب یہ خوشخبری آئے کہ دونوں مارے گئے اور ولی ابن ولی کے فدیوں میں محسوب ہوئے"۔ ایک پُرخلوص، پاکباز اور فیاض عورت کی کس قدر صحیح تصویر ہے!

حضرت زینب صرف اپنے بچوں کی قربانی پر اکتفا نہیں کرتیں، بلکہ کہتی ہیں کہ "اگر انکا باپ (یعنی زینب کا شوہر) ہوتا تو وہ بھی آپ (یعنی امام حسینؑ) کے لیے جان دیدیتا۔ کیونکہ ہم سب پر آپ کا حق ہے۔ اور جب ہمارا حق ان بچوں پر ہے تو پھر کیوں نہ وہ اس حق کو ادا کریں"۔ چنانچہ کس خلوص سے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہِ نامدار! کرتا قدم پہ سر کو تصدق بہ افتخار
ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان زار

ان پر ہمارا حق ہے، تو ہم پر حق آپ کا
یہ بھی تو حق ادا کریں کچھ اپنے باپ کا!

اسوقت حضرت امام حسین اپنی بہن کو ہر طرح سے سمجھاتے ہیں کہ "میں عون و محمد کو جنگ کی ضرور اجازت دیتا، لیکن اول تو وہ کمسن ہیں اور دوسرے یہ کہ اسکے بعد جعفر طیار کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا، اس لیے مجبور ہوں"۔ مگر حضرت زینب اپنے بھائی کے مقابلہ میں ایک نسل کے معدوم ہو جانے کو کچھ نہیں سمجھتیں۔ یہ عالیشان جذبۂ ایثار عام عورتوں اور حضرت زینب میں حد امتیاز قائم کرتا ہے۔ جب تک عورت اَن بیاہی رہتی ہے اپنے بھائی بہنوں سے اسکو بیحد محبت رہتی ہے۔ لیکن بیاہے سے نکلنے اور دولاد ہو جانے کے بعد اسکو اپنی اولاد اور اپنے خاوند سے

جس قدر محبت ہو جاتی ہے اپنے بھائی بہن سے اتنی ہرگز باقی نہیں رہتی۔ اگر اسکے بھائی اور بچے دونوں ایک ہی چیز کے خواہشمند ہوں تو اپنے بھائی پر اپنے بچوں کو ہر حال میں ترجیح دیگی۔ یہ دنیا کی تمام عورتوں کی سرشت میں داخل ہے۔ لیکن بعض غیر معمولی مردوں کی طرح بعض عورتیں بھی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جنکا ایثار اپنی قبیل کی اور مخلوق کے واسطے ایک خوشنما جادۂ عمل پیدا کر دیتا ہے اور جن کی محبت ساری دنیا میں ایک زندۂ جاوید نغمہ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت زینب امام حسینؑ کی چھاتی سے سر لگا کر نہایت عاجزی سے کہتی ہیں ؎

للہ ان کے باپ میں اب کہ نہ کیجیے ہدیہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجیے

ان بیانات کے بعد حضرت زینب کے کردار کا ایک زبردست عنصر پیش نظر ہوتا ہے، جو صرف ایک عرب عورت کے لیے مخصوص ہے۔ دنیا کی کوئی عورت جرأت و دلیری کے غالباً ایسے اعلیٰ جذبات و تخیلات نہیں رکھتی جیسے کہ ایک عرب کو عطا کیے جاتے ہیں۔ اس کا بچپن لڑکوں کے ساتھ ساتھ خونخوار معرکوں میں گذرتا ہے اسکی جوانی نوجوان مردوں کو اُنکے قلوب کے گرمانے، ان کی رگِ حمیت کے جوش میں لانے، اپنے گھر، اپنے قبیلہ، اپنی قوم اور اپنے ملک کیلیے جان دیدینے پر اُکساتی ہے، نیز انکی کاہلی اور پژمردگی کو بجلی بنکر جلا دیتی ہے۔ اور اُس کا بڑھاپا عرصہ ہائے کارزار کے زخمی بچوں اور بھائیوں کی نگہداشت، بھولے بھٹکے مسافروں کی امداد، اور غریبوں لاوارثوں کی غمخواری میں گذر جاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح کسی کو اپنے گھر، خاوند، اور بچوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ کر، کسی تہ خانے کے گوشہ میں چھپنے، کسی باؤلی میں ڈوب مرنے، یا کسی آگ میں جل جانے کی کوشش نہیں کرتی، بلکہ ہمت اور عقلمندی کے ذریعے ایسے طریقے اختیار کرتی ہے کہ حملہ آور کو منہ کی کھانی پڑے۔ میر انیس نے حضرت زینب کا کردار پیش کرتے وقت ان تمام خصوصیات کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے۔

حضرت زینب کے صاحبزادے جب لڑائی کے لیے نکلتے ہیں تو وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح رونے رُلانے کے بجائے اُنکو جنگ کی ہمت دلاتی اور جوانمردوں کے ساتھ مرنے مارنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اسکے متعلق چند شعر ملاحظہ ہوں ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ میر انیس کی نگاہوں میں ایک مکمل عورت کن عظیم الشان صفات سے جلوہ گر ہوتی ہے ؎

ہاں چاہیے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو دو شیر ہو مل کر نہ ۔ شکار گھیر و

[illegible] سر دونوں کے [illegible]

ہاں سب میں یہ سرتاج دلیروں کے تھیں ہو — ہاں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تھیں ہو
اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے — جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے
بودے کی کہاں آنکھ، کہاں مرد کے تیور — چھپتے نہیں لاکھوں میں جو افسر کے تیور
ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ — جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
سر بیچ کے ذی قدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ — ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
مر کر نہ ہٹے قابلِ احسنت وہی ہے
جو کھیت میں سرسبز ہو ساونت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی — گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی — بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

ہاں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا — پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نہ جانا
ساحل پہ کبھی ٹھنڈی ہوا کھا کے نہ جانا — صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا
ایسے تو نہیں جو مجھے محجوب کروگے!
میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

بھائی کسی ہنگام بھی بھائی کو نہ چھوڑے — دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے
اک بھائی لڑے بڑھ کے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے — بلوہ جو پھر اسپر ہو تو یہ ہر لک جائے
ہاتھوں میں صفائی ہو کہ کسل بھی پھڑک جائے — گر صف ہو تو پسپا ہو، پسپا ہو تو سرک جائے
حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے دلی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علی کے

اس جنگ کا چرچا سمر و شام رہیگا — دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

ایک اور مرثیہ میں اسی موقع پر جنگی طریقہ بتاتے ہیں ؎

فوجوں کو مری دودھ کی تاثیر دکھانا — دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا
مظلومیت حضرت شبیر دکھانا — تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
تلوار اگر اٹھ چلے سر فرد ہو — جو سامنے آجائے وہ اک دار میں دو ہو

دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے غش کھا کے جو گر پڑیں بھی تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے یہ آبِ رواں بند ہے ماموں پہ تمہارے
تلواریں ہیں، موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست اور تجربہ کار سپہ سالار اپنے نوجوان سپاہیوں کو کسی عظیم الشان معرکۂ جنگ کے لیے جوش دلا رہا ہے۔ وہ صرف خطرناک حملہ ہی کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اپنے کمزور مخاطبوں کو اُنکے نامور اسلاف اور بہادر افراد کے کارنامے یاد دلا کر اُنکی ہمت بڑھاتا ہے اور ساتھ ہی اُنکی ناتجربہ کاری کا بھی اُسے علم ہے۔ اس لیے وہ دوران تقریر میں نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ اُنکو نصیحتیں بھی کرتا ہے تاکہ وہ اسرار فہمندی سے واقف ہو جائیں۔

حضرت زینب اپنی قومی اور خاندانی روایتوں کے مطابق اپنے بچوں کو نام آوری کے لیے آمادہ کرتی ہیں اور اس جوش و طنطنہ سے فرماتی ہیں کہ ؎

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو، دلیرو! حیدر سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو!
جرار ہو، کرار ہو، صفدر ہو، دلیرو! منزغام ہو، ضیغم ہو، غضنفر ہو، دلیرو!
تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ

خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو بچے اسد اللہ کے ہو، جان پہ کھیلو
تیغوں میں دھنسو، چھاتیوں سے تیر دکو لو کوفے کو تہ تیغ کرو شام کو لے لو
دو اور جلا آئینۂ تیغ عرب کو
لو روم کو قبضے میں تو قابو میں حلب کو

فاتح کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج ہاں غازیو چین و جبش و زنگ سے لو باج!
چڑھنا ہے لڑائی پہ جو مردوں کا مزاج گیتی تو دہلا ہو وہ تلوار چلے آج
میلے نہ ہوں تو رہ یہ سپاہی کے ہنر ہیں جھکے ہیں سر ... ہیں اُدھر میں
گہ خون میں ڈوبے ہیں گے خون میں تر ہیں صحبت میں ... ہیں سپر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جھکے ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر دے چکے ہیں

عون و محمد کی لڑائی کا بیان میر انیس کے رزمیہ کارنامہ کا ایک جزو لاینفک ہے جسکے بغیر انکی رزم نگاری مہتم بالشان نہیں کہلائی جا سکتی۔ حضرت زینب دم بدم بیٹوں کی جنگ کی خبریں منگاتی ہیں اور جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل مزاجی سے لڑ رہے ہیں تو ؎

سنکر یہ بیاں شاد ہوئیں زینب خوشخو — پر جوش محبت سے رہا دل پہ نہ قابو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو — میدان سے سر کے نہیں ابتک مرے گلرو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے
سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

آخر کار دونوں لڑکے ایک تہلکہ انداز لڑائی کے بعد جان دیدیتے ہیں۔ اور جب ماں کو انکی شہادت کی خبر ہوتی ہے تو بجائے آہ و زاری کے ؎

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینب — سجدے سے اُٹھیں جب تو کہا شکر ہے یارب
طالب تھی میں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب — سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب
مٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچا لے
سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچا لے

کس مُنہ سے ترا شکر کروں بار خدایا — تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
گر یہ فلک نے نہ دکھایا، نہ دکھایا — جو مرتبہ اعلائے شہادت ہے وہ پایا
عالم میں جو دُکھ انکے لیے سینے بھرے ہیں
تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

اور جب دوسری عورتوں کی آہ و زاری دیکھتی ہیں تو حضرت زینب صابر اور مستقل مزاج زینب! تعجب کرتی ہیں کہ یہ کونسی بڑی اونچی بات ہوئی ہے جسکے سبب اسقدر کہرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ تمام بیویوں سے مخاطب ہوکے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا؟ — زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
بیٹوں کو یوں ہی میری طرح نذر کو لاتا — دیتے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
جو پاس ہے جسکے وہ عطائے شہ دیں ہے
کہدے مرے ماں جائے کا حق کیسپہ نہیں ہے؟

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی — سر پر مرے ہیں سلامت رہیں بھائی

اک دولتِ ادلاد لٹائی تو لٹائی کیا لٹ گیا وہ کون سی ایسی تھی کمائی؟
کیا دو ہوں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں؟

ایثار و محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے! حضرت زینب کی تشفی کے لیے یہی بہت کافی ہے کہ امام حسین، اکبر اور اصغر ابھی زندہ ہیں جن کی موجودگی میں ماتمی صف کا نام تک لینا انھیں ناگوار گذرتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی وہ مقام ہے جہاں انیس نے اپنے رموز دانِ فطرت ہونے کا ثبوت دیا ہے ؎

چلائیں ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا! بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پرسا؟
ہے ہے نہ کرو صاحبو! گھبرائیں گے شبیر پھر کوئی ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر؟
تم روتے ہو کس واسطے؟ میں تو نہیں روتی دامان مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی؟
دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹیوں کو کھوتی؟ دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
قائم رہے اقبال محمدؐ کے خلف کا
بس نام بھرے گھر میں نہ لو ماتمی صف کا

امام حسین اور علی اکبر دونوں لاشوں کو میدان جنگ سے خیمہ میں لے آتے ہیں تو حضرت سب سے پہلے بھائی سے اُنکی لڑائی کے متعلق دریافت کرتی ہیں۔ اور جب امام حسین سے ان کی بہادری اور جرأت کی بیحد تعریف سنتی ہیں تو انکی اسکے بعد کی حالت کا انیس نے اس طرح نقشہ پیش کیا ہے ؎

یہ سنتے ہی سرخی سی لبِ زرد پہ آئی حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی
کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی اب شاد ہوئی ان سے یداللہ کی جائی
آقا! مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ انکے
بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ انکے

آخر ماں ہی ہیں۔ اب انکا دل بھر آتا ہے۔ جب لوگ انھیں یدار کے لیے بلاتے ہیں تو انکی نسائیت کی سوتیں ایک دم اُبل پڑتی ہیں۔ تا ؎

فرمایا میں بچوں کی لاش پر
آپ آقا کی دل کو جلائے تو کیا کروں؟

گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں؟

بس سُن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے　　لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں، کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا، دو گھر اُجڑ چکے　　گودوں میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے

اب ان کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئینگے　　صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئینگے

لیکن جب بچوں کی لاشوں کو دیکھتی ہیں تو بیہوش ہو جاتی ہیں۔ آخر میر کی کوئی حد بھی ہے! انسان، پھر عورت اور وہ بھی وہ جسکے دونوں بچے اسکی آنکھوں کے سامنے مار ڈالے گئے ہوں، اگر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے تو فوق الفطرت بات ہوگی! کس قدر صحیح اور پاکیزہ نقشہ پیش کیا ہے کہ حضرت زینب کو جب ہوش آتا ہے تو انھیں اپنے بچوں کے کفن دفن کی فکر نہیں ہوتی بلکہ ؎

ہوش آیا تو اکبر سے کہا "رانڈوں کو سمجھاؤ　　"ہے ہے نہ کرو صاحبو! اک لحظہ ٹھہر جاؤ"
عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ "اوھر آؤ　　کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ"

ہا تو ہیں کدھر، آہ یہ کیا بیخبری ہے
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے!

ایثار اور محبت کی انتہا ہے کہ اپنے بچے تو مرے پڑے ہیں، لیکن زینب کو علی اکبر کی فکر لگی ہوئی ہے۔ انھیں یہ برا معلوم ہوتا ہے کہ بن بیاہے علی اکبر نے انکی لاشیں کیوں اُٹھائیں؟ انکی نسائیت کا اقتضا تھا کہ اس موقعہ پر وہ عورتوں کے عام اوہام سے بری نہ ہوتیں۔ چنانچہ اسوقت انھیں ایک معمولی عورت کی طرح وسواس ہوا مگر یہ وسواس بھی ایک گہری محبت کا نتیجہ ہے ؎

زینب نے کہا کیوں مجھے وسواس نہ آئے　　ہے ہے علی اکبر اسے کیوں گود میں لائے؟
لوگو! مرے پیارے نے بڑے رنج اُٹھائے　　صدقے یہ پھوپی لاش کے لے آنے کے جائے

دور و زسے وہ سر پہ دھوپ تشنہ دہاں ہے
اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے

ان دونوں نے گر جان کی گنوائی تو گنوائی　　بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اُٹھائی
میں ماں ہوں [illegible]　　اکبر مری اماں وہ برس کی ہے [illegible]

دل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
صدقہ اب اُتاروں گی تو سو اس مٹے گا

حضرت زینب امام حسین کے بچوں (بالخصوص علی اکبر) کی عاشق زار تھیں، اور اس قدر محبت کرتی تھیں کہ اکبر کا رونا تک اُنھیں پسند نہ تھا۔ اپنے ہر کام میں وہ علی اکبر کا لحاظ رکھتی تھیں۔ جب نیا چاند نکلتا تو وہ پہلے ان ہی کا چہرہ دیکھتی تھیں۔ اپنے بچوں اور شوہر کو بھی ہمیشہ انکا خادم سمجھتی تھیں۔ ایسی صورت میں وہ کب گوارا کر سکتی تھیں کہ علی اکبر عون و محمد کی لاشیں لے آئیں؟

یہاں تک تو انیس نے حضرت زینب کو ایک عربی شکل میں پیش کیا ہے۔ اسکے بعد جب بین شروع ہو جاتے ہیں تو وہ میر انیس کے لیے ایک ہندی عورت بن جاتی ہیں۔ اور چونکہ مرثیوں کی ظاہری کامیابی کے لیے اس عنصر کا شامل کرنا لازمات سے تھا، اس لیے انیس نے اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے۔ اور اگرچہ اس امر میں وہ بعض جگہ جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئے ہیں، لیکن یہ کوئی بڑا نقص نہیں ہے کہ صرف اسکی وجہ سے انکے شاندار شہ کاروں کی حقیقی قدر و منزلت میں کسی قسم کی کمی واقع ہو سکے۔ ان الحسنات یذہبن السیئات۔

سید محی الدین قادری زور

وارداتِ قلب

ہے آرزو کہ جلوۂ جانانہ دیکھیے — روشن جبینِ یار سے کاشانہ دیکھیے
چھٹ جائے جامِ ضبط نہ پھر ہاتھ سے کہیں — مستِ شرابِ شوق ہے دیوانہ دیکھیے
منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر — لیجائے کس طرف دلِ دیوانہ دیکھیے
کس کے جمال سے چمک اُٹھے ہیں بام و در — کس سے ہوئی ہے رونقِ کاشانہ دیکھیے
رنگین جوشِ گل سے ہے پھر دامنِ بہار — پھر کہہ رہا ہے کچھ دلِ دیوانہ دیکھیے
لایا تو ہے نکال کے اُس بزم سے مجھے — لیجائے اب کہاں دلِ دیوانہ دیکھیے
لیکر نگاہِ شوق میں اُسکی خدائی حسن — ہر ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ دیکھیے
ذروں کو اک نظر میں گلستاں بنائیے — ملجائیں پھر سمانہ دیکھیے

کھلے نہ شانِ حسن میں اک آدنگ
[illegible] نہ دیکھیں

مروائی

بیان واقعہ

شاعری نام ہے جذبات کی موزونی کا اور باقی مرے دل میں کوئی جذبہ ہی نہیں

میری اُس نظم کا مقطع ہے جو "وجہِ خموشی" کے عنوان سے ۱۹۱۴ء کے کسی نمبر میں درج الناظر ہو چکی ہے، اور جسکے بعد سے میں ادبی دنیا سے بتدریج کنارہ کش ہوتا چلا گیا۔ غزل میں یوں بھی شاذونادر ہی کہتا تھا، اس ترکِ فکر کے بعد پھر کیا نوبت آتی، ۱۹۲۵ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں جبکہ دورۂ دہات پر تھا، ایک دلفریب شام کی لطافت منظر نے میرے سکوت شعری کو ۱۱-۱۲ سال بعد نطقِ تغزل میں منتقل کر دیا اور حالتِ بیاختگی میں میری زبان سے نکلا ؎

تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر فصلِ بہار ہاتھ ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں میں

جی چاہا، لکھوں، اب قلم کی دوسری گردش کا نتیجہ یہ تھا ؎

میری فردوس نگاہی بھی ہے تزئینِ جنوں کہ گلستاں ہی گلستاں ہیں بیابانوں میں

پھر فوراً ہی زبان پر آیا

ہیں قدح خوار ترے مستِ الست ساقی مئے وحدت ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

آخر کار غزل مکمل ہو گئی، جو الناظر کے جنوری نمبر میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے، اسکے بعد طبیعت جو متوجہ ہوئی، غزل گوئی کا سلسلہ چل گیا، جو دوست بھی فرمائش کرتے ہیں اُنکے رسالہ یا اخبار کے لیے غزل عرض کی اور پیش کر دی، ایڈیٹر صاحب مرقع کے خط کا جواب لکھنے بیٹھا، اُسی ضمن میں ایک غزل بھی کہہ گیا، عباس کی خیریت معلوم کرنا چاہی، آخر میں قوم کے لیے غزل بھی درج کر دی، سائل صاحب کو ایک خاص معاملہ میں چٹھی لکھی پیمانہ کے لیے غزل بھی رکھ دی، غرضکہ میری ادبی زندگی کے دورِ چار سالہ بازی میں "فصلِ بہار کے منتظر دیوانوں" کا شعر ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے، جسکو پڑھنے کے ساتھ ہی سب سے پہلے میرے چھوٹے بھائی محمد عمر شوکت تھانوی نے مجھے لکھنؤ سے خط لکھا کہ رسالہ نقاد کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا، جناب جلیل کی غزل نظر پڑی جسکا ایک شعر یہ ہے

منتظر موسمِ گل کے ہیں ترے دیوانے ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

لہٰذا الناظر میں جو آپ کی تازہ غزل شائع ہوئی ہے اُسکا چوتھا شعر اپنی بیاض میں سے حذف کر دیجئے میں نے جواب دیا، آخر کیوں؟ اگر جلیل القدر نے مجھ سے پہلے اسی مضمون کو انھیں الفاظ میں ادا

کر دیا ہے، تو صرف یہ وجہ میرے لیے اس شعر سے دست بردار ہو جانے کے واسطے کافی نہیں اُستادِ نظام ہی اپنا شعر کیوں نہ کاٹ ڈالیں، اور میری فکر مایہ کو اپنے سے مقدم تصور فرمالیں، اُنکو اگر اپنی قوت سخنگوئی پر اعتماد ہے تو مجھے بھی اپنے کلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی طرف سے یہ سوظنی نہیں ہے کہ میری نسبت قوار دے زیادہ کوئی دوسری بدگمانی کریں گے"۔

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، دو مہینے ہوئے میں لکھنؤ میں تھا، ایک پُرلطف صحبت میں حضرت وصل بلگرامی کے یہاں بسبیل تذکرہ مولانا عبدالباری آسی نے مجھ سے پوچھا کہ "سازِ عشق، نازِ عشق" کوئی غزل بھوپال میں سُنی ہے؟ میں نے کہا، منشی سراج میرخاں صاحب سحر وہاں ایک مشہور اُستاد گذرے ہیں، اس زمین میں اُنکی ایک غزل بہت مشہور ہے، اور اُنھیں سے سُنے ہوئے یہ تین شعر مجھے بھی یاد ہیں:-

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوزِ سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق
باندھ کے صف ہوں سب کھڑے، تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق
فرشِ زمیں پہ مصطفےٰ، عرشِ بریں پہ کبریا!
پہونچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

میرے اس بیان پر جرح ہونے لگی، کب سے بھوپال میں ہو؟ کیا خود سحر صاحب نے یہ شعر سُنائے تھے؟ کس جگہ پڑھے گئے تھے؟ وغیرہ۔ میں متعجب تھا اور جواب دینے پر مجبور، کہا، ۱۹۰۵ء سے وہاں مقیم ہوں، تقریباً ۱۵ سال ہوئے۔ شہید ٹونکی کے منعقدہ مشاعرہ میں غیرطرح کلام کی فرمائش متواتر پر "سحر مرحوم" نے خود یہ غزل پڑھی تھی، اور مدتِ دراز تک شہر بھوپال میں بچہ بچہ کی زبان پر اسکے اشعار رہے، آخر بات کیا ہے؟

جناب اُمید امیٹھوی بھی موجود تھے، فرمانے لگے، قنوج کے مرحوم رسالہ "پیام عاشق" میں بیس برس ہوئے یہ غزل میں نے صفدر مرزاپوری کے نام سے طبع ہونکہ سحر بھوپالی کی شخصیت سے میں بخوبی واقف تھا، اور کسی طرح اُنکی طرف سے سیلیے خیال ہوا کہ حضرت صفدر سے جو شریکِ بزم تھے اُمید صاحب تفریح فرمارہے ہوت کی کوئی انتہا رہی جب وصل صاحب اور حضرت آسی نے بطور امر واقعہ فرمایا کہ صفدر صاحب اس غزل کو اپنی

بتاتے ہیں، اور سفر بھوپال میں جناب وصل یہی غزل مرحوم سحر کے جزوِ کلام کی حیثیت سے سُن آئے ہیں جس کی وجہ سے تنقیحی سوالات ہوئے تھے - میں جناب صفدر کا دیرینہ نیازمند اور اُنکی مشقِ سخن کا معترف ہوں، سحر کی کہنہ مشقی اور مقامی ہر دلعزیزی و کثرتِ تلامذہ سے بھی آگاہ ہوں، پوری غزل کے تواردکی عمر بھر میں یہ پہلی مثال مجھے ملی ہے، ورنہ دو دو، چار چار شعر تو ہر مہینے کسی نہ کسی رسالہ میں مشاہیرِ قدیم کے جدید کہنے والوں کے نام کے ساتھ دیکھنے میں آجاتے ہیں، ماہ گذشتہ کے رسالہ اُردوئے معلّٰی دہلی میں مولوی محمد اسمٰعیل مصنف کتب درسی کا مشہور شعر:-

ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت　　اصلاح پذیر اسلئے عادت نہیں ہوتی

کسی ثاقب دہلوی کی غزل کے اشعار میں شایع ہوا ہے، ساتھ کے دو اور شعر بھی مشتبہ ہیں - اس سے پہلے رسالۂ مذکور کی ایک غزل "جبیں کا، حسیں کا" والی زمین میں حضرت شوق قدوائی مرحوم کی مشہور غزل کا یہ شعر بہ اندک تغیر موجود تھا -

روز ان کریں نالے مرے تو کیوں وہ خفا ہوں　　گر رہ ہوا جاتا ہے ہوا دار اُنھیں کا

صرف ردیف بدلدی گئی ہے - شوق صاحب بھی خوب فرماتے ہیں

لب کیوں نہ ہوں باتوں میں طرفدار اُنھیں کے　　پروردہ اُنھیں کے ہیں نمکخوار اُنھیں کے
اس سے تو ہمیں کاش وہ گھر ہی میں بُلالیں　　کہلاتے ہیں یوں بھی پس دیوار اُنھیں کے

لطف یہ ہے کہ میں نے ایڈیٹر صاحب کو خط لکھ کر اس طرف متوجہ بھی کیا تھا مگر اُنھوں نے شفات نہ فرمایا، بلکہ اس سلسلہ میں ایک صاحب سے ذکر آیا تو کہنے لگے کہ آپ تو مضمون نگار کے دو ایک اشعار ہی کو کہتے ہیں، رسالۂ مذکور کے "مدیر اعزازی" خود اکبر حیدری صاحب پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا کہ اُنکے بقول خویش ایک کامیاب غزل ہے

شمع میں اک سوز تھا اک ساز پروانے میں تھا　　کس کا عنوان محبت کس کے افسانے میں تھا

جو پہلے "پیمانہ" میں شایع ہوئی، اور پھر خاص طور پر اُردوئے معلّٰی میں نقل کی گئی ہے لکھنؤ کے کسی خوش دماغ کی فکر کا نتیجہ ہے، اور کسی دوسری پوری غزل کے کوئی مالک صاحب دعویدار ہیں واللہ اعلم بحقیقۃ حال -

اسی سفر لکھنؤ میں یہ معلوم ہوا تھا، کہ صفدر مرزا پوری اور کسی لکھنوی شاعر کے مابین ایک اور غزل بھی مابہ النزاع ہے جو بہ یک وقت دو شاعروں (شاید اُناؤ اور لکھنؤ) میں اپنے اپنے نام سے ہر دو صاحبان نے پڑھی، اور اب اُس کا مجمع احباب میں چرچا ہے، گذشتہ سال کسی

بہزاد لکھنوی نے منشی نوبت رائے نظر آں جہانی کا کلام زمانہ وغیرہ میں اپنے نام سے چھپوانا شروع کر دیا تھا، مگر رازِ جلد ہی افشا ہو گیا، اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

"بہرِ خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے" کہنے والوں کی یہ کثرت دیکھکر میرے ایک کاسبِ زر زمانہ شناس دوست کو خوب سوجھی، اپنے اشتہار میں فرماتے ہیں

"قدیم و جدید رنگ کی غزلیں، نظمیں، عمدہ فسانے، قصائد، قطعات، تاریخیں، غرضکہ تمام اقسام کلام آپ کے نام سے تصنیف کی جا سکتی ہیں، کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، ناول تیار ہو سکتے ہیں..... اور اب تک **ایک ہزار** غزلیں اور نظمیں وغیرہ لکھکر بھیجی گئیں"۔

اور نہایت شد و مد کے ساتھ جلی حروف میں اپنے زیرِ نگرانی شائع ہونیوالے رسالہ کے ٹائیٹل پر مسلسل سال بھر سے اس اعلانِ سخن فروشی کی اشاعت کر رہے ہیں، گمان غالب ہے، کامیابی ہوئی ہوگی، [illegible] "ادبی و علمی شعبہ نے جو ملکی ضروریاتِ لطیف کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے" کافی معاوضہ حاصل کیا ہوگا۔ صرف نقص ہے تو اس قدر کہ یہ سکھائے پھول دربار نہیں چڑھتے، اور ایسے مصنوعی شاعروں کا بھانڈا کلام سناتے وقت پھوٹ جاتا ہے۔ زیادہ محتاط لوگ جو صرف اشاعتِ کلام پر اکتفا کرتے ہیں، انکو بھی "تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے"۔ بالخصوص نسوانی طبقہ اس سودے میں قطعاً خسارہ برداشت کر رہا ہے، اور کوئی غیر شاعرہ خواہ کتنا ہی "میں شاعرہ ہوں" کی تکرار کرے، [illegible] اس کا حقیقی موضوعِ شعریت جمالِ پنہاں نہیں رہتا، اور نگاہیں پردۂ زنگاری کے اندر پہونچے بغیر نہیں رہتیں، پھر بھی یہ فیشن ایبل دوکان اُن پرانی قسم کے شعر فروش و صنداروں سے بہتر طریقہ پر چلائی جا سکتی ہے، جن کے تقاضائے قیمت کی جھونڈی اور فرسودہ ترکیبیں "اصلاحِ سخن" کے ریویو مندرجہ ذیل ناظرا، گذشتہ سے منظرِ عام پر آگئیں جسکے لیے ناظرین کو منشی امیر احمد صاحب علوی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

اسی نمبر کے "نظرے خوش گذرے" میں ایڈیٹر صاحب نے اپنے کرم فرمائے دیرینہ قاضی غلام میر صاحب بدایونی کے خط کا اقتباس دیکر مجھ سے خواہش فرمائی ہے کہ "[illegible] تو موصوف کے اندیشہ کو صاحت کرکے دفع کردوں" قاضی صاحب مجھ سے [illegible] غیر ضروری مگر صحیح خوف پر اظہار فرماتے ہوئے میری غزل مطبوعہ جنوری نمبر کو "لچا [illegible] ست مضامین قرار دیتے ہیں، اور متواردِ شعر کو "تماشِ حسین" کا مستحق قرار دیکر [illegible] ایڈیٹر صاحب سے تحریک کی ہے کہ "ارشد صاحب سے پوچھیے ایسی حالت میں اسے توارد کہیں گے یا اس سے بڑھکر

بڑھ کر کچھ اور کہنا چاہیے؟

موجودہ لیل و نہار میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس "کچھ اور" میں قاضی صاحب نے جو مفہوم پنہاں رکھا ہے، اُسکا علی الاعلان اعتراف کرلیا جائے۔ لیکن میں قاضی صاحب کو فنِ شعر کا ماہر اور ایک ممتاز ادیب سمجھتا ہوں، گو صورت آشنا نہیں ہوں لیکن بحیثیت شاعر کے ۱۹۱۰ء سے واقف ہوں، جبکہ اُنھوں نے اپنی غزل

شور تھا وسعتِ دامانِ قیامت کا امیر
بڑھ کے دیکھا تو مرا چاک گریباں نکلا[1]

بھوپال کے اُس مشہور مشاعرہ کے لیے بھیجی تھی، جسکو میں نے قیصر بھوپالی اور سرور بدایونی نے خاص اہتمام سے منعقد کیا تھا، اور بیرونی شعراء میر نیرنگ و ڈاکٹر اقبال وغیرہ نے مخصوص طور پر اُسکے لیے غزلیں کہی تھیں۔ پس میں قاضی صاحب کے ذوقِ سلیم پر اسکا انحصار رکھتا ہوں کہ زیرِ بحث شعر کیا غزل کے بقیہ اشعار کچھ بہت زیادہ بلند اور ممتاز ہے، اور کیا ایسی غزل جو لحاظ بندش الفاظ و سلاستِ مضامین بلند درجہ رکھتی ہو، اُس کا کوئی شعر اگر "خاص تحسین" کا مستحق قرار پائے، تو کیا رفتارِ تخیل و طرزِ بیان کی یکرنگی بھی اُس میں سے مفقود ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قاضی صاحب کی سوزنی اس حد تک نہ پہونچنا چاہیے تھی کہ دوسرا ہم مضمون شعر دیکھ کر بجائے تواردکے وہ "کچھ اور" کہنے کی خواہش اپنے قلب میں پیدا فرمالیتے۔ قاضی صاحب مولانا ظفر الملک کے کرمفرمائے دیرینہ ہیں، آغاز اجراء سے یقیناً انکا نظر اُن کی خدمت میں جاتا ہے، میری متعدد وے چند نہیں بلکہ کثیر التعداد نظمیں انکا نظر میں چھپی ہیں، نہ بھی دیکھنا چاہا ہوگا تب بھی کافی طور پر میرا کلام اُنکے پیشِ نظر ہوتا رہا ہوگا، اور کچھ نہ کچھ رائے وہ میری نسبت رکھتے ہوں گے، اچھی یا بُری، لیکن یقیناً سارقِ سخن سمجھنے کے لیے کوئی مواد اُنھیں نہ ملا ہوگا، ورنہ موجودہ انداز کی طرح پہلے بھی صفحات انکا نظر اُن کے لیے موجود تھے، ایسی صورت میں قاضی صاحب کی بدگمانی "ظن المومنین خیرا" کے تحت میں نہیں آتی، اور اُنھیں صحیح طور پر باور کرنا چاہیے، کہ یہ شعر کیا باعتبار الفاظ اور کیا باعتبار معانی تمامتر میرا ہے۔

اگر حافظ جلیل حسن صاحب کی غزل میں نے دیکھی ہوتی، تو ممکن تھا کہ اُنکے شعر کے مفہوم کو دماغ محفوظ کرلیتا۔ اور عرصۂ دراز کے بعد جب حافظہ سے اُنکے شعر کی ترتیب لفظی محو ہو جاتی تو فکرِ سخن

---

[1] یہ شعر قاضی صاحب کا نہیں ہے بلکہ بدایوں کے ایک دوسرے رئیس جناب امیر احمد صاحب امیر کا ہے جو آل انڈیا اُردو کانفرنس بدایوں کے سکرٹری تھے۔ ایڈیٹر

وقت یا یوں ہی اتفاقیہ طور پر اس شعر کا مضمون میرے طرزِ ادا میں صورتِ موزونی اختیار کر لیتا، اس صورت میں البتہ شعر تخیل میرے تنبہ کا باعث ہو سکتا تھا، خود بخود حافظہ سب کچھ یاد دلا دیتا۔ لیکن جب حقیقت یہ نہ ہو تو میں اپنے زادۂ طبع کو کیوں ضایع کروں۔ فطرت خود اس قوارد کی مرتکب ہوتی رہتی ہے۔ اور مخلوقات میں بہت زیادہ مشابہتیں اسکی پائی جا چکی ہیں۔ مگر یہ ایک اصولی بحث تھی، ورنہ حقیقتاً یہ شعر مجھے کچھ زیادہ عزیز نہیں اور نہ اس قدر فرصت کہ میر و غالب کے کلام سے اساتذۂ سلف کے افکارِ عالیہ کا مقابلہ کر کے اپنی تائید میں ثبوتِ توارد فراہم کروں۔ اور "پیشہ ور شاعر" نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہائے باطل کے عدم وقعیہ کی صورت میں میرا کوئی نقصان نہیں، میری نظمیات کا موضوع بیشتر میرے سوانح حیات ہیں یا پُر لطف اوقاتِ زندگی کے تاثرات، جو دلچسپی احباب کیلیے طبع ہوتے رہتے ہیں، دنیائے سخن میں اپنی شخصیتِ شعری کو نمایاں کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس بازار میں یہ متاعِ ارزاں پہلے ہی کثرت موجود ہے، اور میری جنس کا سد کسی ہنگامۂ مزید کا باعث نہیں ہو سکتی۔ پس میرا ذوقِ سخن میرے جذباتِ ذاتی کی تسکین کے لیے ہے اور بہ قول ایک سخنگوے کلکتہ۔۔

وہی کہتا ہوں دل جسکی مجھے تعلیم کرتا ہے نہیں ہے شاعری میری مگر وحشت بیانِ دل

میرے ایک دو دوستوں نے جو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر کہتے اور لکھتے ہیں، میری ایک محنت سے تیار کردہ مطول نظم کو محض مجھے ستانے کے لیے اپنے نام سے بغیر میرے علم کے شایع کرا دیا، مقصود مجھے برہم کرنا تھا، میں جھنجھلا گیا تو تردید لکھی، اُس کی اشاعت میں نے روک دی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظم لاوارث ہو کر رہ گئی۔ وہ ہر شخص سے صحیح واقعہ بیان کرتے رہتے ہیں، اور میں اُنکی تردید۔ اب وہ اس تکلیف میں مبتلا ہیں کہ غلط طور پر ایک چیز اُن سے منسوب ہو گئی، اور میں اُن سے اپنی اذیت دہی کے (صرف اقدام) کا انتقام لے رہا ہوں۔ لیکن جس طرح اُن کا ضمیر تنازی ہے، ہر شخص آتنا ذی حس نہیں ہوتا۔ ۱۹۰۸ء میں "بے ماں کی بچی" کے عنوان سے میری ایک نظم رسالہ الحجاب میں نکلی تھی، دو تین سال بعد ریاست میسور کی کسی شہرت طلب خیر النسا نے اُسے [illegible] نام سے صرف عنوان بدلکر اخبار پھول میں شایع کرا دیا۔ ایک مناجات جو اتفاقاً میرے مجموعۂ نظم "حسن تخیل" کے شروع میں درج ہے، رحیم النسا کی طرف لاہور میں نکل چکی ہے، پروفیسر نجم صاحب ایم اے نے گذشتہ سال مجھ سے [illegible] لیے لکھی گئی تھیں، طلب فرمائیں۔ میں نے بھیجدیں۔ ایک نظم کے متعلق اُنھوں نے پوچھا کہ واحد یار خاں صاحب کے

نام سے غلاں رسالہ میں کیوں چھپی ہے، میں اس کا کیا جواب دیتا۔ آگرہ کے رسالہ "عزیز" کے لیے وہ نظم لکھی گئی تھی اور اُسی میں چھپی بھی تھی۔ سب سے زیادہ مزیدار واقعہ ۱۹۱۵ء میں سیر بمبئی سے واپسی کے وقت پیش آیا۔ حیدرآباد سے آنے والے ایک یوسف حسین صاحب عزم سفر بنگلور پر میرے رفیقِ سفر ہوئے۔ مبادیاتِ تصادم کے بعد شعراء کے رسم قدیم کے مطابق سننے سنانے کا سلسلہ چلا، فرمانے لگے، مطلع عرض ہے

اعتبارِ زندگانی کچھ نہیں کچھ نہیں دنیائے فانی کچھ نہیں

میں نے کہا، سبحان اللہ، یہ تو آپ کی مشہور غزل ہے جو مجھے بھی حفظ ہے

صبحِ پیری ہنس رہی ہے آڑ میں منظرِ شامِ جوانی کچھ نہیں
بول کچھ تو اے لبِ گویائے غریب یہ زبانِ بے زبانی کچھ نہیں

ٹوک کر بولے، آپ نے کہاں سنی،

رسالہ العصر لکھنؤ میں کسی لکھنوی نے اس مقطع کے ساتھ اپنے نام سے چھپوائی تھی

ہستیِ بے مدعا آرشد ہوں میں شعر کے میرے معانی کچھ نہیں

مجھ سے یہ جواب سُن کر بیساختہ فرمایا، یہ مقطع ہرگز میرا نہیں ہے۔ میں نے کہا بھی تو محل بھی ہے آپ نے کیا فرمایا تھا؟ اس پر وہ کچھ پریشان سے ہوگئے، اور بمشکل بولے اسوقت ذہن میں نہیں رہا۔ مگر صاحب سچ یہ ہے کہ لوگ بھی غضب کرتے ہیں۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہوا، اور ہنسی آنی شروع ہوگئی، جسپر وہ کھسیانے ہوگئے۔ اور بات ٹال کر کہنے لگے، معاف کیجیے گا۔ جناب کا اسم گرامی؟ میں نے کہا آرشد تھانوی۔

اُف۔ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ "عزم" صاحب کی شدتِ ندامت سے کیا کیفیت ہوئی ہوگی مگر واقعہ یہ نہیں، اُنھوں نے جو کچھ کہا میں ہرگز اُس کا متوقع نہ تھا۔ بولے، اچھا تو آپ ہی نے میری غزل اپنے نام سے چھپوائی ہے۔

کاش دوسرے مسافر ہمارے ہم ذوق ہوتے، وہ اس لکھنؤ کو سنکر میری اُسوقت کی حالت کا کا صحیح اندازہ کرسکتے تھے۔ مگر ذرا سے تامل کے بعد راز میری سمجھ میں آگیا۔ غریب عزم نیک نیت تھا، اور ارتکاب سرقہ سے قطعاً بری۔ یقیناً اُس نے کسی دوست سے فرمائشِ غزل کی التماس کیا ہے، وہ اِن سے زیادہ طباع تھے، العصر سے غزل نقل کرکے حضرت کو دیدی۔ اب سادہ لوح شاعر کو کوئی قوت داد سخن سے محروم نہیں کرسکتی۔ اگر اُسی وقت میرے ذہن میں یہ مقولہ بھی آجاتا

کہ "شعر گفتن چہ ضرور" تو آج قاضی صاحب کے حسنِ ظن کی بدولت غالباً اس قدر قلم فرسائی کی نوبت نہ آتی۔

امید ہے کہ سطور بالا اُس بیگانگی کے انسداد کا باعث بھی ہو جائیں گی جو میری طویل خاموشی کی وجہ سے ناظرین الناظر کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے، اور جسکے ازالہ کی طرف برادر محترم مولانا ظفر الملک نے اپنے نوٹ کے آخر میں اشارہ فرمایا ہے

چہ خوش بودے کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

ارشد تھانوی

جذباتِ اثر

لاؤں کہاں سے دیدۂ بینا کہیں جسے
تو خود ہی وہ نہیں ہے کہ تجھ سا کہیں جسے

ہر چند اب وہ دل ہے نہ طوفاں طرازیاں
قطرے میں گم ہے وسعتِ دریا کہیں جسے

حیرت نے بے نقاب کیا بزمِ ناز میں
وہ جلوہ رشکِ شعلۂ سینا کہیں جسے

کچھ آج سے نہیں ہوں میں ناکامِ آرزو
دل پر ہے ایک داغ سویدا کہیں جسے

ٹپکا ہے یادِ عیش گذشتہ میں آنکھ سے
وہ اشکِ ناب ریزۂ مینا کہیں جسے

وہ دیکھنا کسی کا باندازِ دلبری
میرا سکوت نالۂ دُوا کہیں جسے

پھر گلفروشِ دیدۂ خونابہ بار ہے
اک نوبہار، جانِ تمنا کہیں جسے

افسونِ حسنِ دوست سے عالم میں چارسُو
چھایا ہوا ہے رنگِ تماشا کہیں جسے

وجہِ خودی وسیلۂ ترکِ خودی بھی ہے
نیرنگِ ہست و بود کہ دُنیا کہیں جسے

بیتابیوں کی نذر ہوئی انتظار میں
وہ بیخودی کہ شوق کا پردا کہیں جسے

پہلو میں ایک دل ہے سو ویران اس قدر
اہلِ نظر بھی دیکھ کے صحرا کہیں جسے

رنگیں اسی سے دامنِ حسنِ دوام ہے
گو نقش بے ثبات ہے دُنیا کہیں جسے

مشکل گہِ نیاز میں وہ بھی گناہ ہے
اک ا تمنا کہیں جسے

چھپتا ہے کب چھپائے سے درد
خاموش اس طرح ہو تماشا کہیں جسے

اثر۔ لکھنوی

شہیدِ چلیپا

زرغوزہ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ سب ایک ایک کرکے عیسائیوں کے پنجے میں جا چکے ایک بلنسیہ والے البتہ ابھی لڑے جا رہے ہیں۔ مفتوحہ صوبوں میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر خون خشک ہوا جا رہا ہے۔ اور شکست ہے کہ ہر دم نزدیک تر آتی جا رہی ہے۔ کھلے میدان میں لڑنا دشوار ہو گیا تو بیچارے قلعہ میں بند ہو گئے۔ پھر بھی امان نہ ملی۔ عیسائی لشکر نے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور سرنگ لگانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دن بھر محاصرین سرنگ کھود کر اس میں بارود بھرتے اور رات بھر میں محصورین اندر سے ساری بارود نکال لیتے۔ جب یہ حالت دیکھی تو عیسائی جنرل نے آدھی رات کو بارود میں آگ لگوا دی۔ ایک دھماکا ہوا اور شہر پناہ میں ایک بڑا رخنہ ہو گیا۔ محاصرین کی ٹڈی دل فوج اس طرف بڑھی۔ بلنسیہ کے حاکم سلیم نے اپنے چند جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ موقع پر پہونچ کر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا مگر اس طوفان میں نہ ٹھہر سکے اور غلامی سے موت کے خطرے کو بہتر سمجھ کر دشمن کی فوج میں گھسے اور صفیں چیرتے ہوئے نکل گئے۔ باہر نکل کر دم لیا تو سلیم نے اپنے دوستوں سے کہا "میری جان اب خطرے میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میرے رفقا بھی آفت میں پھنسیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ اب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔" ساتھیوں نے سلیم کی اس تجویز سے اختلاف کیا، مگر سلیم کے اصرار اور اپنی جان کے خوف سے انھیں جدا ہونا پڑا۔ اور علی الصباح سلیم اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر بادلِ ناخواستہ بندرِ قرطاجنہ کو چل کھڑا ہوا۔

تمام دن پہاڑی علاقوں میں چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ تاریکی کے ساتھ سردی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ اور سلیم کے پاس اسلحہ اور بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سامنے کچھ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور سلیم جلد جلد قدم اٹھا رہا تھا کہ شاید رات کو آرام کرنے کے لیے کوئی جھونپڑا ملجائے۔ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہوتا ہوا نزدیک پہونچا تو دیکھا کہ دو سپاہی ایک تنگ غار کے دہانے پر الاؤ لگا رہے ہیں اور اسکے اندر کمزور اور گھبرائی ہوئی آواز میں کوئی چلا رہا ہے "رحم..... رحم..... میں بقیصور ہوں..... جلی..... جلی..... آہ..... پانی..... پانی!"

سلیم کے جذبۂ ہمدردی نے جوش مارا۔ اس نے اپنی کمینگاہ سے للکار کر کیا۔ ایک سپاہی تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا چونک پڑا۔ ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا، اور کچھ آہٹ پا کر سلیم پر جھپٹا۔

سلیم نے بھی تلوار سونت لی اور چند منٹ کی سخت جنگ کے بعد اُسے بھی خاک پر سُلا دیا۔ اسکے بعد وہ غار کی طرف بڑھا۔ سُلگتی ہوئی لکڑیوں کو جلدی جلدی ہٹایا تو چاند کی روشنی میں دیکھا کہ ایک حسین لڑکی بیہوش پڑی ہے۔ بڑی مشکلوں سے اُسے باہر نکال کر گھاس پر سلایا۔ دوڑ کر پانی لایا پلایا، مُنہ دھویا اور بیٹھ کر دامن سے پنکھا جھلنے لگا۔ بے حس و حرکت لڑکی کے گورے گورے گال لمبے لمبے سنہرے بال، خوبصورت کتابی چہرہ، سرخ پتلے ہونٹ، نازک جسم اور متناسب اعضا نے جادو کا سا اثر کیا، اُسکی آنکھیں اس حسن کی دیوی کی بلائیں لے رہی تھیں کہ لڑکی نے آنکھیں کھولیں، اور ایک نامحرم کی موجودگی سے بھبک کر اُٹھ بیٹھی۔

سلیم بہوت بیٹھا ہوا تھا، اُسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلسلۂ گفتگو کس طرح چھیڑے۔ تھوڑی دیر کی خموشی کے بعد وہ ہمت کرکے بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں اور اس مصیبت میں کیسے گرفتار ہوگئیں؟" لڑکی نے ہونٹ ہیں بھینچ لیے ہوئے جواب دیا "مجھ بدنصیب کو زہرا کہتے ہیں۔ میرے والد عبدالرحمٰن غرناطہ میں تجارت کرتے ہیں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ مراقش کی سیر کو گئی تھی، وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ آج مہینوں سے والد کا کوئی خط ہے نہ پتہ۔ میں نے گھبرا کر گھر کا رخ کیا، باب الخمیر سے آگے بڑھی تھی کہ ان بے رحم سپاہیوں نے میرا پیچھا کیا۔ بھاگتے بھاگتے میں ادھر نکل آئی اور اپنی جان بچانے کے لیے اس غار میں چھپ گئی" اتنا کہا اور زار زار رونے لگی۔ سلیم نے بہت دلاسا دیا اور کہا "دل چھوٹا نہ کیجیے۔ خدا مددگار ہے غرناطہ تک میں آپ کو پہونچا دوں گا، لیکن اب یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ آئیے ہم اپنا لباس ان مردہ سپاہیوں سے بدل لیں اور فوراً روانہ ہو جائیں"۔

لباس بدل کر زہرا اور سلیم فوراً چل کھڑے ہوئے اور صبح ہوتے ہوتے غرناطہ پہونچ گئے۔ زہرا دوڑ کر باپ کے گلے لپٹ گئی۔ پھر سفر کی صعوبتیں بیان کیں۔ سلیم کا تعارف کرایا اور بڑے اصرار سے کچھ روز قیام کرنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت نے اسلامی زبان اور اسلامی رسوم کو جرم قرار دیدیا تھا۔ مسلمانوں کو قسم قسم کی اذیتیں پہونچائی جاتی تھیں۔ اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے، ذرا سے بہانہ پر بڑی بڑی جائدادیں ضبط ہوتی تھیں۔ امن پسند رعیت [illegible] تھی اور اُنکے علمی خزانے شارع عام پر جلائے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا [illegible] نکو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ بیچاروں نے دول عثمانیہ اور مراقش سے دردبھری اپیلیں [illegible] ہے۔ فرانس اور انگلستان سے مدد چاہی، ایک لاکھ آدمیوں کی کمک فراہم کرنے کی امید دلائی۔ پروٹسٹنٹ مذہب

اختیار کرنے کا وعدہ کیا، مگر سب فضول۔ آخر انھوں نے لڑکر جان دیدینے کا تہیہ کرلیا تھا۔ خفیہ طور پر افریقہ سے ہتھیار منگا لیے تھے اور غدر کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔

زہرا کا جذبۂ احسانمندی محبت سے تبدیل ہوگیا۔ وہ سلیم کو دل سے چاہتی، اور اسکا ہر برتاؤ انتہائی محبت سے لبریز ہوتا۔ سلیم اسی روز گھائل ہوچکا تھا، جب اس نے زہرا کو موت کے غار سے نکالا تھا، اور اب تو وہ جدائی کے خیال ہی سے کانپ اٹھتا تھا۔ محبت کی آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ پیار کی نظریں چار ہوتی تھیں، مگر محبت نے الفاظ کا جامہ نہ پہنا۔ بزرگ باپ حسن وعشق کے کرشموں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دن اس نے سلیم سے کہا "میری دلی خواہش ہے کہ زہرا کی جان بچانے کے صلہ میں اسے آپ کے دامن سے وابستہ کردوں"۔ سلیم نے شرما کر سر جھکا لیا۔

دوسری صبح کو عبدالرحمن نے قاضی کو بلوا کر خفیہ طور پر نکاح کی رسم ادا کرادی۔ شادی میں نمائش ساز و سامان تھا اور نہ بڑی بڑی دعوتیں۔ پھر بھی یہ چھوٹی سی دنیا سچی مسرت سے لبریز تھی۔ مگر افسوس یہ شادی شہاب ثاقب کی طرح مختصر تھی۔ ابھی شام ہونے میں دو گھڑیاں باقی ہونگی کہ پولیس کے چند سپاہی عبدالرحمن کے مکان میں گھس آئے۔ دولہا اور دلھن، اور اسکے بڈھے باپ کو گرفتار کرلیا۔ چند گھنٹوں کی دولھن دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے اپنے باپ کے پیچھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سلیم شیر کی طرح بپھر رہا تھا۔ غصہ سے آنکھیں اور رخسارے سرخ ہوگئے تھے۔ عبدالرحمن نے سمجھا بجھا کر سلیم کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔ اور سب بلا مزاحمت سپاہیوں کے ساتھ ہولیے۔

دوسرے دن عدالت مقدمہ میں مقدمہ پیش ہوا۔ جرم یہ تھا کہ عبدالرحمن نے قانون رائج الوقت کے خلاف اپنی لڑکی کی شادی میں اسلامی رسوم ادا کیے۔ عبدالرحمن نے نہایت پیش اقبال جرم کرلیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو تیل میں بھیگے ہوئے کوڑے اور لوہے کی گرم گرم سلاخیں اسے ایسا کہنے پر مجبور کرینگے۔ اس راست گوئی کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، یعنے تمام جائداد منقولہ وغیر منقولہ بحق کلیسا ضبط کرلی گئی۔

زہرا اپنے حسن کے لیے "ماہِ غرناطہ" کے نام سے مشہور تھی، اور اپنی نسوانی خوبیوں سے اہل غرناطہ کے دلوں میں گھر کرچکی تھی۔ اس کا باپ بھی غرناطہ کے بڑے امرا میں گنا جاتا تھا اور اپنی فیاضی اور ہمدردی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھا۔ ایسے محبوب خاندان کو لٹتے دیکھ کر مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کا ایک مسلح جتھا عیسائی قاضی پر حملہ آور ہوا۔ پولیس نے مدافعت کی مگر انکو ناکامی ہوئی۔ آخر ایک فوج انکی کمک کو آئی۔ کایا پلٹ گئی۔ مسلمان نقصان اٹھاتے مگر

لڑنے سے باز نہ آتے۔ عیسائی جنرل نے جب یہ حال دیکھا تو مفتوحین کی سلامتی کے لیے شاہی معافی کا وعدہ سنایا۔ جان بچنے کی صورت نظر آئی تو بیچاروں نے ہتھیار رکھ دیے اور اپنے اپنے گھروں کا رُخ کیا۔

دوسرے ہی دن منادوں نے تمام مسلمانوں کو شہر کے بڑے کلیسا میں جمع ہونے کا حکم سُنایا لوگ ڈرتے ڈرتے جمع ہوئے تو گورنر نے شاہ فلپ کی طرف سے سب کو جلاوطنی کا حکم سنایا۔ اور بیچاروں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے بندرگاہوں کو روانہ کر دیا۔ نازونعمت کے عادی عیش وعشرت کے خوگر قیدیوں نے اپنے عالیشان محلات، خوبصورت باغات، اور بیشمار مساجد کو بڑی حسرت سے خدا حافظ کہا۔ ضروریاتِ زندگی کا بوجھ سر پر لادا، ننھے ننھے بچوں کو گود میں لیا اور دردوریہ تماشائیوں کی قطاروں میں ہو کر اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہوئے۔

زہرا اور سلیم کا قافلہ اشبیلیہ پہونچا۔ رنج اور سفر کی صعوبتوں نے بڈھے باپ کو سفر ہی میں بستر پر ڈال دیا تھا۔ منزل پر پہونچکر مسافر نے انتقال کیا۔ اللہ اللہ کیا مصیبت تھی کہ بیچاری زہرا عزیز باپ کی میت پر رونے بھی نہ پائی۔ لاش کو ایک غریب بوڑھے کے سپرد کیا اور قافلہ کے ساتھ ہو لیے۔ بندرگاہ پر محافظین نے قافلہ کو کپتان کے سپرد کیا۔ جہاز پر بیٹھے تو مایوس مسلمانوں میں جان آگئی۔ شکرانہ کی نمازیں پڑھیں، خوشی کے ترانے گائے، گویا اپنے چھ سو برس کے پُرانے وطن کو چھوڑنے کا اُنھیں ذرا بھی قلق نہ تھا۔

اس ہنگامۂ مسرت میں جہاز نے لنگر اُٹھایا اور ابھی ساحل نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوا تھا کہ عیسائی کپتان نے زہرا کو بلوا بھیجا۔ زہرا بلا خوف وہاں چلی گئی۔ کپتان نے ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اُس سے کہا "تم اب بھی غرناطہ کی مہ جبینوں کی ملکہ بن سکتی ہو، تم اب بھی اپنے وطن میں رہ سکتی ہو، اور تمھاری ساری جائداد تمھیں واپس مل سکتی ہے، اگر تم میرے ساتھ شادی کر لو" زہرا فوراً جواب دیا "میری شادی بلنسیہ کے بہادر جنرل سلیم کے ساتھ ہو چکی ہے، اور عیش وعشرت اور مال ودولت کے خواب مجھے اُس سے جدا نہیں کر سکتے" کپتان خفیف ہو کر بولا "تمھیں میرے ساتھ شادی کرنی پڑیگی۔ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آؤگی تو جوا رے بہادر سلیم کو بندر کی پولیس کے حوالہ کر دوں گا" زہرا نے زور دیکر جو تجھ سے شادی نہ کروں گی" کپتان لال پیلا ہو کر بولا "میں تجھے مجبور کر دوں پیر پٹخ کر کمرے کے باہر چلا گیا۔

زہرا سمجھ گئی کہ اب سلیم کی خیر نہیں، وہ سجدہ میں گری اور رو رو کر دعا مانگنے لگی "مولا، تو حاضر و ناظر ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہم بے گناہ ہیں، تو دیکھتا ہے کہ ہم ستائے جاتے ہیں، ہماری مدد کر۔ آہ! ظالموں نے ہمارا سکھ چین لیا، مال و دولت چھینا، ہمیں وطن سے بے وطن کیا۔ اب جان کے درپے ہیں! خدایا! اب ہماری عزت پر حملہ کرتے ہیں! کاش اس جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے قبل اسکے کہ یہ پھر ساحل ہسپانیہ پر لنگر انداز ہوتا۔ کاش یہ موذی کپتان سمندر کے خوفناک جانوروں کی خوراک بنجاتا! قبل اسکے کہ سلیم کی موت کا خیال اس کمینے کپتان کی صحبت اختیار کرنے کے لیے مجھے مجبور کرتا۔ میرے مالک! تو بیکسوں کا مددگار ہے، کمزوروں کی عزت کا پاسدار ہے، اپنے حبیبؐ کے صدقہ میں غریب زہرا کی دعا قبول کر"

ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ سلیم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ زہرا نے سجدہ سے سر اُٹھایا اور دوڑ کر اُسکے گلے سے لپٹ گئی۔ سلیم نے گھبراہٹ ہوئی آواز میں کہا "کپتان نے ملاحوں کو حکم دیا کہ جہاز واپس لے چلیں۔ ہم لوگوں نے اُسے اس حرکت سے باز رکھنا چاہا۔ اس میں لڑائی ہوئی۔ بے ناخدا کا جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔" یہ گفتگو کرتا ہوا زہرا کو تختہ پر نکال لایا۔ تمام مسافر حیران و پریشان ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ بچوں اور عورتوں کے رونے اور بلکنے سے اور بھی قیامت بپا تھی۔ عجلت جلد جہاز نے ایک طرف کروٹ لی اور خونخوار آب نے اس لقمہ کو اپنے خوفناک منہ میں رکھ لیا!

جہاز ڈوبنے کے بعد سطح آب ذرا برابر ہوئی تو سلیم اور زہرا مستول کے ایک ٹکڑے سے لٹکے، تند موجوں کا مقابلہ کرتے دکھائی دیے۔ دیکھتے دیکھتے ایک موج کا تھپیڑ لگا اور زہرا کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ سلیم اپنی جان سے عزیز بیوی کو بچانے کے لیے لپکا۔ مگر زہرا یاسی کے عالم میں سلیم سے کچھ ایسا لپٹ گئی کہ اُس کے ہاتھ پاؤں رُک گئے۔ اور ساحل کے قریب آکر یہ مظلوم جوڑا خوفناک تھپیڑوں کی نذر ہوگیا۔ آج تک دونوں عاشق کلیسائی مظالم کی پہونچ سے دُور، سمندر کی تہ میں دوش بدوش میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور بحر روم کی موجیں دن رات اُن کے مدفن پر سرد آہیں بھرتی ہیں۔

سید

قیصر باغ

بحیثیت ایک سیاح کے اگر آپ لکھنؤ میں کسی قدیم عمارت کو سب سے زیادہ پسند فرمائیں گے تو وہ قیصر باغ ہوگا۔ جانشام پیا آخری تاجدار اودھ کے مکمل ذوق و ندرتِ خیال کا بہترین نمونہ یہ عمارت ہے۔ اس عمارت کے بہت کم تاریخی حالات میسر آئے۔ ۱۸۵۰ء میں تعمیر ہوئی۔ اس میں متعدد بینظیر عمارات کے علاوہ زائد از ایک ہزار محلات شاہی کے قیام کے لیے مکانات بنے ہوئے تھے۔ تکمیل کے بعد اس باغ میں ایک قسم کے مخصوص اجتماع ہوا کرتے تھے۔ ایک مقررہ دن سب لوگ صندلی رنگ کے لباس میں شریک ہو کر اپنے تعیش و لطف صحبت کا ثبوت دیتے۔ سلطنت کا چراغ جب "چراغ سحری" کی مدنظر پہونچ گیا اور طوائف الملوکی کی شان ہر چہار جانب پیدا ہو گئی اسکی سب سے بڑی وجہ حضرت اختر (شاہِ اودھ) کی طبیعت کا وہ رنگیلا انقلاب تھا جسکو باصطلاحِ عام "عشرت پسندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں اس عظیم الشان باغ میں "مثنوی دریائے عشق" کے ذریعہ تھیٹر کھیلے جاتے جس میں بسا اوقات خود بادشاہ سلامت بھی ایکٹ کرتے اور اپنے حوارئین سے خوب خوب کمال فن کی داد چاہتے۔ غرضکہ شاہانہ اُلوالعزمیاں ہر چیز سے آشکارا تھیں۔

عمارت کی تعمیر میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ پوری عمارت اعلیٰ کمال معماری کا بہترین نمونہ تھی۔ قصر کا خاص حصہ مربع مستطیل وضع کے احاطہ سے تعلق رکھتا تھا۔ گرد کی عمارت میں اتنی بڑی گنجایش تھی کہ ایک ہزار محلات بافراغت رہ سکیں۔ ہر عمارت میں ایک جداگانہ باغین باغ تھا اور وسط صحن میں سب سے زیادہ پُرتکلف چمن بندی کے علاوہ صدہا قسم کے خوشنما فوارے اور متعدد خوشنما نہریں تھیں۔ انہیں سے ایک سنگ مرمر کی نہر میں اپنے خوبصورت و عجیب پُل کے ابتک موجودہ کونسل ہال کے سامنے قیصر باغ کی گذشتہ شان و شوکت کی یاد دلا رہی ہے۔ ہر روش پر مرمری مورتیں، پُرچیاں اور دوسری خوبصورت صناعیوں سے [illegible] تھے۔ تمام وسیع عمارت قسم قسم کے اسبابِ تعیش سے بہترین اصولوں پر آراستہ تھی۔ قیصر باغ میں وہ اگلی سی شان نہیں مگر اس گئے گذرے عالم پر بھی وہ عمارتیں [illegible] ہے۔ گو اس سے ہم اگلی شان و شوکت کا کسی طور سے بھی اندازہ نہیں لگا سکتے [illegible] بولہ کے مربع مستطیل کی

حادی ہے وہ "تعلقداران اودھ" کو دیدگئی ہے جنھوں نے بعض حصوں کو اپنے رہنے کے مکانات قرار دے لیا ہے۔ بقیہ حصے بغیر چھت کی عالیشان دیواریں اور خوبصورت کھنڈر نظر آتے ہیں۔ جن سے زمانہ کے نشیب و فراز کا ایک عبرتناک سبق ملتا ہے!

بڑے بڑے عالیشان محراب دار پھاٹک اپنے بھاری بھاری تانبے کے طلا کار دروازوں کے ساتھ جن پر دریائی پریاں اور شاہ اودھ کا معرکہ بنا ہوا ہے، ابتک قائم ہیں۔ جب بلگرام تک پہونچنے کے لیے غدر میں لڑائی ہوئی ہے تو قیصر باغ وہ مقام تھا جسپر انگریزی فوج کو قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اسکی تمام عمارتیں باغیوں سے بھری ہوئی تھیں، جو مال غنیمت لالا کر وہاں جمع کر چکے تھے انگریزی فوج نے داخلہ پر باغیوں کو سنگینوں سے قتل کرنے کے علاوہ تمام مال غنیمت کو اپنا بنا لیا۔ تمامی پھاٹک جسکے نیچے بدنصیب قیدی "سرمونٹ اسٹوارٹ جیکسن" اور دیگر انگریز نہایت بیدردانہ طور پر قتل کیے گئے تھے، اُس میں سے ہوکر اگر جائیے، تو آپ کو "شاہی جلوخانہ" کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات دکھلائی دینگے یہ وہ مقام ہے جہاں شاہی جلوس آکر صف بندی کرتا تھا۔ اور اسی جگہ سے سواری نکلا کرتی تھی اسکے داہنی طرف دوسری محراب میں جائیے، تو "چینی باغ" نظر کے سامنے آئیگا۔ اس باغ کی خصوصیت تھی کہ اس میں جس قدر بھی سامان تھا سب چینی کا نظر آتا تھا۔ ایک اور محراب جسکے گرد سبز دریائی پریاں ہیں، وہ راستہ حضرت گنج کو لیجاتا ہے۔ یہ باغ خاص! دشاہ کے نام سے منسوب تھا۔ اسکے داہنی طرف "چاندی والی بارہ دری" مشہور و نفیس عمارت تھی، جسکے سقف و ستون سب چاندی کے پتروں سے منڈھے ہوے تھے۔ یہ تمام چاندی ۱۸۵۷ء کے غدر میں تلف ہوئی۔

غرضکہ یہ ہیں اس مٹی ہوئی تاریخی عمارت کے مختصر حالات۔ آہ! کبھی یہ عمارت گہوارۂ عیش و عشرت اور سرمایۂ راحت و آرام تھی کسی کے جوش و ولولہ اور شوق کا مکمل نمونہ تھی، اور آج اُسکی کیا حالت ہے؟ کاش اودھ کے نامور تعلقہ دار جن کو کچھ بھی اپنے اسلاف کی یادگاروں کی قدر ہے وہ اس عظیم الشان تاریخی عمارت کی طرف پوری توجہ سے کام لیں، ورنہ اگر یہی لاپروائی اور عدم توجہ رہی تو وہ دن دُور نہیں کہ یہاں ایک ویرانۂ عبرتناک کا منظر آنکھوں کو نظر آئے اور آنے والی نسلیں ہماری غفلت پہ آنسو بہائیں۔ خدا ایسا وقت نہ لائے جسکے خیال اور تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

مسعود الرحمٰن ندوی

بارگاہِ سخن

یہ بارگاہِ شعر ہے، جھکتے ہیں سر یہاں
داغِ جگر سے ہوتی ہے پیدا نظر یہاں

چومی ہے نخوتوں نے یہ خاکِ فتادگی
ڈالی ہے رفعتوں نے فلک کی سپر یہاں

اللہ رے علوئے مراتب، زہے شرف
قدموں پہ کائنات کا رہتا ہے سر یہاں

اس راستہ کی شمع ہے جبریل کا نفس
بجھ جاتا ہے ہوا سے چراغِ خضر یہاں

ہر شے ہے اپنی صورتِ اصلی میں جلوہ ریز
ہے ساز و برگِ دہر، برنگِ دگر یہاں

پڑتی ہے ضوءِ جبینِ طلوع و غروب پر
کھلتا ہے رنگِ عارضِ شام و سحر یہاں

اس کفورِ خیال کی اللہ ری عافیت
شاہوں سے فاقہ مست ہیں آسودہ تر یہاں

فرماں روا دلوں پہ ہے گلبانگِ بیخودی
یعنی حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

ہر گوشۂ بساط پہ تاروں کی چھاؤں میں
کرتے ہیں رقص زہرہ وش و سیمبر یہاں

پڑتی ہے آ کے قلب پہ حسنِ ازل کی ضرب
آئینہ توڑ دیتا ہے، آئینہ گر یہاں

اس مجلۂ لطیف کی رخشندگی نہ پوچھ
بجھتے ہوئے چراغ ہیں شمس و قمر یہاں

اللہ رے سرود، کہ اجزائے کائنات
ہر زیر و بم پہ ہوتے ہیں زیر و زبر یہاں

چلتی ہے بادِ جنسِ کمال اس دیار میں
آتا ہے گھر کے ابرِ متاعِ ہنر یہاں

اس دائرے میں منصبِ کام و دہن ہے ایک
زہراب میں ہے لذتِ شہد و شکر یہاں

ہاتھوں پہ خلد سے طبقِ زر لیے ہوئے
قد سی ادب سے آتے ہیں شام و سحر یہاں

با طل، فسانۂ کرۂ ارض و دورِ چرخ
یہ دائرے ہیں حلقۂ بیرونِ در یہاں

رنگِ شفق سے ہوتے ہیں تعمیرِ سقف و بام
گلبرگِ تر سے بنتے ہیں دیوار و در یہاں

پروانۂ معرفت کا ہے دل کی شکستگی
پیغمبری [illegible] داغِ جگر یہاں

ہے کس خیالِ خام میں پروازِ علم و فضل
ہر [illegible] صد بال و پر یہاں

اڑتا ہے سوئے عرش بریں شب کو مرغِ دل
ہو [illegible] تیں بسر یہاں

ہر سنگ میں ہے خندۂ اصنامِ آذری
ہر خار میں [illegible] ہوۂ گلہائے تر یہاں

ہر ذرۂ حقیر، بصد ناز و دلبری — رکھتا ہے آفتاب کے زانو پہ سر یہاں
کیا پوچھتا ہے جوشؔ تصور کے معجزے — ہوتی ہے ہر "خیال" سے پیدا "نظر" یہاں
جوشؔ، ملیح آبادی

رباعیاتِ رواں

(حسن و عشق)

جب حسن سے فیضیاب ہو جاتا ہے — دل خود گرِ پیچ و تاب ہو جاتا ہے
اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے بشر — ایسا کچھ انقلاب ہو جاتا ہے

ختمِ غمِ روزگار کر دیتا ہیں — یہ دورِ خزاں بہار کر دیتا ہیں
کوئی مقصودِ آرزو ہی نہ ملا — جس پر دل و جاں نثار کر دیتا ہیں

اس سے بہتر کہ بادہ کوثر دے — اک مست نگاہ عاشقوں پر کر دے
اے مطلعِ حسن، اے بیاضِ خورشید! — پیمانۂ دل میں نورِ الفت بھر دے

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے — کیا لطف سفر سے ہو، جو منزل نہ ملے
وسطِ دریا میں غرق ہونا بہتر — اس سے، کہ قریب آ کے ساحل نہ ملے

سُن، اے دامن بچا کے جانے والے — کیا کہتے ہیں اشکِ خوں بہانے والے
کس طرح ہو جمع خاطرِ خستہ دلاں — اے چاکِ جگر پہ مسکرانے والے

جب نفس پہ فتحیاب ہو جاتا ہے — انساں عظمت مآب ہو جاتا ہے
اُف، عشق کی سوزشِ دروں کی تاثیر — ہر داغِ دل آفتاب ہو جاتا ہے

رواں، ایم اے، ال ال بی،

سفرِ حجاز کی مختصر روداد

نویں منزل

حسن سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ علی الصباح اونٹ آجائیں گے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جائیں اور منا میں پہونچکر مسجد خیف میں پانچ وقت کی مسنون نماز ادا کر سکیں، لیکن اونٹوں کے آنے میں بہت دیر ہوئی اور ظہر پڑھ کر روانگی ہو سکی۔ چونکہ راستہ زیادہ فراخ نہیں بلکہ مکۂ معظمہ کے بازاروں میں اور بھی تنگ ہے، اور بکثرت اونٹ منا کی طرف جا رہے تھے، اسلیے اونٹ جا بجا رُکتے بھی تھے اور چلتے بھی نسبتاً آہستہ آہستہ تھے۔ منا کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ ہماری جائے قیام سے دو ڈھائی کوس کا فاصلہ ہوگا مگر تقریباً نصف مسافت شہر کے اندر ہے اسوجہ سے منزل کسی قدر دیر میں طے ہوئی اور جب ہم منا میں پہونچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی چار دیواری سے بالکل متصل ایک احاطہ میں ہمارے اونٹ ٹھہرائے گئے۔ جلدی جلدی شتدف اُتار کر اور سامان رکھ کر نماز کے لیے مسجد خیف میں گئے۔ مسجد کا صحن اور نیز کعبۂ شریف کے رخ پر جو دو دروازہ کا دالان ہے سب کی زمین کچی ہے۔ اور چونکہ بعض حجاج نے وہیں قیام کرنا پسند کیا اور جا بجا کھانا پکایا تھا اس لیے مسجد کی حالت ایک کارواں سرائے کے مانند ہو گئی تھی اور صحن کہیں بھی صاف ستھرا نہ تھا۔ بہرحال اپنی اپنی جانمازیں بچھا کر نماز ادا کر لی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر پیٹ کی فکر پڑی۔ منا میں دو رویہ پختہ بازار بنا ہوا ہے۔ جس میں دوکانیں بھی ہیں اور بعض حصوں میں لوگ ٹھہرتے بھی ہیں۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں اُسوقت بازار زائد رونق پر اگرچہ نہ تھا پھر بھی روٹی گوشت کی متعدد دوکانیں موجود تھیں۔ گرم گرم تنوری روٹیاں لیکر میں اور حاجی شبراتی، چونکہ مکۂ معظمہ سے منا تک پیدل آئے تھے، شکم سیر ہوئے۔

برادر عزیز انور علی سلمہٗ کی ران میں ایک گلٹی نکل آئی تھی جس [illegible] انکو سخت تکلیف تھی اور وہ ساتھ کی مستورات کی کوئی خدمت نہ کر سکتے تھے، [illegible] کو اپنے اونٹ پر بٹھا لیا تھا تاکہ انھیں میرے ساتھ آرام مل سکے۔ مغرب [illegible] نے بعض دوسرے حجاج سے مشورہ کرنے کے بعد حسن سکندر سے کہا کہ رات ہی کو عرفات کے لیے روانگی ہو جائے

کیونکہ دیر میں پہونچنے کی وجہ سے مسجد خیف میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور نماز عشا سے فراغت پاتے ہی کوچ کر دیا۔ چچی صاحبہ وغیرہ کو سوار کرانے اور اُن کا سامان قرینے سے بندھوانے کی خدمت چونکہ میرے متعلق ہوگئی تھی اسلیے ہمارے اونٹ ذرا رُکے رہے اور جب عورتیں سوار ہوچکیں تو سب سے آخر میں میں بھی اپنے شغدف میں جاکر لیٹ رہا۔ دن بھر میں کافی خستگی ہوگئی تھی اسلیے باوجودیکہ شب ماہ تھی مجھے قافلہ حجاج یا منا سے عرفات تک کی منزل کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی اور عقب نماز فجر کے اول وقت میدان عرفات میں نہ پہونچ گئے آنکھ نہ کھلی۔ ہمارے اونٹ اُس پہاڑی سے تقریباً چند فرلانگ کے فاصلہ پر رُکے جسکا نام جبل رحمت بتایا گیا اور جہاں امام خطبہ پڑھتا ہے۔ قریب ہی بازار سا لگا ہوا تھا جہاں تمام ضروری سامان خورد و نوش ملتا تھا۔ نہر زبیدہ چونکہ مظہر میں ہے وہی منا اور عرفات میں بھی ہے۔ بلکہ یہاں شاید کھلی ہوئی ہے جس میں اکثر لوگوں نے جاکر غسل بھی کیا۔

میر عبد العزیز صاحب کو مکہ معظمہ ہی میں پیچش کی کچھ خلش ہوگئی تھی، یہاں تک آتے آتے اور زیادتی ہوگئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے۔ بازار میں جاکر کھانا کھایا اور پھر اپنے شغدفوں میں آکے بیٹھ رہے۔ دھوپ بہت سخت تھی، اوپر تیز لُو چل رہی تھی اور احرام کی وجہ سے نہ سر ڈھک سکتے تھے نہ سینہ کا تحفظ ممکن تھا۔ اس لیے عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ شغدفوں میں پڑے رہیں۔ نماز ظہر کے بعد امام مع شریف صاحب کے مسجد نمرہ سے جو مزدلفہ کے قریب ہے ظہر اور عصر کی نماز ساتھ ادا کرکے اس پہاڑی پر جو جبل عرفات کے پائین میں واقع ہے آتے ہیں اور یہیں اونٹ پر سوار ہوکر امام خطبہ پڑھتا ہے۔ حجاج میں سے جو لوگ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ دھوپ اور لُو کی تاب لاسکیں وہ پہلے ہی سے جاکر اس پہاڑی پر بیٹھ گئے تھے۔ فاصلہ سے لوگوں کی صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر احرام کی سفیدی اور چھتریوں کی سیاہی ضرور نظر آتی تھی۔ مسجد نمرہ میں نماز ادا ہوتے وقت یا ہو چلنے کے وقت توپوں کے چھوٹنے کی آواز آئی جس کے بعد ہی حسن سکندر کے سالہ یوسف اور اُنکے چھوٹے بھائی نے اپنے حاجیوں کو حج کی مبارکباد دیدی اور اُن سے نذرانے وصول کرنا شروع کر دیے۔ عصر کے وقت تک امام صاحب اُس پہاڑی پر پہونچ گئے۔ اور اُنکے پہونچتے ہی پہاڑی کے لوگوں میں ایک عام جنبش معلوم ہوئی۔ گویا لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ یا امام سے قریب ہونے کے لیے بڑھے۔ ہم لوگوں نے پہاڑی کا رخ کرکے زمین پر چٹائی بچھائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ معلوم ہوگیا تھا کہ جس وقت امام خطبہ پڑھتا ہے اور لبیک اللھم لبیک پڑھتا ہے تو جو لوگ پہاڑی پر ہوتے ہیں وہ

حاجیوں کی اطلاع کے لیے اپنے اپنے رومال ہلاتے ہیں۔ چنانچہ جب رومال ہلنے لگے تو ہم لوگوں نے بھی خوب ذوق و شوق سے لبیک پڑھی۔ جیسے جیسے آفتاب ڈھلتا گیا پہاڑی زیادہ صاف نظر آنے لگی مگر صورتیں اب بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یوں تو ظہر اور عصر کے درمیان ہی قوافل کی واپسی شروع ہو گئی تھی مگر جب خطبہ تمام ہو گیا اور لوگ پہاڑی سے اُترے تو عام طور پر کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ عرفات کے وسیع میدان میں جہاں صبح کو چاروں طرف خیمے، چھولداریاں اور شندف نظر آرہے تھے اس وقت سوائے اونٹوں کی آوازوں یا شندفوں سمیت اونٹوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے جمالوں نے بھی عصر کے بعد ہی سے حی۔ حی (چلو چلو) کا ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے میں نہیں رہوں گا۔ جمالوں کی اُس وقت کی بیتابی اور بار بار روانگی کے لیے کہنا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ حالانکہ وہی وقت خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے کا تھا جب جمالوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہہ کہ اور لوگ سوار ہو کر چلیں میں پیدل چلا آؤں گا، اور اپنا آہنی بیگ اُتار کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور غروب آفتاب تک برابر مصروف دعا خوانی رہا۔ اور جب آفتاب بالکل غروب ہو گیا تب وہاں سے اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جمال نے جو میرے پاس ٹھہر گیا تھا اونٹوں تک پہونچا دیا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا میں شندف میں سوار ہو گیا۔ جبل عرفات سے مزدلفہ تک کوئی ڈیڑھ کوس کا فاصلہ ہوگا۔ اور راستہ اتنا وسیع و عریض ہے کہ چار چار پانچ پانچ قطاریں اونٹوں کی ساتھ ہی چلتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اس قدر گرد اُڑتی ہے کہ بمشکل راستہ میں کچھ سجھائی دیتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بازار آگیا جو لالٹینوں اور چراغوں کی کثرت سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہ بازار مسجد نمرہ کے قریب سے شروع ہوا تھا اور شاید میلوں تک چلا گیا تھا۔ مگر دوکانیں عموماً ایک ہی سمت میں یعنے مسجد کے جانب تھیں۔ ہمارے اونٹ مزدلفہ میں ایک مقام پر اُتار دیے گئے۔ رات کے وقت اسکا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مسجد نمرہ سے کتنے فاصلہ پر تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے مقابل کے سمت میں پڑاؤ ہے۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد اسی مقام پر کنکریاں چُنی گئیں۔ اسکے بعد اگرچہ رات بہت ہو چکی تھی اور اس کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں، مگر ہمت کرکے میں بازار گیا اور وہاں کھانا کھا کر چائے پی اور کچھ مٹھا[illegible] کے لیے لیتا آیا۔ حاجی شبراتی صاحب چونکہ پیدل تھے اس لیے ہمارے ساتھ [illegible] سے واپسی میں اپنے مقام تک پہونچنے میں کافی دقت ہوئی۔ اس لیے کہ ہر جا[illegible] یں تھیں۔ چاندنی رات تھی۔ اس لیے شندفوں کے ساتھ عموماً روشنی نہ تھی۔ زیادہ سے زیا[illegible] رقافلہ میں ایک روشنی تھی۔

شندفوں کی یکسانیت کے باعث امتیاز مشکل تھا۔ بہرحال کئی جگہ ٹھوکریں کھا کر بالآخر ایک بار اپنے شندفوں تک رسائی ہوگئی۔ شندفوں کے آگے ہمنے بچھونا پہلے ہی بچھا لیا تھا۔ اور سلمہ سو گئے تھے اس لیے انکو جگانا مناسب نہ معلوم ہوا اور جو کچھ کھانے کا سامان خریدا گیا تھا شندف میں رکھکر میں بھی سو رہا۔ نماز فجر کے وقت اُٹھے اور نماز سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ جمال آگئے اور جلدی جلدی شندف کسے گئے اور آفتاب نکلتے نکلتے منا کی جانب روانہ ہوگئے۔ اسوقت بھی اونٹوں کی کثیر تعداد کے چلنے سے گرد بہت اُڑ رہی تھی، پھر بھی آفتاب کی تیز روشنی میں راستہ اور گرد و پیش کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اب بازار کا کہیں نام و نشان نہ نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں دوکانوں کا سامان اُٹھ نہیں چکا تھا تو وہاں کچھ آثار رات کے بازار کے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلے تھے۔ بائیں جانب مگر ہمارے اونٹوں کے پیچھے مسجد نمرہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس مسجد میں نہ جا سکنے کا افسوس رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں قافلہ پھر منا پہونچ گیا۔ اور اپنے مقام پر پہونچنے سے پہلے ہی ہم نے دیکھ لیا کہ راستہ ہی میں ایک جگہ مذبح ہے جہاں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب ایک چبوترہ پر شریف صاحب اور اُنکے ساتھیوں کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ جس احاطہ میں پہلے قیام تھا اب بھی ہمارے شندف وہیں اُتارے گئے۔ سامان خورونوش ساتھ موجود تھا اس لیے اونٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا۔ شندف رکھنے کے بعد پہلی فکر یہ ہوئی کہ جمرۃ العقبیٰ کے کنکریاں مار آویں۔ چنانچہ ایک ایک دو دو کرکے سب ساتھی اس غرض سے گئے۔ منا کے بازار کی سڑک کے درمیان میں دو حصے ہیں اور مکہ معظمہ کی جانب جاتے ہوئے سرے پر داہنی سمت میں ایک جمرہ ہے جنکی صورت ایک بھدی لاٹ کی سی ہے۔ لاٹ کوئی قد آدم بلند ہوگی انکے گرد ذرا اونچی منڈیر کے تھالے سے بنے ہوئے ہیں جن میں کنکریاں گرتی ہیں۔ جو کنکریاں مزدلفہ میں چُنی تھیں اُنہی سے یہاں جمرہ کو مارا۔ مجمع بہت ہوتا ہے اس وجہ سے بازار میں چلتے وقت بھی کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور جہاں جمرہ ہے وہاں تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور بغیر دھکم دھکا کے رمی جمار انجام نہیں پا سکتی۔ عورتوں اور ضعیفوں کیلیے یہ مرحلہ کافی دشوار ہے۔ رمی جمار سے فراغت پائی تو دھوپ کافی تیز ہو چلی تھی اسلیے تھوڑی دیر آرام کیا اور تازہ دم ہوکر قربانی کے لیے مذبح کی جانب روانہ ہوئے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی طرف سے قربانی کرنے کی خدمت میرے متعلق تھی، اسلیے تقریباً چالیس راسیں خرید کر ذبح کرنا پڑیں۔ ہمراہیوں میں سے دو تین آدمی میرے ساتھ تھے جنکی مدد سے جانور خریدے گئے۔ مذبح جس مقام پر ہے وہاں بڑے بڑے گڈھے اس غرض سے کھُدے ہوئے

ہیں کہ قربانی کے بعد کھالیں اور اوجھڑی وغیرہ اُن میں ڈال دیں۔ مگر اسکی پابندی کم کی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ اُس سے ملحقہ وسیع میدان میں جہاں دور تک بکری، بھیڑ، دُنبوں اور گایوں وغیرہ کے جھنڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ جانور خرید کر کے وہیں ذبح کر دیتے ہیں اور غریب عربوں کی کثیر تعداد وہاں موجود رہتی ہے اور ہر قربانی کرنے والے کو گھیرے رہتی ہے، ذبح شدہ جانور دیدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی یہی کیا کہ سوائے دو دُنبوں کے جنکا گوشت ساتھ لیجانا منظور تھا باقی کُل راسوں کو ذبح کر کے وہیں تقسیم کر دیا۔ جانوروں کی قیمت اگرچہ کسی قدر زیادہ دینا پڑی لیکن مجھے تو اُس میدان میں اُنکی اس قدر کثیر تعداد میں فراہم ہو جانے پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ میں تین چار روپیہ سے لیکر گیارہ گیارہ بارہ بارہ روپیہ تک کی مختلف مدارج کی بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے خریدے گئے اور تقریباً تین چار گھنٹے میں قربانی کے مرحلہ سے فراغت پائی۔ نماز ظہر کے وقت وہیں پانی لیکر وضو کیا گیا اور نماز ادا کی گئی۔ جو عرب چھوکرے ذبح ہونے کے بعد راسیں مانگ لیتے تھے، اُنکے پاس عموماً چھریاں موجود تھیں اور اُنھیں چھریوں سے جانور ذبح کیے گئے۔ بعض وقت یہ چھوکرے کسی جانور کو پسند کر کے چاہتے تھے کہ اُنکو دیا جائے۔ اور ایک جانور کے کئی کئی گاہک ہوتے تھے تو دشواری پیش آتی تھی۔ کیونکہ وہ آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے اور ذبح کرنے والے سے بھی اُلجھ جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اسی چھین جھپٹ میں ایک چھوکرے کے ہاتھ میں چھری لگ گئی اور خون نکل آیا۔ اب کیا تھا وہ میرے ابھر گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے کچھ بخشش دو نہیں تو تم کو پکڑوا دوں گا۔ میں نے ہر چند سمجھایا مگر نہ مانا۔ اور بالآخر ایک مسلح عرب کو جو غالباً فوجی تھا بُلا لایا۔ وہ مجکو اپنے ہمراہ ایک راؤنڈ میں لیگیا جو مذبح سے بالکل ہی قریب تھی اور جس میں پولیس کے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر نے اُسکا بیان سنکر مجھسے کہا کہ اس لڑکے کو کچھ بخشش دیدو۔ میں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بہت سا وقت فضول ضائع ہو چکا ہے اور اگر اب بھی تامل کرونگا تو ممکن ہے کہ اور وقت رائیگاں جائے، اُس لڑکے کو چونی دیکر اپنی جان چھڑائی۔

جن جانوروں کو بنوا کر گوشت اپنے ہمراہ لیجانا تھا اُنکی قربانی سب سے آخر میں ذبح میں کی گئی اور ایک ایک روپیہ دیکر قصاب سے گوشت بنوایا۔ اُس نے مہ لائش نکالدی اور جانور ہمارے حوالہ کر دیا۔ گوشت کے بنانے کی وہاں کس دو تین روپئے دیے جاتے تو شاید بنا دیتا۔

گوشت لیکر چلے تو ایک پولیس والے نے پھر روکا اور دوسری بار افسرِ پولیس کے یہاں

پیشی ہوئی۔ مگر اب کی کچھ دینا نہیں پڑا۔ بلکہ یہ دریافت کرکے کہ گوشت کہاں جائے گا چھوڑ دیے گئے۔ عصر کی نماز میں نے اسی افسر کی راؤٹی کے ایک جانب ادا کی اور اپنے مقام پر پہونچکر فوراً سر سنڈایا۔

مغرب سے کچھ پہلے کھانے کی فکر میں بازار گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت شریف صاحب کی سواری مکہ معظمہ کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑے سے سوار آگے اور تھوڑے سے پیچھے تھے۔ بیچ میں ایک فٹن پر شریف صاحب سوار تھے، جنکے پیچھے ایک شخص خوشنما چھتر لگائے ہوئے تھا۔ دوسرے دن سنا کہ آگے بڑھ کر کسی مقام پر یہ چھتر گر گیا۔ اور لوگوں نے اسکو فال بد قرار دیکر یہ نتیجہ نکالا کہ شریف کا نیر اقبال عنقریب غروب ہونے والا ہے۔

رات کو خستگی کے باعث نیند بہت آئی۔ صبح کی نماز بھی قضا ہوئی۔ نماز ادا کرکے حاجی برہان الدین، حاجی نذیر حسین اور حاجی سلیمان صاحبان تاجران لکھنؤ کی معیت میں طواف کعبہ کے لیے روانہ ہوا۔ گدھے کرایہ پر بہت ملتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ نہیں۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک روپیہ دینا پڑا۔ مکہ معظمہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک مقام پر ستانے کے لیے ٹھہرے۔ ساتھیوں نے ناشتہ اور میں نے کھانا کھایا۔ حرم شریف میں حاضر ہوکر اطمینان تمام طواف کیا، زمزم پیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

شہر میں عام طور پر سناٹا تھا۔ نہ راہگیر چلتے تھے نہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھانے یا قہوہ کی کھلی ملتی تھی۔ طواف و سعی سے فراغت پاکر اُس گھر میں آیا جو مکہ معظمہ میں کرایہ لیا گیا تھا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ دیر آرام کرکے چاروں آدمی منا واپس گئے۔ منا کا بازار حج کے بعد خوب رونق پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا کے سوا ہر قسم کی چیزیں اس بازار میں فروخت ہوتی تھیں۔ شام کو تو راستہ چلنا دشوار تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ عصر کے بعد پہلے تینوں جمروں پر رمی کی پھر مغرب تک مذبح کے میدان میں قربانی کرتا رہا۔ دنبہ جو ایک دن قبل ذبح کیا گیا تھا اُسی کا گوشت آج کھایا گیا۔ بہت لذیذ تھا۔ دوسرے دن سویرے ہی سے روانگی کی فکر شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ مستورات اور ساتھی مریضوں کو طواف زیارت کرانا تھا میں نے ایک قربانی تیسرے دن کے لیے باقی رکھی تھی لہذا سویرے ہی مذبح میں جاکر ایک عمدہ دنبہ مول لیا، قربانی کی اور گوشت بنواکر ساتھ لایا۔ چونکہ تیسرے دن بھی رمی کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے طے پایا کہ جو لوگ مریض ہیں وہ رمی کرکے جائے قیام پر واپس نہ آئیں بلکہ بازار کے سرے پر مل جائیں۔ اور وہیں اپنے اپنے

شندفوں میں سوار ہوں۔ اس خیال سے جو لوگ رمی کرکے واپس آگئے تھے اُنکے ہمراہ خالی اونٹ روانہ کر دیئے گئے۔ اور اُنکو ہدایت کی گئی کہ بازار کے سرے پر ٹھہر جائیں۔ مریضوں کو روانہ کرکے میں بھی روانہ ہوا۔ اور رمی کرکے اور اپنے ساتھیوں کو بٹھا کر شندف پر سوار ہوگیا۔

چونکہ اُس دن کثرت سے حجاج مکہ معظمہ واپس جارہے تھے اس لیے راستہ بہت دشوار گذار تھا۔ اور باوجودیکہ ظہر سے بہت قبل ہم روانہ ہوئے تھے مگر کہیں عصر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے۔ حرم شریف کے پاس پہونچتے ہی اونٹ روک کر آنور سلمہ کو طواف وزیارت کے لیے اُتار دیا اور میں سامان کے ہمراہ گھر آیا

تنقیدیں

عربی طب اس مختصر رسالہ میں حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے عربوں کی طب پر ایک مبسوط بحث کی ہے۔ عربوں کی طب کیا تھی اُس نے کیا کیا مدارج طے کیے اور طب جدید اُس سے کیونکر پیدا ہوئی؟ علمی تاریخی نظر سے یہ چھوٹا سا رسالہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس طب کے ظہور سے قبل بیماریوں کے علاج کا کیا طریقہ تھا۔ اشتری اور بابلی طب کا رواج کہاں تھا۔ یونانی طب کا کہاں دور دورہ تھا۔ ویدک کہاں چھائی ہوئی تھی۔ جڑی بوٹیوں کا علاج کہاں کیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ولادت مسیح سے قبل طب کے قدم جم چکے تھے اور علم جراحی بھی کافی ترقی کر چکا تھا۔ غرضکہ اس قسم کے ارتقائی مدارج کا ذکر بہت شرح وبسط سے کیا گیا ہے جس میں کافی تحقیق وتدقیق سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ہم کو حکیم صاحب سے ایک شکایت بھی ہے کہ اُنھوں نے انگریزی الفاظ بہت صفائی سے استعمال کیے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو بہت بہتر ہوتا۔ بہرحال رسالہ اُن "لغزش" کے باوجود بھی دلچسپ ہے۔ طباعت وکتابت بھی دیدہ زیب۔ قیمت ۶ر مصنفہ سے مل سکتی ہے۔

طب کی تعلیمی زبان اس رسالہ کے مولف جناب مولانا پروفیسر کمیل الطب لکھنؤ ہیں۔ اس مختصر رسالہ میں مو یہ ہے کہ طب کی تعلیم عربی زبان میں ہونا چاہیے۔ مولانا نے رسالہ کو بہت دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے

مگر ہم اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ محض عربی زبان میں طب کی تعلیم ہونا چاہیے۔ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اس بحث پر کبھی مستقل طور سے اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ بہرحال رسالہ بحیثیت مجموعی بہت ہی دلچسپ ہے۔ مصنف سے جھوائی ٹولہ کے پتہ پر بقیمت ۶ مل سکتی ہے۔ (م۔ا۔ ع)

تاریخ دریاباد مؤلفہ منشی برج بھوکھن لال محب۔ قیمت فی جلد ۴ غالباً مؤلف سے مل سکتی ہے۔

محب صاحب فرماتے ہیں "عرصہ سے میرا ارادہ تھا کہ کچھ اپنے وطن مالوف کی خدمت کروں چنانچہ ۱۱ سال کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد" دریاباد کی تاریخ مرتب کی ہے۔ محب صاحب کی حب وطن اگرچہ قابل داد ہے تاہم وطن کے معنی کو اس قدر محدود کر دینا کچھ زیادہ مفید نہیں۔ اگر مؤلف صاحب ۱۱ سال ہندوستان کی خدمت میں صرف کرتے تو آج مورخین کی صف اول میں ہوتے۔ دریاباد کی تاریخ ہونے کی حیثیت سے بھی کتاب کچھ زیادہ قابل قدر نہیں ہے۔ بجائے اسکے کہ دریاباد پر ملک کے اہم سیاسی واقعات اور حادثات کے آثار اور ان کے اسباب پر غور کرتے مولف نے دریاباد کے بہت سے خاندانوں کے خاص خاص افراد کی ایک فرہنگ بنا دی ہے۔ اسے بجائے تاریخ کے کتاب رجال کہنا زیادہ مناسب ہے اور اس حیثیت سے یہ کتاب کچھ اہمیت رکھتی ہے۔

صبح وطن مصنف پنڈت برج نرائن چکبست، پتہ: انڈین پریس الہ آباد۔ صفحات ۱۰۸۔ چکبست مرحوم کا مجموعۂ کلام اس سے پیشتر بھی شایع ہو چکا ہے۔ مگر اس ایڈیشن میں مزید نظموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ پنڈت جی کی حیات ہی میں مرتب ہو چکا تھا، اس لیے مصنف کے حالات بہت مختصر دے گئے ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ "نذرانۂ روح" کے عنوان سے مصنف نے "سودائے طبیعت" کو اپنے شفیق اُستاد پنڈت بشن نرائن در کی روح سے معنون کیا ہے۔

جو شعرا اُردو شاعری کو اعلیٰ تقاضۂ قوم اور تہذیب اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں اُن میں چکبست سب سے آگے ہیں۔ حب وطن، تاریخی کارنامے، فطرت کے مناظر یہی اُنکی شاعری کے محرک اور موضوع ہیں۔ مسلسل نظموں کے علاوہ غزلوں پر بھی یہی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسکے ساتھ ہی انکی نظمیں ہندی ٹیمجات سے بھی پُر ہیں۔ ہندو مسلم تمدنی اتحاد کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

گوتم نے آبرو دی اس سرزمین کو شرمؔ نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سُورمیرا پنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُنکی ہڈیاں ہیں

چلبٹ بھی شاعر تھے۔ نام و نمود کی اُنکو ہوس نہ تھی۔ یہاں تک کہ غزلوں میں تخلص بھی نہ رکھا۔ وہ مرگئے، مگر اُنکا کلام غیر فانی ہے۔ اُنکی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ "رامائن کا ایک سین" ہے جسے پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے "اگر چلبٹ نے صرف رامائن کا ترجمہ کر دیا ہوتا تو یقیناً اُنکا شمار ملٹن کی اس اور ہومر کی صف میں جگہ دیجاتی۔

طباعت و کتابت اچھی ہے، مگر بعض جگہ املا کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انڈین پریس سے اس قسم کی غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔

شاہانِ مالوہ مؤلف مولوی امیر احمد علوی۔ پتہ انوار المطابع لکھنؤ۔ صفحات ۵۹ قیمت عہ

ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیب کی بنانے والی دہلی اور آگرہ کی مغل اور پٹھان سلطنتیں نہ تھیں، بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں جو ہر کمزور بادشاہ کے زمانہ میں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اور سو دو سو برس کی زندگی کے بعد پھر سلطنت دہلی میں ضم ہو جاتی تھیں اسلامی تمدن انھیں کے ہاتھوں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا۔ اس حیثیت سے یہ ریاستیں اتنی اہم ہیں کہ تاریخ کا طالب علم کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ امیر احمد صاحب نے شاہانِ مالوہ کے حالات لکھ کر قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اُنکے طرز تحریر کا کیا کہنا، قابل رشک ہے۔ اور کتاب شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔ البتہ بعض امور نظر انداز ہو گئے ہیں دیباچہ میں ضمنی طور پر چند سطروں میں مالوہ کی جغرافی حالت ختم کر دی ہے۔ حالانکہ اس پر ایک پوری فصل کی ضرورت تھی، تاکہ پڑھنے والے فتح و شکست کے اسباب اور علوم و فنون کی ترقی کے وجوہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے۔ دوسری بہت بڑی خامی یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر مالوہ کی تاریخ سے نامناسب لاپروائی برتی گئی ہے۔ بغیر اُسکے شاہانِ مالوہ کی حکمت کی قدر کرنا مشکل ہے۔ اسکے علاوہ اس کتاب میں مالوہ کی تہذیب و تمدن کا کوئی نقشہ نہیں ہے۔ حالانکہ مالوہ علوم و فنون کا مخزن تھا۔ بالخصوص فن تعمیر اور موسیقی کے لئے تو یہ مباحث بھی فصل بحث کی ضرورت تھی۔ ایک اور کمی یہ رہ گئی کہ بازبہادر اور رانی روپمتی ایسے ہندوستان بنیز تاریخی شخصیتوں کے مثالی کتاب کر لی گئی ہے۔ ان مباحث پر مواد بہت مشکل سے ملتا ہے لیکن اس دشواری کو

قصد تالیف سے پیشتر سوچ لینا چاہیے تھا امید ہے کہ مولوی امیر احمد صاحب اسکے بعد کسی دوسری خود مختار اسلامی ریاست کی طرف متوجہ ہوں گے۔

انقلاب فرانس مترجمہ مولانا عبد الرزاق ندوی۔ پتہ: صدیق بکڈپو، لکھنؤ۔ صفحات ۱۹۲ قیمت عہ

مولانا عبد الرزاق ندوی انقلابی خیالات کے آدمی ہیں، اسلیے ہر وہ چیز جو پبلک کو انقلاب کی طرف مائل کرے، ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی خیال اس کتاب کے ترجمہ کا بھی محرک ہوا ہوگا۔ افسانہ کی حیثیت سے اسکا پایہ کچھ بلند نہیں ہے۔ "ایڈیٹر پیام و الجامعہ" کو انقلابی خیالات کی اشاعت کے لیے اس سے بہتر افسانے مل سکتے تھے۔ کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ترجمہ کس زبان سے کیا گیا ہے، غالباً عربی ترجمہ کو اردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ بہرحال زبان میں "ترجمہ پن" نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب کے مطالعہ کا اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اردو داں طبقہ میں اس عظیم الشان انقلاب کے حالات پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی مقصود ہے۔ لکھائی چھپائی بہت معمولی ہے۔ سرورق کو کتاب کے اشتہار سے مزین کرنے کا طریقہ ذوقِ لطیف پر گراں گذرتا ہے اگر حضرات ناشرین اس سے باز آتے تو اچھا ہوتا۔

بدھ اور اس کا مت مترجم پنڈت شیونرائن شمیم لاہوری۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت مع مطالعہ۔ مؤلف سے مل سکتی ہے۔

بدھ مبلغ دھرم پال جی کے ارشاد کے مطابق شمیم صاحب نے یہ کتاب ایک امریکی بودھ سسٹر اسٹر اس کی تصنیف "بدھ اور اس کا مت" سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ اسی کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔ اس کتاب میں مہاتما بدھ کی زندگی، ان کا مذہب، انکے اخلاق اور سنگھا (آرڈر) کے متعلق مختصر بحث کی گئی ہے۔ اخیر میں بدھ دھرم کی حمایت کے عنوان سے چند اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ زبان سلیس و با محاورہ ہے مگر انگریزی الفاظ کہیں کہیں بلا ضرورت بھی استعمال ہوئے ہیں۔

جا بجا مصنف نے اس بات کا دعوے کیا ہے کہ بدھ مت انتہائی رواداری کے ساتھ بغیر ایک قطرہ خون بہائے شائع ہوا۔ اسکولی کتابوں میں بھی یہی پڑھایا جاتا ہے۔ مگر حال میں محکمۂ آثار قدیمہ نے سندھ میں کچھ ہندو دیوتاؤں کے مجسمے دریافت کیے ہیں جو بالکل لڑے ہوئے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ تھپڑ مسلمانوں کی آمد سے بہت پیشتر کے ہیں غالباً یہ جوش بدھ مسلمین

کے ہاتھوں نے یہ بت شکنی کی ہوگی اس لیے کہ اُس زمانہ میں بودھ بھی بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔

ایک جگہ مسٹر اسٹراس فرماتے ہیں "قدیم بدھ مت بوجہ برہمنوں کی مخالفت اور محمدیوں کے تشدد کے مفقود ہو گیا"

یہ سچ ہے کہ کسی زمانے میں ایران بلکہ عراق میں بھی بدھ مذہب پھیلا ہوا تھا، مگر جس وقت اسلام کا آفتاب عرب میں طلوع ہوا ہے زرتشتیوں اور برہمنوں نے اسکو قریب قریب مٹا دیا تھا، مگر عرب اور ایران کے لوگ جو ہند و مذہب اور بدھ مت کی مشابہت کی بنا پر ہندوؤں کو اکثر بودھ اور اُنکے دیوتاؤں کو بدھ (بت) کے نام سے یاد کیا۔ اسی بنا پر یورپین مورخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور باوجود شافی تردید کے اب بھی اسکی صحت نہیں ہوئی۔

اصل کتاب سے زیادہ دلچسپ وہ ضمیمہ ہے جس میں شمیم صاحب نے بدھ مذہب کے متعلق بہت سے قیمتی معلومات اکٹھا کر دیے ہیں۔ مذہبی حیثیت کے علاوہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ معلومات بہت اہم ہیں۔ بدھ کی پیدائش کا زمانہ، (اُس زمانہ کا) ہندو فلسفہ، کاسیا، نالندا، بودھی نار، اور وجوہاتِ زوال خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

سیرت حضرت جعفر طیارؓ مؤلفہ مولوی ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری۔ صفحات ۴۴۔ مؤلف سے ۲ر میں مل سکتی ہے۔

مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر بیشتر عربی اور فارسی میں ہے، اسوجہ سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اُن سے استفادہ نہیں کر سکتی۔ مذہب سے ہماری بیگانگی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔ لہذا ہر وہ کوشش جو حدیث و فقہ، تاریخ و رجال کی مستند کتابوں کو اُردو لباس پہنانے کی کیجائے مستحسن ہے۔ زیر نظر کتاب اسی قسم کی ایک کوشش ہے، مولوی امام الدین صاحب رام نگری نائب مدیر رسالہ فلاح دارین (بنارس) نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم حضرت جعفر طیارؓ کی سیرت لکھکر قوم کی خدمت انجام دی ہے۔ زبان پاکیزہ، طرز بیان دلچسپ اور ترتیب واقعات صحیح ہے۔ شروع میں خواجہ حسن نظامی [illegible] مختصر دیباچہ یا تقارت اور اسکے بعد مولف کا دیباچہ ایک ورق میں ہے۔ آخر میں سید شاہ محمد [illegible] تقریظ ہے۔ افسوس ہے کہ اس کتابچہ اسلام کے سوانح معمولی طباعت اور معمولی کاغذ پر شائع کیا گیا ہے جو مذاقی کی دلیل ہے۔

(سید)

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز اگست کے دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شرر نے "سلطان عالم ۱ واجد علی شاہ" کے متعلق ایک مختصر مگر مفید مضمون شائع کیا ہے۔ اُنکا بیان چشمدید ہے، اسلیئے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لکھنؤ میں ابھی ایسے بزرگ ہیں جنکی وہ سلطان عالم کے متعلق بہت سا صحیح تاریخی مواد اکٹھا ہو سکتا ہے، اور اُن بیشمار اغلاط کی صحت ہو سکتی ہے جو تاریخ کے نام سے رائج ہیں۔ شرر صاحب فرماتے ہیں:۔

"خود میرے والد بزرگوار کا واقعہ ہے کہ وہ ذوالفقار الدولہ بہادر کی پیشی میں خوشنویس تھے۔ بادشاہ کو ایکدن خبر لگی کہ اسد باغ میں مالیوں کے جتنے اسم ہیں۔ اُن میں سے تھوڑوں ہی پر مالی مقرر ہیں۔ باقی فرضی نام ہیں۔ تنخواہ فرضی آدمی دکھا کے لے لیجاتی ہے۔ نہایت برہمی کے ساتھ پیدل برآمد ہوئے اور والد کو حکم دیا کہ برآورد لاؤ۔ اور ساتھ ہی باغ مذکور کے تمام مالیوں کو حاضری کا حکم ہوا۔ جب سب جمع ہوگئے تو ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور والد سے فرمایا "دیکھو خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ پڑھنا" برآورد سے اسد باغ کے مالیوں کی فہرست نکال کے ایک ایک کا نام پکارو"۔ اور مالیوں کو حکم ہوا کہ جسکا نام پکارا جائے سامنے آکے دوسری طرف چلا جائے۔ برآورد اُن دنوں کسی کتاب یا رجسٹر کی صورت میں نہ ہوتی تھی بلکہ کتوب کی طرح بیسیوں بند نیچے اور پرچھٹے ہوتے۔ والد اسد باغ کی برآورد نکال رہے تھے کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا، اور اُسکے بند ہا تھ سے چھوٹ کر اُڑنے لگے۔ والد اُنکے روکنے کے لیے بیٹھ گئے اور برآورد کو سمیٹ کر مرتب کر لیا۔ جب وہ مرتب ہو گئی تو بادشاہ نے انکی طرف دیکھ کر فرمایا "سنو۔ بادشاہوں کے سامنے بیٹھتے نہیں ہیں"۔ وہ کھڑے ہو کر ادب آموزی کا آداب بجا لائے، اور جائزہ ہونے لگا۔

کثرتِ ممتوعات کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"بیشک ممتوعات کی کثرت تھی، اور بادشاہ پر جو فرد قرارداد جرم لگائی گئی ہے اُس میں سب سے زیادہ سنگین جرم یہی تصور کیا جاتا ہے۔ اس پر کوئی شرعی جرم تو ثابت نہیں ہو سکتا، اسلیئے کہ بادشاہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے پیرو تھے، لہذا اُنکے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز ہے ..... اب رہا یہ کہ اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسکی حالت یہ ہے کہ بادشاہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے اور ٹیڑھا پیچ کی زندگی میں اُنھیں ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہ تھا کہ کسی نامحرم عورت پر اُنکی نظر پڑے۔ مگر شاہی محل تھا جس میں بیشمار خدمتوں، محلداروں، مغلانیوں اور مکانداروں، یہاں تک کہ بھشتنوں اور خاکروبنوں کے ایک گروہ کثیر کے موجود رہنے کی ضرورت تھی۔ ممتوعات میں چند ہی تھیں جن کے ساتھ خلوت گاہ میں داخل کرنے کی غرض سے متعہ کیا گیا ہو۔ سب کی سب خدمتگارنیاں تھیں۔ لیکن چونکہ متعہ ہو جانا لہذا جائز تھا کہ اُن میں سے کوئی پسند آئے تو خلوت میں بلائی جائے۔

طریقہ یہ تھا کہ عام ممتوعات کو بیگم کے لقب کے ساتھ اچھے دلکش خطاب عطا ہو جاتے اور اُنکا شمار بیگمات میں ہو جاتا۔ اگر ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو وہ بیگمات کے زمرے سے ترقی کر کے محلات عالیات میں شامل

ہو جاتی۔ بیگم ہونے تک انکی تنخواہیں بہت تھوڑی اور خدمتگاروں کی سی ہوتیں جو کپڑوں کے علاوہ ماہانہ پچیس سے دس بیس روپئے تک پاتیں۔ محلات کے زمرہ میں شامل ہوتے ہی انکی تنخواہ سو دو سو روپیہ ہو جاتی، رہنے کو جداگانہ محلسرا ملتی اور انکی ڈیوڑھیوں پر خدام اور پہرہ کے سپاہی مقرر ہو جاتے۔

زنانہ میں حکیم شمس الدین احمد لکھنوی "صنعت و رعایت" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

مانہ "شعرائے لکھنؤ کی روش خاص یہ رہی کہ لطفِ زبان و محاورہ کے ساتھ مضمون میں شوخی، رنگینی اور دلفریبی ہو۔ خیالات میں ایسی دقت و پیچیدگی نہ ہو جو بار دماغ ہو جائے اور سلاست زبان کو برباد کر دے، اشعار میں موقع موقع سے روزمرہ صرف کیا جائے، استعارات اور تشبیہیں بکثرت مگر قریب الماخذ ہوں، کلام تعقید سے محفوظ رہے، الفاظ معانی اور مطالب میں تناسب اور رعایت کا ہر قدم پر لحاظ رہے، صحتِ زبان و محاورہ کا خیال کہیں پر چھوٹنے نہ پائے ..... دہلی نے اس صنعت کو اختیار کرنے کی ایک حد قرار دی ہے اور وہ اس سے آگے تجاوز نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ تناسب اور رعایت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تکلف اور آورد نہ ہو اور بلا ضرورت اور بے موقع کھینچ تان کر ایک لفظ کے لیے اسکے تمام مناسب الفاظ لا کر اکٹھا نہ کر دیے جائیں" اسکے چل کر یوں فیصلہ کرتے ہیں:-

شاعری کے دو جزو ہیں تخیل اور زبان۔ بلحاظ اول اہل دہلی کو فضیلت حاصل ہے اور بلحاظ ثانی اہل لکھنؤ کو تفوق ہے۔ صنعت، رعایت اور تناسب بلاشبہ ہر زبان کے لیے نہایت عمدہ اور ضروری چیز ہے۔ اس سے کلام پر لطف اور بامزہ ہو جاتا ہے۔ اس سے گریز کر نا کلام کو روکھا پھیکا اور بے مزہ بنا دے گا۔ اور جس چیز میں حد اعتدال سے تجاوز کر جانا اسکو مخل کر دیگا۔ یہ کہنا کہ لکھنؤ والوں کے یہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں تخیل اور مضمون کی خاک نہیں، اسی طرح غلط ہے جس طرح یہ کہا جائے کہ اہل دہلی کو زبان اور محاورہ کا شعور نہیں۔ دونوں کا اپنا اپنا طرز ہے۔ ایک دوسرے کو الزام نہیں دے سکتا۔ ہماری زبان اور ہماری شاعری دونوں کی ممنون احسان ہیں اور ہمیشہ رہیں گی"

مارف کے اگست نمبر میں مولوی ضیاء احمد صاحب ایم اے کا ایک مضمون "ارتقاء ادب فارسی عہد اکبری میں" شایع ہوا ہے۔ اس اہم مبحث کے لیے یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے۔ ونسنٹ اسمتھ نے اس عہد کی فارسی ادبیات کو پانچ عنوانوں میں تقسیم کیا ہے (ترا جم، تواریخ، خطوط، کلام نظم، کتب مذہبی اور متفرق تصانیف) ہر عنوان ایک طویل بحث چاہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مضمون نگار مقالات کے آیندہ نمبروں میں اسکی تلافی فرمائینگے۔ انکا ذیل کا اقتباس دلچسپی سے پڑھا جائے گا:-

خور کرو اکبر کا دربار کیا تھا ایک اچھی خاصی اکاڈمی تھا! جس میں ہر فن کے ۔۔۔ سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔ جب تک قوم تاریخ دنیا میں موجود ہے، کوئی مورخ اسلامی ہند ۔۔۔ انداز نہیں کر سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ زمانہ کی گردش سے شیخ مبارک ناگوری جیسے متبحر ۔۔۔ دں فیضی اور ابوالفضل کے کارنامے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اہل سنت کی تصانیف ۔۔۔ میری جیسے دام تفسیر حدیث و تلمیذ شیخ ابن حجر مکی کی تحریرات یا مشہور فلسفی میر فتح اللہ شیرازی اور زیر دست متکلم قاضی نظام الدین بدخشی اور شیعہ مجتہد قاضی نوراللہ شوستری صاحب مجالس المومنین وغیرہم کی تصنیفات

صفحۂ تاریخ سے محو ہو جائیں یا مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری صدر الصدور شیخ عبدالنبی سید محمد میر عدل اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے اساطین فضل و کمال کی یاد دلوں سے مٹ جائے۔ انھیں بھی جانے دو کیا یہ قرین قیاس ہے کہ زمانہ فیضی، عرفی، نظیری، سنائی، شیری، میلی کی ترانہ ریزیاں اور خوشنوائیاں جنھوں نے دہلی اور آگرہ کے گلزاروں کو گلستان شیراز و اصفہان کا جواب بنا دیا تھا یکسر بھول جائے گا؟

تلک آثارنا تدل علینا　　فانظروا بعدنا الی الآثار

نگار　سید محی الدین صاحب قادری زور بی اے نے نگار میں "غالب کی ذہنیت" پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے۔ زور صاحب کو ادبی تنقید کا صحیح مذاق اور تنقید کو دلچسپ بنانے کا اچھا ملکہ ہے۔ زیر بحث مضمون کے حصے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک جگہ مشرق اور مغرب کے فن تنقید میں اس طرح تفریق فرماتے ہیں:

"یورپ میں جب کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جاتی ہے تو اسکا ایک بڑا جزو یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ زیر بحث شاعر کی ذہنیت اور میلانات کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا وہ ورڈسورتھ کی طرح کائنات اور انسان کی فطرت پر گہری نظر ڈالتا ہے، یا ٹی سن کی طرح اپنے ہی زمانے کے معتقدات اور اپنے ہی ملک و قوم کے توہمات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یا براؤننگ کی طرح فلسفۂ حیات کے بنیادی اصولوں اور رجائیت کے عالمگیر پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ یا میتھو آرنلڈ کی طرح اپنے ماحول کی بدعنوانیوں سے بیزار ہو کر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسکے برعکس جب اردو کے کسی شاعر پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ آیا وہ ناسخ کے اسلوب بیان کی تقلید کرتا ہے یا آتش کے طرز ادا کی پیروی ..... غرض اردو کی تمام شاعری صرف اسلوب ہی پر منحصر رہتی ہے۔"

ہمایوں　بشیر احمد صاحب نے ہمایوں میں "اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" کے عنوان سے ایک دلچسپ و پر از معلومات مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ ایک جگہ اسپین کی اسلامی حکومت کا نقشہ اس کھینچتے ہیں۔ انصاف کیجیے کہ جدید نظریۂ حکومت کس حد تک مسلمانوں کا مرہون منت ہے:

"عربوں کا ہسپانیہ میں داخل ہونا اور ایک باقاعدہ حکومت کا قائم کر لینا بذات خود ایک انقلاب عظیم تھا شخصی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ہر شخص کو بیش بہا آزادی کے حقوق دیے گئے۔ تمام عہدے ہر کہ و مہ کے لیے خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو ممکن الحصول سمجھے گئے۔ غلاموں کو آزادی اور یہودیوں کو برابری کا رتبہ ملا۔ ڈوزی کہتا ہے کہ "ملک میں ایک عجیب و غریب انقلاب آ گیا۔ یہاں تک کہ شروع میں قوانین بھی معلمین تھے۔ وضع قوانین کے لیے ایک دیوان یا قانونی مجلس قائم کی گئی اور قانون، مسلمان، عیسائی، یہودی، دہریے سب کو ایک نظر سے دیکھنے لگا۔

امویٰ خلفا کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی ہسپانیہ کی حکومت متعدد شعبوں میں تقسیم کی گئی۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یورپین قوموں نے تقسیم حکومت کے بعض اصول ان سے اخذ کیے۔ بلکہ سید امیر علی کا بیان ہے کہ یہ تقسیم بعض حیثیتوں میں آج کل کی حکومت کی ترتیب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

مرکزی حکومت صوبوں اور شہروں کی حکومت کے جزئیات میں دخل نہ دیتی تھی اور محض خراج کے مناسب طور پر وصول کر لینے پر اکتفا کرتی تھی۔ شہر بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبے آپ اپنی حکومت کے امانت دار تھے اور بڑے

شہروں میں تو مجالس شوریٰ بھی ہوتی تھیں۔ فوج میں کام کرنا عربوں اور بربریوں کے لیے ضروری تھا اور خوف و خطرہ کے اوقات میں جبریہ بھرتی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔"

اسی رسالہ میں کسی "کلدار" صاحب نے "سلیمیات" کے عنوان سے مولانا سلیم کی مجوزہ اصلاح رسم الخط کی بدولت پچاس سال بعد کی اردو کا نمونہ پیش کیا ہے:

"ایک بنیا دان جج کی ضخامت عجیب و غریب تھی۔ ایک مرتبا اُسکے پاس مقدما گیا۔ ہاں دریافت پر کہا گیا کہ دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کے پاس تین روٹیاں تھیں، دوسرے کے پاس پانچ، اتنے میں ایک تیسرا جو مسافر معلوم ہوتا تھا آموجود ہوا۔ دونوں نے دخوط دی، اور تینوں نے مل کر ناشتہ فرمایا مسافر چلتے وقت آٹھ درہم دے گیا۔ جسکے متعلق جھگڑا شروع ہوا۔ پہلے نے تجویز کی کہ درہم آدھے آدھے بانٹ لیے جائیں۔ لیکن دوسرے نے کہا کہ روٹیوں کا لحاظ کرتے ہوئے پہلے کو تین درہم ملیں اور دوسرے کو پانچ۔"

جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جامعہ میں "ہندوستان کی معیشت ذرعی" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شائع فرما رہے ہیں۔ اگست نمبر میں "عطاء دیوانی" کے بعد کی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر محب وطن ہندوستانی کے لیے ایسے مضامین کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ ذیل کا اقتباس پڑھ کر اندازہ ہوگا:

"کمپنی کو حقوق دیوانی کیا ملے، سونے کی کان ہاتھ آگئی۔ اور ان تاجروں نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ہندوستان سے جو مال خرید کر باہر بھیجا جاتا تھا، اُس کی قیمت کوئی ساڑھے تین لاکھ پونڈ ہوتی تھی، حکم ہوا کہ ۵ لاکھ پونڈ کا مال خرید جائے۔ شرکت نے طے کیا کہ سارا مال دیوانی کی آمدنی سے خرید جائے۔ بنگال کی جنتہ منتخبہ دسمبر ۱۷۶۶ء کے ایک خط میں لکھتی ہے کہ "جہاں دوسری قومیں اپنا اسباب تجارت فراہم کرنے کے لیے بڑی بڑی شرح سود پر قرض لے رہی ہیں وہاں ہم اپنے وطن کو ایک عظیم الشان مالگذاری کی بدولت اجناس کی شکل میں بھیجتے ہیں جو قوم کے لیے اور کمپنی کے لیے خالص منافع کہا جا سکتا ہے" لکھنے والے اگر منصف مزاج ہوتے تو آگے اور لکھتے کہ "اور ایک بدنصیب قوم کے لیے خالص نقصان"

اب دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"کمپنی کے تجارتی اغراض کے لیے تو روپیہ کی ضرورت تھی ہی اور اسکے لیے مالگذاری کا مطالبہ بڑھانا لازمی تھا۔ مزید براں کمپنی کے عہدہ داروں کے ذاتی اغراض بھی اس اضافہ کی حمایت میں تھے۔ کیونکہ وصولیابی کے بعد جو خالص مالگذاری بچتی تھی اُس میں سے ۱/۲ ۲ فیصدی کے حساب سے ملازمین کمپنی کو حصہ ملتا تھا۔ بٹے کے متعلق یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ اُس میں سے ۳۱ فی صدی گورنر کو دیے جاتے تھے۔ نائب ناظم کونسل کو ۴ ۱/۲ فی صدی بقیہ ارکان مجلس منتخبہ کو ۳ ۱/۲ فی صدی بقیہ ارکان کونسل کو ۱ ۱/۲ فی صدی رزیڈنٹ دربار کو ۴ ۱/۲ فی صدی وغیرہ۔ آقا اور ملازمین کے اغراض جب ۳۱ حصہ مشترک رکھتے تھے تو پھر بھلا حصول مقصد میں کیوں دقت کا سامنا ہوتی۔"

قع مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلی نے "اکبر کی شاعری" پر میں پڑھا تھا۔ مرقع نے اُسے نام و کمال شدید کیا ہے۔ اسلوب

نمونہ مسلمہ کا ڈیمی نے اکبر کے پیغام کی

تلاش امدرس کی تحلیل نفسی نے اس مضمون کو اور بھی قابل قدر بنا دیا ہے۔ "جناب شیخ" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

"اپنے کے دیگر شاعروں کی طرح ہمارے حضرت اکبر بھی شیخ سے سخت ناخوش ہیں۔ لیکن وسیلے نہیں کہ وہ تزہد کی مذمت کرتا ہے، ساغر و مینا کا دشمن اور شاہد پرستی کا مخالف ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ انبیا کی اس وراثت سے محروم ہے جو اسکو اسکے علم نے دی ہے اور اس لیے کہ اپنی سند ہدایت پر بیٹھ کر ارشاد و تبلیغ کرنے کے بجائے حدیث اغوات سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت　　وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں جائے پی کر حسب دستور　　تلاوت کرتے ہیں وہ پانچ سورہ کی

ایک جگہ شیخ کی بے ضرورت گوشہ نشینی اور زہد کفر سے غفلت پر تنقید کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ　　گھر میں بیٹھے ہوئے دو لفظ پڑھا کرتے ہیں

عام نظاہری حالت کا یہ خاکہ ہے

شیخ کی وہ بیچ نہیں وہ شیخ کی داڑھی نہیں　　دوستی مذہب سے ہے پر اس قدر گاڑھی نہیں

اخلاقی پستی اور ذلت کا یہ عالم ہے

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں　　مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

شیخ کی زن پرستی کی طرف یوں اشارہ ہے

شیخ صاحب کو نہیں شاعرو کی باتیں کام　　حسن کی قید نہیں بس ہے مسات سے کام

دوسرے شعر میں شیخ کی زن مریدی کے ساتھ اس امر کی طرف بھی لطیف اشارہ فرماتے ہیں کہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت اور علماء کے درمیان جو خلیج مغائرت حائل ہوگئی ہے اسکو بہت جلد پٹ جانا چاہیے، اور یہ جماعت جو سب سے زیادہ علمائے امت کی توجہ کی محتاج ہے انکی طرف علما کا جلد متوجہ نہ ہونا ملک و قوم کی بڑی بدبختی ہے۔

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہدیا　　آپ بی۔ اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

ہاں یہ بیان ملت جس طرح کولہ کے بھنگے بنے رہتے ہیں اور سیاسیات حاضرہ اور دنیا کے موجودہ تغیرات سے بیخبر رہتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ اپنے قدیم اصول و وضع پر جو انکی متعصبانہ ضد ہے اور تکفیر و تضلیل امت اور سب و شتم میں یہ لوگ جس قدر آزاد ہیں اسکا نمونہ یہ ہے

حال دنیا سے بیخبر ہیں آپ　　گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے　　چاہ زمزم کے آپ منبدک ہیں

رسید کتب

۱۔ باوہ ناب ۔ میر بندی اللہ وکیل ایبٹ آباد تیسیہ عہ
۲۔ یادرسول ۔ خان بہادر مرزا سلطان احمد اکسٹرا سسٹنٹ کمشنر لاہور ۲ر
۳۔ غذائے روح ۔ پنڈت پربھو دیال عاشق لکھنوی عہ
۴۔ میلاد النبی ۔ سید نذیر علی وکیل رامپور ۲ر
۵۔ گنج ۔ واصف فارسی عہ
۶۔ سنگھ ۔ سید اولاد حسین ظاہر لکھنوی عہ

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ

زمانہ - کانپور

(۱) صنعت و رعایت

(۲) کربلا (ڈراما)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ

(۲) فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ

(۳) ارتقائے ادب فارسی عہد اکبر میں

نگار - بھوپال

(۱) غالب کی ذہنیت

(۲) فنون لطیفہ اور اسلام

(۳) ہندوستان کی صنعتی پستی کے اسباب

.....

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر

(۲) رہائی (افسانہ)

(۳) فلسفۂ علم الحیات

(۴) سرگوشیاں

جامعہ - دہلی

(۱) انسان کامل

(۲) ہندوستان کی معیشت زراعتی

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) میر انیس کی شاعری پر ایک نظر

(۲) آخری ملاقات (افسانہ)

مرقع - لکھنؤ

(۱) تحقیقات امیر

(۲) اکبر کی ؟

بسم اللہ

فہرست مضامین مابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ نمبر ۴

افلاطون الٰہی		مولوی حامد علیخاں اسشٹنٹ مجسٹریٹ حیدرآباد دکن	۱
افکار تازہ		منشی سید انور حسین آرزو لکھنوی	۱۳
آیو لنیتھی	(ڈراما)	مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی	۱۴
غزل		منشی سید ممتاز علی آہ	۲۳
شیخ محمد لمتانی		مولوی محمد معشوق حسین خاں بی اے (علیگ)	۲۴
مکتوب امیر		قاضی غلام امیر۔ امیر بدایونی	۳۴
دیوان قائم کا ایک صفحہ		مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی بی اے (علیگ)	۳۵
خلق حسن	(نظم)	مولوی ضیاء احمد ضیا بدایونی ایم اے	۳۶
غزل		ہاسٹر باسط بسوانی	۳۷
		تنقیدیں	۳۹ ۳۸
		پچھلے مہینے کے رسالے	۴۲
		اردو رسائل کے خاص مضامین	۴۹
		نظرے خوش گذرے	۵۰
بہترین غزل گو	(انعامی مضمون)	قاضی غلام امیر امیر بدایونی	۱ - ۲۴

نظر

سچ

جسکی عنان ادارت مولوی عبدالماجد صاحب بی اے کے ہاتھ میں ہے، علاوہ اسکے کہ سچی باتیں لکھتا ہے، ادبی حیثیت سے تمام ہندوستان کے اخبارات میں اپنی آپ نظیر ہے، جسکو پڑھ کر ہر شخص صحیح و فصیح اردو لکھنا سیکھ سکتا ہے۔ سالانہ چندہ ۳ر، نمونہ مفت۔

مہتمم اخبار سچ۔ لکھنؤ

نئی کتابیں

فرامین سلاطین

(از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی)

اس میں خلجی، سور، مغل، عادل شاہی اور برطانوی بادشاہوں کے ۱۸۸ نامور فرامین جمع کیے گئے ہیں۔ چھ فرمانوں کے عکسی فوٹو اور جناب مصنف اور نظام دکن کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ فرمانوں کے پلیٹ دیکھ کر ناظرین گویا اصلی فرامین دیکھ لیں گے تاریخ کے طلباء کیلیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے قیمت غیر مجلد ۸؎

مآثر دکن

(از مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد دکن)

اس کتاب میں حیدرآباد و مضافات بلدہ کی ۴۰ عمارات اور دیگر آثار قدیمہ کے تاریخی حالات بہت محنت جانفشانی سے جمع کیے گئے ہیں اور کتاب کے بیچ بیچ میں ۵۰ عمارات اور انکے کتبوں کے عکسی فوٹو بھی شامل کر دیے گئے ہیں تاریخی اہمیت کے علاوہ یہ کتاب عام شائقین کے لیے بھی بہت دلچسپ، اور حیدرآباد کی سیر کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ قیمت ۴؎

تفسیر سورۂ اخلاص

(از مولوی غلام ربانی صاحب بی اے نائب مدیر زمیندار)

حضرت امام ابن تیمیہؒ کی لاجواب تفسیر آج نایاب ہے سورۂ اخلاص کی تفسیر حاصل کر کے اسکا ترجمہ شایع کر دیا گیا ہے، اس میں صداقت اسلام کے تمام اصولوں پر شرح وبسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدامت مادہ تولد مسیح کے متعلق نصاریٰ کے عقائد اور مخالفین اسلام کی دوسری باطل تاویلوں کا نہایت شافی جواب ہے۔ قیمت ۴؎

کتاب التقدیر

یہ کتاب علامہ ابن قیم کی مشہور کتاب شفاء العلیل کا سلیس اور عام فہم ترجمہ ہے۔ جس میں مسئلۂ قضاء و قدر پر قرآن و حدیث سے نہایت مدلل اور دلآویز بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ تقدیر میں آجکل جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اُس کیلیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قیمت ۱۲؎

سبد گل

از مولوی سید اولاد حسین شاعر لکھنوی۔ یہ کتاب ظفرنامہ ہمارا وطن [illegible] تاروں بھری رات [illegible] جمال شاعر، نور جہاں، محبت، دوشیزۂ کوہسار، میدان ریف کے عنوان [illegible] ں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ قومی اور اخلاقی نظموں کے قدردان جلد طلب فرمائیں۔ قیمت [illegible] ظر کمپنی لکھنؤ

واسطہ تہذیب ظاہری ہوا کرتی ہے اور تہذیب ظاہری احکام شرع کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے اسلیے اُسنے مقصد اول یعنی تہذیب باطنی کیلو واسطہ حصول کیلیے آخر عمر میں تدوین احکام شرع ظاہری کو ضروری سمجھا اور تمام کوششوں کو چھوڑ کر اسی ایک دُھن میں آخر تک لگا رہا اور اپنے پیچھے ایک ایسی شرع چھوڑ گیا ہے جو اس کے علوے مرتبت اور اعلیٰ مدارج ذہنی و روحانی کی طرف دلالت کرتی ہے۔

اگر قرآن پاک کے اس ارشاد پر استدلال کیا جائے کہ لِکُلِّ قَومٍ ہاد ہر قوم میں ایک نہ ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے، تو ممکن ہے کہ سقراط اپنے زمانہ اور ملک کا پیغمبر ہو۔ جو آواز کہ ہر وقت اُسکے ساتھ رہا کرتی تھی وہ اور اس خیال کو تقویت دیتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو افلاطون اُسکا شاگرد رشید و خلیفۂ برحق تھا جسنے ایسے علوم کا نشر و اعلا کیا جنکا سرچشمہ نبوت میں نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

حامد علیخاں

افکار تازہ

(جانشین جلال جناب منشی انور حسین آرزو لکھنوی)

مرنے پر آہِ گرم کا بازار سرد تھا　　یارب یہ تھا نفس کا تعلق کہ درد تھا
مجھ سے وفا نہ آپ سے چھوٹی کشیدگی　　یہ خاکسار آپ کے دامن کی گرد تھا
پروانۂ جمال رُخ ہوشاں رہا　　پابندِ شوق بھی عجب آزاد مرد تھا
کروٹ بھی جب بدل نہ سکا تو ان ہجر　　پھر اور کس مرض کی دوا دل کا درد تھا
بسمل اسے ادا نے اُسے ناز نے کیا　　جوہر تو ایک جا تھے اثر فرد فرد تھا
دل جلوۂ حبیب سے تھا لعلِ شبچراغ　　ظاہر میں جل رہا تھا حقیقت میں سرد تھا
آرام جاں تو ہیں مگر ایذا رساں بھی ہیں　　بیٹھے تھے وہ جدھر اُسی پہلو میں درد تھا
اک وقت میں تھے سوز جدائی کے دو اثر　　شعلہ بنا ہوا تھا نفس جسم سرد تھا
نازک مزاجیوں سے تری وقتِ التفات　　گو خون بڑھ رہا تھا مگر رنگ زرد تھا
تاثیرِ شوقِ قتل یہ مجھ سخت جاں کی تھی　　پہلے سے دست و بازوِ قاتل میں درد تھا

آیولینتھی

چوتھا منظر

[ٹرسٹان - جیوفری - اور آیولینتھی]

[آیولینتھی نابینا ہے مگر اُسکے حرکات وسکنات سے اس امر کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ بلا تکلف چلتی پھرتی ہے کبھی کبھی جیسے سننے کو ٹھہر جاتی ہے اور اُسوقت اپنے ہاتھ آگے بڑھاتی ہے گویا ٹٹولتی ہے اور صرف اسی سے اُسکے آنکھوں سے معذور ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ اُسکی آنکھیں کھلی رہتی ہیں، مگر بسا اوقات زمین کی طرف جھکی ہوئی، اُنکو جنبش بھی کم ہوتی ہے]

آیولینتھی (دروازہ پر) مارتھا! برٹرانڈ!

ٹرسٹان - ارے یہ تو وہی ہے

آیولینتھی - یقیناً میں نے کسی کی آواز سُنی۔ (آگے بڑھ کر) کون ہے؟

ٹرسٹان - ایک اجنبی جو معافی کا خواستگار ہے، کیونکہ وہ بلا اجازت داخل ہوا اور آپ کے آرام اور اس جگہ کے پُرامن سکوت میں خلل ڈالا۔

آیولینتھی - مجھے اپنا ہاتھ دو۔ تم پہلے یہاں کبھی نہیں آئے ہو نہ میں تمہاری آواز پہچانتی ہوں۔ راستہ میں برٹرانڈ یا مارتھا نہیں ملے؟

ٹرسٹان - مجھ سے کسی سے گفتگو نہیں ہوئی۔ میں یہاں اتفاقیہ پہونچ گیا۔

جیوفری (علیحدہ ٹرسٹان سے) یہ چھوکرا ڈگون ہے!

آیولینتھی (سنکر) یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟

ٹرسٹان - یہ میرے دوست ہیں، جو ناٹ اور ٹرویڈور ہیں، اور یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں۔

آیولینتھی - میں تم دونوں کا خیر مقدم کرتی ہوں کیا تم میرے ساتھ اندر نہیں چلوگے، وہاں باہر سے زیادہ خنکی و تازگی ہے۔

جیوفری (جلدی سے) آپ کی عنایت۔ لیکن ہم یہیں ٹھہرے رہیں گے۔ (علیحدہ ٹرسٹان سے) میرے نزدیک اسی میں خیریت ہے۔

آیولینتھی (جو ابھی تک ٹرسٹان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے) تمہارا ہاتھ گرم ہے اور مجھے نبض کی حرکت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا راستہ میں گرمی نے تمہیں تکلیف پہونچائی۔ پیاس تو نہیں لگی ہے؟ ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے جام شراب لاؤں۔ (مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

ٹرسٹان - کس قدر خوبصورت ہے۔ اور ہر خط و خال سے کس قدر خلق و نرم دلی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اسکی شبیہ

جیوفری - عجیب و غریب ہے
جو دل پر ... رکھ گر مضبوط زنجیروں
میں جکڑ دینی ... یں طلق شک نہیں کہ وہ

بڑی عالی نسب ہے، لیکن احتیاط شرط ہے۔ پیارے ٹرسٹان، وہ شراب لائے تو پینا نہیں۔

ٹرسٹان - میں اُسکے ہاتھ سے اجل تک بطیب خاطر پینے کو تیار ہوں، آپ شراب کو کہتے ہیں۔

آیولینتھی (ایک صراحی اور پیالہ لیکر آتی ہے) یہ شراب میرے والد ہمیشہ پیتے ہیں۔ یہ بہت تیز ہے اور میں نہیں پی سکتی۔ لیکن تم ضرور چکھو! (پیالہ بھر کر ٹرسٹان کو پیش کرتی ہے)

ٹرسٹان (پیالہ لیکر اور پیتے ہوئے) اے نازنیں خاتون، میں آپ کا جام صحت پیتا ہوں!

آیولینتھی - اب یہ پیالہ اپنے دوست کو دیدو اگر وہ پینا چاہیں۔ میں تمھارے لیے میوہ لینے جاتی ہوں۔ خرمے اور انگور یا اور جو تم کہو (پھل توڑکر ایک ٹوکری میں رکھتی جاتی ہے جو اُس نے میز پر سے اُٹھائی ہے)

ٹرسٹان (شراب کا پیالہ جیوفری کو دیتا ہے) لو جیوفری پیو۔

جیوفری - تمھیں اس شراب میں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں معلوم ہوئی۔ مثلاً سستی ..... غش .....

ٹرسٹان - بس پی جاؤ۔ ڈرو نہیں۔

جیوفری - تو یہ ہے شراب؟ (پی جاتا ہے) اہا ہا! اصلی میلوائسی۔ اس سے بہتر شراب تو بادشاہ رینی بھی نہ پیتا ہوگا (پھر پیتا ہے) اُہوہو! کیا عمدہ شراب ہے جہاں ایسی حیات جاوید بخشنے والی شراب ملے بھوتوں کا گذر نہیں ہو سکتا۔

آیولینتھی (واپس آتی ہے) لو یہ پھل کھاؤ۔ میں انھیں میز پر رکھے دیتی ہوں۔

جیوفری - اے خوبصورت خاتون آپ نے ہماری ایسی ضیافت کی ہے اور ایسی نایاب و خوش ذائقہ شراب پلائی ہے کہ ہمیں کوئی شبہہ نہیں رہا کہ ہمارا میزبان ایک امیر اور شریف خاندان کا رُکن ہے۔ حسن اور شراب، شاعری و موسیقی کے انجم رہبر ہیں۔ اب آپ میرے الفاظ کو سنیے میں نے فی البدیہہ ایک گیت نظم کیا ہے جو ہماری اطاعت اور احسانمندی کا ترجمان ہوگا۔ (اپنے ستار پر گاتا ہے)

ہم جانتے ہیں کہ عقاب ہے جب وہ ہوا میں بڑے بڑے چکر کاٹتا ہے اور غرور کے ساتھ اونچے بادلوں میں اُڑتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ بلبل ہے جب موسم بہار کی شبنم آلود راتوں میں اُسکے دلربا نغمے اُبلتے ہیں۔

شجاعت و ہنرمندی اور اعتدال نفس سے ایک بہادر شخص تمام عالم کے دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ جما دیتا ہے۔

خوش آہنگ ساز پر گا کر مطرب اپنے کمال موسیقی کا ثبوت دیتا ہے۔ محلوں اور باغوں میں اُسکی عزت کی جاتی ہے۔

(دُھن بدل کر)

لیکن جب شریف اور خوشدل مرد اور عورتیں

کے درمیان وہ اپنا ستار چھیڑتا ہے اور اپنے سُریلے اور دلکش گیتوں کی تعریف کا امیدوار ہوتا ہے۔ جب نوعمر و قبول صورت لڑکے جامِ شراب سب کے سامنے پیش کرکے مطرب کے خیر مقدم کا اعلان کرتے ہیں تو شراب کے ذائقے سے وہ اندازہ کرلیتا ہے کہ ایک شریف خاندان کے سایۂ عاطفت میں ہے۔

آیولینتھی۔ یہ بہت اچھا گیت ہے اور اس سے تمھاری بلند اور غیر معمولی صلاحیتِ شعر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ٹرسٹان۔ میرا دوست پروانس کے نوجوان ٹروبیڈوں میں مشہور ہے۔

آیولینتھی (ٹرسٹان سے) کیا تمھیں بھی نظم و موسیقی میں دخل ہے؟

ٹرسٹان۔ میں ایک مبتدی ہوں، لیکن آپ کی نوازش مجھے ہمت دلاتی ہے کہ میں بھی گاؤں۔ میری نیت سے میرے الفاظ کو پرکھیے۔ (پہلے ستار بجاتا اور پھر گاتا ہے)

شہر کے شور و غل سے پریشان ہوکر میں نے پہاڑوں کا قصد کیا۔ تھکا ماندہ اور مضمحل تھا، دفعتہً ایک وادی نظر آئی جس پر آفتاب اپنی شعاعیں بچھا کر رہا تھا، اور جہاں مختلف اقسام کے پھولوں سے مرصع کاری کی گئی تھی۔ یہاں سکونِ کامل تھا، کسی طائر کا نغمہ تک میرے کانوں کو تکلیف نہیں دیتا تھا انسان کی آواز یا اور کوئی صدا نہیں آتی تھی۔ اس جادو کی وادی میں ہر چیز پر ایک طلسمی نیند چھائی ہوئی تھی۔ ایک دروازہ کھلا اور ایک نورانی صورت نے ستارے کی طرح میری متحیر آنکھوں کو پُر ضیا کر دیا۔ اے نازنین تو مجھے ایک گلاب کی کلی معلوم ہوئی جس پر شبنم کے قطرے ہوں اور کسی جادوگر نے نیند کو مسلط کر دیا ہو۔ تیرے ساتھ گرد و پیش کی ہر شئے پر سکوت طاری تھا۔ بادِ نسیم تیرے موتی سے رخساروں کا خواب دیکھتی تھی۔ آتشخانہ کی آگ دھیمی اور نرم جلتی تھی۔ کھجور کے درخت نیند میں گھتے ہوئے تھے اور اُنکے سر جھکے جاتے تھے۔ ہر چیز میں صرف تیرے سبب سے زندگی ہے اور سب تیری تابع ہیں۔ اور جب تو آرام کرتی ہے تو وہ بھی آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔

تو جاگی اور ہوا میں، باغ میں، پھولوں میں ایک روح دوڑ گئی۔ گویا سورج کی کرن نے اُنھیں نیند سے جگا دیا۔

اے تو کہ گلاب کا ایک نازک پھول ہے میرے ناقص گیت کو جو میری سچی اور دلی اطاعت کا مؤید ہے قبول کر، کیونکہ تیرے حُسن نے اِس کو موزوں کیا۔

آیولینتھی (تھوڑے سکوت کے بعد جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ رہی ہے) مجھے اپنا ستار دو! (ستار پر گاتی ہے)

۱۔ تیری عزت کرتی ہوں
کیونکہ: کا مسکن اور قصص

موسیقی کا مخزن ہے۔ جس سے مجھے خاموشی و حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی۔

تیرے گیت میں ایسا اثر ہے کہ ہوا بھی دم بخود ہو کر سُن رہی ہے۔ اور پھول خاموش کان لگائے ہوئے ہیں۔ تیرے ساز کا نغمہ سننے کو اُنھوں نے اپنی معطر سانس روک لی ہے۔ شام کے وقت اس وادی کی گھنی جھاڑیوں میں آوارہ بُلبلے خاموش عندلیب آکر نواسنج ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے شعار میں بھی وہی نغمے گونجیں جو اُسکی آواز میں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے گانے میں بھی اُسکی طرح روح کو اپنے بازوؤں پر اُڑا لیجانے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اے اجنبیو! تم نے یہ گانا کہاں سیکھا؟ کیا اسکا مولد وہاں ہے جہاں مشتاق آرزوئیں اور تمنائیں اور ٹھنڈی سانسیں شام کی خواب آلود خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ اُبھرتی ہیں۔

بتاؤ کیا ہولے لطیف کے ساکنوں نے تمھیں گانا سکھایا ہے کہ تمھاری موسیقی میں جادو کا اثر اور روانی ہے۔ تمھارے گیتوں نے میرے خیالات کو خوشی سے چھکا دیا ہے۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

جیو فری۔ کس قدر بلند شاعری ہے!

ٹرسٹان (آیولنتھی سے) آپ نے ہمارے گیت کو بلبل سے تشبیہ دی ہے۔ کاش میں ان پرندوں میں سب سے زیادہ حقیر اور چھوٹا ہوتا جو اپنے آشیانے اس محل کے قریب بناتے ہیں تاکہ ہمیشہ اُن روح پرور نغموں کو سُن سکتا آپ جن کی مالک ہیں۔

جیو فری۔ اے شریف خاتون! مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے جو بار بار میری زبان تک آتا ہے۔ آپ اس جگہ تمام دنیا سے علحدہ رہتی ہیں اور یہ وداس کے تمام شریف مردوں اور عورتوں میں سے کسی کو بھی آپ کے غیر معمولی کمالات کا علم نہیں ہے۔ وہ کون مبارک خاندان ہے آپ جسکی فرد ہیں اور آپ کے والد کون ہیں؟

آیولنتھی۔ ہائیں تم میرے والد سے واقف نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں آیا جو اُن سے آگاہ نہ ہو۔

جیو فری۔ مجھے اُن کا نام بتایئے۔

آیولنتھی۔ سب لوگ انھیں ریباڈ کہتے ہیں۔

جیو فری۔ ریباڈ! ریباڈ! وہ کوئی نائٹ ہیں؟

آیولنتھی۔ نائٹ!

جیو فری۔ یا سپاہی۔ کیا وہ خود زرہ پہنتے ہیں اور سنہری مہمیز لگاتے ہیں۔ اُنکا مشغلہ کیا ہے؟

آیولنتھی۔ یہ تو میں نے کبھی دریافت نہیں کیا۔

جیو فری۔ تو آپ یہاں بند کیوں ہیں؟

آیولنتھی (استعجاب سے) بند!

جیو فری۔ جی ہاں مقید اور تنہا!

آیولنتھی۔ میں تنہا تو نہیں ہوں۔ تم غلطی کرتے ہو۔

جیو فری - تاہم یہاں کوئی نظر نہیں آتا -
آیو لینتھی - یہ سچ کہتے ہو کہ اسوقت یہاں کوئی نہیں ہے - میں نہیں سمجھ سکتی کہ سبب کیا ہے، ورنہ میں کبھی تنہا نہیں رہتی - لیکن انتظار کرو میں بزرانڈ کو بلاتی ہوں - وہ بھی خوش ہوگا کہ تم یہاں آئے -
(مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

جیو فری - اب معلوم ہو جائے گا کہ اس وادی کا مالک کون ہے - تاہم میں اس خیال کو دور نہیں کر سکتا کہ یہاں کوئی تاریک بھید ضرور ہے اور اس وادی کا مالک پسند نہیں کریگا کہ ہم اس کی چھان بین کریں - تم نے دیکھا ہوگا کہ اس دروازہ کی تیاری میں کس قدر ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے، وہ کائی اور پتھروں اور شاخوں میں چھپا ہوا ہے بند ہونے پر اس میں اور چٹان میں کوئی فرق نہیں رہتا - میری صلاح مانو تو دروازہ کے قریب ٹھہرو جب تک کوئی آئے میں منتظر رہوں گا، پھر فوراً درۂ کوہ کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور دروازہ کو تمہارے بھاگنے کے لیے کھلا چھوڑ دوں گا - تمہارے ساتھی شاید مل جائیں - ممکن ہے کوئی واقعہ پیش آئے - میں انھیں لیکر فوراً پہونچ جاؤں گا - ٹرسٹان سنتے ہو؟

ٹرسٹان - ہاں ہاں جاؤ -

جیو فری - کیا تمہارا دل گرفتار ہو گیا اس نوجوان دوشیزہ کا جادو چل گیا؟

ٹرسٹان - نہیں، مگر میرا دم الجھتا ہے، اور زیر

حواس منتشر ہیں - مجھے یقین ہوتا ہے کہ یہی پُرسکون وادی وہ مقام ہے جسکا میں عمر بھر جویا رہا ہوں - آخر کار یہاں میرا بچپن اور فلک مسیر غرور تسکین پائے گا -

جیو فری (سنجیدگی سے) مگر عزیز من یہ نہ بھول جانا کہ بادشاہ رینی تمہارا منتظر ہے -

ٹرسٹان - میں بادشاہ رینی اور اسکے منصوبوں کی پروا نہیں کرتا - کیا ایک صوبہ کے لیے جو قانوناً اور استحقاقاً میرا ہے اور بزور شمشیر حاصل کیا گیا ہے میں اپنی آزادی کو خیرباد کہدوں گا اور اپنی قسمت کو اس کی لڑکی سے وابستہ کر دوں گا - لڑکی بھی وہ جس کو میں جانتا نہیں جسکو کسی نے کبھی دیکھا نہیں - جبکہ میں ——— "

جیو فری - تم ہذیاں بک رہے ہو - مگر یہ دورہ جلد ختم ہو جائے گا - اسوقت تم پر جادو کا اثر ہے - اس جذبہ کو جو تپ محرقہ سے بدتر ہے دبائے رکھو -

ٹرسٹان - اگر یہ ممکن ہوتا تو بیشک میں سمجھتا کہ جادو ہے -

جیو فری - خاموش! خاموش! کوئی آرہا ہے -
(آیو لینتھی واپس آتی ہے)
وہاں موجود ہو؟
اس مکان کے مالک

آیو لینتھ
جیو

آیولینتھی۔ افسوس وہ سب چلے گئے میں نے پکارا مگر کوئی نہیں آیا۔ وہ مجھے چھوڑ گئے۔

ٹرسٹان۔ لیکن وہ پھر آئیں گے۔

آیولینتھی۔ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ غالباً وہ انگوروں کی تاک کی طرف گئے ہیں۔ میں بھی بعض اوقات وہاں جاتی ہوں۔ اور اگر نہیں جاتی تو کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود رہتا ہے۔

جیوفری (ٹرسٹان سے) تم یہاں ٹھہرو گے؟

ٹرسٹان۔ بیشک

جیوفری۔ بہتر۔ میں دروازہ کی نگرانی کرتا ہوں۔ (آیولینتھی کو گردن کے اشارہ سے سلام کرتا اور باہر چلا جاتا ہے۔ آیولینتھی سلام کا جواب نہیں دیتی)

ایولینتھی (سنتی ہے) کیا تمہارے دوست جاتے ہیں؟

ٹرسٹان۔ وہ ابھی واپس آئیں گے۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور اپنی خطا کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آہ آپ ناراض نہ ہوئیگی جب آپ سو رہی تھیں تو میں نے آپ کے سینہ سے یہ زیور اٹھا لیا تھا تاکہ یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں۔ وہ حاضر ہے۔

آیولینتھی۔ کہاں کہاں؟ (ٹرسٹان وہ طلسمی نقش اُسے واپس دیتا ہے) زیور اور میرا!

ٹرسٹان۔ ہاں میرا خیال تو یہی ہے۔

آیولینتھی۔ یہ میرا نہیں ہے مگر میں تمہارے پوچھونگی۔ (نقش کو میز پر رکھ دیتی ہے)

ٹرسٹان۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ براہ کرم اسکے بدلے اُن شرمانے والے گلاب کے پھولوں میں سے مجھے ایک پھول توڑ دینگی۔ ان میں ایسی رعنائی ہے کہ کوئی پھول مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چہرہ اُتار لیا ہے۔

آیولینتھی۔ گلاب کا پھول؟ بیشک خوشی سے۔ (ایک سفید گلاب کا پھول توڑ کر دیتی ہے)

ٹرسٹان۔ لیکن یہ تو سفید ہے۔ مجھے وہ سُرخ گلاب کا پھول دیجیے جو آپ کی طرح خوبصورت ہے۔

آیولینتھی۔ تمہارا کیا مطلب ہے۔ سرخ گلاب؟

ٹرسٹان (ہاتھ سے بتا کر) اِن میں سے۔

آیولینتھی۔ تم خود لے لو۔

ٹرسٹان۔ نہیں! یہی رہنے دیجیے جو آپ نے انتخاب کیا ہے اور جسے آپ کے نازک ہاتھوں نے توڑا ہے بلکہ میں سچے دل سے آپ کی پسند کی تعریف کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ سفید گلاب جسکے حلقہ میں موہوم و مرتعش پیازی رنگ محصور ہے اس خوشنما باغ کی خواب نما خوبصورتی کا مرقع ہے۔ ایک گلاب مجھے اور دیجیے مگر وہ بھی سفید ہو تاکہ ان دونوں کو اپنا طرۂ دستار بناؤں۔ اور ہمیشہ اُنھیں آپ کا مخصوص رنگ قرار دوں۔

آیولینتھی (ایک سرخ پھول توڑ کر دیتی ہے) لو! تمہارا یہی مطلب تھا نا؟

ٹرسٹان (چونک کر) میں نے آپ سے سفید گلاب مانگا تھا۔

آیولینتھی - پھر؟ اور یہ؟

ٹرسٹان (علٰحدہ) یہ کیا خیال میرے دل میں آیا۔ (بلند آواز سے) اچھا بتائیے (دونوں گلاب کے پھولوں کو بلند کرتا ہے اور ان میں ایک اور گلاب شامل کرتا ہے جو خود اُس نے توڑا) میرے ہاتھ میں گلاب کے کتنے پھول ہیں؟

آیولینتھی (ہاتھ پھیلاتی ہے) مجھے دیدو تو بتاؤں۔

ٹرسٹان - نہیں - بغیر چھوئے ہوئے بتائیے۔

آیولینتھی - یوں کس طرح بتا سکتی ہوں۔

ٹرسٹان (علٰحدہ) افسوس! افسوس! وہ نابینا ہے (بلند مگر لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے) مجھے یقین ہے کہ آپ جانتی ہیں۔

آیولینتھی - نہیں تم غلطی کرتے ہو۔ اگر میں جاننا چاہتی ہوں کہ کسی چیز کی شکل کیا ہے یا تعداد میں کتنی ہے تو میں اسے پہلے چھوتی ہوں۔ کیا اب بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔

ٹرسٹان (گھبرا کر) ہاں بیشک۔ آپ کا کہنا درست ہے، تاہم بعض اوقات ——

آیولینتھی - ہاں ہاں بعض اوقات - بولو! بولو!

ٹرسٹان - میں خیال کرتا ہوں کہ ..... کہ ..... بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی تمیز صرف رنگ سے ہوتی ہے جیسے مختلف اقسام کے پھول اور کپڑے۔

آیولینتھی - اس سے تمھارا مطلب اُنکے خواص و افعال سے ہے - کیوں؟

ٹرسٹان - نہیں بالکل یہ تو نہیں۔

آیولینتھی - تو کیا پھولوں کی شناخت اس قدر مشکل ہے - کیا گلاب گول اور نرم و نازک نہیں ہوتا - گول جس طرح ہلکی ہوا اور نرم و نازک جسطرح گرمی کی شام - کیا موگرا گلاب کا ایسا ہوتا ہے۔ نہیں، اُسکی خوشبو سے چکر آتا ہے جس طرح اُس شراب سے جو میں نے تم کو دی - اور پھر کیتکی - کیا اُسکی خاردار پتیاں نہیں چبھتیں جس طرح برف باری کے وقت ہوا۔

ٹرسٹان (علٰحدہ) سخت حیرت ہے! (بلند آواز سے) کیا کسی نے آپ کو نہیں بتایا کہ انسان چیزوں کو اگرچہ فاصلہ پر ہوں نگاہ کے ذریعہ سے پہچان سکتا ہے؟

آیولینتھی - فاصلہ! ہاں! اُسکی آواز سے میں پہچان لیتی ہوں کہ ننھی چڑیا چھت پر بیٹھی ہوئی ہے اور اسی طرح تمام آدمیوں کو اُنکی آواز سے - وہ تازہ دم گھوڑا جسپر میں سوار ہوتی ہوں میں اُسکو دور ہی سے اُس کے سموں کی آواز اور ہنہنانے سے پہچان لیتی ہوں - لیکن نظر؟ یہ تو مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں - یہ کون آلہ ہے؟ کیا اس میں بڑی کاریگری صرف کیجاتی ہے یا کوئی معمولی اوزار ہے - میں اس نظر کو نہیں جانتی - کیا تم ——— کس طرح اور کس لیے

استعمال

ٹرسٹان ——— خدا ہے برتر! اس کو

شان وگمان بھی نہیں کہ وہ نابینا ہے!

آیولینتھی (تھوڑے توقف کے بعد) تم کہاں سے آئے ہو۔ تم نے بہت سی ایسی لفظیں استعمال کیں، جنکا سمجھنا میرے لیے ناممکن ہے اور تمھاری گفتگو کی طرز بھی نئی اور عجیب ہے۔ بتاؤ کیا وہ وادی جہاں تم رہتے ہو یہاں سے بالکل مختلف ہے۔ اگر تم قیام کرسکتے ہو تو یہاں قیام کرو اور وہ باتیں مجھے سکھاؤ جو میں نہیں جانتی

ٹرسٹان - اے مہربان ونیکدل خاتون - میں آپ کو وہ باتیں نہیں سکھا سکتا جنکی آپ کو احتیاج ہے۔

آیولینتھی - میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم چاہو تو بتا سکتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بے کہی نہیں ہوں اور ہر بات جلد سیکھ لیتی ہوں۔ بہت لوگ جو یہاں آئے اُنھوں نے کوئی نہ کوئی بات مجھے ضرور سکھائی تم امتحان تو کرو۔ تمھارا لہجہ نرم اور شریفانہ ہے کیا جب میں تم سے التجا کرونگی تو تم انکار کروگے؟ بولو! میں پوری توجہ سے سننے کو تیار رہوں۔

ٹرسٹان - افسوس! اس امر میں توجہ سے کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ لیکن ایک بات مجھے بتایئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے خوبصورت جسم کا کوئی حصہ بیکار اور بلا کسی مقصد کے نہیں بنایا گیا ہاتھ اور انگلیاں چیزوں کو چھونے اور اُٹھانے کے لیے، پانوں چلنے کے لیے تاکہ جہاں آپ چاہیں پہونچ جائیں۔ کان سننے کے لیے، زبان گفتگو کا سرچشمہ ہے۔

آیولینتھی - ہاں ان سب باتوں پر میں نے غور کیا ہے۔ مہربانی کرکے اور بتاؤ۔

ٹرسٹان - پھر یہ بتایئے کہ قادرِ مطلق نے آپکو آنکھیں کس واسطے دیں۔ یہ دو ستارے کس لیے ہیں جو اس قدر حیرت انگیز طریقہ سے چمکتے ہیں کہ دن کی معمولی روشنی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔

آیولینتھی (اپنی آنکھوں کو چھوتی اور کچھ دیر غور کرتی ہے) تم پوچھتے ہو ان کا مقصد کیا ہے۔ تم کس طرح پوچھ سکتے ہو۔ میں نے انکے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔ میری آنکھیں! میری آنکھیں! محسوس کرنا تو آسان ہے۔ شام کے وقت جب جب میں تھک جاتی ہوں تو میرے پپوٹے نیند سے بھاری ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے نیند میرے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے۔ میری آنکھیں بڑی کام کی ہیں۔ کیا تمھیں تجربہ نہیں کہ تمھاری آنکھیں کیا کیا ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ ایکدن میں گلاب کی قلم لگا رہی تھی، ایک چھوٹے سانپ نے تیزی سے آکر میری اُنگلی میں کاٹ کھایا! درد کی تکلیف سے میں رونے لگی۔ ایک مرتبہ میں کئی دن تک اُداس رہی کیونکہ میرے والد کوئی ضروری پیش آگئی اور وہ نہیں آئے پھر جب وہ آئے تو اسے خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ اور اس طرح میرے دل کو جو ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا آرام ملا۔

پھر بھی تم دریافت کرتے ہو کہ خدائے کریم نے آنکھیں — سے جو دیکھا ہوا نہیں ہے تنہا گذر رہی ہوں۔ پھر بھی
کس واسطے دی ہیں۔ جب میں تھک جاتی ہوں — جو کچھ تم نے کہا اُس نے دل کو موہ لیا۔ یہ کوئی آسمانی
تو انھیں کے ذریعہ سے راحت ملتی ہے انھیں کے — پیغام ہے۔ آہ اور باتیں کرو۔ لیکن نہیں خاموش
ذریعہ سے میرے رنج والم کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور — رہو۔ مجھے دل میں اُن باتوں کو دوہرانے دو جو
انھیں کے ذریعہ سے میری خوشی وجد میں منتقل ہوتی ہے — تم نے کہی ہیں۔ اُنھوں نے ایذا اور خوشی کو میرے
ٹرسٹان۔ میری خطا معاف کیجیے۔ میرا سوال اتفاقاً — دل میں متحد کر دیا! (جیوفری گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)
تھا۔ آپ کی روح میں ایسی تابندگی پنہاں ہے کہ آپکو — جیوفری۔ فاصلہ پر آدمی ادھر آتے ہوئے دکھائی
اُس روشنی کی ضرورت نہیں جو آنکھوں کے ذریعہ — دیتے ہیں۔ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ ہم یہاں یکہ و تنہا
سے مہیا ہوتی ہے۔ کیا میں یہ خیال کروں کہ آپ — ہیں۔
کسی ایسی نسل سے ہیں جس میں ہم لوگوں کے — ٹرسٹان۔ (آیو لینتھی سے) اے شریف خاتون
علاوہ اور قومیں بھی دولیت ہیں۔ آپ یہاں — اب میں رخصت ہوتا ہوں۔
تنہا زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ وادی بھی ایسا معلوم — آیو لینتھی۔ آہ نہیں! نہیں! تم کہاں جاتے ہو؟
ہوتا ہے کہ جادو کے ذریعہ سے وجود میں لایا گیا۔ — ٹرسٹان۔ میں دوبارہ آؤنگا اور بہت جلد۔
کیا آپ زنگا مشرق سے یہاں آئی ہیں۔ لیکن اگر — آج ہی آؤں گا۔ لیکن آپ مجھے پہچانیں گی کس طرح۔
آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو دھرتی کو اپنی ماتا — آیو لینتھی۔ تمھارے لہجہ سے۔ کسی کی آواز تمھاری
کہتے ہیں اگر آپ پر بھی دنیا کی ناپائدار خوشیوں کا — ایسی نہیں ہے۔ میں نے کوئی آواز کوئی گیت ایسا
اثر ہوتا ہے تو ایک سپاہی کی پرستارانہ محبت قبول — نہیں سنا جس میں اتنی موسیقیت ہو، جو ایسی سُریلی
کیجیے، اور اُسکا عہد سنیے۔ کوئی عورت چاہے وہ کتنی — اور شیریں ہو اور جو دل پر اس طرح قابو کرلے اور
ہی عالی مرتبہ کیوں نہ ہو آپ کے نقش کو اُسکی روح — جو اس قدر لے دار اور پُر لطف ہو۔ تم اطمینان
سے نہیں مٹا سکتی۔ — رکھو کہ میں بھیڑ میں بھی تمھاری آواز پہچان لوں گی۔
آیو لینتھی (تھوڑے سکوت کے بعد) تمھارے — ٹرسٹان۔ دوبارہ ملاقات ہونے تک رخصت!
الفاظ میں عجیب و غریب طاقت ہے۔ مجھے بتاؤ — آیو لینتھی۔ رخصت! مگر تم دوبارہ آؤ گے
کہ تم نے یہ ہنر کس سے سیکھا کہ ان لفظوں کے ذریعہ — اور جلد۔ تم — منتظر رہونگی۔
سے جو میری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتیں میرے دل — ٹرسٹان — ہاتھ کو پھیر دیتا ہے)
کو تسخیر کرلیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک راستہ — آپ مطمئن رہیے — ۔ میرا دل اصرار

کرتا ہے کہ دوبارہ آؤں۔ اگرچہ میں جاتا ہوں مگر پانوؤں کی چاپ نہیں سنائی دیتی۔ ہاں پھر سنائی دی!
اپنے خیالات کا بڑا حصہ یہیں چھوڑے جاتا ہوں کیا دراصل وہ واپس آئے گا، یا دوسرے مہمانوں
اور جو کچھ زندگی باقی ہے یہیں ختم کرنے کو بیتاب کی طرح وہ بھی ایک مرتبہ آکر پھر نہیں آئے گا۔ آہ اگر
ہوں۔ رخصت! (چور دروازہ سے جیوفری نہیں! نہیں! کیا اُس نے وعدہ نہیں کیا؟ کیا اُس نے
کے بعد باہر نکل جاتا ہے) قسم نہیں کھائی کہ آج ہی واپس آئیگا۔ اوس گرنا
آیو نینتھی۔ سنو وہ اُن پہاڑیوں سے گذر رہا ہے شروع ہوگئی۔ شام قریب ہے۔ آہ! آج کسی طرح
جہاں اجنبی قدموں کی آواز اکثر سنائی دیتی ہے۔ وہ نہیں آسکتا۔ شاید کل آئے گا لیکن یہ جگہ کس قدر
تیزی سے گذر رہا ہے۔ آہ خاموش! خاموش! اب سُونی معلوم ہوتی ہے! (باقی)

اثر۔ لکھنوی

غزل

از منشی ممتاز علی آہ، تلمیذ منشی امیر احمد امیر مینائی

دولت جو لٹو چکے ہیں اُسکو تو رو رہے ہیں — باقی جو رہ گئی ہے اُسکو بھی کھو رہے ہیں
ایسے کہاں کے منصف کب مجکو رو رہے ہیں — وہ داغِ خونِ ناحق اشکوں سے دھو رہے ہیں
دریائے غم میں یارب جو آشنا بنے تھے — منجدھار میں وہی اب کشتی ڈبو رہے ہیں
باتیں بہت بنا کر سب ہو گئے کنارے — وہ بھی کھسک نہ جائیں جو ایک دو رہے ہیں
رحم آئے کس کو ہم پر کون اُنسے جا کے جھگڑے — دربار رس ہیں جتنے صاحب کے ہو رہے ہیں
ظاہر میں ہیں مسیحا باطن میں سچے قاتل — سہلا کے سر کو دل میں نشتر چبھو رہے ہیں
اس پر نظر نہیں کچھ کیا حال ہے اب اپنا — اتنا سبق پڑھا ہے ماضی کو رو رہے ہیں
سورج نکل رہا ہے کچھ روشنی ہے پھیلی — دنیا تو جاگ اُٹھی ہم اب بھی سو رہے ہیں
مژدہ تمھیں غلامو، ہے دعوتِ غلامی — صاحب کے خانساماں جوتے بھگو رہے ہیں
امریکہ اور یورپ اپنے جہاز بھریں — ایسوں ہی کے لیے تو ہم جوت بو رہے ہیں
مرحوم قوم کی پھر ہوتی ہے آہ برسی — آیا ہے پھر دسمبر اجلاس ہو رہے ہیں
پھر پہلی جنوری کو تم جا کے دیکھ لینا — پھر سال بھر کی کرکے نیت وہ سو رہے ہیں

شیخ محمدؒ ملتانی ثم بیدری قدس سرہ العزیز

گنجینۂ اسرار توحید، خزینۂ نکاتِ تجرید و تفرید، والیِ ملکِ ولایت، ہادیِ راہِ ہدایت، متجلی تجلیاتِ رحمانی، ابوالفتح شمس الدین شیخ محمد قادری ملتانی، رحمۃ اللہ علیہ، جنوبی ہند کے اکابر مشائخ قادریہ میں سے تھے۔ آپ کا مزار مبارک، محمد آباد بیدر (ریاست حیدرآباد) میں ہے اور ملتانی بادشاہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی ولادت ملتان میں ہوئی اور وہیں سے یہ خاندان ہجرت کرکے بیدر آیا تھا، اس لئے آپ ملتانی کہلاتے ہیں۔ آں حضرتؒ کا سلسلۂ نسب معدن الجواہر میں یہ لکھا ہے:۔

شیخ محمدؒ بن شیخ ابراہیم بن شیخ فتح اللہ بن شیخ ابی بکر بن شیخ فخر الدین بن شیخ بدر الدین بن اسبیلار (سپہ سالار؟) فخر الدین بن اسبیلار بدر الدین بن اسبیلار شاہ مینا بن شاہ الغوری بن سلطان شہاب الدین غوری الغزنوی رحمۃ اللہ علیہم۔

آپ کے والد اپنے نسب کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں ربیع الاسمٰعیلی ہوں۔ یعنی قبیلۂ ربیع کی طرف منسوب کرتے جو معد بن عدنان اور اسی سلسلہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھا۔ حضرت سرور کائنات علیہ الف الف تحیۃ والصلوٰۃ کے شجرۂ نسب میں اس سلسلہ کی کل کڑیاں مذکور ہیں۔ آپ کے جد امجد شیخ فتح اللہ اور والد ماجد شیخ ابراہیم قدس سرہٗ سلطان علاء الدین بہمنی ابن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کے زمانہ میں ملتان سے بیدر تشریف لائے۔ شیخ فتح اللہ ضعیف اور مسن تھے، چند روز میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ شیخ ابراہیمؒ بڑے پرہیزگار اور اپنے زمانہ کے علامہ تھے۔ بادشاہ سے ملنے کی آپ نے کوشش کی۔ رشید حریر ایک عالم مقرب سلطانی تھا۔ اُس نے پہلے وعدہ کیا لیکن آپ کی قابلیت سے اندیشہ کرکے ٹال گیا۔ خدا کی قدرت کہ جامع مسجد میں ایک جمعہ کو بادشاہ سے خود بخود ملاقات ہوگئی۔ آپ نے چودہ علوم میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا نام بادشاہ کے نام پر علائی رکھا تھا وہ نذر گزرانی

بادشاہ خود عالم تھا، یہ لمبا نسب دیکھ کر آزردہ ہوگیا، اور کہا آپ ہی خطبہ پڑھایا کریں اور اگلے جمعہ کو نیا خطبہ تصنیف کرکے پڑھیے تاکہ لوگ نماز کے لیے

آ ہی رہے ہیں، کافی وقت ہے میں ابھی نیا خطبہ لکھ کر پڑھتا ہوں۔ بادشاہ کو تعجب ہوا اور آپ کو اجازت دی اور جب خطبہ پڑھا تو بہت خوش ہوا اور چودہ موضع لطور انعام جاگیر عطا فرمائے۔ بادشاہ کی اس قدردانی علوم کی وجہ سے آپ بیدر ہی میں رہ گئے۔ اُسکے انتقال کے بعد جب سلطان ہمایوں تخت نشیں ہوا تو چونکہ وہ ظالم تھا، آپ نے اُسکے پاس آنا جانا ترک کر دیا۔ پھر جب ۸۶۸ھ میں سلطان محمد شاہ بہمنی تخت نشیں ہوا تو آپ کو اپنی تعلیم کے لیے طلب کیا۔ اور قاضی شہر مقرر کیا۔ آپ نے اس عہدہ کو باکراہ قبول فرمایا مگر پہلے اٹھارہ شرطیں منظور کرالیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ اگر آپ بھی، گو بادشاہ ہیں، شرع کے خلاف کرینگے تو حدود شرع کی پابندی لازمی ہوگی۔ بادشاہ نے ان شرطوں کو قبول کر لیا اور آپ ایک عرصہ تک قاضی شہر رہے۔

شیخ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک صاحبزادے تولد ہوئے جن کا نام احمد تھا۔ رشد کو پہونچنے کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُنکا مزار موضع کنجر کہ بزرگ واقع پٹنچرو میں ہے۔ بیٹے کے انتقال کا باپ کو بہت صدمہ تھا۔ اسی رنج و غم کے زمانہ میں آپ نے روح پُر فتوح حضرت غوث الثقلینؓ کی طرف توجہ فرمائی۔ وہاں سے یہ اشارہ ہوا کہ تمھارے ایک لڑکا صاحب اسرار پیدا ہوگا جسکا نام ہمارے جد کے نام پر ہوگا۔ چنانچہ شیخ ابراہیمؒ کے گھر میں حمل کے آثار نمایاں ہوئے اور شیخ محمدؒ تولد ہوئے

آفریں باد بر چنیں پدرے کہ از و زاد ایں چنیں پسرے

آپ کی ولادت گاہ شہر بیدر ہے جو اس زمانہ میں اعظم البلدان محمد آباد بیدر کہلاتا تھا۔ معدن الجواہر میں ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کے تیسرے سال ہمایوں شاہ ظالم کی وفات ہوئی۔ ہمایوں ۵ شوال ۸۶۵ھ کو مرا ہے، اس لحاظ سے آپ کی ولادت ۸۶۲ھ میں ہوئی چنانچہ آپ کی پیدائش کا یہی سنہ قرار پایا، اور "شمس جہاں تاب" (۸۶۲) تاریخ ہوئی۔ واقعی آپ شمس جہانتاب ہی تھے۔ جسکے طلوع ہونے سے اس دہر ظلمانی کی بہت کچھ تاریکی مٹ گئی۔

ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ "میں ابھی بچہ ہی تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ والد ماجد نے عالم جاودانی کا قصد فرمایا۔ علمائے شہر اور مشائخان صاحب نظر میں سے کسی بزرگ نے میری طرف نظر ہدایت نہ فرمائی"۔ اسی اثنا میں حضرت شیخ المشائخ شیخ حسن جیلی القادریؒ کا بنگالہ کی طرف سے یہاں آنا ہوا۔ حضرت شیخ چھوٹے

بیڑوں اور سوار و پیادوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ شہر بیدر کی ایک مسجد میں جو فصیل کے باہر تھی اور مسجد بلاک مشرف کے نام سے مشہور تھی مقیم ہوئے اور شیخ محمدؒ کو خود طلب فرما کر بہ اشارت حضرت غوث الثقلینؒ مرید فرمایا۔

شیخ محمدؒ اپنے پیر کی صحبت میں عرصہ تک رہے اور انعام گوناگوں سے فیضیاب ہوتے رہے حتیٰ کہ شیخ حسنؒ کی مراجعت کا وقت آگیا اور آپ مفتخر فرمائے بنگالہ ہوئے لیکن شیخ محمدؒ کو سوقت تک خرقۂ خلافت و اجازت مطلقہ عطا نہ فرمائی جب تک کہ آپ کمالات ظاہری و باطنی سے بدرجۂ اتم بہرہ ور اور عمر کی آخری منزلوں کے قریب نہ پہونچ گئے۔

آپ کو حضرت غوث الثقلین قطب ربانی غوث الصمدانی سے نسبت اویسی اور براہ راست حصول فیض و نعمت کا شرف حاصل تھا اور حضرت بندگی مخدوم شیخ بہاء الدین انصاری القادری دہلوی اللہ دولت آبادی سے بھی جنکا مزار مبارک اب بھی دولت آباد ضلع اورنگ آباد دکن میں مرجع خاص و عام ہے اور جو سلسلۂ قادریہ کے مشائخ عظام میں سے ہیں خرقۂ خلافت اور اجازت مطلقہ حاصل تھی۔ حضرت شیخ بہاء الدینؒ اس زمانہ میں شادی آباد المشہور بہ مانڈو میں تھے وہیں سے آپ نے بہ اشارت مبارک حضرت پیر دستگیر پیران پیرؒ اجازت نامہ اور خرقۂ خلافت روانہ فرمایا۔

آپ کا طریقہ ۔۔۔ ترک دنیا، ذکر اسم الٰہی کیا تھا ہر طور پر اور کیا پوشیدہ طریق پر اور کیا بنظر معرفت الٰہی، اور رات دن مراقبۂ توحیدی میں رہنا اور اپنے پروردگار کی ظاہری و باطنی نعمتوں کی شکر گزاری کرنا۔ کبھی کبھی آپ پر حالت توجہ طاری ہوتی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ آپ کے صاحبزادہ شیخ بدرالدینؒ فرماتے ہیں کہ ہم سب نہایت ادب سے آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ قلب مبارک پر آفتاب محبت طالع ہونا شروع ہوا اور حالات وجد و سماع ظاہر ہونے لگی حتیٰ کہ ہم لوگ بھی اس شیم اشتیاق سے مست ہو گئے۔ آپ اسی حالت وجد میں الفاظ جلالہ زبان مبارک سے ادا فرماتے اور بس طرف متوجہ ہوتے سجدہ کرتے۔ تھوڑی دیر تک یہ بیخبری کی حالت رہی اسکے بعد رفع ہو گئی۔ ایک دوسری مرتبہ آپ سنا رہے تھے کہ ہر بن موے اللہ اللہ کی آواز نکلنی شروع ہو گئی۔ اور روضہ محترمہ جو قریب ہی تھیں گھبرا گئے

حضرت مشرف القلوب تھے اور دوسروں کے دلوں کا حال کے خواب
منکشف ہو جاتے اور آپ انھیں بیان فرمایا کرتے ہی کی ایک
کامل ذات ایسی تھی جس سے انوار قادریہ اور فیوض سبحانیہ کو نسبت ہوا کرتی

تھیں۔ حضرت مخدوم شیخ بہاء الدین القادری الانصاری الدولت آبادی کے دو خلیفہ اجل مشہور تھے۔ ایک حضرت شیخ محمد ابراہیم القادری قدس سرہ العزیز، دوسرے شیخ جلال الدین قادری البرہان پوری۔ ان دونوں کی ذات بابرکات سے پروردگار عالم نے خطۂ دکن کو گلزار فرمایا تھا اور سلسلۂ قادری کی ترقی کا باعث بنایا تھا۔ شیخ جمالؒ بہتری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان میں تمام اولیاء حاضر ہیں۔ ان میں شیخ جلال برہان پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صف راستیں میں استادہ ہیں مگر شیخ محمدؒ کہیں نہیں۔ پھر آگے چلا تو یہ دیکھتا ہوں کہ جناب پیران پیر قدس سرہ العزیز کی گود میں سر رکھے ایک تخت پر آپ آرام فرما ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ انھیں ہم نے بلاد دکن پر مسلط کیا ہے۔ یہی شیخ جلال برہان پوری ایک مرتبہ آپ کے پاس سیدہ تشریف لے گئے۔ اور چند روز پاس رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت کو عزیقاً باللہ وحریقاً فی محبۃ اللہ اور مالک حالات و صاحب کشف و کرامات پایا۔ شیخ ایوب تلواری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخی شیخ محمدؒ قدس سرہ العزیز اپنے زمانہ کے خاتم ولایت تھے۔ دنیا و مافیہا دنیا کی طرف آپ کی طبیعت کسی نہج پر مائل نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جب تک جان میں جان ہے میں اور وہ دونوں ایک جگہ نہیں ہو سکتے۔ آپ کی طبیعت کا تعلق نہ دنیا سے تھا اور نہ عقبےٰ سے۔ صرف اپنے مولائے والا وشیفتہ تھے۔

شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو آپ کے ممتاز اوے تھے روایت کرتے ہیں حضرت والدی شیخ محمدؒ قادری قدس سرہ العزیز میرے کسی کام کے سلسلہ میں گلبرگہ شریف تشریف لیگئے۔ اثنائے قیام گلبرگہ میں حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے تشریف لیگئے۔ لیکن گنبد کے دروازہ کے اندر ابھی ایک ہی پیر ڈالا تھا کہ واپس نکال لیا اور لوٹ آئے اور وہاں سے حضرت سید اللہ حسینیؒ کے مزار پر تشریف لے گئے اور زیارت فرمائی۔ آپ سے میں نے حضرت بندہ نوازؒ کے مزار پاک سے بغیر زیارت واپس ہونے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ حضرت مزار میں تشریف فرما نہیں تھے اور اپنے رب کی طرف تشریف لیگئے تھے۔ سید اللہ حسینیؒ موجود تھے اُنکی روح پرفتوح قبر سے ظاہر ہو کر مجھ سے ملی اور میں اُن سے ملاقات ہی کر رہا تھا کہ حضرت سید السادات محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی روح پاک نے ظاہر ہو کر مجھے اپنی طرف بلایا اور میں وہاں سے چلا گیا۔

اس دوران میں خاندان حسینی کا زوال شروع ہوا، اور سیدیوں کا زمانہ آیا سو ہمیوں کے

طعام کی بو تک نہیں آتی تھی۔ ہم حضرتؒ کو رجوع کراتے اور حضرت تسلی و تشفی فرماتے حتیٰ کہ پروردگار نے اپنا فضل و کرم فرمایا۔

اُس زمانہ میں ایک شیخ خانخاناں تھے، اُنھوں نے حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی کتاب سمر الاسرار پر ایک مرتبہ بہت سے اعتراضات فرمائے اور شیخ ابو الحسنؒ سے جو اُنکی اطلاع میں تھے کہا کہ یا تو انھیں شرع شریف کے موافق بیان کرو ورنہ اپنے جد پر کفر کا فتوےٰ دو۔ شیخ ابو الحسنؒ تے عاجز آکر اس قضیہ کو حضرت شیخ محمد قادریؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ چنانچہ آپ نے اُن تمام اعتراضات کی از روئے شرع ایسی توجیہ و توضیح فرمائی کہ سب ساکت و صامت رہ گئے۔ آپ کے تبحر علمی اور تصرف باطنی کا یہ ایک شمہ تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ذات نبوی صلعم اور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ اور جناب غوث الثقلین سیدنا عبد القادر جیلانی یہ تینوں گو ظاہرا الگ الگ ذاتیں ہیں مگر باطناً ایک ہیں۔ خبردار ان میں فرق نہ کرنا ؎

فرزند خلف حیات ثانی است گفتم غلط عین زندگانی است

حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شعر ہے کہ ؎

نحا مرنی من النسیم بنفحۃ خلیلیۃ علیتہ احمدیۃ

آں حضرت کا وجود باجود حضرت سرور انبیا صلعم کی خلقت مبارک سے خمیر ہوا ہے، اسی لیے ذات نبوی صلعم سے جناب کو محبت تامہ حاصل تھی۔ پس تینوں بزرگوں کو ایک ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ الگ الگ نہیں ہیں

۹۳۵ھ جمادی الثانی میں جب بہادر شاہ والی گجرات نے بھی دکن کا قصد کیا تھا اُسوقت آپ علیل تھے لیکن شفا ہوگئی۔ دوبارہ اسی سال رمضان المبارک میں پھر علالت لاحق ہوئی اور یہ شعر اکثر زبان مبارک پر رہتا تھا ؎

ما بفلک رفتہ ایم یار ملک بودہ ایم باز ہما نجا رویم منزل ما کبریاست

لوگوں نے یہ حال دیکھ کر اضطراب ظاہر کیا آپ نے فرمایا کہ "دوست [illegible] ارمی خواہد و مرا ہم از غایت اشتیاق دیدار طاقت انتظار نماند"۔ اسکے بعد وصیت فرمائی کہ ابراہیم عرف مخدوم جی کو جو آپ ہی کے طور و طریقوں پر چلا کرتے تھے صاحب سجادہ [illegible] نے عرض کی کہ حضور کے طریقہ پر چلنا اور استقامت برتنا مجھے دشوار ہے۔ آپ نے [illegible] طریق باطن پر تمھیں قدرت

نہیں ہے تو ظاہری طریقہ ہی پر مستقیم رہو انشاء اللہ تعالیٰ احوال باطنی کی بھی توفیق عطا ہوگی۔ پھر ستائیسویں تاریخ ماہ رمضان المبارک کو یہ وصیت نامہ تحریر فرما کر اس پر ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ الذی خلقنا وخلق جنابنا ومریدنا وخلقانا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا ونبینا محمد الہادی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔ اما بعد فان الموصیۃ ثابتۃ بدلیل عقلی ونقلی وفعلی فاقول علیکم ان تتخذوا بالکتاب والسنۃ ثم باقوال الصحابۃ وتبعا بعۃ طریقۃ حضرت شیخنا سلطان الاولیاء ورۃ البیضا قطب الوجود سیف اللہ الموجود امام المتصرفین رئیس المحبوبین شیخ الثقلین سر اللہ سید السادات سید محی الدین ابی محمد السید عبد القادر حسنی الحسینی الجعفری الجیلانی رضی اللہ عنہ وارضاہ فی الاقوال والاحوال۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہر طرح کی تعریف کا وہی مستحق ہے جس نے ہمیں اور ہمارے احباب ہمارے مریدین اور ہمارے خلفاء کو پیدا کیا۔ اور درود وسلام ہو جو ہمارے سردار و نبی محمد پر (صلی اللہ علیہ وسلم) جنہوں نے ہمیں سیدھی راہ بتائی۔ اما بعد چونکہ وصیت کرنا عقلی نقلی فعلی تینوں دلیلوں سے ثابت ہے اسلیئے میں تم سے کہتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلعم) کی پابندی کرنا۔ انکے بعد صحابہ اور انکے تابعین کے اقوال۔ پھر ہمارے شیخ حضرت سلطان الاولیاء ورۃ البیضا قطب الوجود سیف اللہ الموجود امام المتصرفین رئیس المحبوبین شیخ الثقلین سر اللہ سید سادات سید محی الدین ابی محمد عبد القادر حسنی الحسینی وجعفری الجیلانی کے طریقہ پر اقوال و احوال دونوں میں عمل کرنا رضی اللہ عنہ وارضہ

اس وصیت کے بعد یہ زبانی ارشاد فرمایا کہ فقرا کی خدمت کرو، جادۂ شریعت پر قائم رہو، خدا کی یاد کرو اور اسکی محبت وعشق وعرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو اور سوائے حق تعالیٰ کے کسی دوسرے کو اپنا مقصود ومطلوب نہ بناؤ اور سوائے خدائے تعالیٰ کے دل میں کوئی وہم وغم مت لاؤ۔ مردار دنیا پر نظر مت ڈالو اور باطن کو طمع کی آلودگی سے پاک وصاف رکھو جس طرح مشائخ قادریہ نے معہود ومقرر کر دیا ہے اسی اسلوب وطریقہ پر عشق وعرفان کی راہ میں گامزن رہو۔ آپس میں موافقت واتفاق رکھو۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کی خوشنودی کا طلبگار رہے اور انکی خوشنودی ورضا کو میری خوشنودی اور رضا جانے۔ فقرا، مسافرین اور سادات کی خدمت کرنا لازم جانو۔ کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ اور حسن خلق، تواضع وقناعت وتوکل کو اپنا طریقہ بناؤ اور خدائے عزوجل کے ساتھ اخلاص کا اور اسکی مخلوق کے ساتھ مروت کا معاملہ رکھو۔ دین کے کام میں سب بھائی متفق رہیں۔ پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں اور ہمارے شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ملفوظات پر عمل کریں۔ کسی قسم کا تردد نہ کریں۔

حصول دنیا کی کوشش نہ کریں اور دونوں جہان کے مہمات میں خدائے عزوجل پر توکل و اعتماد رکھیں۔
پھر آپ نے ارشاد فرمایا حضرت شیخ ابراہیم مخدوم جی سریر سجادہ پر بیٹھیں اور شیخ بدرالدین اسی طرح خانقاہ کا انتظام کریں جس طرح اب تک کرتے آئے ہیں۔

آپ نے خلافت قادریہ اور اجازت مطلقہ حسب ذیل مریدوں کو عطا فرمائی تھی:۔
شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی۔ شیخ اسمٰعیل۔ شیخ اسحٰق۔ شیخ بدرالدین۔ میاں خدا بخش۔ مرزا موسیٰ۔ شیخ احمد۔ قاضی محمد محتسب۔ میاں حسین (بشرطیکہ یہ صاحب جادۂ شریعت پر مستقیم رہیں اور سرکاری نوکری ترک کردیں) سید نعیم اللہ۔ سید حمید رشہدی۔ شیخ عبدالکریم۔ شیخ عبداللہ عرب۔ شیخ نظام ہتنوری۔ شیخ عبداللہ بجنوری۔ شیخ مجید جونپوری۔ میاں راجی محمد گجراتی۔ شیخ یوسف بیجاپوری۔ شیخ بڑیا اودگیری۔ میاں سید علاء الدین۔ سلطان شاہ۔ شیخ گھوڑ دساکن کارنجہ۔ میاں نحو ساکن تلوارہ۔ میاں حسان کوہیری۔

آپ کی طبیعت رمضان شریف کے پورے مہینہ علیل رہی۔ حتیٰ کہ عید کا دن آیا۔ آپنے ہر ایک کو عید منانے کا حکم فرمایا اور آپ خود تمام اشیاء سے فراغت حاصل کرکے ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے، اور مکاشفہ و مشاہدہ الٰہی کے بحر میں مستغرق ہوگئے اور اسی عالم استغراق میں بتاریخ یکم شوال ۹۳۵ھ ندا غیبی یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ کو لبیک کہا اور عمر کی تہتر منزلیں طے کرکے اس عالم آب و گل سے عالم قدس کی طرف سدھارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

بعلم معرفت در اہل عرفاں بجستم سال تاریخ وفاتش
محمد شاہ ملتانی نست کامل ندا آمد بہ لے گشت واصل ۹۳۵

آپ شہر بیدر میں اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم قدس سرہٗ کے بائیں جانب دفن ہوئے۔ آپکا مزار ابتک مرجع خاص و عام اور فیض بخش عوام ہے۔

آپ کے پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں:
شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی۔ شیخ اسمٰعیل۔ شیخ اسحٰق۔ شیخ بدرالدین اور شیخ فخرالدین۔ صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں:۔ بی بی مریم۔ بی بی عائشہ۔ یہ دونوں حضرت کی زندگی ہی میں وفات فرماگئیں تیسری صاحبزادی بواجی کہلاتی تھیں اور چوتھی بی بی اللہ دینی تھیں جن سید محمد بن حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے ہوئی تھی۔ انکی بہت اولاد ہوئی

آپ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ سید محمد جونپوری جو آپ کو مہدی موعود کہا کرتے

تھے اور جنکے ماننے والے اب بھی حیدرآباد دکن میں بہت ہیں، محمد آباد بیدر تشریف لائے اور شہر کے باہر قیام فرمایا اور آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔ پھر جب اُنھوں نے اصرار کیا تو اپنے چاروں لڑکوں کو اجازت دیدی کہ جاکر اُنسے ملاقات کریں۔ سید صاحب موصوف نے بہت تپاک سے صاحبزادوں کا استقبال کیا۔ تھوڑی دیر تک گفتگو رہی اسکے بعد رخصت ہوکر صاحبزادے واپس ہوئے۔ شیخ بدرالدین فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت والد ماجد قدس سرہ العزیز سے پوچھا کہ حضور یہ صاحب اپنے آپ کو مہدی موعود کہتے ہیں۔ یہ سنکر حضرت نے کسی قدر تامل فرمایا اسکے بعد ارشاد کیا کہ جس طرح قطبیت اور غوثیت کے منازل و مقامات سلوک میں ہیں، مہدیت بھی ایک مقام ہے جس پر جناب سید صاحب فائز ہیں۔ جب اس مقام کی حالت کا غلبہ ہوتا ہے اور سُکر پیدا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو مہدی موعود کہنے لگتے ہیں آپ انتہا درجہ کے پابند شرع شریف اور متبع سنت نبوی صلعم تھے۔ اور کسی امر میں اُسکے خلاف عمل نہیں کرتے تھے۔ لوگوں کو درویشانہ طریق پر مُرید کرتے تھے اور جس میں استعداد دیکھتے خرقۂ خلافتِ قادریہ سے ممتاز فرماتے تھے۔ آپ کا سلوک سلف صالحین کا سا تھا۔ جناب بڑے پیر صاحب قدس سرہ کے ملفوظات اکثر ملاحظہ میں رکھتے اور اُن پر عمل پیرا ہوا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ یہ ملفوظ جامع سلوک مبتدی و متوسط و منتہی ہیں اور بالکل کافی ہیں۔ فقرا اور ضعفاء سے ہمدردی کرتے اور اُن سے بڑی نرمی اور مہربانی سے ملا کرتے تھے۔ آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تھے اور جو کچھ پاس ہوتا عطا فرماتے۔ اپنے پیران عظام رَوح اللہ تعالیٰ ارواحہم کا عرس کیا کرتے تھے۔ خود سماع سنتے اور وجد لایا کرتے تھے۔ اکثر شب جاگتے رہتے۔ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے۔ آپ کے روزہ کی خبر کسی کو نہیں ہوتی حتی کہ اہل خانہ اور ملازمین وغیرہ تک ناواقف رہتے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے۔ جب سوتے تو ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور ذکر کرتے کرتے آرام فرماتے تھے۔ آپ نے کبھی کوئی جاگیر یا انعام و اراضی قبول نہیں فرمائی لیکن جو نذریں اور فتوح کہ مریدان و معتقدان با اخلاص لاتے محض اُنکی دلجوئی کے خیال سے لیا کرتے تھے اور سب کا سب اُسی روز فقرا کو تقسیم فرما دیتے رات تک کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ کسی دنیا دار کی تعظیم نہ کرتے اور ملوک و سلاطین کے پاس آمد و رفت نہ رکھتے تھے۔ اگر کوئی دنیا دار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اُسے نصیحتیں فرماتے اور دنیا کی مذمت کرتے۔ آپ پنجوقتہ نماز باجماعت مسجد میں گزارتے اور اکثر اوقات مسجد ہی میں رہتے جب مکان تشریف لاتے تو حجرۂ مبارک میں مشغول بحق رہا کرتے تھے۔

آپ دُبلے پتلے ۔ رنگ مائل بہ سُرخی اور اوسط قد کے تھے ۔ چہرۂ مبارک منور نظر آتا تھا ۔ زبان بہت فصیح تھی ۔ اپنے زمانہ کے بڑے زبردست عالم تھے اور آپ کے بشرۂ مبارک سے ایک ہیبت عظیم نظر آتی تھی جو کوئی آپ پر نظر ڈالتا رعب سے آنکھیں نیچی کر لیتا تھا ۔

آپ سے بکثرت خوارق عادات ظہور میں آئے ہیں ۔ کتاب معدن الجواہر میں جو شاید قاضی محمد اشرف قاضی سرکار رمیدک کی تالیف ہے اور سنہ ۱۰۴۲ھ میں مطبع گلزار دکن حیدرآباد دکن میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی بکثرت آپ کے خوارق مذکور ہیں ۔

آپ کے مزار مبارک کو کاتب حروف نے دیکھا ہے ۔ نہایت اچھی حالت میں ہے لیکن ایک مرتبہ کسی زمانہ میں اُسے شہید کر دیا گیا تھا ۔ چنانچہ آپ کے ایک مرید شیخ شہر اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ خبر سنکر میں بہت متردد و متفکر تھا اسی رنج میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا کہ عالم مراقبہ میں آپ کی زیارت ہوئی میں نے سُنا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ تم اس ذری سی بات کے لیے کیوں پریشان ہو ۔ محب و محبوب میں حالات واقع ہوتے رہتے ہیں اور ہر ساعت میں ایک نئی صفت اور ہر لحظہ میں ایک نیا مظہر نظر آتا ہے محب و محبوب کے حالات میں غیر کو دخل نہیں ہے ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے اور کبھی ویسا ۔ کبھی درست کرتے ہیں اور کبھی شکست کرتے ہیں ۔

اے ز خیال ما بروں در تو خیال کے رسد — با صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت — دامن عزت ترا گردِ زوال کے رسد
ہست ز تختگاہ دل جلوۂ قرب روز و شب — لیکہ بجلوۂ چناں چشم خیال کے رسد
کنگرِ کبریائے تو ہست فراز لا مکاں — طائرِ ما دراں ہوا جز پر و بال کے رسد
زاں چمنے کہ لبلبش روح قدس نمی سزد — گلخنیانِ خاک را بوے وصال کے رسد
بر در بے نیازیت صد چو حسین کربلا — تشنہ بماند و در گذرد تا بہ زلال کے رسد

آیت رحمت از حرم ہست برائے عاجزاں
خسرو بت پرست را جز خد و خال کے رسد

محمد معشوق حسین خاں

مکتوب امیر

الناظر نمبر ۳ جلد ۱۳ میں میں نے ارشد صاحب تھانوی کا "بیان واقعہ" پڑھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تھانوی صاحب کو ایک مختصر استفسار کے جواب میں اسقدر طویل و غریض مضمون لکھنے کی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ اپنے سوانح شاعری اور تواردو کے امکانات و تجربات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ارشد صاحب سے میں نے ناواقفیت کا اظہار بھی ضرورۃً کیا تھا جسکو وہ صحیح اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر مجھے اُنکی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا تو میں براہ راست بنیر آپ کے توسط کے اُن سے التماس کرنے کی جرأت کرتا۔ فاضل تھانوی کا میرے دوست اور ہم عمر و ہموطن، امیر احمد صاحب امیر کے شعر کو میرا شعر سمجھ لینا کچھ زیادہ قابل تعجب نہیں ہے اکثر حضرات کو ایسا دھوکا ہو جاتا ہے۔

جناب میرے دیرینہ مراسم کی بنا پر ارشد صاحب نے یہ یقین فرمالیا ہے کہ میں ۱۷ سال سے متواتر الناظر کے قارئین میں شامل ہوں اور اسلیے ارشد صاحب سے اور اُنکے کلام سے میرا متعارف ہونا غلب ہے۔ فاضل مضمون نگار کا یہ قیاس بھی کچھ بیجا نہیں ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ شروع میں الناظر میرے پاس آتا تھا پھر ایک طویل مدت تک چند حالات کی وجہ سے میں الناظر کو نہیں دیکھ سکا۔ دو تین سال سے الناظر کو پڑھنے کا اب پھر موقع ملا ہے۔

میں نے اپنے خط میں ارشد صاحب کے کلام کی تحسین کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا "اسے تواردو کہیں گے یا اس سے بڑھ کر کچھ کہنا چاہیے"۔ تواردو سے بڑھ کر القا کا بھی درجہ ہے، ارشد صاحب کو خود ظنّوا المومنین خیراً پر عمل کرنا چاہیے اور انصاف سے بھی کام لینا چاہیے۔ جب اُنکے عزیز بھائی شوکت تھانوی کی نظر میں بھی یہ تواردو کھٹکتا ہوا معلوم ہوا اور اُنھوں نے بھی سفارش کی کہ ارشد صاحب اپنی بیاض سے اس شعر کو حذف فرمادیں، تو میں بھی اس استفسار پر ملامت کے قابل نہیں ہوں حقیقت میں تواردو معجزات سخن میں سے ہے۔ لیکن علمدرآمد یہ ہے کہ جسکا ذہن مضمون حاصل کرنے میں پیشدستی کرتا ہے دوسرا شاعر اس مضمون کو اُسی کے حق میں چھوڑ دیتا ہے۔ ارشد صاحب اگر اپنی فکر ما بعد سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے، تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ مجھے کوئی اصرار نہیں ہے۔ صفدر صاحب اور شعر صاحب کی ساری غزل کا تواردو ایک معمّہ ہے۔ جسکو میرا ذہن ابتک بھی نہیں حل کر سکا ہے۔

بہر حال میں نے اپنے خط میں ارشد صاحب کی لطافت کلام کا اعتراف کرتے ہوئے اگر اس توارد پر اظہار تعجب کیا تھا تو اُس کے معنی قریب یہ نہیں ہو سکتے کہ میں اُنھیں سرقہ کا ملزم سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ ارشد صاحب بھی میرے الفاظ کے وہی معنی لیں گے جو میرا اصلی مقصود ہیں۔

دیوان قائم چاندپوری کا ایک صفحہ

نقیر امیر بدایونی

ذیل کی دو غزلوں کی روانی و سلاست سے قائم کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے پہلی غزل کا تیسرا اور دوسری کا چوتھا شعر کس قدر بیباختہ، نرم، اور پُرکیف ہے! جلیل قدوائی

کون چاہے ہے بتاں تم سے مدارا کے تئیں
پر تنک نرم کرو اس دلِ خارا کے تئیں

اُس میں تیرے لبِ میگوں کی کہاں کیفیت
ہم نے دیکھا ہے مئے لعل دوبارا کے تئیں

دیکھ بے وجہ نہ کھو دل کو ہمارے کہ ضرور
آئینہ چاہیے خوبان خود آرا کے تئیں!

دینداری کا ہوں میں شیخ کی بندہ جس نے
دی جلا کفر ہیودی و نصارا کے تئیں

بوسے اُس زلف کی مانوس ہے اپنا تو دماغ
لیکے ہم آگ دیں کیا عنبر سارا کے تئیں

ہے جو کچھ ہوش تو کر دیدۂ عبرت سے نگاہ
دیکھ کر حالت اسکندر و دارا کے تئیں

قائم اُس بزم میں تھا کون کہ جسنے نہ پیا
شربتِ مرگ کے اس جامِ گوارا کے تئیں

شکوہ اغیار سے نے یار کی بیزاری سے
جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے

ہر قدم کوئے بتاں کارگہ مینا ہے
دیکھیو بچ کے، سنبھالے ہوئے ہشیاری سے

رو کے پوچھا میں میسر ہو ترا کیونکہ وصال
ہنس کے کہنے لگا "طالع کی مددگاری سے"

شور تجھ حسن کا گر عالم علوی میں نہیں
مہر و مہ جھانکے ہیں کیوں پردۂ زنگاری سے!

غافل اُس لب سے بمقدور مذاولی تر
گھ[illegible] کا بلا ہے اسی چنگاری سے

ہائے ری لٹیں تری زلفوں کی سبحان اللہ
کس نافۂ تاتاری سے

دارے کا ہے کو منصور نے دیکھا وہ رنج
ن ہے ناداری سے

ہائے قائم نہ تری آنکھ پسیجی اک دن
ابر رو[illegible] خوف سیہ کاری سے

خُلقِ حسنؓ

ایک دن راہ میں تشریف لیے جاتے تھے
سبطِ اکبرؐ جگر و جانِ رسولِ معصوم

ابن زہراؓ و علیؓ روحِ نبی عربی
محوِ ذاتِ احدی خاصِ خدائے قیوم

خلق اِس طرح تھی اُس نورِ مجسم کے قریں
شمع کے گرد ہو جس طرح پتنگوں کا ہجوم

ساتھ میں کہتے ہوئے جاتے تھے خدامِ ادب
مانگنے والو چلو واہے درِ فیضِ عموم

جدِ پیغمبر سا بلا ان کو پدر رشیدؓ رسا
فرش سے عرش تک اس گھر کی سخاوت کی ہے دھوم

یہی دلوائیں گے خالق سے نعیمِ ابدی
یہی پلوائیں گے جنت میں رحیقِ مختوم

آنکھیں روشن ہوئی جاتی ہیں زہے نورِ جمال
راہِ گلشن بنی جاتی ہے خمِ فیضِ قدوم

اسی انداز سے جاتی تھی سواری سرِ راہ
کہ بڑھا مجمعِ حضار سے اک دشمنِ شوم

جس کا سر نشۂ ایماں کے اثر سے خالی
جس کا دل عترتِ احمدؐ کی ولا سے محروم

شان میں شیرِ الٰہی کے وہ روباہ منش
لبِ گستاخ پہ لایا کلماتِ مذموم

دیکھی ظالم کی جو تہذیب سے بیگانہ وشی
غیظ میں آ گئے انصارِ امامِ مظلوم

روک کر سب کو یہ اُس شخص سے فرمانے لگے
وارثِ خُلقِ نبی خاصۂ ربِّ قیوم

شدتِ رنج سے قائم نہیں شاید ترے ہوش
ورنہ وہ شانِ علیؓ اور یہ کلامِ مذموم

تجھکو کھانے کی ضرورت ہے تو حاضر ہے فقیر
پھیرتے ہم نہیں کافر کو بھی در سے محروم

کہہ اگر راحلۂ و زاد کی حاجت ہے تجھے
دوں ابھی مرکبِ مخصوص و کفافِ مرسوم

حق دلاؤں تجھے غاصب سے اگر ہے مجبور
یا عوض لوں ترا ظالم سے اگر ہے مظلوم

دیکھ کر خُلقِ حسنؓ کو وہ ہُوا حلقہ بگوش
عرضِ خدمت میں یہ کی از پسِ آدابِ رسوم

اے تری رائے رزیں مہبطِ انوار و حکم
اے ترا قلبِ امیں مخزنِ اسرار و علوم

دشمنوں سے یہ مراعات زہے جوشِ عطا
منکروں سے یہ مدارات خمِ فیضِ عموم

بالیقیں آلِ محمدؐ کا یہی ہے دستور
لاجرم شانِ امامت کا یہی ہے مفہوم

زہر کھانے میں دیا سبطِ نبی کو کئی بار
اثر اس کا نہ ہوا آپ کو لیکن معلوم

آخری بار دیا آب میں سم قاتل
اشقیا نے: کیا خوف خدائے قیوم

منہ تک آنے لگے کٹ کٹ کے جگر کے ٹکڑے
تن سے آنے لگا رُک رُک کے نفس تا حلقوم

ہو گئی آلِ محمدؐ میں قیامت برپا
مچ گئی عترتِ اطہار میں فریاد کی دھوم

پھول کمھلا گیا تاراج ہوا صحنِ چمن
چاند گہنا گیا بے نور ہوئی چشمِ نجوم

سُن کے بیت الشرف خاص سے فریادِ حرم
آئے روتے ہوئے باہیں پہ حسینؑ مغموم

عرض کی آکے برادر سے کہ اے سرورِ دیں
قاتلِ شوم کا ہو نام تو آخر معلوم

گرچہ جعدہ سے بجا طور پہ بدظن تھے مگر
غایتِ حلم سے بولے یہ امامِ مسموم

اس گھرانے میں طریقہ نہیں غمازی کا
کب روا ہے جو کروں گھر میں کسی کو موسوم

ہے گماں راست جو میرا تو نہیں فکر کی جا
اُس سے خود لیگا عوض خالقِ حی و قیوم

ورنہ کیوں ہو کوئی بے جُرم گرفتارِ بلا
یہ نہیں شیوۂ اولادِ نبی معصوم

ضیا ایم اے

غزل

یہ کہتے ہیں آہ رسا کرنے والے
نہیں تیر اپنے خطا کرنے والے

سمجھ بوجھ کر اوجفا کرنے والے
کہاں پھر لیں گے وفا کرنے والے

مرے یا جیے کوئی بیمارِ الفت
سلامت رہو تم دوا کرنے والے

نہ لاتے دمِ مرگ بالیں پہ اُن کو
خدا جانے ہمدم ہیں کیا کرنے والے

ادھر آ کلیجے سے تجھ کو لگا لوں
مرے درد دل کو سوا کرنے والے

کبھی آکے بتخانے کی سیر کرلیں
حرم میں تلاشِ خدا کرنے والے

ستم ابتدا میں کیے انتہا کے
ہم ابتدا انتہا کرنے والے

دوا سے بھی ناآشنا مجھ کو کر دے
مجھے درد سے آشنا کرنے والے

خدا کی خدائی سے باہر نہیں ہیں
دربت[illegible]دا کرنے والے

میں قربان دردِ محبت پہ
کوئی اور ہونگے دوا کرنے

باسط بسوانی

تنقیدیں

تاریخ السلف مؤلفہ مولوی عبدالباری معنی، مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ، کتابت طباعت، کاغذ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب میں معنی صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تذکروں پر بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک آزاد مورخ کی طرح تنقید کی ہے۔ آپ کے سوانح کی بعض تاریخوں کی صحت فرمائی ہے، اور آپ کے ملفوظات کے متعلق مختلف روایات میں باہم تطبیق یا ترجیح کی کوشش کی ہے۔ شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری مرحوم کے قلم سے دو دیباچے ہیں۔ "قول فیصل" کے عنوان سے حضرت خواجہ کے بہت مختصر حالات اور "اسلاف کرام" کے تحت میں اُن کے آستانہ نشینوں کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں۔

"جہت ترتیب" کے تحت میں "واہمہ پرست معاندین کے توہمات باطلہ اور خارخانہ طرفۂ عمل" کو وجہ تالیف بتایا ہے۔ اسی باب میں اپنا نقطۂ نگاہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ہماری یہ تالیف منصفین سے خراج تحسین حاصل کرنے سے بیشتر حاسدین کے ملامت وطعن کا نشانہ بنے گی۔ مگر ہم اس سے مستغنی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کا عام دستور ہے:۔ مہ نوری نشاند و سگ بانگ می زند اسی طرح خاتمۂ کتاب پر "تاخیر اور غلط بیں نکتہ چینوں" کو بھی ایک چیلنج دیا گیا ہے۔ یہ وجہ تالیف، یہ نقطۂ نگاہ اور یہ چیلنج ایک خاک نشین آستانۂ عالیہ کو کہاں تک زیب دیتا ہے، اس کا تعصب ارباب بصیرت بخوبی کر سکتے ہیں۔

سید العارفین پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں "شقق علیہ یہ مسئلہ ہے کہ ۵۶۱ھ میں حضرت غوث پاکؒ نے عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف قدم رنجہ فرمایا" اور اسی بنا پر سید العارفین کی ولادت کی تاریخ کی تغلیط کی گئی ہے، مگر "قول فیصل" میں خود جناب مؤلف نے تاریخ وصال ۶۳۳ھ قرار دیا ہے۔ تذکرہ نویسوں ہی سے نہیں مؤرخوں سے بھی کبھی کبھی اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس سے قطع نظر تنقیدی حیثیت سے کتاب بہت بلند ہے۔ دنیائے اُردو حضرت سلطان الہند کی مفصل روداد کے لیے بیچینی سے منتظر ہے۔

روداد اُردو مرتبہ مسٹر رشید احمد صدیقی (علیگ) سکرٹری انجمن اُردوئے ملی مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ۔ انجمن اردوئے ملی (مسلم یونیورسٹی) نے اُردو کی اہمیت، توسیع اور اشاعت کے متعلق چند ضروری استفسارات شایع کیے تھے۔ بعض ہمدردان اُردو نے جو جوابات ارسال کیے ان کی ایک رپورٹ "روداد اُردو" کے نام سے مسلم یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر قوم کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس روداد میں اُردو کی ترقی کے لیے ایک سے ایک اہم اور قابل قدر تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ کاش انجمن اردوئے ملی ان میں سے ایک بھی انجام دے سکتی! علیگڈھ کے پُرجوش نوجوانو! سنو، اکبر کہتا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

بچوں کا قاعدہ مرتبہ مولوی سجاد مرزا ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ۔ پتہ: دی حیدرآباد بکڈپو، چادر گھاٹ، حیدرآباد دکن۔ قیمت ۴ر

مولوی سجاد مرزا صاحب نے اس قاعدہ کو کنڈرگارٹن کے اصول پر مرتب کیا ہے، اور بچوں کی نفسیات کے مطابق قاعدہ پڑھانے کے طریقہ میں بہت کچھ اصلاح کردی ہے۔ شروع میں "عرض" کے عنوان سے اُن جدید اصول تعلیم کی تشریح کی گئی ہے جن کو پیش نظر رکھ کر یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ بچوں کو کتاب اور پڑھنے لکھنے سے دلچسپی پیدا کرادینا ابتدائی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے، اسکے لیے یہ کتاب نہایت موزوں ہے جس میں بچے کو رٹانے اور رٹانے سے پرہیز کرتا سکھایا گیا ہے۔ تحریر جلی اور کاغذ اعلیٰ ہے، کہ پڑھنے میں آنکھ اور دماغ پر زور ابھی زور نہ پڑے۔ پوری کتاب میں ۵۸ تصاویر ہیں جن سے لڑکوں کو بہت دلچسپی ہوگی۔ اور سرورق کی رنگینی نے تو کتاب کو بالکل کھلونا بنا دیا ہے۔ آخر میں حاکی کی ایک آسان حمد ہے جسے بچے بہت خوشی سے حفظ کرلیں گے۔ غرضکہ ہر حیثیت سے یہ قاعدہ دوسرے جدید قاعدوں پر فوقیت رکھتا ہے، اور اس قابل ہے کہ اسکو ہر مدرسہ میں رواج دیا جائے۔

فطرت اطفال مترجمۂ مولوی حاجی حسن صاحب قادری ایڈیٹر اخبار سعید (کانپور) حجم ۶۴ صفحے قیمت ۲ر ملنے کا پتہ:۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ۔

یہ کتاب "دی سائنٹفک ٹریننگ آف چیلڈرن" مصنفۂ کریسچین ڈی لارسن کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں بچوں کی تربیت کے لیے بہت آسان اور قابل عمل اصول اور انکی نفسیات پر عام فہم بحث کی گئی ہے۔ بچوں کی ارجی، رجحانات طبعی، تربیت، تخیل، احساسات لطیفہ، ملکۂ تقالی، تاثرات فطری، اور تعمیر سیرت کے سات عنوانوں پر کتاب کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُنکے اُردو ترجمے بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ زبان سلیس اور پاکیزہ ہے۔

مطلع الانوار مصنفۂ حضرت امیر خسرو دہلوی، مولفۂ مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی، حجم ۲۳۶ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت قسم اول عہ، دوم سے، سوم سے،

عرصہ ہوا مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کا کلام جمع اور شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اس غرض سے اُنکی کتابوں کی ایک فہرست تیار کرائی گئی اور نسخوں کی تلاش ہونے لگی۔ اس فہرست میں سے کئی کتابیں شایع کی جاچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ تاریخ اور ادب کے طلباء اس خدمت کے لیے مسلم یونیورسٹی کے ممنون رہیں گے۔ شروع میں چھیاسٹھ صفحے کا مقدمہ ہے، جس میں مولف نے مثنوی اور اسکے عنوانوں کا تعارف کرایا ہے۔ اگر خسرو کی شاعری اور اُنکے سوانح حیات پر بحث نہیں کی گئی تو چنداں حرج نہیں۔ اس سے پیشتر کی مثنویوں کے ساتھ ان مباحث پر بہت کافی مواد شایع ہوچکا ہے۔ مگر چونکہ یہ مثنوی نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں تھی لہذا ان دونوں کا موازنہ ضروری تھا۔ ایک اور اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ مختلف نسخوں کا مقابلہ نہیں کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک تصنیف و تالیف کا صحیح ذوق نہیں پیدا ہوا ہے ورنہ شروانی صاحب اس اہم فرض کو آسانی [illegible] دیتے۔

نخچیر محبت مصنفۂ مولوی محمد سلیمان واصف بنارسی عہ ملنے کا پتہ: ہرسین روڈ۔ کلکتہ۔

جناب واصف کے اس تاریخی افسانہ میں یہ دکھانے کی کوشش [illegible] پانسو ہندوؤں کے لشکر کاٹ کر نکل سکتا ہے اور دس مسلمان ہزار دو ہزار ہندوؤں کو شکست [illegible] یں۔ (اہل عقیدت معاف

فرمائیں) ایسی ہی غلط فہمیاں ہماری معکوس ترقی کی ذمہ دار ہیں۔ اس وقت تو اہل ملک کو ایسے لٹریچر کی ضرورت تھی جو زخمی دلوں پر مرہم کا کام کرتا۔

سیرت نگاری کی حیثیت سے یہ تاول بہت معمولی ہے۔ فسانہ کا اصل یہ ہے کہ اسلامی فوج کا ایک افسر، حسن، سادھو کے بھیس میں پرتھوی راج کی فوجی نقل و حرکت کا پتہ لگانے جاتا ہے اور وہیں راجکماری پارتی پر عاشق ہو کر عرصہ تک مقیم رہتا ہے۔ کون یقین کرے گا کہ جس فوج کے افسر ایسے غیر ذمہ دار ہوں وہ ایک جرار ہندو لشکر کو فاش شکست دیگی۔ تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔ نمونہ کے لیے آٹھویں باب کی پہلی سطر ملاحظہ ہو "پارتی خیمہ کے وسط میں ایک کوچ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے" کہاں ہندوستان کا ہندو عہد اور کہاں کوچ پر کروٹیں بدلنا! زبان پر کہیں کہیں اردو شاعری کا تاریک سایہ پڑا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں "فوجوں کے رعب سے دریا کا پانی تھر تھراتا ہے، آسمان کا عکس متزلزل نظر آرہا ہے۔۔۔۔" پہلا باب سیدھی سادی تاریخ ہے جسکو اصل پلاٹ سے کچھ سروکار نہیں۔ ناظرین کو یہ خشک حصہ مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے۔ واصف صاحب نہایت آسانی سے اس باب کو نظر انداز کر سکتے تھے۔

میلاد حبیب مولفہ مولوی حبیب حسین صاحب ردولوی۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت ۸ ر پتہ: سجاد حسین عبد الرزاق تاجران، نواب بازار، قصبہ ردولی (بارہ بنکی)

میلاد حبیب یا تذکرہ رحمۃ للعالمین حصہ اول میلاد شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ پہلے ۶۸ صفحوں میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، حقوق العباد، احکام خدا، اقوال رسول، سردار دو عالم میدان عمل میں کے عنوانوں سے سات لکچر ہیں۔ پھر نظام الشائخ سے "معجزات سرور انام" نقل کر لیا ہے اور آخر میں ذکر ولادت شریف ہے۔ اس بے ڈھنگی ترتیب کے علاوہ نفس مضمون بھی قابل شکایت ہے۔ محفل میلاد وعظ و نصیحت کے لیے نہیں۔ اسکی غایت اصلی یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے سوانح زندگی اس طرح بیان کیے جائیں کہ سامعین کو اپنی روزمرہ زندگی میں انکی تابعیت و تقلید کا شوق پیدا ہو۔ طباعت و کتابت معمولی ہے اور سرورق پر عین وسط میں کتاب کا اشتہار ہے۔

ماں بچہ کی نگہداشت مولفہ مولوی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی وکیل گوڑگانوہ۔ مطبوعہ قیصر ہند پریس دہلی۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۶۲ صفحے۔ قیمت ۶ر

جناب مولف نے ایک ننھے بچہ کے انتقال کی یاد میں یہ رسالہ مجسٹریٹ ضلع کی نذر کیا ہے۔ یہ ایک قابل غور بات ہے کہ نئی تہذیب کے زیر اثر ہندوستان کی مائیں قدیم خانگی علاج اور اصول تیمارداری سب روز بروز بھولتی جاتی ہیں۔ لیکن جس رفتار سے پرانی چیزیں متروک ہو رہی ہیں اُس رفتار سے صحت اور تیمارداری کے جدید اصول نہیں سکھائے جاتے۔ یہی جہالت بچوں اور ماؤں کی عمر ناک شرح اموات کی ذمہ دار ہے۔ مولوی محمد ظفر نے اسی جہالت کو رفع کرنے کے لیے یہ عام فہم رسالہ لکھا ہے جسمیں اسباب اموات شیر خوار بچوں کی حفاظت، زچہ کی داشت اور دودھ سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔ ان معلومات کے ماخذ کا پتہ نہیں۔ غالباً کسی انگریزی رسالہ کا ترجمہ ہوگا۔ بہر حال کتاب بہت مفید ہے اور ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے۔

سید

پچھلے مہینے کے رسالے

اُردو انجمن اُردو لکھنؤ کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۴ء میں مولوی مسعود حسن ایم اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے "اُردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ" کے عنوان سے ایک متفقانہ مضمون پڑھا تھا جو رسالہ اُردو کے پچھلے نمبر میں شائع ہوا ہے (جولائی کا پرچہ ستمبر میں آیا ہے اس لیے اسے ہم تاخیر سے پیش کر رہے ہیں)۔

اُردو شاعری میں ایک عاشق کے کئی رقیب ہوتے ہیں، اور معشوق عاشق سے زیادہ اُس کے رقیبوں پر مائل رہتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اعتراض تھا۔ پروفیسر مسعود حسن اس کا جواب دیتے ہیں:-

غزل میں سرگذشت عشق کا بیان عاشق کی زبان سے ہوتا ہے۔ شرح اسکی یہ ہے کہ خود عاشق ہی کی نگاہ ہے جو رقیب پیدا کر لیتی ہے۔ وہ معشوق کو محبت کے دائرہ کا مرکز سمجھتا ہے۔ اُسکے نزدیک ساری دنیا کو اُس پر فریفتہ ہونا ہی چاہیے۔ اور نفس انسانی کا خاصہ ہے کہ ادھر کوئی خیال دل میں جما، اُدھر قدم قدم پر اُسکے ثبوت ملنے لگے۔ معشوق کسی سے یا کوئی معشوق سے ہنسکے بولدیا اور عاشق نے اُسے اپنا رقیب سمجھ لیا۔ پھر رشک اور بدگمانی جو عشق کی ایک منزل کے لوازمات ہیں، عاشق کی قوت متخیلہ کو متحرک کر دیتی ہے اور خیالوں کا سلسلہ اسے نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں نے تو معشوق کو فلاں شخص سے صرف معمولی بات چیت کرتے ہوئے یا ہنستے بولتے ہوئے دیکھا ہے، مگر ان دونوں میں نہ معلوم کتنی بے تکلفی ہوگی، نہ معلوم کتنی محبت ہوگی، نہ معلوم کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہونگی، جنسے میں بالکل محروم ہوں، اور ایک اسی شخص پر کیا منحصر ہے، نہ معلوم ایسے خوش نصیب کتنے اور ہونگے جنسے معشوق ایسی ہی رسم و راہ رکھتا ہوگا۔

.... عشق کی پُر اسرار کیفیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس سے بے انتہا محبت ہوتی ہے اُسی سے ملتے ہوئے ایک حجاب سا ہوتا ہے۔ خود عاشق تو اس بیباکی کے ساتھ معشوق سے مل نہیں سکتا جس طرح دوسروں سے ملتا ہے۔ مگر جب وہ معشوق کو اپنے سے زیادہ دوسروں سے بے تکلف دیکھتا ہے، تو بدگمانی اُسکے کان میں کہہ دیتی ہے کہ معشوق کو تجھ سے اتنی محبت نہیں جتنی اوروں سے ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ حقیقت بالکل برعکس ہو۔

ایک اور اہم اعتراض یہ ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں معشوق ہمیشہ طبقۂ ذکور سے ہوتا ہے۔ یہ بات خلاف فطرت بھی ہے اور مخرب اخلاق بھی۔ اسکے متعلق مولوی مسعود حسن صاحب:-

"ہمارے شاعروں نے ایشیائی حیا کے تقاضے سے معشوق کے ... ب ڈالدی ہے
کہ دیکھنے والے اُسے پہچان نہ لیں۔ یہ رازداری اکثر اس حد ... ں لینا کیسا یہ
سمجھنا بھی دشوار ہے کہ معشوق جنس ذکور سے ہے یا جنس اناث ... ی معشوق کے لیے

مذکر فعل لانا معشوق کے مرد ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ غزل کے جن شعروں میں مشوق کا طبقۂ نسواں سے ہونا مسلم ہے اُن میں بھی معشوق کے لیے مذکر ہی فعل یا صفت وغیرہ لائے ہیں۔ مثلاً

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے

..... تیسری وجہ یہ ہے کہ غزل میں شاعر کسی خاص شخص کا عشق کسی مخصوص شخص کے ساتھ نہیں دکھاتا۔ وہ مجرد جذبۂ عشق کی تصویریں کھینچتا ہے۔ عشق کی دنیا کے واقعات بیان کرتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی شخصیت یا جنسیت سے اُسے بحث نہیں ہوتی بلکہ انکے باہمی تعلقات سے۔ عاشق و معشوق کا بیان تو محض اسوجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ بغیر انکے ذکر کے عشق کا بیان ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص یہ بتانا چاہتا ہو کہ سیاہی کے کہتے ہیں تو لا محالہ اُسے کسی سیاہ چیز کی طرف اشارہ کرنا ہوگا۔"

معارف

اس نمبر میں پروفیسر ضیا احمد صاحب ایم اے نے "ارتقائے ادب فارسی کے عنوان سے متاخرین کی خصوصیات پر بحث کی ہے اس کا اقتباس نمونۃً پیش کیا جاتا ہے:۔

اب متاخرین کے دور میں تہذیب و تمدن میں ترقی ہو گئی تھی اور اسباب تعیش کی ہر طرف فراوانی تھی، اسوجہ سے انکی قوت تخیل نے اگلوں کی پامال روش پر چلنا اور پرانے اسلوب بیان کو برتنا پسند نہ کیا لا محالہ خیالی اور فرضی استعارات ایجاد کیے گئے اور بناء الفاسد علی الفاسد استعارہ در استعارہ سے کام لیا گیا اور اس طریقہ سے شاعری کی زمینوں میں مجاز کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ یہ نیا انداز بیان لطیف ہونے کے ساتھ مدتتک قریب الفہم رہا کچھ مضائقہ نہ تھا مگر عہد اکبری کے بعد مضمون آفرینیوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی جسنے شاعری کو گورکھ دھندا بنا دیا۔ شعر کی تعریف یہ کیجاتی تھی کہ نفس کو انبساط یا انقباض ہو لیکن جلال، اسیر، شوکت، بنجاری، بیدل، وغیرہ کے کلام سے "طبیعت" کو تو ضرور انقباض ہوتا ہے باقی خیر صلاح۔ گویا اس دور کا کلام سجا سے اسکے کہ قلب کی تفریح کا ذریعہ ہو دماغ کی مشق کا سامان بہم پہونچاتا ہے اور اس کی تہ کو پہونچنے کے لیے اُسی کد و کاوش کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک مسئلہ ریاضی کے حل کرنے کے لیے درکار ہے۔ نظم پر موقوف نہیں، بیدل وغیرہ کی نثریں بھی یہی عالم نظر آتا ہے۔ خود فیضی و عرفی وغیرہ کے معاصر ظہوری کی تصنیف دیکھ جاؤ۔ تصنع اور اغلاق کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔ ہمیں ان باکمالوں کی خصوصیت یا اُنکے کمال سے انکار نہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس روش خاص نے اس دور میں خاقانی جیسے تو بہت پیدا کر دیے مگر سعدی جیسا ایک بھی پیدا

نہ کیا۔ غرض یہ کہ اس طریقہ سے نفس مضمون واضح اور ذہن نشین ہونے کے عوض اور تاریک و مبہم ہو گیا اور تشبیہ جو محض مقصود بالغیر تھی مقصود بالذات بن گئی "

زمانہ زمانہ کے ستمبر نمبر میں مسٹر علی عباس حسینی ایم اے نے "غالب کا مذہب" کے عنوان سے ایک ناقدانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے۔ جس میں اُنھوں نے غالب کو مذہب اثنا عشری کا پیرو ثابت کیا ہے۔ مگر غالب کے مذہب سے متعلق اُسکے کلام اور خطوط ہی میں متضاد شہادتیں ملتی ہیں۔ اگر اُنکی تردید بھی فرما دیتے تو بہتر تھا۔ ذیل کا اقتباس آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا جاتا ہے :-

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو عیسیٰ کو نبوت خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نوسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں، دوزخ اُن لوگوں کے لیے ہے ..... مقطع نبوت کا مطلع امامت، اور امامت نہ جاہی بلکہ من اللہ و امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسنؓ ثم حسینؓ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ....." اب اسکے بعد غالب مرحوم کی شیعیت میں شک ایک بیجا سی بات ہوگی۔ نہ کوئی ذی ہوش اس سے انکار کر سکتا ہے نہ اسکے ماننے میں پس و پیش۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب کی سی بے تعصب ہستیاں آجکل کی مکدر دنیا میں بھی ہمارے لیے شمع ہدایت بن سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم اُنکے نقش قدم پر گامزن ہونے کے لیے خود بھی تیار ہوں۔ اے کاش ہندوستان سے آپس کے تعلقات میں یہ سنی و شیعہ، ہندو مسلمان، گورے اور کالے کی تفریق اُٹھ جاتی اور ہم ایکدوسرے کو بھائی سمجھنے لگتے اور اس طرح شیر و شکر ہو کر رہتے کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی ہم کو اپنا ہی سمجھتا اور ہم کو اپنا کہنا باعث فخر و نمود جانتا!"

نگار ستمبر کے نگار میں محمد عبدالقادر سروری بی اے کا ایک ماخوذ مضمون تنظیم تمدن پر شایع ہوا ہے ایسے پُر از معلومات مضامین اُردو رسالوں میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ مذہبی علوم (Theology) کی برکات پر بحث کرتے ہوئے ایجاد و تحریر کے متعلق فرماتے ہیں :-

"..... تحریر پریشاں کن اور غیر مفہوم اشکال اور اشاروں کے مراحل طے کرتی ہوئی آخری ہزاری قبل مسیح کے شروع میں سادہ، آسان اور پڑھنے کے قابل شکلیں اختیار کر لیتی ہیں یہ وہی زمانہ ہے جبکہ یونانیوں نے پرانے رسومات، عادات اور خرافات کے قیود کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات قابل یادداشت ہے کہ پرسی پولس کی چٹانوں کے کندہ کتبے جو ایک صدی قبل ماہرین آثار قدیمہ کے اُکسانے اور خط مثلث کے رازوں کو طشت از بام کرنے کا باعث ہوئے۔ اس وسیع تر مگر کم تر تنظیم یافتہ [illegible] کے شہنشاہوں کی یادگاریں ہیں جن پر یونانیوں نے حیات نو [illegible] خط مثلث کی یہ تحقیق جو خط تصویر ہی کے اصول پر ہوئی اپنے [illegible] علاوہ اور کئی گتھیوں کے سلجھانے میں بیحد مفید ثابت ہوئی۔ ان محنت [illegible] خداداد

قابلیت سے کام لینے والوں کی اَن تھک کوششوں کا یہ صلہ ملا کہ قدیم واقعات کی توثیق اور جدید واقعات کے انکشاف سے گویا ایک "جہانِ دیگر" وجود پذیر ہوگیا جو آج عجائب خانہ لوور میں قوانین شاہ ہامورابی کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں خط اپنی تخلیق کے وقت لفظی حالت ایک جیسے تھے مگر رفتہ رفتہ تاریخی اختلافات کی وجہ سے جس تہذیب کے ماحول میں اُنھوں نے پرورش پائی، اُسکی مجسم مثال بنگئے۔ مصری تحریر نے اپنی بہت سی پیدائشی خصوصیات کو محفوظ رکھا اور مصریوں کی طرح اپنے پیدائشی وطن سے قدم باہر نکالنا گوارا نہیں کیا، لیکن خط مثلث وسیع ممالک میں منتشر ہوگیا۔ جن جن قوموں نے اُسکو اپنی گود میں لیا، اسکو اپنے طور پر پال پوس کر بڑا کیا اور یوں اس نوجوان نے اپنی جبلّی عادتیں کھودیں۔ حتیٰ کہ دو ہزار قبل مسیح ہی میں، جس وقت شاہ ہامورابی کی معاشرتی تنظیمات قلمبند کیجا رہی تھیں یہ تحریر آرمینیا، ایشیائے کوچک اور خود مصر کے شمالی حدود تک پہونچ گئی تھی۔ مصر کے خط تصویر کی ایجاد اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مصریوں میں نقشہ کشی کس حد تک ترقی کر چکی تھی! مصری خط، ارتقاء کے مختلف مدارج میں مختلف شکلوں میں نمودار ہونے کی وجہ سے متاخرین کے لیے کسی قدر پریشان کن بنگیا ہے۔ پہلے تو مصری جس شے کے متعلق کچھ کہنا چاہتے اُسکی تصویر کھینچدیتے بعد میں یہ تغیر ہوا کہ مطلوبہ شے کا اظہار اُسکی فرضی تصویر کے ذریعہ کیا جانے لگا۔ آخر کار خاص خاص چیزوں کے لیے خاص خاص علامات مقرر کرلی گئیں اور یہی حروف کا کام دینے لگیں۔"

ہمایوں

میجر عطاء الرحمٰن بی اے نے ہمایوں کے ستمبر نمبر میں "موجودہ فن مصوری پر ایک نظر" کے عنوان سے جدید ہندی مصوری پر ایک مختصر مگر فاضلانہ مضمون لکھا ہے۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس اقتباس کو غور سے ملاحظہ فرمائیں:۔

"زیادہ تعداد ہمارے جدید مصوروں کی ایسی ہے جو انسانی اعضاء کی بناوٹ اور تناسب (Anatomy) سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ مصور بننے سے قبل اُنھوں نے یہ ضروری علم حاصل نہیں کیا۔ اور اب ان نقائص کو جو اصل میں انکی ناقابلیت کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں، انڈین آرٹ کی خصوصیات بتا کر اُسے بدنام کر رہے ہیں۔ انسانی اعضاء تو علیحدہ رہے یورپین مصور پھولوں، پودوں اور درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ مختلف اقسام کے پودوں میں جن مختلف طریقوں سے چھوٹی ٹہنیاں بڑی شاخوں میں سے نکلتی ہیں اُنھیں تصویر میں کما حقہٗ ادا کرسکیں، گویا وہ مصوری کے لیے علم نباتات کا بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے مصور جس زمانہ یا قوم کے افراد کی تصویر بناتے ہیں اُنکے عادات واطوار، طریق زندگی، بلکہ لباس تک کی طرف بالکل توجہ نہیں

کرتے - جس طرح عموماً ہمارے تھیٹروں میں ایکٹروں کے لیے ایک خاص قطع کا لباس مقرر کرلیا گیا ہے اور خواہ ڈرامہ کا محل وقوع چین ہو یا امریکہ، مصر قدیم کا واقعہ ہو، یا الف لیلہ کا قصہ یا شکسپیر کا ڈرامہ، رومۃ الکبریٰ کا زمانہ ہو یا جارج پنجم کا، بادشاہ، اُمرا، فوج کے افسر، ہیرو ہیروئن، مذاقیہ اور اور قسم کے کیرکٹر اپنے اپنے پارٹ کے مطابق ہمیشہ وہی لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں - یعنی جو لباس ایک دن خاقان پہنے ہوئے ہے، وہی دوسرے دن کنگ لیر کے بدن پر دیکھا جا سکتا ہے - اسی طرح بعض مصوروں نے اپنی تصاویر میں دکھانے کے لیے ایک خاص قسم کا لباس اختراع کرلیا ہے جیسا دنیا کے کسی ملک میں نہ کبھی پہنا گیا نہ آجکل پہنا جاتا ہے - اُنکی تصاویر فقط لباس سے پہچانی جا سکتی ہیں - مختلف اقوام کے خط و خال مختلف ہیں - تاتاری النسل، آریائی افریقی، اور عربی اقوام کے چہروں اور بدن کی ساخت میں بیّن فرق ہے ..... اب اگر کسی قدیم یونانی دیوتا کے چہرے کے ساتھ بدن پر ہندوستانی یا ایرانی یا اختراعی لباس دکھایا جائے یا لیلیٰ کی تصویر دیکھنے سے یہ معلوم ہو کہ کسی جاپانی ماہ وش کو عربی لبادہ پہنا کر کھڑا کردیا ہے، اور بہادر ارجن پر تلا کوخاں کے بیٹے کا شبہ گذرے تو ان باتوں کو مذاق سلیم کہاں تک گوارا کرسکتا ہے - خواہ تصویر بذاتِ خود رنگ وغیرہ کے لحاظ سے کتنی بھی دلفریب کیوں نہ ہو - یورپ کے مصور ایک تصویر تیار کرنے کے لیے بعض اوقات دور و دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ وہاں کے حالات کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرسکیں، اور لائبریریوں سے پرانی کتب لیکر جس زمانہ کی تصویر بنانا مقصود ہوتا ہے اُسوقت کے لباس اور طرز معاشرت کی باریکیوں کے مطالعہ میں مہینوں کی کاوش صرف کردیتے ہیں -

جامعہ

دانتے اپنی نظم (Divine Comedy) "الروایۃ الالٰہیۃ" کے باعث دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں گنا جاتا تھا - یہ ایک طویل نظم ہے جس میں جنت اور دوزخ کے مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے - یہ تصویر اُس عہد کے مسیحی خیالات سے بالکل مختلف ہے - ایک مدت سے شارحین کو اُسکے ماخذ کی تلاش تھی مگر اب تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی - حال میں میڈرڈ یونیورسٹی کے عربی پروفیسر میگوئیل آسن نے اس کی تاویل کی ہے کہ یہ سب کا سب محی الدین عربی کی تصنیف اور دیگر اسلامی روایات سے ماخوذ ہے - عبد العلیم احراری صاحب نے اصل مضمون کا خلاصہ جامعہ میں شایع کرایا ہے - اس میں وہ تمام داخلی و خارجی دلائل آگئے ہیں جن کی بنا پر پادری موصوف نے یہ تعصبانہ دعوے کیا ہے - ہمیں افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم اُن دلائل کو ناظرین الناظر کی خدمت میں نہیں پیش کرسکتے - ذیل کا اقتباس البتہ حاضر ہے :-

" اگر یہ نظریہ کہ دانتے نے ابن عربی کا نقشہ اپنے
جائے تو یہ بدیہی مشابہت یا تو ایک ناقابل حل معہ
اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا

ج مسترد بھی کردیا
لمعقول معجزہ -
تا ان ہے کہ دانتے

کو اسلامی ادب سے واقفیت رہی ہو۔ اس مسئلہ پر تین قسم کی شہادتیں پیش کیجا سکتی ہیں۔
(۱) یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسیحی یورپ نے باہمی تعلقات کی بنا پر مسلمانوں کے مذہب، عقائد و رسم و رواج اور آخرت کے تصور کے متعلق کافی علم حاصل کر لیا تھا (۲) اسکا امکان ہے کہ دانتے نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلامی ادب سے اپنی نظم کے لیے مواد حاصل کیا ہو (۳) اسکی شہادتیں۔ جو ہیں کہ وہ ادب اسلامی سے شوق رکھتا تھا اور اس کا اثر بھی اُسپر پڑا تھا۔ اسلام ان ممالک کی فتح کے بعد جو عرب سے متصل تھے بڑی سرعت کے ساتھ اندلس، جنوبی فرانس، اطالیہ اور سسلی میں پھیل گیا۔ جنگ کے زمانہ میں بھی دو قومیں بہت جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جاتی ہیں اور یہاں تو ایک مدت تک اسلامی اور مسیحی تہذیبیں امن کے ایام میں دوش بدوش رہی ہیں۔ عرب تجار برابر روس اور شمالی یورپ میں جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی تو فنلینڈ، ڈنمارک، اور آئرلینڈ تک پہونچ جاتے تھے۔ اسکے علاوہ اندلس اور سسلی میں جو باہمی تعلقات تھے اُن کا پوچھنا ہی کیا۔"

قوس قزح قوس قزح کے سالانہ نمبر میں سید وقار احمد صاحب بی اے ایل ایل بی نے "مثنوی اور میر تقی میر" پر ایک ناقدانہ بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

"میر صاحب کی مثنویات میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو اقتضائے حال کے موافق نہ ہو، اور نہ ان میں کوئی ایسی بات ہے جو دوسری بات کی تکذیب کرے۔ غرض جہاں تک فن کا تعلق ہے میر صاحب کی مثنویاں خوب ہیں، مگر ان میں وقعہ پن نہیں ہے۔ اسلیے دوسرے مثنوی نگاروں سے انکا مقابلہ مشکل ہے۔ مگر بایں ہمہ ایک خاص حیثیت سے میر صاحب کا درجہ تمام مثنوی نگاروں میں بڑھا ہوا ہے اور وہ انکا اخلاقی پہلو ہے۔ میر صاحب کا درجہ غزل گوئی میں وہی ہے جو میر حسن کا مثنوی نگاروں میں ہے۔ مگر ہم میر حسن کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُنھوں نے اخلاقی پہلو نظر انداز کر دیا۔ اُنھوں نے بدر منیر میں بادشاہ کو شرع کا پابند بتایا ہے مگر بینظیر اور بدر منیر کی ملاقات قبل از نکاح کرادی! اسکے برخلاف ہم میر صاحب کے یہاں ایسی باتیں نہیں پاتے۔"

اسی رسالہ میں "طلسمی کتبخانہ" کے عنوان سے محمد شاہ ولی تہینی بی اے نے قصہ کے پیرایہ میں ادبی سرقہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک منظر آپ کی دلچسپی کے لیے اخذ کیا جاتا ہے۔ تہینی صاحب کتبخانہ میں خواب دیکھ رہے ہیں:

"عوام الناس کے گروہ کے گروہ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ جب وہ کسی کتاب کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ عجیب فیشن کے لباس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ اسے پہن لیتے ہیں مگر ایک ہی قسم کا لباس زیب تن نہیں کرتے بلکہ کسی کی آستین، کسی کا دامن، کسی کا جبہ کسی کا عمامہ۔ اسی طرح فرد فرد ٹکڑوں سے اپنے جسم کو سجاتے ہیں، مگر اصلی چیتھڑے پھر بھی کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتے ہیں ..... اس علمی اور ادبی کارخانہ میں

اچانک ہر طرف سے چور چور کی صدائیں بلند ہوئیں .... اُٹھائی گیرا ور مضامین کے چور مصنف اور مؤلف کتابیں بغلوں میں دبا بھاگنے لگے۔ مگر اصل مالکوں نے انکا تعاقب کیا اور سب کے کپڑے اُتار لیے اور اُن سب کو برہنہ تن گھر سے نکال دیا"

نظام المشائخ نظام المشائخ کے رسالہ نمبر میں خواجہ حسن نظامی صاحب "جمال" کے عنوان سے پیغمبر اسلام کے بعض فضائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان کی موجودہ افسوسناک حالت پر ہندرجہ ذیل تبصرہ فرماتے ہیں۔

"ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہودی، سب ہی ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ایک صورت اور ایک فطرت کے انسان ہیں۔ سب کا پیدا ہونا ایک ہے سب کا جینا ایک طرح کا ہے اور سب کا مرنا بھی ایک قسم کا ہے۔ پھر کیوں باہمی کدورت میں مبتلا ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی سچی اور اصلی بات کو سننا نہیں چاہتے؟

ہندوستان میں یہ سب تو لڑ رہے ہیں۔ ہاتھ سے، قلم سے، زبان سے، یہاں تک کہ انکے خیالات بھی اور انکے دل و دماغ بھی لڑ رہے ہیں، مگر کس بات کے لیے اور کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اسکی خبر خود انکو بھی نہیں ہے اور یہ بالکل نہیں جانتے کہ اس لڑائی کو ایک دن موت آجائے گی اور عقل ایک دن ان سب کو ملا کر ایک کر دیگی۔ اُس دن یہ افسوس کریں گے کہ ہم کیوں لڑے، کس بات پر لڑے اور اس لڑائی میں ہم نے کیسی بے عقلی اور غیر انسانیت کی حرکتیں کیں۔

سید

رسید کتب

۱۔ ادب العرب	مولوی نجیب احمد ایم۔ اے	سے م
۲۔ خطوط شبلی	مولوی محمد امین زبیری و سید محمد یوسف قیصر	صہ
۳۔ تاج تردکن	مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ	صہ
۴۔ حقیقت اسلام	نواب سراامین جنگ کے، سی، آئی	عہ
۵۔ رپورٹ	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	

اُردو رسائل کے خاص مضامین

ستمبر ۱۹۲۶ء

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ
(۲) عنقا

زمانہ - کانپور

(۱) غالب کا مذہب
(۲) قرۃ العین
(۳) کربلا (ڈراما)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) امام غزالیؒ اور فلسفۂ اخلاق
(۲) روشنی کی عدم جسمیت
(۳) ارتقائے ادبیات فارسی

قوس قزح - لاہور (سالانہ نمبر)

(۱) سزائے موت
(۲) جودھا بائی۔
(۳) دلربا دھوکا (افسانہ)
(۴) طلسمی کتبخانہ (افسانہ)
(۵) مثنوی اور میر تقی میر
(۶) قندیل احمر کی ضیاء

اُردو - اورنگ آباد

(۱) اُردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ
(۲) نوبل انعام
(۳) ادبی بات چیت

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) موجودہ فن مصوری پر ایک نظر
(۳) انتقام (افسانہ)

نگار - بھوپال

(۱) غالب کی ذہنیت
(۲) حسین کا انجام (افسانہ)
(۳) تنظیم تمدن
(۴) لارڈ رپن کا عہد حکومت

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) انسان بندر کی اولاد نہیں
(۲) شاہان مغلیہ کے اوقات شبانہ روزی
(۳) ایسٹیج۔
(۴) کوالف ترکی

نظرے خوش گذرے

۲۵-۲۶-ستمبر کو، حجاز کانفرنس کے نام سے جو جلسہ ہمارے شہر میں منعقد ہوا، وہ مہاراجہ صاحب محمود آباد و دیگر تعلقہ داران اودھ کی تمام کوششوں کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا۔ اور بجائے اسکے کہ مسئلۂ حجاز میں مسلمانوں کے لیے کوئی متفقہ راہِ عمل تجویز کیجاتی، افسوس ہے کہ مزید افتراق کی بنیاد پڑ گئی۔

اعلان کیا گیا تھا کہ اس کانفرنس کی حیثیت ایک ایسے اجتماع کی ہوگی جو مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی جماعتوں کا نمایندہ ہو مگر شروع ہی سے طریق کار ایسا اختیار کیا گیا جس نے اس قسم کے اجتماع کو ناممکن بنا دیا۔ پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ داعیان جلسہ میں صرف ایک خیال کے لوگ رکھے گئے۔ حالانکہ جب ملک کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کے نمایندوں کو دعوت دینا منظور تھی تو سب سے پہلے ہی کوشش ہونا چاہیے تھی کہ دعوت دینے والوں میں ہر جماعت کے ممتاز افراد شریک ہوں تاکہ جن لوگوں کو دعوت جائے اُنکو اس بات پر پورا اعتماد ہوسکے کہ یہ جلسہ واقعی ہر طبقہ کے مسلمانوں کی رائے کا نمایندہ ہوگا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ دعوت نامہ میں بطور اصول موضوعہ یہ امر ظاہر کر دیا گیا کہ حجاز سے سنجدیوں کے خراج کی تدابیر پر غور کرنا اس کانفرنس کا مدعا ہے ——— گویا مسلمانوں کی تمام جماعتیں پہلے سے اسپر متحد تھیں اور صرف حصول مقصد کے لیے تعین راہ کی حاجت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا نہ ہوئے تھے اُنکے لیے اس جلسہ کی شرکت کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہا۔ تیسری غلطی یہ کی گئی کہ دعوت ناموں کے بھیجنے میں بھی پوری تنگدلی اور تعصب کا اظہار کیا گیا۔ جن لوگوں کے متعلق معلوم تھا کہ مخالف رائے رکھتے ہیں اُنکو یا تو سرے سے دعوت ہی نہیں بھیجی گئی یا ایسے طریقہ پر بھیجی گئی کہ وہ شریک نہ ہوسکیں۔

انھیں سب فروگذاشتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ ہفتوں پیشتر سے اخبارات میں کانفرنس کا غلغلہ مچ رہا تھا، جگہ جگہ وفود گئے اور کثیر التعداد خطوط [illegible] جاری ہوئے لیکن نہ تو ہندوستان کے مشاہیر میں سے معدودے چند کے سوا کسی نے [illegible] آیا اور نہ ملک کے کثیر التعداد کارکنوں ہی نے اُسکی شرکت گوارا کی جنکے بغیر ظاہر [illegible] جامہ پہنانا قریب قریب ناممکن ہے۔ جو چند بندگان شکم مہاراجہ صاحب اور [illegible] کی رہنمائی کو اصلاے

کلمۃ الحق پر ترجیح دیتے ہیں وہ آنکھوں میں خاک ڈال کر مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ حجاز کانفرنس ہر طرح کامیاب رہی۔ حالانکہ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ بنگال کے سب سے بڑے اسلامی صوبہ سے محسن خاں کے سوا جو ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے باشندے ہیں، کون سے قومی کارکن یا سردار اس کانفرنس میں شریک ہوئے یا پنجاب سے جو بنگال کے بعد مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا اسلامی صوبہ ہے، مشہور خدام الحرمین کا رکن سید حبیب شاہ کے سوا کون صاحب ایسے آئے جو پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نمائندے کہے جا سکیں، یا سرحد کے پُرجوش مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے کون حضرات شریکِ جلسہ ہوئے۔ تو ایک نام بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو کسی وقعت کا سزاوار ہو۔ ان تینوں اسلامی صوبوں کے علاوہ مدراس، آسام، برہما اور بہار کا بھی کوئی نمائندہ نہ تھا۔ سندھ کے اسلامی صوبہ سے صرف ایک پیر مجدد صاحب تشریف لائے، اور صوبہ متوسط سے فرنگی محل کے ایک شاگرد مولوی حامد علی۔ خود بمبئی سے جہاں کے ایک شریف جلسہ کے صدر منتخب کیے گئے تھے باوجود یکہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مشہور مذہبی پیشوا کے حکم سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، کوئی بڑی جماعت نہیں آئی۔ اور جو چند آدمی انکی ہمراہی میں آئے بھی وہ بدنصیبی سے ایسے نہیں جنکی شرکت کسی جلسہ کے لیے موجب افتخار ہو۔ صوبجات غیر کے چند اشخاص کے سوا جن میں بہار کے بعض حضرات بھی شامل تھے باقی تمام لوگ اسی صوبہ کے تھے۔ اور ان میں بھی اکثر و بیشتر وہی اصحاب تھے جو خدام الحرمین کے رکن ہیں یا جنھیں مہاراجہ صاحب محمود آباد کی ذاتی دوستی کا فخر حاصل ہے۔

ابھی کچھ بہت زیادہ مدت نہیں گذری جب ۱۹۱۹ء میں ایک اجتماع تقریباً اسی قسم کا یہاں منعقد ہوا تھا جسکے اہتمام میں وقت و سرمایہ کی قلت کے ساتھ ساتھ ایک شعاری عظیم عالیجناب مہاراجہ صاحب محمود آباد کی اس عنایت سے پیدا ہو گئی تھی کہ دعوت نامہ پر دستخط کرنے کے بعد جبکہ خطوط طبع ہو چکے تھے، کسی کا اشارہ پاکر جناب والا شان نے اپنا نام بھی دعوت دہندگان میں سے خارج کرا دیا اور منتظمین جلسہ کو مجبوراً آپ کی مالی اعانت قبول کرنے سے بھی دستکشی کرنا پڑی۔ یہ وہی جلسہ تھا جس میں درحقیقت تحریک خلافت کی بنیاد رکھی گئی اور ظاہر ہے کہ اس جلسہ کے مہاراجہ صاحب ایسے نامور سیاسی لیڈر کو ہیلو بچانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو دوسرے عافیت پسندوں اور حکومت پرستوں سے شرکت کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ جو لوگ اُس جلسہ میں شریک تھے یا جنھوں نے اخباروں میں اس جلسہ کی رُوداد پڑھی وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ حجاز کانفرنس کو جہاں تک کہ صوبجات ہند

کی مسلم آبادی کی نمائندگی کا تعلق ہے اس اجتماع کے مقابلہ میں کیا نسبت رہی۔
مقامی خدام الحرمین ارغن نے یہ اعلان کرکے بہت سے لوگوں کو مغالطہ میں ڈالدیا تھا کہ کانفرنس کے لیے تجاویز کا مسودہ جس مجلس میں ترتیب دیا جائے گا اُس میں مجلس خلافت، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، جمعیت تنظیم وغیرہ نصف درجن سے زائد قومی مجالس کے دو دو نمائندے لیے جائینگے اور اختتام جلسہ کے بعد بھی یہی ظاہر کیا گیا کہ مجلس مضامین میں ان قومی مجالس کے دو دو نمائندے شریک تھے۔ حالانکہ یہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ دوسری جماعتوں کا ذکر نہیں، مگر کم سے کم ان چاروں مجلسوں نے تو اپنا کوئی نمائندہ نہیں بھیجا۔ اور حجاز کانفرنس کے طریق کار سے اختلاف اگر نہیں تو صریح بے اعتنائی کا ثبوت ان مجالس کی بے تعلقی سے بخوبی مل جاتا ہے۔

بہرحال کسی نہ کسی نوع کا ایک اجتماع ضرور ہوگیا جس نے دو دن کی متعدد نشستوں میں ایک درجن سے زائد تجاویز مسلمانان ہند کے نامۂ اعمال میں اور اضافہ کردیں۔ اور غالباً عالیجناب مہاراجہ صاحب بہادر، کارفرمایان مجلس خدام الحرمین، اور ہمارے مکرم و محترم جناب ایڈیٹر صاحب ہمدم کو پوری دلی تشفی حاصل ہوگئی ہوگی کہ تینوں کی متحدہ اور منفردہ کوششوں نے بالآخر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی طرف سے سلطان نجد و حجاز کے نام اعلان جنگ جاری کرادیا۔

لیکن غالباً ان سب اصحاب کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہوگی کہ ہزاروں روپے کے صرف کردینے اور اپنا اور دوسرے بہت سے لوگوں کا وقت عزیز رائیگاں کرنے کے بعد بھی مسلمانوں نے اُنکی رہنمائی کو قبول نہیں کیا۔ حجاز کانفرنس کی کارروائیوں پر جو تبصرہ اسلامی پریس میں ہوتا رہا ہے وہ یقیناً منتظمین کانفرنس کے لیے کچھ خوش آیند نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ اخبارات کی اس روش عام کو دیکھتے ہوئے قطعاً غیرضروری معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کی تجاویز پر کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کی جائے، تاہم میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم بانیان و کارکنان جلسہ کو اس بات پر دلی مبارکباد دوں کہ اُنھوں نے یہ اعلان کردیا کہ حجاز میں غیرمسلم مداخلت کسی طرح گوارا نہ کیجائے گی۔ اور اس طرح اُس فتنہ کا ایک بڑی حد تک سدِباب ہوگیا جو [illegible] کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے کی تجویز سے پیدا ہونے والا تھا۔

رہنمایان خلافت اور ایڈیٹر ہمدم کے درمیان یہ امر [illegible] س تجویز کا سہرا کسکے
اذعا جائے۔ محترم علی برادران اسے اپنی شرکتِ جلسہ کا حاصل [illegible] تصور فرماتے ہیں، اور
جالب صاحب لکھتے ہیں کہ کانفرنس کے اربابِ حل و عقد یعنی فرنگی محل و قیصرباغ کے باہمت

بزرگوں کا یہ مسلمہ مسلک ہے جس کا جلسہ سے قبل اعلان کر دیا گیا تھا۔ ہم اس بارے میں کچھ کہنے سے احتراز کریں گے، البتہ یہ عرض کرنے میں تامل نہیں کہ اس اعلان سے بھی پہلے والیسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے کی ایک تجویز کہیں تصیر باغ یا اُسکے نواح ہی میں منظور کی گئی تھی۔ اور ہمدم کے ذریعہ سے تمام ملک میں مشتہر ہوئی۔

حجاز کانفرنس کی حاصل تجویز یہ تھی کہ جب تک نجدیوں کا اخراج عمل میں نہ آئے حج ملتوی رکھا جائے تاکہ اقتصادی دشواریوں سے تنگ آکر سلطان ابن سعود حجاز کو چھوڑ کر اپنے ملک میں واپس چلے جائیں۔ اس تجویز کی نامقبولیت کے بارے میں غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ باخبر اور سنجیدہ طبقہ میں کوئی دو رائیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو اخبارات نجدیوں کے حامی و ہوا خواہ ہونے کے مجرم نہیں قرار دیے جا سکتے اور قبوں کی شکست سے بدل ناخوش ہیں اور برابر سال بھر سے اپنی رایوں کا اظہار کر رہے ہیں وہ بھی اس دانشمندی کی داد دینے کے لیے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مولانا محمد علی صاحب باوجود نجدیوں کے اخراج کے خواہشمند ہونے اور التوائے حج کو ایک قومی اقتصادی حربہ تصور فرمانے کے بھی اپنے اخبار میں اس تحریک کو قبل از وقت کہہ کر مردود قرار دیا۔ اور خلافت و مدینہ وغیرہ نے تو خوب ہی مضحکہ اُڑایا ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں نہ صرف یہ تجویز قبل از وقت، خلاف مصلحت، غیر مؤثر اور بے سود محض ہے بلکہ سرتا پا ایک مذہبی فتنہ کہے جانے کی سزاوار ہے۔ ارکان اسلام کے متعلق گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر مصلحین امت کی اُس جماعت نے جو مسیحی عقلائے یورپ اور اُن کے مسلمان متبعین سے اسلام کی عظمت منوانا چاہتی ہے اور اس خیال سے ہر مذہبی حکم کو محدود عقل انسانی اور اُسکے وضع کردہ قوانین طبعی سے مطابقت دینا ضروری سمجھتی ہے، طرح طرح کی دنیاوی اور مادی منفعتیں منسوب کر دی ہیں۔ لیکن فریضۂ حج کو بطور ایک اقتصادی حربہ کے استعمال کرنے کا خیال بالکل جدید انکشاف ہے۔ جسکی کم سے کم ہم کسی نہج سے بھی تائید نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ قرامطہ کے عہد میں بعض فقہانے التوائے حج کا فتوے صادر کیا تھا۔ اُس فتوے کو اُس زمانہ کے لوگوں نے کس حد تک قبول کیا، یہ بالکل جداگانہ بحث ہے۔ لیکن کیا کوئی صاحب یہ بتانے کے لیے تیار ہیں کہ اُن فقہانے التوائے حج کا فتوے محض اس لیے دیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے حج کرنا اُس عہد میں موجب نقصان مال و جان تھا، یا فتوے کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ قرامطہ

فقر و فاقہ سے تنگ آکر ارض مقدس کو چھوڑ بھاگیں گے۔

ابھی تک اسی کا رونا تھا کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد لے جن میں انگریزی خواں طبقہ اس لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ اُسے جاہل کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی اسلام کے چار اہم ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج سے تمتع اندوز ہونا چھوڑ دیا ہے اور اس سبب سے ساری برکتیں مسلمانوں سے اُٹھتی جاتی ہیں۔ اب جس فتنہ کا دروازہ اس نئی ایجاد نے کھولا ہے اُسکی بہ دولت قوی اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں میں تعلیم یافتہ انگریزی خواں ہی نہیں بلکہ جاہل و ناخواندہ اشخاص بھی سرے سے حج کی فرضیت ہی کے منکر ہو جائیں گے۔

جس طرح بڑے بڑے درخت چھوٹے چھوٹے بیجوں سے پیدا ہوتے ہیں اور عرصہ تک زمین کے اندر ایسے دبے رہتے ہیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کلہ کب پھوٹے گا اور نھا سا تخم درخت کی صورت اختیار کرلے گا۔ عینہ اسی طرح انسانی خیالات کا نشو و نما ہوا کرتا ہے۔ آج ہمارے بعض ہمایوں نے التوائے حج کو بطور ایک اقتصادی حربہ کے استعمال کرنے کا تخم بویا ہے، ابھی لوگ اسے خلاف مصلحت غیر موثر، ناقابل عمل اور قبل از وقت قرار دیتے ہیں، مگر کچھ تعجب نہ ہوگا اگر رفتہ رفتہ زمانہ کی عمر میں ترقی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی نشو و نما پا جائے اور نہ اخیر استہ ایک وقت ایسا آجائے کہ حج کی صرف اقتصادی مصلحتیں لوگوں کو یاد رہ جائیں اور یہ امر ذہن سے بالکل ناقابل ہو جائے کہ حج کا مقصود اصلی حجازیوں کی روٹیاں نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کی اطاعت و عبادت ہے۔

جو لوگ استطاعت نہیں رکھتے یا سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر سابقہ سے بہت زیادہ امن و امان ہونے کے آج بھی ہم اپنی ہے اور اپنے مال و جان کی حفاظت کا یقین نہیں کر سکتے وہ شوق سے تصدق حج ملتوی رکھیں مگر یہ کیا بدبختی ہے کہ قرآنی شریعت و ہدایت و ملوکیت سے نفرت کی بنا پر مسلمانوں کو ایک فریضہ دینی کی بجا آوری سے روکا جاتا ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت نے اس تجویز کے ساتھ جو کیا سلوک کیا جس کی وہ سزاوار تھی۔ اور خداوند کریم سے دعا ہے کہ مسلمانوں کو عقل ہو اور آئندہ ایسے فریب میں نہ آئیں اور وہ اپنے ہاتھوں اپنی بے آبروئی اور جگ ہنسائی کرانے سے باز رہیں۔

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہترین غزل گو

الناظر جنوری ۱۹۲۶ء کے انعامی نوٹس مین کچھ ایسی دلکشی ہی کہ اُسنے مجھ ناکارہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اِس عمر مین مقابلہ کا ذوق اور وہ بھی نوجوان انشاپردازون سے مجھ مین موجود نہین ہی۔ اور موجود نہ ہونا چاہیے۔ انعام حاصل کرنے کا لالچ بھی مجھ افسردہ دل کو میدان مقابلہ مین نہین لے جاسکتا تھا۔ اول تو اپنے دل و دماغ کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ اُمید ہی نہین ہوسکتی کہ مین اِس میدان کو جیت سکونگا۔ اور اگر یہ واہمہ پیدا بھی ہوجاتا تو بھی اِس گرم موسم مین مشتہرہ رقم انعام میری توجہ کو اپنی طرف مائل نہین کرسکتی تھی لیکن آجکل دنیائے شاعری مین انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانون کی خودروی زبان اردو کو شدید نقصان پہونچارہی ہے اور مین مدت سے اسے محسوس کررہا ہون۔ ممکن ہی کہ غزل گوئی اور غزل سرائی پر میری ناچیز تنقید اُن حضرات کی رہنمائی کا باعث ہو۔ اِسی خیال سے بہ حیثیت زبان اردو کے ایک ادنےٰ خادم کے مین نے اس مضمون پر قلم اُٹھانیکی جرأت کی ہے۔

انعامی مضمون کا عنوان یہ ہی۔

عہد میر تقی میر کے بعد سے اسوقت تک غزل گوئی مین کون شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ اسکے بعد مزید ہدایات اور شرایط لکھے گئے ہین۔

میر کے بعد سے اسوقت تک اردو شعرا کی تعداد لاکھوں نہین تو ہزاروں تک تو پہونچ چکی ہے تذکرہ نگار کا فرض ہے کہ وہ ان سب شعرا کے کلام اور حالات سے مطلع ہوکر اپنی قوت فیصلہ کو کام مین لائے۔ لیکن ایسی طویل اطلاعات کا بہم پہونچانا ہر شخص کے واسطے آسان نہین ہے اور کم سے کم مجھ جیسے ان کی طاقت اور ہمت سے باہر ہے اسلیے مین حضرت میر کے عہد کے بعد ہی متصل عہد سے ایک شاعر کا انتخاب کرون گا جس نے اردو غزل گوئی مین کامیابی کا تمغۂ امتیاز حاصل کیا ہے اور رنگ تغزل کو کامیاب بنادیا ہے۔ اس محترم شاعر کا مقابلہ بھی اسی عہد کے ایک مشہور شاعر سے کیا جائیگا۔ ناقدین کرام مجھے معاف فرمائینگے کہ مین نے اپنی محدود معلومات کی وجہ سے اُنکے مضمون کے وسیع عنوان کو اپنے اوپر تنگ کرلیا ہے۔

اُردو شاعری نے دامن مین بہت سے اصناف سخن کو لیے ہوئے ہے منجملہ اُنکے غزل بھی ہے۔ غزل گوئی مین یہ خوبی ہے کہ ہر شعر مین جدا جدا مضمون ہوتا ہے بخلاف قصیدہ مثنوی اور قطعہ کے کہ ان مین ایک ہی مضمون کو ترتیب کے ساتھ اور سلسلہ کے ساتھ لکھنا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اسکے غزل مین یہ دشواری بھی ہے کہ ہر شعر مین پہلے دو مصرعون مین ایک مضمون کو مکمل اور ختم کرنا پڑتا ہے لغت مین غزل کے معنی ہین عورتون سے باتین کرنا۔ اصطلاحی معنی مین بھی لغوی معنی کی جھلک موجود ہے اور غزل کا مایۂ ناز عشق کے پاکیزہ خیالات ہین یعنے وصل و ہجر کی کشمکش حسن و عشق کے معرکے، شمع و پروانہ کا معاملہ، گل و بلبل کا معاشقہ، بہار و خزان کا تصادم، جفا و وفا کے واردات، گھر کا بن کرنا اور بن کو گھر بنانا، قیس کا رنانا، لیلیٰ و شیرین کی بے اعتنائیان، کبھی مرنا اور کبھی جینا، کبھی ر ت اور متضاد خیالات ہین جن کو سامان غزل کہا جاتا ہے۔ اردو شا م فارسی شاعری کا

متبع کیا ہے۔ امیر خسرو یا ولی نے نظم اردو کی بنیاد قائم کی اور پھر میر و سودا نے اُس پر محل تعمیر کیا۔ سون، سین کی جگہ سے ہمن کو کے بجائے ہمکو لکھے جانے لگے۔ لیکن پھر بھی مین نے کہا کے موقع پر مین کہا نظم کیا جاتا تھا۔ اِس زمانہ تک نظم اردو مین کافی صلاح ہو چکی تھی، اور غزل کی شاعری کو چار چاند لگ چکے تھے فارسی اور بھاشا کا ایک معقول تناسب سے امتزاج ہو کر اردو زبان ایک مستقل حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ اردو زبان اور اردو غزل نے اہل بصیرت کی نظر مین ایک وقیع اور رفیع درجہ حاصل کر لیا تھا۔ آخر موت و حیات کی کشمکش نے اردو زبان کو ان محسنون کی سرپرستی سے محروم کر دیا اور وہ اِس نونہال کو دوسرون کے سپرد کر کے عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ میر جیسے قادر الکلام شاعر کی وفات کے بعد ملک ہند اور بالخصوص دہلی لکھنؤ مین بہت سے باکمال نظم اردو اور غزل اردو کی خدمت مین مصروف ہے جرأت، مصحفی، انشا، ناسخ، آتش، مومن، ذوق، غالب کا نام آج تک اردو غزل کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ فن شاعری اُسوقت ایک فن شریف خیال کیا جاتا تھا۔ اُمرا کی طرف سے اہل کمال کی قدر کی جاتی تھی۔ دربار دہلی اور دربار لکھنؤ کی داد و دہش بھی بڑی حد تک ترقی زبان اردو مین مددگار رہی۔ اردو زبان کو اپنے محسنون کا شکریہ ادا کرتے وقت مرحوم دہلی اور لکھنؤ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔

شیخ محمد رمضان ایک غریب چپراسی کو ۱۲۰۴ھ مین خداوند عالم نے ایک فرزند عطا فرمایا جسکا نام ابراہیم ہے۔ دنیا مین روزانہ سیکڑون ہزارون بچے پیدا ہوتے ہین۔ کس کو خبر تھی کہ یہ نومولود عید کا چاند بن کر اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اور شاعری کے افق پر ماہ کامل ہو کر چمکیگا۔ اِسی محترم ہستی نے ملک الشعرا اور خاقانی ہند کے القاب سے دنیائے شاعری مین شہرت پائی۔ سودا اور میر کے بعد

غزل اردو کو بلند سے بلند درجہ پر پہونچا دیا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اِس آسانی سے کہدیا کہ دشوار پسند طبیعتین آج تک حیران ہین۔ بندشون مین صفائی کا رنگ دکھایا۔ مشکل اور سخت قوافی کو اِس خوبی سے اپنی جگہ پر بٹھایا کہ تعقید بھی جو ایسے قوافی کے نظم کرنے مین لابدی ہے بھلی معلوم ہونے لگی ضرب الامثال کو نظم کے سانچہ مین ڈھال کر اپنے کمال کو ثابت کیا۔ فارسی ترکیبون سے بھی نظم اردو کو زینت دی عشق و حُسن، درد و محبت، تصوف، فلسفہ قدرت، موت و حیات وغیرہ کے مضامین سے غزل کے چمن کو سجا کر دنیائے شاعری مین سیر و تفریح کا سامان مہیا کر دیا۔ اُس عہد کے ارباب سخن نے قدر و منزلت کی اور آج تک منصف مزاج اعتراف کرتے ہین کہ ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق اقلیم سخن کا مالک اور غزل اردو کا بادشاہ ہے۔ اُس کے کلام نے کبھی الفاظ کی مناسب نشست و برخاست سے سہل ممتنع کا درجہ حاصل کر لیا ہی، کبھی مضامین کی ندرت سے محال کو ممکن کر دکھایا ہے۔ سودا اور میر کے بعد یہی وہ زبردست شخصیت ہی جس نے نظم اردو مین کامیابی کا افتخار حاصل کر کے غزل کی شاعری کو کامیاب بنا دیا ہی ان دعاوی کی دلائل و براہین خود اُسکا کلام پاکیزہ ہی جو عنقریب ہدیۂ قارئین ہوگا۔ اِس نیک نیت اور باکمال شاعر کے خدمات نے شہرت کے ساتھ شرف قبول بھی حاصل کیا اور اسوقت تک بھی دنیائے شاعری مین کثرت سے اُس خرمن کے خوشہ چین زبان اردو کی خدمت کر رہے ہین۔ حاسدین اور متعصبین کبھی اُسکو شیخ رمضان کا بیٹا کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہین۔ کبھی خلیفہ یا شیخ جی کہکر مذاق اُڑاتے ہین لیکن وہ سمجھ لین کہ خاک اُڑانے سے سورج کی روشنی فنا نہین ہو سکتی۔ ذوق کے کمال کا آفتاب ایسے بادلون سے بے نور نہین ہو سکتا۔ عرب کے مشہور شاعر متنبی کو بھی اہل حسد کے اِسی قسم کے طعن و تشنیع برداشت کرنے پڑے تھے وہ کوفہ کے ایک بھشتی کا لڑکا تھا۔ لیکن اسکی جوھر آفرین طبیعت نے اسکو معراج کمال پر

پہونچایا۔ اسی طرح چپراسی کا لڑکا خلیفہ یا شیخ جی جو اردو شاعری کے واسطے مایۂ ناز ہے، خاقانی ہند ہو کر رہا۔ ذوق نے غزل گوئی مین جو درجہ حاصل کر لیا اُسکا کوئی اور مستحق نہین تھا۔ بقول مولانا آزاد مرحوم ذوق خاتم الشعرا بلکہ خاتم الشعرا ہی۔ قارئین کرام اب اُسکے کلام کے مختلف نمونے ملاحظہ فرمائین۔

---

(۱) ہوا یہ سینہ یکسر خارزار دشت غم میرا — کہ آیا پا بجوان آغشتہ ہو کر لب بدم میرا

(۲) رسیدہ سایۂ ہستی سے ہوں وہ آہوئے وحشت — کہ ہی اک کوچۂ رم جادۂ دشت عدم میرا

(۳) وہ ہون مین گیسوئی موج محیط اعظم وحشت — کہ ہی گھیرے ہوئے روئے زمین کو پیچ و خم میرا

(۴) مری صوت کے معنی ہین نفخت فیہ من روحی — حدوث بے ثبات اثبات کرتا ہی قدم میرا

(۵) وہ ہوں مین رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہی — برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

ان اشعار مین مضامین کی ندرت اور صفائی کے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہی کہ فارسی ترکیبون کو کس خوبی کے ساتھ اردو نظم مین جگہ دی ہی۔ میرزا غالب کا بھی مطلع جو اسی زمین میں ہے ملاحظہ کے قابل ہی۔

نہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

دیوان غالب کے شارحین اس شعر کے معنی مین بھی اختلاف کرتے ہین لیکن مطلب یہ ہی کہ یک بیاباں ماندگی (تھک کر رہ جانا) کی وجہ سے میرا ذوق دشت نوردی کم نہین ہوگا کیونکہ میرا نقش قدم حباب موجہ رفتار ہی۔ میرزا نے ایسے الفاظ مین اس مضمون کو ادا کیا ہے کہ ہر دماغ بآسانی اسکا لطف حاصل نہین کر سکتا۔ میرزا نے اپنے تھک جانیکے باوجود اپنے نقش قدم کو حباب موجۂ رفتار کہہ کر ذوق دشت نوردی کو قائم رکھا ہی۔ لیکن خاقانی ہند کا پانچواں شعر اس تخیل مین کسقدر مکمل ہی۔ اپنے شوق نوردی کو عجیب صورت سے ثابت کیا ہے کہ میرا نقش قدم بھی برنگ سایہ

مرغ ہوا میرے ساتھ جاتا ہے۔ زیادہ تیز روی مین پاؤن کے نشان زمین پر نہین بنتے ہین

لکھیے اُسے خط مین کہ ستم اُٹھ نہین سکتا — پر ضعف سے ہاتھون مین قلم اُٹھ نہین سکتا
آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلے — پر حیف کہ مجنون کا قدم اُٹھ نہین سکتا

مطلع کسقدر لطیف ہی ناتوانی کو کس انداز سے ثابت کیا ہی اور قادر الکلامی کی شان دکھائی ہے۔ دوسرا شعر جس کیفیت کو لیے ہوئے ہے وہ زبان سے ادا نہین ہوسکتی اس کا اندازہ صرف وہی دل کرسکتا ہی جو درد و عشق سے لبریز ہو ؎

حسرت پہ اُس مسافر بیکس کی روئیے — جو تھک رہا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اِس قافیہ پر شاہ نصیر کا بھی شعر ہے۔

سر معرکۂ عشق مین آساں نہین دینا — گاڑے ہے جہاں شمع قدم اُٹھ نہیں سکتا

شاہ صاحب نے قافیہ کو اچھا بٹھایا ہے لیکن ذوق کا شعر جسقدر بلند ہی وہانتک شاہ صاحب کے فکر کی پرواز نہین ہوسکی۔

(۱) اس تپش کا بھی مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا — کاش میں عشق مین سرتابقدم دل ہوتا
(۲) چین پیشانی اگر تیری نہوتی زنجیر — نالہ دیوانہ تھا جو پا بہ سلاسل ہوتا
(۳) موت نے کردیا ناچار وگرنہ انسان — ہی وہ خود بین کہ خدا کا بھی قائل ہوتا
(۴) آپ آئینۂ ہستی مین ہی تو اپنا حریف — ورنہ یان کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

ہر شعر سامان غزل کی بھری پری دوکان ہی۔ سلاست بیان اور لطف زبان نے مضمون کی آب و تاب کو دوبالا کردیا ہے۔ مطلع مین عجیب قسم کی لطافت ہی جسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔ میرزا غالب فرماتے ہین۔

میری قسمت مین غم گر اتنا تھا — یے ہوتے

یہ شعر بھی اپنے اندر بہت کچھ تاثیر رکھتا ہے۔ ... ری کثرت غم کی وجہ سے

چند دل مانگتا ہی۔ لیکن ذوق تپش عشق کا اہل صرف دل ہی کو سمجھتا ہی اور چاہتا ہی کہ ع
کاش مین عشق مین سرتا بقدم دل ہوتا۔ دونونکی تخیل مین ایک نازک فرق ہے اور جو
لوگ شاعری کا مذاق سلیم رکھتے ہین اُن کی توجہ کے قابل ہے۔

یہ حیات چند روزہ جو نہ سدرا ہوتی تو پھر ایک۔ عرصہ گاہ عدم وجود ہوتا

بندش کی لطافت اور مضمون کی بلندی جسقدر خراج تحسین وصول کرے
کم ہے۔

ساتھ آہ کے شب دلسے وہ پیکان نکل آیا تھا کام تو مشکل مگر آسان نکل آیا
رات آہ مین یون سینہ سے اک شعلہ سا چمکا مین نے تو یہ جانا دل سوزان نکل آیا

جس آسانی سے خاقانی ہند نے اِس مضمون کو ادا کیا ہے وہ اہل بصیرت کی
نظر مین ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

پانی طبیب دیگا ہمین کیا بجھا ہوا ہر دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
کہتے ہین آفتاب قیامت جسے سو وہ نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا
پھر دل مین آ سمو ہوئی میرے شعلہ رو لو پھر بھڑک اُٹھا یہ فتیلا بجھا ہوا

متبذل ردیف کو خوش فکر شاعر نے کہانتک بلند کردیا ہے۔

میں ہوں وہ خفت کہن مدتسے اِس ویرانہ مین برسون مسجد مین رہا برسون رہا بتخانہ مین
مستی و ناآشنائی، وحشت و بیگانگی یا تری آنکھون مین دیکھی یا ترے دیوانہ مین
ایک چھپر چونے کو شیخ جی کعبہ گئے ذوق ہر بت قابل بوسہ ہی اِس بتخانہ مین

ہر شعر حسن بندش سے ایک شاہ رعنا ہے جسکا کوئی خط و خال بے موقع نہین ہر
کہتے ہین مرجائین گر چھٹ جائین غم کے ہاتھ سے پر تجھے غم سے ہمین مرنیکی بھی فرصت نہیں
ایک دل اور آپ اتنے بار غم اللہ سے دل اور اِس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

پہلے شعر مین عدم امکان مرگ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے زبان تعریف سے

قاصر ہے۔ مرزا غالب نے بھی اسی تخیل کو نہایت لطافت سے بیان کیا ہے

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے ہمنے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہوا

لیکن ذوق غم عشق مین محرومی مرگ کو ایک دلیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ع بر ترے غم سے ہمین مرنے کی بھی فرصت نہیں۔

دوسرے شعر مین جو ندرت ہے یہ مرحوم خاقانی ہند کا حصہ تھا دوسرے شاعر نے نہ ایسا کہا ہے نہ کہہ سکتا تھا

دیکھے عشق مین جاں دامق و قیس و فرہاد اور ابھی دیکھیے کس کس کی قضا ہے آئین

اُس جفا کیش کے نامہ کو پڑھون کیا قاصد جو کہ قسمت کا لکھا تھا سو لکھا ہے اِسمین

جا پڑا پاؤن پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ سرد ہونے پہ بھی گرمی وفا ہے اِسمین

زبان کی سلاست اور بندش کی صفائی کا اگر لطیف مضامین کے واسطے جزو لاینفک ہونا ضروری ہے تو ذوق کی سحر کلامی دیکھیے۔ اِس خصوص مین اُسکا کوئی ہمعصر اُس سے بڑھ کر کیا اُسکے برابر بھی نہین ہے۔ تیسرے شعر مین گرمی وفا کو جس انداز سے لکھا ہے اُسکی تعریف زبان سے ادا نہین ہوسکتی۔

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزین ہون مین ہون اسطرح جہان مین کہ گویا نہین ہون مین

مین وہ نہین کہ تم ہو کہین اور کہین ہون مین مین ہون تمھارا سایہ جہان تم۔ وہین ہو نہین

اُس در پہ شوق سجدہ سے فرش زمین ہو نہین مانند سایہ سر سے قدم تک جبین ہو نہین

بہ لحاظ لطف بیان اور حسن بندش تینون مطلعے کسقدر مکمل ہین۔ اور قوافی کو ردیف سے کس خوبی کے ساتھ چسپان کیا ہے۔

جنون نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب داماں سے نفس مجھو یا گریباں مین

جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو وہ بھی نہ پیتا ماآب حیواں مین

قادر الکلام شاعر مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل ادا کر سکتا ہے اور ایسے

ہی شعر اہل نظر سے خراج تحسین وصول کرنیکا حق رکھتے ہیں

اُس سنگ آستان پہ جبین نیاز ہے — وہ اپنی جا نمانہ ہی اور یہ نماز ہے
خنجر کہین نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب — میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

مطلع مین تشبیہ کی ندرت اور شعر مین نالۂ آہن گداز ترکیب فارسی حد سے زیادہ دلکش اور لطیف ہین۔

ذوق — نہ دل رہا نہ جگر دونون جلکے خاک ہوئے — رہا ہی سینہ مین کیا چشم خونفشانکے لیے
اُمید ہوگئی ہمسایہ۔ ورنہ خانۂ یاس — بہشت تھا ہمین آرام جاودانکے لیے
بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو — زبان دلکے لیے ہی نہ دل زبانکے لیے
مومن — خلاف وعدۂ فردا کی ہکو تاب کہان — اُمید یک شبہ ہی پاس جاودانکے لیے
لیا ہی دلکے عوض جان دے رقیب تو دون — مین اور آپکی سودا گری زبانکے لیے
وہ لعل روح فزا دے کہان تلک بوسہ — کہ جو ہو کم ہی یہان شوق جانفشانکے لیے
غالب — بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہی — رکھون کچھ اپنی بھی مژگان خونفشانکے لیے
دغدہ ہم ہین کہ ہین روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاودان کے لیے
زبانپہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زبانکے لیے

ایک ہی قافیون مین ذوق، مومن، غالب کی فکر سخن سے انکی معجز نگار طبائع کی گلکاریون کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ذوق نے جاودان کے قافیہ کو اس لطافت اور نظامت سے زمین شعر مین سرسبز کیا ہی کہ وہ ہمیشہ تر و تازہ رہی گا۔

غالب نے اسی جاودان کے قافیہ کو ایک شوخ رنگ کے پالش سے بالکل نیا کرلیا ہے اور یہ غالب ہی کا حصہ تھا۔ مومن نے بھی وعدۂ فردا اور اُمید یک شبہ کا دام بچھا کر قافیہ جاودان کو پھانسنے کی بلیغ کوشش کی مگر قافیہ تڑپ رہا ہے۔ خوں فشان کے قافیہ کو بھی ذوق نے نہایت سلیس اور لطیف پیرایہ مین ردیف سے وابستہ کیا ہی۔ میرزا غالب نے

اِس قافیہ کو ایک نئے انداز سے لکھکر شعر کا درجہ بہت بلند کردیا ہی زبان کے قافیہ پر ذوق نے جس حُسن بندش سے کام لیا ہی اور جس آسانی سے بیان درد محبت مین اپنی معذوری کو ثابت کیا ہی وہ تحسین و آفرین سے مستغنی ہی مومن و غالب کے شعر اِس قافیہ مین بہت سُست ہین۔

پھنسے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار مین دِل　　بلا سے گر ہو نوالہ دہان مار مین دل

سانپ کو گیسو سے اور حلقۂ گیسو کو دہان مار سے تشبیہ دی ہے اور اِس طور پر ذوق مرحوم نے ایک مکمل مطلع بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ سانپ کے منھ مین دل کا دینا بہ نسبت اسکے کہ دل کو مبتلائے عشق کیا جائے بہتر ہی۔ میرزا غالب مرحوم نے بھی اِس تخیل مین طبع آزمائی کی ہے۔

دہن شیر مین جا بیٹھیے لیکن اے دل　　نہ کھڑے ہوجیے خوبان دل آزار کے پاس

میرزا نے دہن شیر کے بالمقابل خوبان دل آزار دوسرے مصرعہ مین لکھا ہی تشبیہ ناموس بھی ہے اور بھدی بھی ہے جس سے ذوق و غالب کا فرق نمایان ہوجاتا ہے۔

دیکھا دم نزع دل آرام کو　　عید ہوئی ذوق و نے شام کو

خاقانی ہند نے نزع کے وقت کی ملاقات اور اُسکی مسرت کا نقشہ نہایت لطیف تشبیہ مین دکھایا ہے۔ بندش بھی ایسی صاف اور مضبوط ہی کہ نثر مین بھی اِس مضمون کو ادا کرنے مین کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہٹایا نہین جاسکتا۔ میرزا غالب مرحوم نے بھی نزع کے وقت کی ملاقات کو ایک مقطع اور پھر ایک شعر مین نظم کیا ہی۔ قارئین کرام خود ذوق و غالب کے انداز بیان اور طرز ادا سے اندازہ فرماسکتے ہین کہ اردو غزل گوئی مین کون کس درجہ پر ہے۔

غالب۔ مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھین غالب　　یا ‘‘ ‘‘ سے پر کسو وقت

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھین ہی ہی　　عاشق بیمار کے پاس

ذوق مرحوم کے کلام سے چند اشعار کا اور انتخاب کیا جاتا ہے جسمین مکمل محاورات اور ضرب الامثال کو نظم کرکے غزل کی شاعری کو چار چاند لگائے ہین۔ میر علیہ الرحمۃ کے بعد کے شاعر کے کلام مین محاورات کی یہ خصوصی حالت نہین پائی جاتی۔ یہ کلام صحیح طور پر سہل ممتنع کہے جانیکا مستحق ہے۔ بندش اسقدر چست ہے کہ ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے ہٹائے جانیکے قابل نہین ہے۔ زبان اسقدر لطیف ہے کہ دوسرے فصیح الفاظ مین ان مضامین کا ادا کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ جو حضرات غزل اردو کا مذاق سلیم رکھتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ذوق کو غزل اردو سے اور غزل اردو کو ذوق سے کیسا گہرا تعلق ہے۔

مین ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا — تم وقت پہ آ پہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ و گرنہ — جانے کا ارادہ تو کہین ہو ہی چکا تھا
کیا گرم تپش ہوتا تڑپ کر ترے آگے — میں سرد تہ خنجر کیں ہو ہی چکا تھا

محفل میں شور قلقل مینائے مُل ہوا — لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قل ہوا

شکر پردہ ہی میں اُس بت کو خدا نے رکھا — ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
تلخکامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر — استخوان کو مرے مُنھ پر نہ ہمانے رکھا

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا — کہ نیچے آسماں کے اک نیا اور آسماں ہوتا

گل اُس نرگس کے زخم رسیدوں میں مِل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مِل گیا

کیا کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہہ جو تجھے کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

آدمی ہو گر مکدر کیا تصور ادراک کا
خاک کا پتلا ہے یہ۔ کچھ تو اثر ہو خاک کا

دلکی تپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا
طائر جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پاکر چھوٹ گیا

چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیون کریگا
مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مریگا

کچھ راز نہاں دلکا عیاں ہو نہین سکتا
گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہین سکتا

بادام دو جو بھیجے ہین بٹوے مین ڈالکر
ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھین نکال کر
قاتل ہے کر مزے سے نمک پاش زخم دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک کو حلال کر

صفحہ دھر پہ یک دل نوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہین سو وہ بھی جدا ایک سے ایک

نہ ڈال آبلہ اے گرمی فغاں منھ میں
کہ چپکا بیٹھا رہون بھر کے گھنگھنیاں منھ میں

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہین
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہین

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے مین
دیر ہے لیجانے مین

جس جگہ بیٹھے ہین بادیدۂ نم اُٹھے ہین
آج کس شخص کا مُنھ دیکھ کے ہم اُٹھے ہین

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسون
ہوئے برسون۔ نہوئی پر وہ تمھاری پرسون

اشکباری مری مژگان کی ذرا دیکھین تو
کتنے پانی میں ہیں فوارے ذرا دیکھین تو

بزم صنم مین حضرت دل ذکر کعبہ کیا
تھی جس چمن کی بات گئی اُس چمن کے ساتھ
گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت مین
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہو تو سب کچھ
ایمان کی کہین گے ایمان ہو تو سب کچھ

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہو
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہو
زال دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دھر
مرد دیندار کو بھی دھریہ کر دیتی ہو
فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا
اب تو اکسیر بھی دیجیے تو ضرر دیتی ہو

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کر پیاسے ہیں مے آشام مہینہ بھر کے

جو تھے مژگان پر خون سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنون یہ کیسے نشتر تھے کہین ڈوبے کہیں نکلے
خدا دے دوربینی اور اِس چشم تصور کو
کہ لاکھون کام اِس سے دور کے بڑھ بڑھ کے نکلے

خط بڑھا، کاکل بڑھی، زلفین بڑھین، گیسو بڑھے
حُسن کے سرکار مین جتنے بڑھے ہندو بڑھے

لیکن میری رائے مین آزاد مرحوم نے حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ ذوق کے مرتبۂ شاعری سے بہت کم ہے۔ مولانا حسرت موہانی جو دیوان غالب کے شارح اور طرز غالب کے دلدادہ ہین اور غالب کو من حیث المجموع اُن کے سب ہمعصرون سے افضل بھی سمجھتے ہین حضرت ذوق کی بابت تسلیم فرماتے ہین کہ "غالب کے ہمعصرون مین اوستاد ذوق سب سے زیادہ محتاط ہین اور صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہی"

بہرحال۔ کل شئی یعرف باضدادہا کے اُصول پر نظر کرکے نہایت ضروری ہی کہ مین میرزا غالب کی اردو شاعری پر بھی تبصرہ کرون تاکہ اہل انصاف دیکھ لین کہ غالب مرحوم نے اردو غزل گوئی مین بعد میرؒ کے کسقدر بلند درجہ حاصل کیا ہے اور ذوق کی غزل گوئی سے غالب کی غزل سرائی کو کیا نسبت ہی۔ مجھے میرزا سے کوئی عداوت نہین ہی بلکہ بحیثیت تبصرہ نگار کے میرزا کے معتقدین کو حقیقت حال سے مطلع کرنا چاہتا ہون اور اُمید کرتا ہون کہ وہ حضرات بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمانے کی تکلیف گوارا کرینگے۔

میرزا غالب کی اُردو شاعری

میرزا غالب کو قدرت نے جدت طرز دماغ اور معنی آفرین طبیعت عطا فرمائی تھی۔ گو اُنھون نے اکتساب علوم مین وقت نہین گزارا۔ کسی کے شاگرد بھی نہین تھے۔ گھر کی الماریان کتابون سے خالی تھین۔ اِن باتون سے اُنکے کمال کی تنقیص نہین ہوسکتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملکۂ مضمون آفرینی بلاواسطہ قدرت کا نمونہ تھا۔ حقیقت مین میرزا غالب فارسی کا باکمال شاعر تھا زمانہ کی ضرورت نے اُسے اردو کا بھی شاعر بنایا۔ دربار دہلی کی وظیفہ خواری کی وجہ سے یہ بغیر چارہ نہ تھا۔

میرزا نے نہایت بیدلی سے اِس خدمت کو انجام دیا۔ جسکی تفصیل آیندہ آئیگی۔ لیکن فیض سخن سے میرزا بھی محروم نہین رہے کبھی کبھی غزل اردو مین ایسا شعر بھی کہہ جاتے تھے جو بہ لحاظ ندرت دیوانوں کا جواب ہوتا تھا۔ مگر محض اس بنا پر انکو اردو غزل کا کامیاب شاعر قرار نہین دیا جاسکتا۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶ پر خواجہ حالی مرحوم تحریر فرماتے ہین "میرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہین دیا تھا، بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر کبھی اپنے دلکی اُپج سے کبھی دوستونکی فرمایش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دیوان مین غزل کی صنف کے سوا کوئی صنف معتد بہ نہین پائی جاتی وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہین "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور مین شرماتا ہون۔ یہ غزلین کاہے کو ہین پیٹ پالنے کی باتین ہین۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی اُن کا لطف نہین اُٹھاتا۔ اب قدردانی اِس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہین کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہین لائے لیئے نیا نیچہ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لیجاتا ہون"۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسقدر بیدلی سے میرزا اردو غزل لکھتے تھے اور اردو غزل گوئی کس حد تک بار خاطر تھی۔ میرزا اپنے ایک طویل فارسی قطعہ مین بھی خود اپنی اردو شاعری کے بابت اظہار رائے فرماتے ہین یہ دونون شعر زبان زد عام ہین۔

فارسی بین تا بہ بینی نکتہ ہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من ست

راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید — ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگ من ست

میرزا کا غزل گوئی اردو مین کیا طرز تھا اور میر علیہ الرحمۃ کے بعد میرزا سب سے زیادہ کامیاب شاعر غزل اردو کا تھا یا نہین اِس بارہ مین خود میرزا کی پیشینگوئی سے بہت

کچھ مدد مل سکتی ہے۔

یادگار غالب صفحہ ۹۸ "خود میرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو میرزا کے ہموطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اوستاد مل گیا اور اُسنے اس کو سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگیگا"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۱ پر خواجہ حالی مرحوم میر تقی کی پیشین گوئی کے دونون شقون کو میرزا غالب کے حق مین پورا ہونا تسلیم کرتے ہین لیکن خواجہ کی رائے مین میرزا آخر مین غلط راستہ چھوڑکر صحیح المذاق دوستونکی روک ٹوک سے اور نکتہ چین ہمعصرون کی خوردہ گیری سے صحیح راستہ پر پڑ لیے تھے گویا خواجہ کی رائے مین سامان مذکورہ میرزا کے واسطے اوستاد کامل تھا جسکی حضرت میر نے نصیحت کی تھی خواجہ صاحب مرحوم بیباگرفی مین کتنے ہی محتاط ہون لیکن میرزا کی شاگردی کے حقوق نے ان کے دل و دماغ پر ایک ایسا خفیہ غلبہ حاصل کرلیا تھا جسکی وجہ سے وہ دانستہ نہین تو نادانستگی سے ایک مغالطہ مین پڑ گئے اور جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ صحت سے دور ہے اگر میر کی پیشین گوئی صحیح ہے تو اسکی کوئی شق بھی میرزا کے حق مین پوری نہین ہوئی اور میرزا کا کلام معنے کا منت کیش نہین ہو سکتا۔ میرزا نے کبھی اوستاد کامل کی تلاش نہین کی۔ میرزا اپنے ادعائے کمال کی وجہ سے یا ضد کی وجہ سے کبھی دوست دشمن کے مشورہ یا نکتہ چینی کی پروانہ کرتے تھے ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ۔۔۔ گر نہین ہین مرے اشعار مین معنی نہ سہی

خواجہ کی یہ رائے بھی صحیح نہین ہے کہ میرزا ۔۔۔ مانہ مین اپنے طرز
قدیم کو چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ میرزا کا سہل اور مشکل کلا ۔۔۔ ہے ایسا کوئی
خاص زمانہ معین نہین کیا جا سکتا کہ میرزا نے اپنے ۔۔۔ کے شکنجہ سے آزاد

فرما کر محض سہل گوئی پر قناعت کی ہو ۱۲۴۵ھ ہجری مین بقول مولانا آزاد میرزا نے بجائے اسد کے غالب تخلص کر لیا تھا لیکن جب اسد تخلص کرتے تھے اُس زمانہ کی اُن کی ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں ثقیل اور وزنی الفاظ کا دخل نہیں ہی اور مطلب بھی اغلاق و اجمال کی دست برد سے محفوظ ہی۔ شاعرانہ حیثیت سے یہ اشعار دقیق ہوں یا نہوں لیکن معانی سے بیگانہ نہیں ہیں۔ میں صرف مطلع کا پہلا مصرعہ لکھ کر قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ دیوان غالب میں اِن غزلوں کو ملاحظہ فرمالیں:-

(۱) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
(۲) عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
(۳) سر گشتگی مین عالم ہستی سے یاس ہی
(۴) چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
(۵) رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
(۶) عشق مجھکو نہین وحشت ہی سہی
(۷) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہی
(۸) دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ میرزا نے بہ حیثیت اسد کے ہی دشوار گوئی سے توبہ فرمالی تھی تو اُس زمانہ مین بھی جب میرزا صاحب غالب ہو چکے تھے ایسا کلام موجود ہی جو بعض لوگونکی رائے مین معانی کے لباس مین ستور ہونا نہین چاہتا۔ اِسلیے یہ ماننا پڑیگا کہ میرزا مرحوم کا دماغ جب بے کیف ہوتا تھا تو جو کچھ فرماتے تھے وہ سادہ ضرور ہوتا تھا لیکن بے کیفی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ اور جب میرزا کا دماغ کیف و سرور سے بے قابو ہو جاتا تھا تو شعر بھی ایسے نکلتے تھے جو مطالب و معانی کے ضرورت مند نہین ہوتے تھے اور اُس حالت مین میرزا کی بلند آفرین طبیعت جسقدر مضامین کے دریا بہاتی تھی اُن کا محدود الفاظ مین سما جانا ممکن نہ تھا۔

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

یادگار غالب صفحہ ۱۰۲ "میرزا نے ریختہ مین جو روش ابتدا مین اختیار کی تھی ظاہر ہی کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہین ہو سکتی تھی"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۳ "میرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اسمین شک نہین کہ اس سے اُنکی غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے"

یادگار غالب صفحہ ۸۱ "وہ اِس خیال سے کہ اُنکے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے۔ اکثر تنگ دل رہتے تھے..... ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفےٰ خان کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری بڑی قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد مین قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب مین قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ میرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو"

فی الحقیقت میرزا کو اردو غزل اور اردو شاعری کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر میرزا کا یہ قصد ہوتا کہ وہ اردو زبان مین فارسی ترکیبونکے اضافہ سے زبان اردو کو وسعت دیں گے تو بھی میرزا مبارکباد کا مستحق تھا اگر میرزا چاہتا تو اپنی توجہ سے غزل اردو کو معراج کمال پر پہونچا سکتا تھا۔ لیکن میرزا نے فارسی شاعری کے جنون میں اردو شاعری سے شدید بیگانگی کا اظہار کیا۔ نثر اردو میں بھی کبھی کبھی اِس بے التفاتی کا ثبوت دیا جسکے نمونے آب حیات صفحہ ۴۸۳ پر آزاد مرحوم نے دیے ہین مثلاً "منشی نبی بخش تمھارے خطوط لکھنے کا گلہ رکھتے ہین" (گلہ دارند) "منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو یاد نہ لانا" (یاد نیاوردن) "جو آپ پر معلوم ہو وہ مجھپر مجہول نہیے" (پرچہ بر شما منکشف است بر من مخفی نماند) یہ غنیمت تھا کہ اُس زمانہ میں میرزا کے ہمعصر میرزا کے کلام کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ اگر یہ ساری جماعت میرزا سے متفق الرائے ہو جاتی تو اردو زبان جو فارسی زبان سے نکلی تھی پھر فارسی زبان میں جذب ہو جاتی اور آج ادب اردو کا نام و نشان باقی نہوتا۔

شروع بیسوین صدی عیسوی یا اِس سے تعلیم یافتہ نوجوانونکی

قدر دان نگاہیں دیوان غالب پر پڑنے لگیں دیوان غالب کا نصف حصہ اس قدر بلیغ یا ثقیل تھا کہ اگر اُسے معانی سے کوئی تعلق بھی ہو تو اسکا معلوم کرلینا دشوار تھا مولانا شوکت مرحوم میرٹھی نے شرح لکھی لیکن مولانا کا خود اپنا کلام اسقدر دقیق ہے کہ میرزا غالب ہی اسکی شرح لکھ سکتے ہین اسلیے مولانا کی شرح دیوان غالب پر خود ایک حاشیہ کی ضرورت تھی بہرحال اگر میرزا مرحوم کے اشعار مین معانی مستور ہیں تو وہ ابتک بھی زیر نقاب ہیں اور مولانا میرٹھی اُن کی پردہ دری نہ کرسکے۔ دوسرے نمبر پر علامہ طباطبائی نے دیوان غالب کی شرح لکھی گو بلحاظ سال تصنیف شرح کا تو دوسرا نمبر ہے لیکن بہ نظر فضل و کمال اور سن و سال کے شارحین کا پہلا نمبر ہے۔ علامہ موصوف نے تشنگان معانی کے سیراب کرنے کے واسطے اشعار کی تشریح بھی کی تنقید بھی کی۔ اور کہیں کہیں میرزا کے کلام مین اصلاح بھی کی۔ بعض موقع پر تعریض کے تبصرہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ شاعری کے بہت سے نکات درج فرماکر شرح کو وزنی کردیا ہے۔ یہ امر کہ شرح کامیاب ثابت ہوئی یا نہیں بہت غور طلب ہے۔ علامہ کی شرح کی بابتہ مولانا نجم دوہانی کو بہت سے شکوک ہیں۔ الناظر اور اودھ پنچ مین عرصہ تک یہ تذکرہ جاری رہا ہے۔ مولانا نجم دوہانی ایک نوجوان اور ہونہار ادیب ہین اُن کا ذوق سخن۔ تبحر علمی۔ اور وسعت معلومات دیکھ کر بے اختیار دل سے دُعا نکلتی ہے خدا اِس نوجوان کو عمر کثیر عطا فرمائے اور استقلال و ہمت کے ساتھ ادب اردو کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ مولانا نجم دوہانی بھی دیوان غالب کی ایک شرح تیار کرچکے ہین جو ابھی شایع نہین ہوئی ہے اور مولانا نے اُمید دلائی ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں اِس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مشکل اشعار کی تشریح مین علامہ طباطبائی کہانتک کامیاب ہوئے ہین اور انکی تعریض و تنقید کیا وقعت رکھتی ہے لیکن غالب مرحوم کے سہل کلام کی تشریح میں بھی عالیجناب علامہ طباطبائی نے ایسی بلند پروازی سے کام لیا ہے کہ الفاظ اور معانی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے مین چند نمونے پیش کرتے

علامہ موصوف سے التجا کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو نظر ثانی فرما کر شرح دیوان غالب کو اِس قابل کر دیں کہ وہ بجا طور پر علامہ کی ذات سے منسوب ہو سکے۔ اِس شرح کے بعد مولانا حسرت موہانی اور حضرت سہا نے شروح لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ ممکن ہے کہ دلدادگان کلام غالب اُن جملہ شروح سے ابتک مطمئن نہ ہوئے ہوں لیکن کثرت تعداد شروح و شارحین سے ایک دلیل ترجیح کلام میرزا پر دستیاب ہو گئی ہے جسکو یہ لوگ کام مین لاتے ہیں میری رائے مین اردو غزل کا حُسن یہ ہے کہ سامع کے کانوں مین پہونچکر فوراً دل مین اُتر جائے۔ میرزا کا کلام نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ دماغون مین چکر لگا رہا ہے اور ابھی قلوب اُس سے مطمئن اور مسرور نہین ہوئے ہیں۔ اِن حالات میں اُس انجمن ادب اردو کی صدارت جو میرزا کی وفات کے بعد قائم ہوئی تھی میرزا غالب مرحوم کو پیش نہین کیجا سکتی۔ نہ میرزا غزل اردو کے کامیاب شاعر قرار پا سکتے ہیں۔

علامہ طباطبائی کے نکتہ رس ذہن نے عجیب معجز نمائی کی ہے میرزا کا سہل کلام بھی جسکو خواجہ حالی میرزا کے شاعری کا ماحصل قرار دیتے ہین تبدیلی معانی سے "مشکل کلام" کے مدین داخل ہوا جاتا ہے۔ مین علامہ شارح کے فضل و کمال کا احترام کرتے ہوئے چند نمونے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہون جسکا وعدہ کیا تھا۔

میرزا غالب پڑھتا ہوں مکتب غم دلمیں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

علامہ طباطبائی۔ غم وہ کیفیت نفسانی ہے جو مطلوب کے فوت ہو جانے پر پیدا ہو مطلب یہ ہے کہ مکتب غم میں میرا سبق یہ ہے کہ رفت گیا اور بود تھا یعنے زمانہ عیش کبھی تھا اور اب جاتا رہا۔

راقم۔ میں مکتب غم دلمین ابھی مبتدی ہوں اور — رفت گیا۔ بود تھا۔

جس نے مکتبوں میں فارسی صرف کی پہلی کتاب صفو — ی اس کو اِس ابتدائی

سبق کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

میرزا غالب کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ ترے جلوے نے کرے جو پرتو خورشید عالم شبنستان کا

علامہ طباطبائی۔ یعنی جسطرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اُسی طرح تیرے مقابلہ کی تاب آئینہ نہیں لاسکتا۔ آئینہ خانہ کی تشبیہ شبنستاں سے تشبیہ مرکب ہے۔

راقم۔ خورشید کے پرتو سے شبنم کا ہر قطرہ آفتاب کی طرح چمک اوٹھتا ہے۔ اسی طرح تیرے جلوہ نے آئینہ خانہ کا یہ نقشہ کردیا کہ ہر آئینہ شبنم کے ہر قطرہ کی طرح تیرے جلوہ سے منور ہوگیا یعنے ہر آئینہ مین تیرا پورا عکس نظر آنے لگا۔

میرزا غالب۔ آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن مین نہیں ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن مین نہیں

علامہ طباطبائی۔ گریباں دامن میں جب ہی ہوگا جب چاک ہوجائیگا اور چاک ہوکر گل سے مشابہت پیدا کریگا۔ اور دامن کو صحن گلشن بنادیگا۔

راقم۔ جب گریبان دامن سے جدا ہوجاتا ہے تو وہ ایک پھٹا ہوا چیتھڑا ننگ پیراہن خیال کیا جاتا ہے اسی طرح سے جن پھولوں کا چمن سے افتراق ہوجاتا ہے وہ بے آبرو ہوجاتے ہیں۔

میرزا غالب۔ ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل مین کسی رنگ سے معذور نہیں

علامہ طباطبائی۔ یعنے تغافل تو ناآشنائی محض ہے یہ مجھے کیونکر گوارا ہو۔

راقم۔ یعنے تغافل کے معنی معذوری نہیں ہیں تو مجھپر ظلم بھی کرسکتا ہے لطف بھی کرسکتا ہے اگر لطف کرنے سے دریغ ہے تو ظلم ہی سہی کچھ تو ہو۔

میرزا غالب۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

علامہ طباطبائی۔ تنگ چشم ہونا حاسد کی صفات مین سے ہے۔ (گرم تماشا ہو یعنے دنیا کو دیکھ۔ حاصل یہ کہ تجربہ کے بعد تجھے معلوم ہوجائیگا کہ حسد کرنا بیجا ہے۔ دنیا مین دولت کے لیے کوئی سبب نہین درکار ہے ہر جگہ یہی حال ہے۔

راقم۔ عالم کی سیر کرنا۔ حسد کا علاج تجویز کیا گیا ہے یعنے کثرت سیر و سفر سے مختلف حالتوں کے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملیگا اور تنگ نظری رفع ہو جائیگی۔

میرزا غالب۔ وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں اپنی سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

علامہ طباطبائی۔ یعنے وارستگی اور آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ بیگانگی و وحشت کا بہانہ کرلیا۔ اور ہم سمجھے کہ دنیا سے آزاد ہو گئے۔ ارے بیگانگی و وحشت بھی کرتو اپنے نفس سے کر نہ غیر سے۔

راقم۔ وارستگی کو بیگانگی کا حیلہ نہ بنانا چاہیے۔ یعنی آزاد مزاجی کا لازمہ بیگانگی نہیں ہے۔ خواہ کتنی ہی وحشت دامنگیر ہو لیکن دوست دشمن سے بیگانگی نہ برتنا چاہیے۔ یہ اصول باہمہ اور بے ہمہ کی تعلیم ہے۔

میرزا غالب۔ موت کی راہ دیکھوں۔ کب نہ آئے نہ ہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

علامہ طباطبائی کہتے ہیں موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ بغیر آئے نہیں رہیگی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں کہ تم نہ آؤ کہ پھر مجھے بلانے بھی نہ بن پڑے۔ یعنے آپ ہی آنے کو منع کروں تو پھر کس منہ سے بلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمہارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے

نوٹ:۔ اس شعر کی شرح میں مولانا حسرت موہانی نے بھی دماغ پر بہت زور دیا ہے گو مولانا کی شرح بھی اصل مطلب سے بہت دور ہے لیکن انکی ذہن کاوی بھی نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے مولانا حسرت کی موشگافیاں بھی قارئین کے انفراح طبع کا باعث ہونگی۔ وہو ہذا۔

مولانا حسرت۔ مجھکو موت کی راہ نہ دیکھنا چاہیے کیونکہ وہ خواہ مخواہ آئے گی۔ علاوہ اس کے موت کی خواہش کرنے میں یہ بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ نہ آؤ اور اگر ایسے خیال کا شبہ بھی میری نسبت ہوا تو میں پھر کبھی تم کو بلا۔ یعنے ایسا خیال رکھکر پھر کس منہ سے تمھیں بلاؤنگا۔

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ — نمبر ۵

قرآن شریف اور حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ پیدا ہونا		مولوی زبید احمد ایم اے	۱
غزل		حضرت مختار بدایونی	۱۶
فریبِ خیال	(افسانہ)	مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی بی اے (علیگ)	۱۷
غزل		قاضی غلام امیر امیر بدایونی	۲۶
آیولنتھی	(ڈراما)	مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی اے	۲۷
غزل		مسٹر جلال الدین اکبر	۳۲
ایشیا کا نشاۃ جدید		مسٹر سید حسن بی اے (لک)	۳۳
		مقدس ڈاکو	۳۶
		پچھلے مہینے کے رسالے	۴۳
		تنقیدیں	۴۹
		اُردو رسائل کے خاص مضامین	۵۳
		نظرے خوش گذرے	۵۴
بہترین غزل گو	(انعامی مضمون)	قاضی غلام امیر امیر بدایونی	۲۵ - ۴۱

ظ

اخبار صبح

کا دوسرا سال بفضلہ ختم کے قریب ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے جس کثرت سے ہر ہفتہ اسکے مضامین نقل کیے ہیں پسندیدگی خواص کا کسیقدر اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ سنہ ۲۷ء کے جملہ نئے خریداروں کو ایک نہایت ہی مستند اور دلآویز میلاد شریف "نغمۂ حرم" ہدیۃً دیا جائے گا بشرطیکہ سالانہ چندہ ۴ر اور نغمۂ حرم کا محصول ڈاک ۴ر جملہ ۸ر بذریعہ منی آرڈر بھیجدیا جائے۔

مہتمم صبح۔ لکھنؤ

نئی کتابیں

ہملیٹ

دنیا کے سب سے بڑے ڈراما نویس شیکسپیر کے شاہکار ہملیٹ کا سلیس و با محاورہ اردو ترجمہ، فاضل اہل قلم منشی امتیاز علی صاحب بی اے وکیل فیض آباد کے قلم سے۔ دیباچہ میں ڈراما اور اس کی تاریخ پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور خلاصہ قصہ اور اس پر تنقید بھی شامل کر دی ہے۔ مزور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت عہ

خوروں کا کلب

آغا بہار رضوی لکھنوی نے اس ناول میں تحیر خیز طریقہ پر اور نہایت دلکش انداز میں ایک پُراسرار قتل کے رازوں کا انکشاف، ایک حسین عیارہ کے حیرت انگیز کارنامے، پری جمال نازنینوں کے کرشمے، بوالہوسی کے راز و نیاز، برقی ایجاد کے جلوے، با محاورہ اور سلیس اردو زبان میں تحریر کیے ہیں۔ ہندوستانی زندگی کا یہ ادبی ناول اتنا دلچسپ ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے ہوئے اٹھنا مشکل ہے۔ ٹائیٹل پیج ایک خوبصورت تصویر سے مزین ہے۔ قیمت صرف عہ

مسئلۂ مجاز

یعنی وفد خلافت ۱۹۲۶ء کی رپورٹ جسکا مجموعی حجم ۲۸۰ صفحے ہے اور جسمیں آثار و مقابر وغیرہ کی ایک درجن سے زائد فلمی تصویریں ہیں۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مسٹر شعیب قریشی۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

حکایات الصالحین فی محاسن المحسنین

یہ کتاب روض الریاحین مولفہ امام یافعیؒ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں مشہور صوفیا اور اولیاء کے اقوال و حکایات نہایت دلکش انداز میں اور بڑے اہتمام سے بیان کیے گئے ہیں قصص صوفیاء کرام پر اس سے زیادہ مستند اور بہتر کتاب نہیں ہے۔ جھوٹی سچی کہانیوں کو چھوڑ کر اسے پڑھیے کہ رسول اللہ صلعم اور صلحاء سے محبت پیدا ہو۔ قیمت ۱۲ر

ذکر حبیب

اس نام سے ملک محمد الدین ایڈیٹر رسالہ صوفی نے جناب سید غلام حیدر علی شاہؒ جلال پوری کے مفصل حالات، کرامات اور ملفوظات سلیس اردو اور دلکش انداز میں تحریر فرمائے ہیں۔ خواجہ صاحب کی شان میں ہندوستان کے مشہور شعراء کی بہت سی دلپسند نظمیں آخر میں شامل کر دیگئی ہیں۔ جلالپور کا عام نظارہ، مزار کی رنگین تصویر، شاہ صاحب کا علمی [illegible] اقبال کی کسی ہوئی دستی [illegible] بھی کتاب میں شامل ہے۔ [illegible] جلالپور کے قلم سے [illegible] ایک [illegible] ہے۔ قیمت ہے ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۳۱ — نومبر سنہ ۱۹۲۶ء

قرآن شریف

اور

حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا ہونا

موقر نگار کے فاضل ایڈیٹر جناب نیاز فتح پوری نے نگار کے گذشتہ نمبر میں بذیل استفسارات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں فاضل مضمون نگار نے قرآن شریف سے حضرت مسیح کا بے باپ کے پیدا نہ ہونا ثابت کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تردید کی اور تیسرے حصہ میں معجزات عیسوی سے انکار کیا گیا ہے۔ ان تینوں مباحث میں پہلا مبحث اہم ہے۔ لہذا میں اس صحبت میں یہ ثابت کروں گا کہ قرآن شریف سے حضرت روح اللہ کا بے باپ ہی کے پیدا ہونا پایا جاتا ہے۔ چونکہ کلام اللہ کی صحت میں کسی مسلمان کو شک نہیں، اس لیے حدیث اور تاریخ کا حوالہ نہ دوں گا۔

قبل اسکے کہ میں اصل موضوع کی طرف توجہ کروں، کچھ بطریق مقدمہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خرق عادت اور معجزہ کا مسئلہ، ہو عباس کی پہلی صدی سے، جبکہ فلسفۂ یونانی کے عربی میں ترجمہ ہو جانے کے باعث مسلمانوں کی ذہنیات میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا تھا، مختلف فیہ بحث رہا ہے۔ طرفین افراط و تفریط

کے ہمیشہ شکار رہے۔ معتزلی خیال کے نام نہاد آزاد منش اصحاب جو عقل و معقولیت کے ضرورت سے زیادہ بندے بنے ہوئے ہیں خرق عادت کو یکدم محال و غیر ممکن خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف خوش عقیدہ مذہبی حضرات اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ معجزہ شئے مضحکہ ہو گیا ہے۔ شروع سے اب تک جو کچھ اس مبحث پر لکھا گیا ہے اُس میں بہترین، سیرۃ النبی کے تیسرے حصہ کی بحث ہے، جو درحقیقت قول فیصل اور افراط و تفریط سے خالی ہے۔ اس میں خرق عادت و معجزہ کے امکان کو بدلائل ثابت کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ صحت روایت کا جس قدر زیادہ لحاظ کیا جائے گا معجزوں کی تعداد کم ہوتی جائیگی تاہم چند معجزات ایسے ضرور ہیں جو کلام پاک اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور جن سے کسی مسلمان کو انکار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ انکا انکار قرآن کے انکار کا مترادف ہوگا۔ ایک مسلمان کے نزدیک قرآن کے اخبار و احکام یقینی ہیں اور علوم جدیدہ کے مقرر کردہ اصول و نتائج محض قیاسی و تخمینی۔ اور یقین و تخمین میں بڑا فرق ہے۔

مولانا نیاز کی قابلیت سے یہ درحقیقت نہایت مستبعد ہے کہ وہ معجزہ کا انکار کریں۔ دس گیارہ برس ہوئے، رسالہ اُسوۂ حسنہ میں جو میرٹھ سے نکلتا تھا، انکا ایک طویل مضمون بعنوان معجزۂ شق القمر کئی قسطوں میں شایع ہوا تھا جس میں نیاز صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اُن سب اعتراضات عقلیہ و نقلیہ کی جو معجزۂ اشقاق قمر پر وارد کیے جاتے ہیں تردید کی تھی۔ اُس وقت مولانا کا اعتقاد تھا کہ قانون قدرت کی حقیقت معلوم کرنے کا ہمارا ذریعۂ علم یعنی استقرار ناقص ہے، اور اس استقراء ناقص کی بنا پر قانون قدرت کے متعلق کوئی قطعی و اذعانی حکم لگانا سخت غلطی و حماقت ہے۔ چنانچہ مولانا نے آٹھ مثالیں ایسی دی تھیں جن سے استقراء کی غلطی ثابت ہوتی تھی۔ اُنکے علاوہ اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس صحبت میں میرا مقصود حضرت عیسیٰ کی ولادت بے پدر کو قرآن شریف سے ثابت کرنا ہے اسلیے فی الحال عقلیہ دلائل سے سروکار نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ مولانا کی یہ مذہبی ذہنیت اس قدر جلد بدل گئی کہ مولانا اب اعتقاد بالمعجزہ کو اعجوبہ پرستی اور عقل و ہوش کی دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مولانا اگرچہ بالفاظ صریح معجزہ کا انکار نہیں کرتے مگر اگر غ حضرت عیسیٰ کی ولادت
بے پدر کی بابت انکو جو اختلاف ہے اُس کا منشا سوا اسکے ں کے مقرر کردہ
قانون الٰہی کے خلاف کسی چیز کو، خواہ وہ قرآن شریف سے ثابت ہ سے، قبول کرنا نہیں
چاہتے۔ قانون الٰہی کے خلاف جانا تو ہمارا ذہن بھی گوارا نہیں کرتا۔ مرسوال تو یہ ہے کہ قوانین قدرت

سے کون سے قوانین مراد ہیں۔ وہ جو درحقیقت اس عالم میں کام کر رہے ہیں اور جن پر اس عالم کا نظام قائم ہے، یا وہ جنکو چند انسانی ہستیوں کی محدود عقل نے اپنے زعم میں معلوم کر لیا ہے؟ کیا سب قوانین قدرت پورے طور پر کما ہی معلوم و مشخص کر لیے گئے؟ کیا کوئی صاحب عقل سلیم اس کا جواب ایجاب میں دے سکتا ہے؟ سائنس نے حقائق عالم معلوم کرنے اور قوانین فطرت مشخص کرنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ اُس ضعیف چیونٹی کی اچیز کوشش سے جو تمام کرۂ زمین کے چپہ چپہ پر سفر کر کے دنیا کا حال معلوم کرنا چاہتی ہے، زیادہ وقعت نہیں رکھتا کیا کوئی شخص دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ جو قوانین قدرت معلوم کر لیے گئے ہیں وہ یقینی اور حقیقی ہیں؟ کیا آپ کے پاس اسکی کوئی گارنٹی ہے کہ جس طرح تحقیقاتِ قدیمہ کو تفحصاتِ جدیدہ نے باطل کر دیا ہے اُسی طرح زمانۂ آئندہ کی کاوش و جستجو موجودہ مسلمات کو غلط ثابت نہ کر دیگی۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ نیوٹن کا مایۂ ناز قانون ثقل ارضی جس وثوق و یقین کی قوت کے ساتھ ایک عرصۂ دراز سے سائنس دانوں کے دماغوں پر مسلط ہیں، محتاج بیان نہیں لیکن آجکل اسی قانون کو متعدد علمبرداران تحقیق و تدقیق غلط ثابت کر رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ علوم جدیدہ کے معلوم کردہ قوانین قدرت یقینی نہیں۔ اسکے برخلاف اگر کسی ذاتِ انسانی کو قانون قدرت کے بنانے والے خداوند حقیقی کا رازدار سمجھتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ اُسنے کہا، وہ خدا کی طرف سے کہا، تو اسکی خبر اگرچہ ہمارے معلوم کردہ قوانین فطرت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، درحقیقت صحیح ہے اور قانون قدرت کے عین مطابق۔ مولانا نیاز ممکن ہے بطا ہر کسی معجزہ کو نہ مانتے ہوں، مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم اس معجزہ کا ماننا ضروری ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے جو وحی کے ذریعہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا، اور یہ کہ یہ کتاب نقص و عیب سے پاک اور ہر نقطۂ خیال سے بے نظیر اور لاجواب ہے، اور یہ کہ آنحضرتؐ خدا کے رسول اور آخری رسول ہیں۔ اگر مولانا کے یہ عقائد نہیں تب تو وہ مسلمان نہیں۔ اور اگر وہ انکے معتقد ہیں تو وہ ضمناً معجزہ کے بھی قائل ہیں۔ یہ تمام امور بظاہر خلاف فطرۃ ہیں۔ قانون فطرت کسی ایک یا چند واقعات کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ کیا انسان پر وحی آنا، خدا سے بات کرنا وغیرہ وغیرہ باتیں اس زمانہ میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں؟ کیا ایسی کتاب ہو سکتی ہے جو قرآن سے بڑھ کر ہو۔ کیا کوئی اُمّی محض صرف الہام ربانی کی بدولت ایسی کتاب نادر پیش کر سکتا ہے جس کا حقیقۃً دنیا میں جواب نہ ہو۔ کیا یہ خرق عادت و معجزہ نہ تھا۔ غرضکہ قرآن شریف کے نزول اور بعثت رسولؐ پر ایمان لانا ہی معجزہ کا قائل ہونا ہے۔ یعنی اصولاً معجزہ کا وجود مان لیا گیا۔ تو پھر یہ بحث رہ جاتی ہے کہ کون کون سے معجزے قرآن پاک اور احادیث صحیحہ

سے ثابت ہیں۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ اب میں حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا ہونا قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔ مگر پہلے ایک اور مقدمہ کے ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔

آیات قرآنیہ کی تفسیر میں بہت کچھ اختلافات پیدا کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن پاک کے صحیح سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل اصول ہو سکتے ہیں:-

۱- قرآن عربی زبان میں ہے، اسلیے عربی لغت، عربی صرف و نحو اور عربی اسلوب بیان کا لحاظ رکھا جائے۔

(۲) ہمیشہ وہ معنی مراد لیے جائیں جو الفاظ ظاہر سے لغت و محاورہ کے مطابق مترشح ہوں۔ البتہ اگر کہیں اصول بلاغت کے مطابق مجازی معنی مراد ہیں تو پھر لغوی معنی مراد نہ لیے جائیں۔ مثلاً 'ید اللہ' سے اللہ کا ہاتھ نہیں، بلکہ اُسکی قدرت مراد ہے۔

۳۔ قرآن شریف پیش کرنے والے یعنی جناب رسالتمآبؐ نے کیا معنے بتائے اور سامعین یعنے صحابۂ کرامؓ نے کیا مفہوم سمجھا، جسکا پتہ احادیث صحیحہ سے چلتا ہے؟

۴۔ جس طرح ہر کتاب کا ایک خاص طرز ہوا کرتا ہے۔ جس سے واقفیت بھی اُس کتاب کے سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کا بھی ایک خاص اسلوب بیان ہے۔ جسکو آیات قرآنیہ سمجھتے وقت نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

جو لوگ معجزات کے منکر ہیں اُن کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ خرق عادت و معجزہ خلاف قانون فطرت ہے اور اس لیے لغو بات ہے اور قرآن شریف میں لغو باتیں نہیں ہیں کیونکہ وہ کلام الٰہی ہے۔ پس اگر کسی آیت یا آیات سے معجزہ کا وجود ثابت ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ الہ آباد میں مولوی ابوالفضل صاحب نامی ایک بزرگ ہیں، جنکو اس میں کچھ شک نہیں، قرآن سے خاص دلچسپی ہے۔ یہ کئی زبانوں میں اسکا ترجمہ کر چکے ہیں۔ مگر آپ قرآن شریف کے سمجھنے میں یہی اصول پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور جہاں جہاں عام عقائد کے مطابق معجزہ کا شائبہ ہوتا ہے وہاں علماے معتزلہ یا سرسید احمد کی تائید و تقلید میں یا اپنی ذاتی آزادانہ تحقیق کی بنا پہ معجزات سے انکار کر جاتے ہیں۔ اور آیات سے حسب مرضی وہ معنی مراد لیتے ہیں جن سے معجزہ کا وجود قائم نہیں

میں ان لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کے طریقہ ا[illegible] قباحت یہ ہے کہ چونکہ آپ معجزہ کو لغو سمجھتے ہیں اس لیے آپ کو آیات کی تفسیر [illegible] وے اصول کے خلاف کرنی پڑتی ہے۔ ہم مسلمان تو آپ کے استدلال پہ کم از کم یہی سمجھ کر خاموش ہو جائیں گے کہ آپ قرآن کو

کلام اللہ تو مانتے ہیں، لیکن غیر مسلم آپ کے دور از کار معنی کب مانے گا، وہ تو آپ کے خیال کے مطابق معجزہ کو لغو سمجھ کر قرآن کو بھی (نعوذ باللہ) لغو سمجھے گا کیونکہ اسے بہت سی آیات ایسی ملیں گی جن میں معجزہ کا ذکر ہوگا۔ پس غیر مسلم کو سمجھانے کے لیے آپ کو خرق عادت اور معجزہ کا امکان ثابت کرنا چاہیے، نہ کہ آیات کے معنی میں تصرف کریں۔ آیات کے معانی آپ کے تصرف سے بدل نہیں سکتے۔ خدا کا کلام قصائد بدر چاچ کی طرح چیستان نہیں ہے، نہ اُس نے اظہار قابلیت کے لیے اسے نازل فرمایا۔ اُسکا اصل منشا ہدایت عالم تھا۔ وہ درہ نادرہ اور مقامات حریری کے طرز پر نہیں ہے کہ اوقات اور مشکل ہو۔ نہ اُس میں قصائد خاقانی کی طرح دور از کار اور پیچیدہ تشبیہات و تراکیب ہیں، اور نہ غالب کے بعض مشکل شعروں کے مانند ہے جنکے مفہوم معین کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا جائے اور پھر بھی سہم رہیں۔ خدا کا کلام ایسا سہل ہے کہ عرب ایسی اُمی و ناخواندہ قوم نے اُسے سُنا اور مطلب سمجھ گئے۔ کلام کی خوبی صرف یہی ہے کہ بآسانی سمجھ میں آسکے۔ کلام الٰہی عرب کی زبان میں ہے اس لیے عربی اسلوب بیان اور عربی فصاحت و بلاغت کا معیار بدرجۂ اتم اس میں ملحوظ رہا ہے۔ تمام معانی و مطالب قرآن اول سے آخر تک نہایت واضح ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی آیت کا مطلب ماسبق و ماالحق سے علیحدہ و مناحت کے ساتھ سمجھ میں نہ آئے مگر دیگر آیات کی مدد اور نیز سیاق کلام سے یہ دشواری رفع ہو جاتی ہے۔

اس قدر گذارش کرنے کے بعد اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

مولانا نیازؔ نے تاریخی حیثیت سے اس مسئلہ پر جو روشنی ڈالی ہے اُس سے قطع نظر کرکے اُنکے قرآنی استدلالات کو لیتا ہوں، کیونکہ یہ زیادہ اہم ہیں۔ اگر قرآن شریف سے حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت ہو جائے، تو تاریخ کتنی معتبر کیوں نہ ہو، ناقابل التفات رہ جاتی ہے قرآن پاک میں حضرت عیسیٰؑ کا متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے، لیکن سورۂ مریم میں مفصل ذکر ہے۔ وہ آیتیں "واذکر فی الکتاب مریم" سے لیکر "کُن فیکون" تک ہیں۔ میں اُن میں سے ایک ایک آیت بناؤں گا کہ یہ تمام آیات کیا بحیثیت مجموعی اور کیا فرداً فرداً حضرت عیسیٰ کی ولادت بے پدری کو ظاہر کرتی ہیں۔

واذکر فی الکتاب مریم اذا نتبذت من اہلہا مکانا شرقیا فاتخذت من دونہم حجابا۔ ذکر کر کتاب میں مریم کا، جب وہ علیحدہ ہوئی اپنے لوگوں سے ایک مشرقی مکان میں، پھر کر لیا اُنکی طرف سے پردہ۔ مکان شرقی سے مراد مکان کا شرقی حصہ ہے، جہاں حضرت مریم غسل کے لیے اپنے گھر والوں سے الگ

ہوگئی تھیں۔ آیۂ فاتخذت من دونہم حجاباً سے یہی مفہوم ذہن میں تبادر ہوتا ہے، ورنہ پردہ کر لینے کی کچھ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ کل آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جب آپ نہانے کی غرض سے اپنے کنبہ والوں سے علیحدہ ہو کر مشرقی حصۂ مکان میں چلی گئیں اور آپ نے اپنے گھر والوں سے پردہ کر لیا، تو جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے، ایک فرشتہ انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں خواب میں۔ خواب کے معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ قرآن شریف کا اسلوب بیان ہے کہ جہاں کہیں خواب کا ذکر ہو وہاں لفظ منام وغیرہ ضرور بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت خلیل اللہ و ذبیح اللہ کے ذکر، یا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں لفظ منام موجود ہے۔

فارسلنا الیہا روحنا فتمثل لہا بشراً سویاً۔ بس ہم نے بھیجی اُسکی طرف اپنی روح جو سچ مچ انسان کی شکل میں اُنکو نظر آئی۔

قالت انی اعوذ بالرحمن منک ان کنت تقیاً۔ حضرت مریم تنہائی کے عالم میں اپنے اہل سے پس پردہ تھیں کہ اُنکو ایک اجنبی نظر آیا تو ڈر کر بولیں کہ اے شخص اگر تجھے کچھ خدا کا خوف ہے تو میں خدا کا واسطہ دیکر تجھ سے بچنا چاہتی ہوں۔ یعنی خدا کے لیے میری عصمت و عفت پر حملہ نہ کر دینا۔ ذرا غور کیجیے۔ تنہائی، گھر والوں سے پس پردہ، اور ایک اجنبی شخص کا نمودار ہونا۔ اور پھر حضرت مریمؑ کا یہ فرمانا کہ اگر تو پرہیزگار ہے تو خدا کا واسطہ دیکر میں بچنا چاہتی ہوں۔ یہ سب واقعات کسقدر باہم مناسب اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مریم غسل یا کسی ایسے ہی کام کے لیے گھر والوں سے الگ پس پردہ ہو گئی تھیں۔ کیا یہ خواب کا واقعہ معلوم ہوتا ہے؟

مولانا نیاز نے ان کنت تقیاً میں 'ان' کا ترجمہ "اگرچہ" سے کیا، جو صحیح نہیں ہے۔ عربی 'ان' کے معنی اگرچہ کے ہیں، نہ کہ 'ان' کے۔ 'اگرچہ' سے عبارت خبط ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے طباعت کی غلطی ہو۔

قال انما انا رسول ربک لاہب لک غلاماً زکیاً۔ اُس نے کہا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا تیرے پاس آیا ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔

مولانا نیاز ترجمہ فرماتے ہیں "خدا کا یہ پیام لیکر آ کہ پاکیزہ بیٹا دونگا"

یعنی 'لاہب' میں ضمیر متکلم خدا کے لیے ہے۔ حالانکہ سیاق کا قائل یعنی روح کے لیے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاعل حقیقی تو خدا ہی ہے، لیکن ہم کی فاعلیت رسول کے ساتھ اس لیے متعلق کی گئی ہے کہ درحقیقت لڑکا دینے وہی آیا تھا۔ جیسا کہ اُردو میں کہا جائے کہ میں

فلاں صاحب کا بھیجا ہوا ہوں کہ آپ کو پانچ روپے دوں۔ یعنی فلاں صاحب کے حکم سے میں پانچ روپے دینے آیا ہوں۔

قالت انی یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر ولم اک بغیا۔ حضرت مریم نے کہا کہ میرے بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہوں۔ کیا یہ خواب کا ذکر ہے؟ کوئی ایک قرینہ بھی خواب کے متعلق بتایا جا سکتا ہے؟

قال کذلک قال ربک ہو علی ہین ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منا وکان امرا مقضیا۔ روح نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ (ولادت بے پدر) میرے لیے آسان ہے اور (علاوہ بریں) میں لوگوں کے لیے (اس پیسر بے پدر کو اپنے قادر مطلق ہونے کی) نشانی اور اپنی طرف سے رحمت یعنے سرچشمہ ہدایت بناؤں گا اور یہ امر مقدر ہو چکا ہے، یعنی ہو کر رہے گا ٹل نہیں سکتا۔ یہاں لفظ کذلک قابل غور ہے۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہاں تجھے آدمی چھوئے گا اور باقاعدہ حمل کے بعد لڑکا پیدا ہوگا۔ مگر یہ معنی بوجوہ غلط ہیں:-

(۱) قال کذلک انی یکون لی ولد کا جواب ہے۔ یعنی حضرت مریم نے فرمایا کہ میرے لڑکا کیونکر پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی نے چھوا تک نہیں۔ اسکے جواب میں یہ کہنا کہ ایسا ہی ہوگا، ظاہر کرتا ہے کہ روح کی یہی مراد تھی کہ اللہ تعالیٰ بغیر مباشرت کے بیٹا دیگا۔ یہ معنی ذہن میں زیادہ تبادر ہوتے ہیں اور سیاق کلام کے مطابق ہیں بجائے اسکے کہ یہ معنی لینا کہ پہلے تجھے انسان چھوئے گا اور پھر لڑکا ہوگا۔

(۲) اسکے آگے کی آیت قال ربک ہو علی ہین سے صاف ظاہر ہے کہ کسی امر مہتم بالشان یا کسی ایسے امر کے لیے جو بظاہر محال معلوم ہوتا ہے، خداوند عالم نے یہ فرمایا کہ میرے لیے یہ آسان ہے حضرت مریم کی شادی کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا کہ میرے لیے یہ آسان ہے کہ پہلے تیری شادی کراؤں گا اور پھر تیرا شوہر تجھے چھوئے گا تب لڑکا پیدا ہوگا۔ سیاق کلام سے یہ مطلب یہاں چسپاں ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں یہ آیت بعینہا دو جگہ آئی ہے، ایک سورۂ آل عمران میں اور پھر سورۂ مریم میں۔ پہلے مقام پر کذلک کے بعد یخلق ما یشاء اذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون ہے اور دوسری جگہ ہو علی ہین ہے۔ دونوں جگہ معاف ظاہر ہو رہا ہے کہ خدا کا نشا صرف یہی ہے کہ بے باپ کا لڑکا پیدا کرنا میرے لیے آسان ہے۔ میں جسکو چاہتا ہوں پیدا کرتا ہوں، اور جب کسی امر کا حکم دیتا ہوں تو کہتا ہوں کہ ہو، وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی میری قدرت قواعد عادیہ کے ساتھ پابند نہیں۔ غرضکہ کذلک کے بعد یخلق ما یشاء الخ کا جملہ نشاء خداوندی کے ظاہر کرنے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں چھوڑتا

اگر کذٰلک سے مراد، شادی ہو کر مباشرت سے حمل قرار پانا ہوتا تو قدرتِ خداوندی پر اس قدر زور دینے کا مناسب موقع نہ ہوتا۔ علاوہ بریں کذٰلک حضرت زکریاؑ کے حق میں بھی ایسے ہی موقع پر مستعمل ہوا ہے۔ جب خداوند تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو لڑکے کی خوشخبری دی تو آپ نے فرمایا کہ اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا، حالانکہ میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا ہوں یہاں تک کہ اکڑ گیا (قال رب انّٰی یکون لی غلام وکانت امرأتی عاقراً وقد بلغتُ من الکبر عتیاً، قال کذٰلک قال ربک ہو علیّ ہین۔) یہاں مولانا نیاز کذٰلک کی کیا تاویل کریں گے؟ کیا بانجھ عورت کے لڑکا پیدا ہونا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ شوہر بوڑھا پھونس ہوگیا ہو، خرقِ عادت نہیں ہے؟ حضرت مریم کے قصہ میں تو مولانا نیاز کذٰلک کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ تجھے آدمی چھوئے گا اور تیرے بچہ پیدا ہوگا۔ کیا اسی تاویل کے مطابق مولانا یہاں یہ معنی نکالیں گے کہ بڑھاپا جوانی سے بدل جائے گا اور تب بچہ پیدا ہوگا؟ اگر یہ معنی نکالتے ہیں تو بھی خرقِ عادت لازم آتا ہے۔ غرضکہ قصۂ حضرت زکریا و قصۂ حضرت مریم کی باہمی مشابہت اس درجے کی ہے کہ لفظ کذٰلک کے معنی میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۳) ولنجعلہ آیۃً بھی قابلِ غور ہے۔ لفظ آیۃ، قرآن شریف میں آیاتِ قرآنیہ کے علاوہ عام طور پر نشانی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اور نشانی بھی قدرتِ خداوندی کی۔ قرآن شریف میں کئی موقعوں پر خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت کی باتیں بیان کرکے فرمایا کہ یہ عقلمندوں کے لیے کھلی نشانیاں ہیں۔ غرضکہ حضرت عیسیٰ آیۃ للناس اُسی وقت ہو سکتے تھے کہ اُنکی ولادت میں کوئی خاص اعجوبہ بات ہو، محض رسالت و نبوت آیۃً للناس نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ کسی اور نبی یا رسول کو قرآن میں آیۃً للناس نہیں کہا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات اعصا، اور ید بیضا وغیرہ عنایت ہوئے تو اُنکے لیے کہا گیا ولقد اٰتینا موسیٰ تسع آیات بیّنٰت یعنی ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں۔ غرضکہ ہُوَ علیّ ہیّن، ولنجعلہ آیۃً للناس، اور لفظ کذٰلک ان سب سے مجموعی طور پر اور نیز جدا جدا صرف یہی مطلب نکلتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ ولادتِ بے پدر میرے لیے آسان ہے۔ اگر مولانا نیاز والے معنی مراد ہوتے تو اللہ تعالیٰ حضرت مریم کے اس کہ میرے لڑکا کیونکر پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی نے چھوا تک نہیں، یوں فرماتے کہ ہوگا، یا اول ہم تمہاری شادی کرا دیں گے۔

(۴) اسکے علاوہ یہ آیت بھی پیشِ نظر رکھیے ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم، خلقہٗ من ترابٍ

ثم قال لہ کن فیکون - یعنی عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جسکو مٹی سے پیدا کیا۔ تم عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ خدا نے تو آدمؑ کو بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا تھا۔

(۵) قرآن شریف میں حضرت عیسیٰؑ کی کنیت ابن مریم بیان کی گئی ہے۔ اس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر اب آپ 'کذٰلک' کے معنوں پر غور کریں تو اسلوبِ بیان اور سیاق کلام سب سے عیسیٰ کا بے باپ ہونا واضح ہو جائے گا۔

فحملتہ - پس حمل ٹھہرا مریم کو۔ سیاق کلام سے بھی ظاہر ہے کہ اُسی وقت حضرت مریم حاملہ ہوگئیں۔ کیونکہ روح خداوندی، مریم کو لڑکا دینے آئی تھی۔ اگر معاً حمل قرار نہ پا جاتا تو 'لاَہَبَ لَکِ غلاماً زکیاً' غلط ٹھہرتا۔

مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ کلام مجید میں قصہ یا واقعہ بیان کرنے کا یہ اسلوب ہے کہ غیر ضروری کڑیاں چھوڑ کر خاص خاص باتوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے، تو بعض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جس طرح سے واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب مسلسل اور فوراً وقوع میں آئے۔ مولانا کا یہ خیال صحیح ہے، مگر اس کا اطلاق یہاں غلط ہے۔ کیونکہ سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ روح خداوند بشکل انسان متمثل ہو کر حضرت مریم کے پاس جبکہ وہ کسی ضرورت سے مکان شرقی میں اپنے گھر والوں سے پس پردہ تھیں، لڑکا دینے آئی۔ مریم نے کہا کہ میرے لڑکا کیونکر ہو سکتا ہے، مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ تو روح نے جواب دیا کہ ولادت بے پدر خدا کے لیے آسان ہے اور یہ ہو کر رہیگا۔ اس صورت میں 'فحملتہ' کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مریم معاً حاملہ ہوگئیں۔

فانتبذت بہ مکاناً قصیاً - فاجاءہا المخاض الی جذع النخلۃ، قالت لیتنی مت قبل ہذا و کنت نسیاً منسیاً - تو آپ دُور چلی گئیں - یہاں البتہ ضروری نہیں کہ حاملہ ہوتے ہی چلی گئیں۔ کیونکہ حمل کا احساس کچھ عرصہ کے بعد ہوتا ہے۔ جب اُنکو احساس ہوا تو آپ (بدنامی کے خیال سے) دُور چلی گئیں اور پھر دردِ زہ آپ کو ایک درختِ خُرما کے نیچے لے گیا۔ تو حضرت مریم فرمانے لگیں کہ کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور نسیاً منسیاً ہو جاتی۔

اول لفظ 'قصیاً' قابل لحاظ ہے۔ چونکہ بغیر مباشرت کے حمل رہ گیا تھا تو بدنامی کے خوف سے آپ دُور چلی گئیں تھیں۔ جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ پھر دردِ زہ حمل کے وقت حضرت مریم کا یہ فرمانا کہ کاش

ہیں مرجاتی اور نسیاً منسیاً ہو جاتی، قابلِ غور ہے۔ ذرا سیاق کلام کو پیش نظر رکھیے۔ بلا نکاح حمل ٹھہر جانا، حضرت مریم کا شرمندگی کی وجہ سے دُور چلا جانا، وضع حمل کا وقت آنا، اور پھر حضرت مریم کی یہ تمنا کس قدر فطرت انسانی کا سچا نقشہ ہے۔ اگر یہ حمل باقاعدہ شوہر کی مباشرت سے قرار پایا ہوتا تو پھر اس تمنا کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ دردِ زہ سے بیقرار ہو کر یہ خواہش کی ہو، تو میں عرض کروں گا کہ درد، دُکھ کے موقع پر انسان یہ تو کہتا ہے کہ کاش مجھے موت آجائے اور اس تکلیف سے نجات پاؤں، یا کاش موت پہلے سے آجاتی اور یہ مصیبت مجھے برداشت نہ کرنی پڑتی۔ لیکن یہ نہیں کہے گا کہ نسیاً منسیاً ہو جاتا۔ یہ تمنا انسان اُسی وقت کرے گا جب کہ نام بدچھوڑنے کا احتمال ہو تاکہ مرنے کے بعد اُسے کوئی یاد تک نہ کرے۔ حضرت مریم کا خیال تھا کہ اگر میں اس حالت میں مرجاؤں گی تو بھی نام بدباقی رہے گا، لوگ میرا ذکر کریں گے اور میرے جنم میں تھوکیں گے۔ اس لیے آپ نے صرف مرنے ہی کی تمنا نہیں کی بلکہ نسیاً منسیاً ہونا بھی چاہا۔ تاکہ نہ کوئی یاد رکھے اور نہ بُرا بھلا کہے۔

فنادٰھا من تحتھا الا تحزنی قد جعل ربکِ تحتک سریًا۔ وھزی الیک بجذع النخلۃ تساقط علیک رطبًا جنیًا۔ فکلی واشربی وقری عینا، فاما ترین من البشر احدًا فقولی انی نذرت للرحمٰن صومًا فلن اکلم الیوم انسیًا۔ اُسکو درخت کے نیچے سے آواز دی کہ رنج نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے، تو درخت خرما کو ہلا، وہ تجھ پر تر و تازہ پھل گرائے گا، اُسے کھا اور پانی پی اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کر، پس اگر تو آدمی کو دیکھے تو کہہ دے (اشارہ سے) کہ میں نے خدا کے لیے ایک روزہ رکھا ہے اور میں آج کسی سے بات نہ کروں گی۔

لفظ تحزنی، قابل غور ہے چونکہ آپ کو اس حمل کا بیحد رنج تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رنج نہ کر، یعنی بدنامی کا خیال نہ کر۔ دردِ زہ کی بیقراری کے لیے 'لا تحزنی' نہیں کہا جا سکتا۔ اسکے لیے تو یہ کہیں گے کہ ذرا تحمل و ضبط سے کام لے۔ خدا و ند تعالیٰ نے حضرت مریم کی 'لا تحزنی' فرما کر نہ صرف ہمت بندھا دی بلکہ ایسے سامان پیدا کر دیے جسکی وجہ سے قدرۃً حضرت مریم کی تسکین ہو گئی اور وہ سمجھ گئیں کہ یہ سب کچھ منجانب اللہ ہوا۔ درخت کے نیچے سے آواز کا آنا، پاؤں کے نیچے سے چشمہ کا جاری ہو جانا، اور خشک درخت خرما کا سبز ہو کر تازہ کھجوریں گرانا، اور حضرت

اعتراض کا یہ جواب

بتلا دینا کہ اگر تم سے کوئی کچھ کہے تو خود خاموش رہنا اور بچے کی طرف

یہ تمام واقعات

حضرت مریم کی تسلی و تشفی کے لیے کافی نہ تھے۔

فائدہ بہ تو مہا تحملہ۔ منجانب اللہ حضرت مریم کی اس قدر تسلی و تسلی ہو جانے کے بعد وہ اپنے

لڑکے کو گود میں لیکر اپنے لوگوں کے پاس آئیں

یہاں لفظ 'تحملہ' خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ حضرت مریم جب عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لائیں تو وہ جوان ہو چلے تھے بچے نہ تھے۔ اور اس لیے 'تحملہ' کے معنی اُنکے نزدیک یہ ہیں کہ حضرت مریم اُنکو سواری میں بٹھا کر لائیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ لغۃً 'تحملہ' کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ذرا غور تو کیجیے کہ یہاں کون سے معنے مراد ہونگے 'گود میں اُٹھا کر' یا 'سواری میں بٹھا کر'؟ اگر دوسرے معنے مراد ہیں، تو اسکا ظاہر کرنا فضول تھا۔ فاتت بہ قومہا، کہہ دینا کافی تھا۔ 'تحملہ' قصہ کی کون سی اہم کڑی ہے جسکو خداوند تعالیٰ نے بیان کرنا ضروری سمجھا؟ یہ کہنا ایک بیکار سی بات ہے کہ ماں اپنے بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائی۔ خدا کا کلام ایسے حشو و زوائد اور فضول الفاظ سے پاک ہے۔ پھر یہ سوچیے کہ ماں، بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائی اور خود پیدل آئی۔ بیٹے نے کیونکر گوارا کیا کہ ماں پیدل آئے۔ اگر دونو سواری پر آئے تو 'تحملہ' کی کیا تخصیص۔ غرضکہ مولانا نیاز نے جو معنی بتائے ہیں وہ بالکل غلط ہیں اور اسلوب قرآن کے شایان شان نہیں۔ اسکے مقابلہ میں 'تحملہ' کے یہ معنی کہ وہ اُسکو گود میں اُٹھا کر لائیں، کس قدر مناسب حال ہے۔ یعنی جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اُنکی ہر طرح تسلی و تشفی کر دی تو وہ گود میں اُٹھا کر قوم کے پاس لے گئیں۔

قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریاً۔ یا اُختَ ہارون ما کان ابوک امرأ سوءٍ و ما کانت اُمک بغیاً۔

لوگوں نے جو حضرت مریم کی گود میں بچہ دیکھا تو بولے کہ اے مریم یہ کیا شے عجیب لائی؟ یعنی نکاح بغیر یہ بچہ کیسا؟ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ خراب آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔

یہاں ایک ایک لفظ قابل غور ہے۔ ذرا دیکھیے کہ جب خاندان کی لڑکی بے باپ کا بچہ لیکر آئے گی تو قوم کس قدر مشتعل ہوگی؟ اور کیا کیا کچھ نہ کہے گی؟ ان خیالات و جذبات کو کس خوبی کے ساتھ ان مختصر سے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے؟ قوم کہتی ہے کہ تو نے یہ کیا غضب کیا، نہ تیرا باپ بدچلن تھا نہ تیری ماں بدکار تھی، یہ بیٹا (نعوذ باللہ) حرام کا کہاں سے لے آئی؟

مولانا نے ان آیات کی اہمیت مطلقاً کچھ نہ بیان کی۔ اگر حضرت عیسیٰ، بقول مولانا نیاز، باپ سے پیدا ہوئے تھے اور اُس وقت یعنی جب مریم اُنکو قوم کے پاس لائیں، جوان اور پیغمبر تھے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مریم سے ان سخت الفاظ میں مواخذہ کیوں کیا گیا۔ اگر اُنکو حضرت عیسیٰ کے مدعی نبوت ہونے کا مواخذہ اُن کی ماں سے کرنا تھا تو یہ کہتے کہ اے مریم تیرے ماں باپ بڑے ایماندار اور مذہب کے پابند تھے، یہ تیرا بیٹا کیونکر کافر ہو کر نبوت کا دعوے کرنے لگا۔ غرضکہ مواخذہ کے

الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو بحالت شیر خوارگی لے گئیں تو قوم نے ولادتِ بے پدر کا مواخذہ کیا۔

فاشارت الیہ، قالوا کیف نکلم من کان فی المہد صبیاً۔ حضرت مریم نے قوم کے مواخذہ کے جواب میں سابقہ تلقین الٰہی کے مطابق حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ کیا، تو اُن لوگوں نے کہا کہ گہوارے کے بچے سے کیونکر گفتگو کریں؟

حضرت مریم نے زبان سے کچھ جواب نہیں دیا، کیونکہ آپ نے حسب تلقین الٰہی بات نہ کرنے کا روزہ رکھ لیا تھا۔ البتہ اشارہ کے ذریعہ سے قوم کو سمجھا دیا کہ میرا تو روزہ ہے: بول سکوں گی، خود اس لڑکے سے دریافت کر لو۔ تو وہ متعجب ہو کر بولے کہ ہم بچہ سے کیا گفتگو کریں۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے تو حضرت مریم کو صرف اتنا بتلایا گیا تھا کہ اگر کوئی آدمی تجھ سے پوچھے تو تو یکہ دینا کہ آج میرا روزہ ہے، کسی سے بات نہ کروں گی، حضرت مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیسے کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہ قول مولانا نیاز، قرآن شریف کا اسلوب بیان یہ ہے کہ قصہ کی درمیانی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ دی جاتی ہیں، تاکہ وہ خود بخود ذہن میں آجائیں۔ اس کلیہ کو یہاں پر استعمال کیجیے۔ خدا نے پہلی کڑی تو یہ بیان کر دی کہ درخت خرما کے نیچے خدا نے حضرت مریم کی ہر طرح تسلی و دلجوئی کر دی اچھی طرح بتا دیا کہ لوگوں سے کہدینا کہ میرا تو روزہ ہے میں کسی سے بات نہ کرونگی۔ آخری کڑی یہ بتا دی کہ مواخذہ پر حضرت مریم نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کر دیا کہ میری طرف سے یہ جواب لگا میرا تو روزہ ہے تو یہ بات خود بخود ذہن میں آجاتی ہے کہ خدا نے صرف اتنا ہی نہیں بتایا تھا کہ کہدینا میرا تو روزہ ہے۔ کیونکہ بات کرنیکا تو روزہ ہے، اور پھر خود ہی کہدینا کہ آج روزہ ہے، اجتماع ضدین ہے۔ خدا نے روزہ کی حالت میں اشارہ کے ذریعہ سے ما فی الضمیر ظاہر کر دینے کی تدبیر بھی ضرور بتا دی ہوگی۔ یعنی کہدیا گیا ہوگا کہ تم تو خاموش ہو جانا اور بچہ کی طرف اشارہ کر دینا، لوگ مطلب سمجھ جائیں گے۔

کیف نکلم من کان فی المہد صبیاً۔ خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم بچے سے کیا پوچھیں، تجھ سے پوچھتے ہیں تو بتا۔ دیکھیے یہ معنی کس قدر مناسب حال ہیں۔ شروع سے آخر تک ایک ہی تلازمہ ہے اور ایک ہی نہج کا سیاق کلام، رتی بھر بھی فرق نہیں۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے کا [illegible] ات ہوئی، ہر شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، وہ لحاظ زمانہ گذشتہ، گہوارہ کا [illegible] معنی کر تو خود حضرت مریم گہوارے کی بچی تھیں۔ یہاں لفظ کان کی وجہ سے شبہ [illegible] کا صیغہ ہے جسکے معنی 'تھا' کے ہیں۔ یعنی من کان فی المہد صبیاً کے یہ معنی ہوئے کہ جو لڑکا گہوارہ میں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کان 'ہے' کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کان اللہ علیما حکیما جسکے معنی

یہ نہیں ہیں کہ اللہ علیم وحکیم تھا، بلکہ یہ ہیں کہ اللہ علیم وحکیم ہے۔ 'کان' کا یہ استعمال عام ہے۔

علاوہ بریں یہ قرآن کا کمال ہے کہ اکثر ایک آیت دوسری آیت کی تشریح وتفسیر کردیتی ہے سورۂ آل عمران کی ایک آیت ہے حضرت عیسیٰ کے بارے میں ویکلم الناس فی المھد وکھلا یعنے وہ آدمیوں سے گفتگو کرتے تھے شیر خواری کے زمانہ میں بھی اور بڑے ہو کر بھی۔ اس آیت نے بالکل صاف کردیا کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو شیر خواری میں قوم کے پاس لے گئی تھیں۔ کیونکہ آگے چل کر حضرت عیسےٰ کے شیر خواری میں تکلم کرنے کا ذکر آیا ہے۔

قال انی عبداللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا این ماکنت واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیا وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا۔ حضرت عیسیٰ فوراً بول اُٹھے اور کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور مجھ پر کتاب نازل کرے گا اور مجھے نبی بنائے گا اور بنایا ہے اُس نے مجھے برکت والا، جہاں کہیں میں رہوں، اور مجھ کو ہدایت کی ہے نماز وروزہ کی جب تک میں زندہ رہوں اور بنایا ہے مجھے نیکی کرنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور نہیں بنایا مجھ کو سرکش بدبخت۔

یہاں آتانی الکتاب و جعلنی نبیا قابل لحاظ ہے۔ اگرچہ یہ دونوں ماضی کے صیغے ہیں مگر مستقبل کے معنی میں ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو ضرور کتاب دے گا اور نبی بنائے گا۔ یقین ووثوق کے موقعہ پر عام طور پر ماضی کا صیغہ مستقبل کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اُردو میں بھی تو کہتے ہیں "لو چلدیے" حالانکہ ابھی چلے نہیں، چلنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور پھر برا بوالدتی قابل غور ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ کا باپ ہوتا تو کیا اُنکے ساتھ نیکی کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ کیا قرآن شریف میں کسی اور موقع پر والدین کے درمیان تفریق کی گئی ہے۔ جہاں کہیں ماں باپ کی تعظیم وتکریم کا ذکر آیا ہے کیا وہاں لفظ والدین نہیں آیا ہے۔ اسی سورۂ مریم میں حضرت مریم سے پہلے حضرت یحییٰؑ کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وبرا بوالدیہ چونکہ یحییٰؑ ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہوئے تھے اس لیے برا بوالدیہ فرمایا گیا اور حضرت عیسیٰ بے باپ پیدا ہوئے تھے اس لیے برا بوالدتی صادق آیا۔

سورۂ مریم کی آیات کے مطالب آپ نے اول سے آخر تک خوب پڑھ لیے۔ اب ذرا اسلوب بیان، سیاق کلام، طرز عبارت، انتخاب الفاظ، تسلسل مضمون، سب باتوں پر ازراہ انصاف و بے تعصبی نظر غائر ڈال کر دیکھیے اور جو کچھ ہر آیت کے متعلق عرض کیا گیا ہے اُسکو غور وخوض سے پڑھ کر سوچیے کہ آیا ان آیات سے حضرت عیسیٰ کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

اگر محض اس خیال کی بنا پر کہ انسان کا بے پدر پیدا ہونا خلاف قانون قدرت اور اس لیے لغو و محال ہے، آپ کا فیصلہ برعکس ہو تو پھر یوں سوچیے کہ کیا آپ ولادت بے پدر کے واقعہ کو ایک حقیقی واقعہ سمجھنا پسند فرمائیں گے یا کلام اللہ کے طرز عبارت کو بجائے ہدیٰ للمتقین ہونے کے غیر واضح، مذبذب بین المتین اور گمراہ کن سمجھنا گوارا کریں گے۔ کیونکہ ان آیات سے اگر ولادت بے پدر کی تردید پائی جاتی ہے، تو کم از کم ان آیات قرآنیہ کی بابت (نعوذ باللہ) یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ خود خداوند تعالیٰ کو حق کا چھپانا اور دنیا کو دھوکا دینا مقصود تھا کہ اول سے آخر تک ایسا سیاق کلام اختیار کیا کہ لفظ لفظ سے ولادت بے پدر کی تائید ہوتی ہے، مگر اصل منشا اُسکے خلاف۔ یہ اشئ عجیب۔ حضرت عیسیٰ کو جو ابن اللہ کہا جاتا تھا اُسکی وجہ یہ تھی کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اس عقیدہ کی بارہا تردید فرمائی۔ لیکن کس طرح؟ مذبذب بین المتین طریقہ سے۔ کیا خدا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اے لوگو جسے تم ابن اللہ خیال کرتے ہو وہ تو باقاعدہ اپنے انسانی باپ کے ماء مہین سے پیدا ہوا ہے۔ علاوہ بریں ان دو آیتوں پر غور کیجیے:

۱۔ المسیح ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القٰھا الی مریم وروح "

۲۔ والتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا وجعلنٰھا وابنھا آیۃ للعالمین

دیکھیے ان دونوں آیتوں کے ایک ایک لفظ سے اُسی حقیقت کی جو سورۂ مریم کی آیات میں بیان ہوئی ہے کس قدر تائید ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مریم میں خدا نے اپنی روح پھونکدی تو حضرت عیسیٰ بے باپ کے پیدا ہوگئے۔ اور اس لیے یہ دونوں ماں بیٹے دنیا کے لیے نشانی بنائے گئے کہ انکو دیکھ کر خدا کے قادر مطلق ہونے پر ایمان لائیں۔ حضرت عیسیٰ کو ابن مریم فرمایا جانا بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ مولانا نیاز کا یہ فرمانا کہ نفخ روح حضرت مریم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا ہے، صحیح ہے۔ لیکن ہر انسان کی ولادت کا واقعہ ایسا تو نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن شریف کی کوئی آیت اس عقیدے کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔ مولانا نیاز نے بہت کچھ زور لگا کر ایک آیت تو وہ پیش کی جس سے حضرت عیسیٰ کا حضرت [illegible] ہونا پایا جاتا ہے۔ جناب نیاز فرماتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہ مانا جا [illegible] ابراہیمؑ کی آل میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں؟ اسکے جواب میں عرض ہے کہ کیا ماں [illegible] آل ابراہیم میں نہیں آسکتے؟ قرآن میں حضرت مریم کو بنت عمران کہا گیا ہے۔ ان کا آل عمران میں سے ہونا مولانا نیاز

تسلیم کرتے ہیں۔ غرضکہ جب حضرت مریم آل عمران سے ہیں تو آل ابراہیم سے بھی ہوئیں، کیونکہ آلِ عمران آل ابراہیم سے ہیں دو دلیل سے :-

دلیل اوّل - جس آیۃ قرآنی سے مولانا نیاز حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی آل میں ہونا قرار دیتے ہیں اُسی سے حضرت موسیٰ و ہارون کا بھی آل ابراہیم میں داخل ہونا پایا جاتا ہے : اور یہ دونوں بھائی، عمران کی اولاد سے تھے۔

دلیل دوم - دوسری آیۃ قرآنی ہے : ان اللہ اصطفٰی آدم و نوحا و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین - اس آیۃ میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ آل عمران آل ابراہیم ہیں، اور آل ابراہیم آل نوح میں اور آل نوح آل آدم میں مدغم ہیں۔

مولانا نے حضرت عیسیٰ کی ولادت بے پدر کے خلاف دوسری آیت یہ پیش کی ہے : والتی احصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا وجعلناہا وابنہا آیۃ للعالمین - آپ کا استدلال ہے کہ محصنہ زنِ شوہردار کو کہتے ہیں - اور حضرت مریم کے لیے 'احصنت' کا لفظ استعمال ہوا ہے - لہذا وہ زنِ شوہردار تھیں -

اس کا جواب یہ ہے کہ 'محصنہ' صرف زن شوہردار ہی کو نہیں کہتے، بلکہ عفیفہ غیر منکوحہ عورت کو بھی کہتے ہیں - چنانچہ قرآن شریف کے پارۂ نجم کے پہلے صفحہ میں یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے - والمحصنٰت من النساء سے تو شوہردار عورتیں مراد ہیں، لیکن آگے چل کر آیت ہے : ومن لم یستطع منکم طولاً ان ینکح المحصنٰت الخ میں محصنٰت سے مراد یقینی طور پر آزاد عورتیں ہیں۔ اگر شوہردار عورتوں سے مراد لی جائے گی تو اُن سے نکاح کیونکر ہو سکتا ہے ؟ علاوہ بریں لفظ 'محصنہ' اسم مفعول کا صیغہ ہے - اور یہاں احصنت فرجہا میں حضرت مریم فاعل ہیں۔ یعنی اپنے شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی - جس سے مراد اُنکا عفیفہ ہونا ہے -

مولانا نے صرف دو آیتیں اپنے خیال کی تائید میں پیش کیں - دونوں کا تشفی بخش جواب ہو گیا اب رہی 'کلمہ' کی بحث - یہ مولانا کا محض ادعا ہے کہ قرآن شریف میں کسی جگہ اسکے معنی لفظ یا کلام کے نہیں لیے گئے - مولانا نے جس قدر آیات پیش کی ہیں اُن سب میں لفظ 'کلمہ' کے معنی لفظ یا کلام ہی کے ہیں -

ان اللہ یبشرک بیحییٰ مصدقا بکلمۃ من اللہ - میں کلمۃ اللہ سے مراد حضرت روح اللہ ہیں - چنانچہ دوسری آیت اسکی تشریح و تائید کرتی ہے - المسیح ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ

القٰھا الیٰ مریم و روح منہ ۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ بھی کہا ہے اور روح اللہ بھی ۔ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ کی تصدیق فرمائی تھی لہذا انکو مصدقاً بکلمۃ من اللہ کہا گیا۔

لا تبدیل لکلمات اللہ سے اللہ کی باتیں مراد ہیں ، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کہ دیتا ہے یا کہہ چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا ۔

قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی میں "مداد" کا لفظ صاف بتلا رہا ہے کہ کلمات کے کیا معنی ہیں ۔

غرضکہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں جس قدر آیات نازل ہوئی ہیں اُن سب کو ایک جگہ جمع کر کے مقابلۃً و موازنۃً غور کیا جائے اور باہمی تناسب اور سیاق کلام کا پورا لحاظ رکھا جائے تو ایک ایک لفظ سے حضرت عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے کی تائید ہوگی ۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) خود خدا کو اخفائے حقیقت مقصود تھا ۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم ۔

زبید احمد

جب ذرا قیدِ تعیّن سے نظر آزاد کی
ہٹ کے اس دُنیا سے اِک دُنیا نئی آباد کی

کیا ہَوا بدلی ہوئی ہے گلشنِ ایجاد کی
بھول جانے کو وہ تیا تے ہیں صورت یاد کی

اے اجل اے آرزو میرے دلِ ناشاد کی
دل کی ہر دھڑکن کو خواہش ہے تری امداد کی

کچھ عجب رسمیں ہیں عشقِ خانماں برباد کی
داد لینی چاہتے ہیں مجھ سے وہ بیداد کی

حشر تک اب مجھ کو شاید ہو نہ یہ موقع نصیب
اے اجل تھم جا کہ صورت دیکھ لوں جلاد کی

وحشتِ دل اک ذرا بڑھنے تو دے اے چارہ گر
رنگ لیتا خونِ دل ہی میں قبا فصاد کی

حسن کی بیباکیوں نے آج وہ بھی کاٹ دی
داستانِ غم میں اک سرخی جو تھی فریاد کی

میری حالت دیکھ کر کچھ رحم اُن کو آگیا
موت سے حدّیں ملا دیں نیمہ بے سیاد کی

ناز استغنا پہ اتنا اے وفا ناآشنا
ہر جفا ممنونِ منت ہے مری امداد کی

زندگی کہتے ہیں غم کو غم ہے اصل زندگی
تیری شرح اس روداد کی

اے وفا ناکام دل میں تیری باتوں کے نثار
پھر ست برباد کی

کس قدر مختار خوش ہے وہ اسیر
قید سے حالانکہ پابندی ہے خود صیاد کی

مختار بدایونی

۱۷

فریبِ خیال

دس سال کا عرصہ گذرا جب میں جہاز پر ملازم تھا، میرے ہمراہ شاہد بھی اُسی جہاز پر ایک کیڈٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا، ہم دونوں لطیف الخیال اور نرم دل تھے، سمندر کی روح پرور اور نشاط افزا ہوائیں ہمارے قلوب میں زمانِ سابق کی یاد پیدا کرتی تھیں، پانی کی بھاری اونچی لہریں ہمارے ایام شباب کے اُس دریائے محبت کی مثال تھیں جو ہمارے سینوں میں کبھی اُبلا تھا۔ کبھی کبھی راتوں کو جب چاند اپنی روپہلی کرنوں سمیت سمندر کی سطح پر اپنی ننھی کشتی ہمارے جہاز کے ساتھ ساتھ کھیتا تھا اور تارے چُپ چاپ ہمارے جہاز کے ساتھ بہتے تھے اور ٹھنڈی، کسی دُور کی سرزمین سے آنے والی بھینی ہَوا ہمارے دل کے پردوں کو جہاز کے بادبانوں کی طرح پھیلاتی اور شمٹینی تھی ہم اچھی اچھی باتیں کرکے راتیں ختم کرتے، رات کے اُس حصہ میں جب تمام مسافر غافل اور خاموش ہو جاتے اور پانی کے متصل تھپیڑوں یا انجن کی مسلسل سنسناہٹ کے سوا کوئی آواز فضا میں پیدا نہ ہوتی۔ ہمارے دھیمے لہجے اس سکوت کے پردے میں ایک سوراخ کرتے اور جیسے اس سوراخ سے ہَوا ایک دھیمی اور تیز سیٹی بجاتی ہوئی نکل جائے اسی طرح ہماری باتوں کی آواز ایک ہلکا راگ پیدا کرتی ہوئی فضا میں پھیل جاتی تھی۔

اسی طرح کی ایک رات تھی، ہمیں کام سے فرصت مل چکی تھی اور باتیں کرتے کرتے دو بج گئے تھے۔ مختلف موضوع پر ہم گفتگو کر چکے تھے مگر ہمارے دماغ تھکن سے خالی تھے اور آنکھوں میں ابھی نیند نہ آئی تھی، شاہد اپنی کہنی کے بل جہاز کے بالائی حصہ میں فرش پر میرے پاس پڑا تھا، میں لوہے کی سلاخوں سے لگا اُفق پر نظر جمائے تھا جو سکوت اور سکون کی سرزمین معلوم ہوتی تھی۔

"جس طرح سال میں مختلف موسم ہوتے ہیں اسی طرح حیاتِ معاشقہ میں بھی مختلف دَور ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ محبت کبھی گھٹتی ہے کبھی بڑھتی ہے، کبھی ایک نازک تار سے لٹکی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کبھی جسم و جان، خیالات و معتقدات، پوری دنیا پر حاوی ہو جانا چاہتی ہے" شاہد نے ادا کیا۔

"سال میں بہار و خزاں، گرمی و سردی وغیرہ کے موسم ہوتے ہیں" میں نے کہا "عشق کی زندگی میں بھی مایوسی و کامرانی، شبہہ و یقین، بیوفائی اور وفاداری کے دور ہوتے ہیں، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ کامرانی و خوش بختی ہی محبت کا انجام ہے لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ عقیدۂ باطل شروع ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مایوسی و بیدلی محبت کا نتیجہ کار ہے، ایسی حالت میں تمام پچھلے رنگین فسانے کمزور و مضمحل ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں، ان میں یقین کا کوئی شائبہ نہیں رہتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم محبت ہی کی نہیں دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے"۔

"ہاں"، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے ہی احساسِ قلب یا تصورات ذہنی کا نتیجہ ہے" شاہد نے کہا "کسی حاضر وقت میں ہمارے دل و دماغ پر ایسی مایوسی چھا جاتی ہے کہ واقعات کے تمام رخ بدلے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں، واقعات میں بذات خود تبدیلی نہیں ہوتی، وہ اپنی جگہ پر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ پہلے تھے، یا اگر تبدیلی ہوتی ہے تو کم ہوتی ہے، ہم خود کسی حاضر اثر کے ماتحت اس قدر بے دل ہو جاتے ہیں کہ تمام دنیا ہمیں بدلی ہوئی نظر آتی ہے، اُس اثر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس سے ہمارا ذہن متزلزل ہوتا ہے، اسے واضح کرنے کے لیے میں اپنی جوانی کی ایک کہانی کہوں"۔

اُس نے کہنا شروع کیا:

"یہ ۱۹۰۰ء کا قصہ ہے، اُسوقت میں بائیس برس کا تھا،

جس لڑکی سے مجھے محبت تھی اُس سے میں مایوس ہو چکا تھا، میرے والدین ایک سے زائد مرتبہ صاف الفاظ میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ کبھی اُسکے ساتھ میری مناکحت قائم نہ کریں گے، اس فیصلہ کا میرا دل متحمل نہ ہو سکتا تھا، میری محبت وہ محبت نہ تھی جو آئے دن بدلی جاتی ہے، یہ وہ محبت تھی جس کا اندازہ کم ہو سکتا ہے، وہ محبت جو دنیا میں تنہا رہنا چاہتی ہے، جو تمام دنیا پر قدرت حاصل کرنا چاہتی ہے، میرے والدین میرے جنون کے اس ہمہ گیری سے ناواقف تھے، وہ سمجھتے تھے کہ میری محبت صرف اُن اشتعال آمیز جذبات پر مبنی ہے جو نوجوانوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، وہ کسی دوسری جگہ میری شادی کرنا چاہتے تھے کہ شادی میرے مرض کا علاج ہے، اور شادی میرے دل سے میری عزیز نغمہ وکامراں بنانے میں کامیاب ہوگی۔

محبت ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، محبوب کے عیوب بھی ہمیں محاسن نظر آتے ہیں،

لیکن نجمہ اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی، یہ نہیں کہ محبت نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اسلیے نجمہ کے عیوب بھی میری نظر میں محاسن تھے بلکہ نجمہ فی الواقع اسقدر حسین، اسقدر مکمل و پاکباز تھی کہ میں اُسپر مٹتا تھا، نجمہ ایسی مکمل ـــــ ہر صحیح معنی میں مکمل ـــــ لڑکی تھی کہ اس سے زیادہ مکمل لڑکی کا تخیل دشوار ہے اور بس، اسی وجہ سے وہ میری رگ رگ میں، جوڑ جوڑ میں ایک زہر کی طرح چھٹک گئی تھی، پیوست ہوگئی تھی، اُس سے رہائی ناممکن تھی، ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلے تھے میں صاف صاف کیوں نہ کہوں، وہ میری چچی کی لڑکی تھی، بچپن سے ایک گھر میں رہنا، ایک ساتھ پڑھنا، کھیلنا، گھومنا، پھرنا، سب ساتھ ساتھ ہوتا تھا، ابتدا ہی سے وہ ایک سنجیدہ قسم کی خاموش لڑکی تھی، وہ تمام گھر میں سب سے زیادہ مجھے چاہتی تھی، اپنی پریشانیاں، اپنی ذرا ذرا سی راز کی باتیں سُنا کر مجھ سے اپنی پریشانیوں کا علاج پوچھتی تھی، میں بھی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا، اکثر تنہائی میں ہم دونوں گھنٹوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے، کبھی مجھے اُس پر پیار آتا اور میں اُسکی پیشانی کے بوسے لیتا، ..... آہ! کسے معلوم تھا کہ بچپن کا یہ سادہ کھیل جوانی میں ہمارے دلوں پر نقش محبت بن جائے گا جس کا مٹانا اس قدر آسان نہ ہوگا جتنا میرے والدین خیال کرتے تھے۔

میرے والدین چاہتے تھے کہ میں وہاں کا آنا جانا بھی ترک کردوں، اور آنا جانا ہی کیا وہاں کے تذکرے تک کبھی بھولے سے گھر میں نہ ہوتے، اور اگر اُن کا ذکر کوئی کرتا تو وہ بہت بڑا مجرم سمجھا جاتا، اُسے گھر بھر کی باتیں سننا ہوتیں، میری نجمہ اپنے والدین کے ساتھ اشرف آباد چلی گئی زمانہ کے ہاتھوں ہم جدا ہوگئے، زمانہ کو کس کی پروا ہے، ہمارے درمیان سیکڑوں میلوں کا فاصلہ تھا، ہم عرصہ تک ایک دوسرے سے نہ مل پاتے اور اگر چار پانچ سال بعد کبھی وہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوتا، تو اب نجمہ کو میرے سامنے نہ لایا جاتا، آہ، فریب ہونے پر بھی اس قدر دوری، ان موانع کے باوجود ہم دونوں کی آگ بھڑکتی رہی رہی اور ہم ایک دوسرے کو دیوانگی سے چاہتے رہے۔

میں سخت مصیبت میں تھا، میرے والدین اپنی ضد پر قائم تھے، اُن کا فیصلہ مایوس کن تھا، وہ میرے لیے پیام اجل تھا، میں ہمیشہ اپنا وقت علمی اور تفریحی مشاغل میں گذارتا تھا، مختلف قسم کے کھیلوں، شکار اور گھوڑے کی سواری میں شوق سے حصہ لیتا تھا، مگر اب مجھے ہر چیز سے نفرت ہوگئی تھی، مجھے تنہائی پسند تھی، تنہائی میں اپنی کتاب اپنے پہلو میں، سینے پر، یا آنکھوں کے سامنے رکھتا، کتاب ہی میری سہیلی تھی، کتاب میں میں محبت کے خواب دیکھتا، تمام علائق سے میں کنارہ کش ہوچکا تھا اندر جانا بھی میں نے کم کردیا، باہر اپنے کمرہ میں ہفتوں پڑا رہتا، مجھے اپنے والدین، اپنی بہنوں اپنے

بھائیوں سے نفرت ہوگئی تھی، سب مجھے دشمن معلوم ہوتے تھے، ان میں سے کوئی میری خوشی کا خواہاں نہ تھا، سب مجھے تکلیف پہونچانا چاہتے تھے، کبھی کبھی کھانا کھانے اندر چلا جاتا اور بس، گھر سے اسی قدر تعلق رہ گیا تھا، مجھے بھوک بھی کم لگتی، کبھی میں تین تین وقت کھانا نہ کھاتا، اور یہ تو کیسے کہوں کہ مجھے تکلیف نہ ہوتی لیکن ہاں اس فاقہ کشی سے مجھے روحانی تسکین ہوتی، مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں محبت کے لیے بڑی قربانی کر رہا ہوں، میں ہر وقت مغموم رہتا، میرے دل میں ایک عجیب افسردگی تھی جو میرے ماحول کو بھی متاثر کرتی تھی، دنیا مجھے تاریک نظر آتی تھی، میرے رفیق مجھے اپنے دشمن معلوم ہوتے تھے، گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا، وحشت و پریشانی ہر طرف چھائی ہوئی معلوم ہوتی، میں نے گفتگو بھی کم کر دی، گھر میں اکثر میرے خوش کرنے کو شادی کے تذکرے ہوتے مگر مجھے وہاں کی ایک بات بھی بے عیب نہ معلوم ہوتی، جو بات مجھے خوش کرنے کو کی جاتی میں اُسے ایک سخت ترین دشمنی کی حرکت سمجھتا، اس ہر وقت کی کوفت نے، ہر وقت کی خاموشی، گرانی اور بیدلی نے مجھے مایوس کر دیا، جسمانی سختیوں نے مجھے مضمحل کر دیا، گر مجھے اپنی روح میں بالیدگی محسوس ہوتی، جب میں غم کی سختی سے بیزار ہو کر ایک آنسو بھی بہاتا مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں نے کوئی بڑا کارِ ثواب کیا ہے، میرا دل اس قدر نازک، اس قدر رقیق ہو گیا تھا کہ بات بات پر جی اُمنڈنے لگتا، جیسے سینہ پر ایک گٹھا ہو جو نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے اور اگر کبھی برستی بھی ہے تو صرف ایک یا دو بوند، جو میرے سینہ کے وزن کو، بوجھ کو، میری کلفت و مایوسی کو کچھ بڑھا ہی دیتی ہے، مجھے اس میں بھی ایک اطمینان، ایک سکون محسوس ہوتا، مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں ہلکا ہو گیا ہوں، گویا قید جسم سے آزاد ہو کر میں ہوا ہو گیا ہوں، گویا میں اوپر اُٹھتا ہوں، اُڑتا ہوں، ایک صاف شفاف بادل، ایک مجسمۂ نور و اخلاص بنکر آسمانی بلندیوں پر جھولتا ہوں۔

میرے دل پر ایک بار تھا، جب تک میں گھر پر رہتا زندگی مجھے ایک بارِ عظیم معلوم ہوتی، اس مسلسل و متصل کوفت سے تنگ آکر کبھی کبھی میں اشرف آباد ہو آتا، جہاں میری منجھلی بہن رہتی تھی، جب تک وہاں رہتا، زندگی ایک مسلسل قہقہہ معلوم ہوتی، وہاں پہونچ کر حیات کا مصرف سمجھ میں آتا، اُن مختصر ایامِ قیام کو جو وہاں گذرتے میں حاصل زندگی سمجھتا، اسی اُمید پر جیتا تھا کہ کبھی کبھی اس طرح منجھلی کو دیکھ سکوں گا۔

ایک روز کا واقعہ سناؤں جو دراصل اس تمام گفتگو کا ایک شام کو میرا رشتہ کا ایک بھائی مرتضیٰ مجھ سے ملنے آیا، یہ اشرف آباد سے آیا ہے نے اُس سے

ایک غیر متعلق شخص کے طور پر نجمہ اور اُسکے گھر کی خیریت پوچھی، مرتضیٰ نے جب یہ کہا کہ سب نے مجھے بلایا ہے تو میرے دل پر ایک چوٹ لگی، میں نے مرتضیٰ کو رخصت کیا اور وہ اندر چلا گیا،

میں کھانا کھانے اندر گیا تو مرتضیٰ وہاں موجود تھا، چلتے وقت اُس نے مجھ سے محبوب منزل چلنے کو کہا، یہ میرے ایک عزیز کی کوٹھی تھی جہاں مرتضیٰ ٹھہرا تھا، میں نے اُس سے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا، گھر میں ایک برہمی نمایاں تھی، اشرف آباد سے آنے والا شخص ہمیشہ گھر میں کچھ نہ کچھ برہمی پیدا کر دیتا تھا، تھوڑی دیر بعد ایک نوکر نے اطلاعاً آکر کہا کہ محبوب منزل میں اشرف آباد سے سواریاں آئی ہیں، ایک چھوٹا بچہ بھی اُنکے ہمراہ ہے، میں چونک پڑا، مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ بھوک بالکل غائب ہوگئی، اور بے اختیار میری زبان سے نکلا "اختر ہوگا" یہ نجمہ کا چھوٹا بھائی تھا جو اپنی والدہ کے ساتھ سفر میں ہمیشہ رہتا تھا، سب کو یقین ہو گیا کہ نجمہ کی ماں آئی ہیں۔

گھر میں اس خبر نے تہلکہ برپا کر دیا، میری ماں نے چلانا شروع کیا:

"آخر کس لیے آئی ہیں؟ اپنے گھر تو میں کبھی نہ بلاؤں گی اور نہ اپنے لڑکے کو وہاں جانے دونگی، کیا تماشا ہے! ہم نے آج تک نہیں سُنا کہ اُلٹے لڑکی والے شادی کا پیام دیں، اور یہ بھی سہی، آخر لڑکے سے کیا واسطہ؟ کیا ہم مرگئے ہیں؟ ہم سے باتیں کریں تو ہم اُنھیں جواب دیں، بچہ کیا جانے، وہ کچی لکڑی ہے، جدھر جھکاؤ جھک جائے گا..... اور شاہد! تجھ سے بھی کتنی مرتبہ منع کیا کہ وہاں نہ جا مگر تو کب سُنتا ہے۔ کیا تجھے لڑکیاں کہیں اور نہ ملیں گی...."

میرے باپ نے برہم ہو کر کہنا شروع کیا:-

"اور یہ دیکھو کہ آج کل کے لڑکے کس قدر شریر ہیں، بھائی میں تو واقعی دنگ ہوں، ہمارے زمانہ میں بھلا ایسی باتیں کہاں تھیں، مرتضیٰ گھنٹوں یہاں بیٹھا رہا مگر ذکر تک نہیں کیا کہ سواریاں آئی ہیں....."

ماں پھر بولیں:

"سب سکھا دیئے گئے ہیں، شاہد سے ساتھ چلنے کو تو کہا مگر یہ نہ بتایا کہ کس نے بلایا ہے.... باہر کہہ چکا ہوگا، سب پکے ہیں، خوب بنے ہوئے ہیں، میں کہتی ہوں کہ شاہد اگر تو وہاں گیا تو خدا کی قسم مرتے وقت دودھ نہ بخشوں گی، وہاں کیا میٹھا ہے، تجھے اُس سے اچھی لڑکی نہ دلاؤں تب سہی....."

اور اس سلسلہ میں نجمہ کے خاندانی نقائص، اُسکے گھر کی بد انتظامیاں، خود اُسکے سانولے بدصورتی، بدتمیزی وغیرہ بالتفصیل گنائے گئے، ماں کہتے کہتے چُپ ہو جاتیں تو باپ شروع کر دیتے، باپ

تھک جاتے تو ماں کی زبان چلنے لگتی،
مجھے سخت صدمہ ہوا، میں سب کچھ سُن سکتا تھا مگر نجمہ کی بُرائی سننا میرے لیے ناقابل برداشت تھا، اس گفتگو سے مجھے اذیت ہوئی، میری تمام خوشی خاک میں مل گئی، سر سے پیر تک مجھے ایک طرح کی حرارت محسوس ہونے لگی، میرے سینہ پر ایک بوجھ سا چھا گیا اور قریب تھا کہ میرے آنسو میرے واردات قلب کی تشریح شروع کردیں لیکن میں نے ضبط کیا اور خاموش اُٹھ کر باہر چلا آیا، چلتے وقت سب نے کھانے کو پوچھا، یہ ایک ٹھیس تھی جس نے میرے کسی حد تک مندمل زخم سے خون جاری کردیا، ایک آنسو میری پلکے پپے ڈھلک کر میرے رخسار پر آگیا، میں نے اپنی گرانی پی ڈالی اور "مجھے اسوقت بھوک نہیں ہے" کہکر غالب کے ان نشتروں سے اپنا سینہ چھلنی کرتا ہوا باہر چلا آیا:-

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

رات ہو چکی تھی، میرے کمرہ میں سبز رنگ کے گلوب سے نکل کر ٹھنڈی روشنی پھیل رہی تھی جو مجھے سخت ناگوار تھی، میں نے لیمپ کو دھیما کردیا اور ایک برسوں کے مضمحل و نڈھال بیمار کی طرح اپنے بستر پر گر گیا، ایک گہرے سکوت میں پڑ کر آہستہ آہستہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے دل میں اس مصرعہ کو میں دوہراتا رہا

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو!

ایک تکلیف دہ دماغی تھکن مجھے محسوس ہونے لگی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی کسی کمزور کچے دھاگے سے زیادہ کمزور رشتہ سے منسلک دُور کہیں لٹک رہی ہے اور اس قسم کی ضرب جیسی کہ اُسوقت والدہ اور والد کی گفتگو سے اُس رشتہ میں لگی ہے اُسے توڑ دینے کو کافی ہوگی، میرا دم گھٹ رہا تھا، میری سانس اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں سمندر کی موجوں کے درمیان پے در پے تھپیڑے کھاتا۔

نجمہ کا گھر ایک دلآویز حُسن کا مرکز تھا، اُس نے ب حُسن کیا تھا حُسن ایک وسیع و جامع لفظ ہے اس میں ہر طرح کا حُسن شامل ہے۔ پوشیدہ ہیں، حُسن میں دوسرا درجہ نہیں ہے، یہ ایک مکمل خواب ہے، حسین عورت کبھی نامکمل نہ ہوگی، لوگ اکثر کہتے ہیں

کہ حسن تمام عیوب کا پردہ پوش ہے، عورت معائب کی حامل ہو اور حسین ہو تو اُسکے معائب ماند پڑ جاتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے، حسن بذاتِ خود ایک کرشمہ ہے، ایک مقدس و برگزیدہ کرشمہ، ایک برکت، حسن کبھی نامکمل نہ ہوگا، یہ ایک طاقت ہے جو سب کچھ سکھا دیتی ہے، یہ اپنے ہمراہ تمام محاسن لاتی ہے، جس عورت پر یہ طاقت یہ برکت چھا جاتی ہے اُسکے محاسن بھی پورے طور پر اُس میں جذب ہو جاتے ہیں، حسن کی لطافت کثافت کو گوارا نہیں کر سکتی، جہاں حسن ہے عیب کا گذر نہیں، یہ دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں جن کا اجتماع نہیں ہوگا، یہ آگ اور پھونس ہیں، حسن کی آگ ہر چیز کو جلا دیگی، حسن رہے گا یا عیب، دونوں ایک جگہ نہیں رہ سکتے،

مجھے اُس گھر کی ہر چیز سے محبت تھی، وہاں کا ذرہ ذرہ مجھے محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، نجمہ سے، نجمہ کی ماں سے، اُسکے بھائی بہنوں سے، سب سے مجھے انتہائی شفیفگی تھی، شاید حسن میں عمر کی بھی قید نہیں ہے ورنہ کیا وجہ تھی کہ اُسکی چھوٹی بہن میں جو صرف پانچ برس کی تھی، میں حسن کے وہ تمام لوازم مہیا دیکھتا تھا جو ایک حسین جوان عورت میں ہوتے ہیں؟ ورنہ کیا وجہ تھی کہ میں نجمہ کی ماں میں بھی جو پانچ بچوں کی ماں تھی حسن کی انتہائی دلفریب اور قابلِ احترام صورت پاتا تھا، جو خود نجمہ کو قابلِ پرستش بنانے کے لیے اُس میں موجود تھے؟ میں وہاں کسی سے اپنی حسبِ خواہش گفتگو نہ کر سکتا تھا، میں سب سے محبت کرتا تھا یا سب سے ڈرتا تھا، یا سب کا احترام کرتا تھا، میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا، کہ وہ کیا چیز تھی جو مجھے وہاں پہونچ جانے کے بعد بات کرنے سے، نظر اُٹھانے سے، چلنے پھرنے سے روکتی تھی، میری گفتگو ایسی نہ ہوتی جیسی معمولاً ہوا کرتی تھی، میری آنکھیں ادھر اُدھر دیکھنے میں اتنی آزاد نہ ہوتیں جتنی کہ پہلے تھیں، چلتے وقت میرے قدم اس قدر آزاد، ایسے بے پروا نہ اُٹھتے تھے جیسے میں اپنے یہاں اپنے دوستوں کے ہمراہ اُٹھاتا تھا، ایک شرم، ایک لحاظ، ایک عجیب قسم کی ناقابلِ بیان کیفیت کے زیرِ اثر میری ہر حرکت بدلی ہوئی ہوتی تھی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدم قدم پر مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، گویا میری ہر بات جانچی جاتی ہے، تولی جاتی ہے، گویا مجھے یہاں امتحان دینا ہے،

اپنے بستر پر پڑے پڑے میں رات بھر کچھ سوچتا رہا، اپنی محبت کے پچھلے واقعات کو جو منتشر صورت میں ادھر اُدھر پڑے تھے مربوط کر کے ایک سلسلہ میں گوندھتا رہا ایک ایک واقعہ میری نظر کے سامنے بنتا ہوا، تیرتا ہوا، چلا آتا، اور ہر واقعہ میں تازگی اور شگفتگی پیدا تھی، میں سوچ رہا تھا، کہ آج وہ آئی ہے، اُسکا بھائی بھی آیا ہے، اُس کی ماں بھی آئی ہے، وہ ماں جو مجھ سے اس قدر

وابستہ ہے جو مجھ پر اس قدر مہربان ہے، بیشک وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا، لیکن مرتضیٰ نے مجھ سے کہا کیوں نہیں؟ میں نے ایک ایک بات کُرید کُرید کر، چھان چھان کر پوچھی بھی، مگر اُس نے اسکا ذکر نہ کیا، وہاں چلنے کو بھی مجھ سے کہا مگر اُنکی آمد کی خبر نہ دی، یہ کیوں؟ ممکن ہے اُنھوں نے منع کر دیا ہو، مگر ممانعت کی وجہ؟ گھر میں ظاہر کرنے سے منع بھی کیا جاتا مگر مجھ سے پوشیدہ رکھے جانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، پھر مجھے خیال ہوا کہ شاید میرے گھر کی عدم توجہی و بے التفاتی نے انھیں بے پروا و بے نیاز بنا دیا ہے، اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا اور میری آنکھوں سے دو قطراتِ اشک ٹپک پڑے۔

پھر میں سوچنے لگا کہ پچھلی مرتبہ اشرف آباد میں مجھ سے کتنا خلوص برتا گیا، کیا یہ سب بے کار تھا؟ کیا اب تک، اتنے عرصۂ گذا تک کے تمام مراسم یوں ایک دم منقطع ہو جائیں گے؟ کیا میں نے اُنکے مراسم و تعلقات کے بابت جو رائے قائم کی وہ غلط تھی؟ اگر مجھ سے علٰحدگی یا کشیدگی منظور تھی تو رفتہ رفتہ مجھے ان سرد مہریوں کا عادی بنایا گیا ہوتا، اس یکایک ستم کے پہاڑ سے تو میں چکنا چُور ہو جاؤں گا، اور پھر مجھے جانے سے بھی روکا جاتا ہے، کیا واقعی وہ اسی شہر میں ہے؟ اسی شہر میں جہاں میں سڑ رہا ہوں؟ کیا وہ بھی اسی ہوا میں سانس لے رہی ہے جس میں اپنی سرد آہیں نکال کر میں اپنی زندگی گذار رہا ہوں؟

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں کبھی مایوس ہوا کبھی بشاش، تمام رات میں نے ایک کرب و اضطراب کے عالم میں کاٹی، مجھے نیند کم آئی اور ہر دفعہ میری آنکھیں ایک لرزشِ مخفی، ایک اختلاجِ قلب کے ساتھ کھُل گئیں، میں نے پریشان خواب دیکھے، مہیب صورتیں میرے گرد و پیش آتی رہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اس رنجِ گراں کی تاب نہ لا سکوں گا، یہ کمزور و ناتواں جسم میرے لیے ایک زنداں تھا جسے توڑ کر میں وہاں پہونچنا چاہتا تھا جہاں روحیں ملتی ہیں، جہاں سے روحیں آتی ہیں، میں اس دنیا سے بیزار تھا، اس دن کے واقعہ نے میری روح میں ایک عجیب بے کیفی پیدا کر دی تھی، میں تمام علائق سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا تھا، بدلنے میں میرے جسم کی ہڈیاں ٹوٹتی تھیں، میرا بستر میرے لیے ایک مزار تھا، ا[illegible] تان، ایک تنگ مقبرہ، میں اپنے رنج کیلیے ایک وسیع دُنیا چاہتا تھا، ایک دوسرا [illegible] رنج کے لیے ناکافی تھا۔

دو دن اس طرح گذر گئے، میں اپنی عزیز نجمہ سے [illegible] بیٹھتے میری نگہبانی کیجاتی تھی، گویا میں نے کہیں سنید پھوڑی ہے، جسکے مواخذہ میں مجھے سزا بھگتنی پڑ گئی، گھر میں سب

متفکر و پریشان تھے، میں نے مطلق نہ کھایا، فاقہ کشی کی انتہائی تکلیفیں برداشت کرتا رہا، اتنے دن میں صرف صبح کے وقت تازہ پانی پی لیتا تھا اور بس، میں نے طے کرلیا کہ جب تک اُسے دیکھ نہ لونگا، میں کچھ نہ کھاؤں گا، اس پر میں اس قدر مُصر تھا کہ اپنی جان تک کا مجھے خوف نہ تھا، میری دماغی کیفیت یوں ہی کیا کم مضمحل تھی کہ اس پر یہ فاقہ کشی، میں بیحد ناتوان و حقیر ہوگیا، میرے جوڑ جوڑ سے جان نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، ہر سانس پر آخری سانس کا گمان ہوتا تھا، میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا، افسردگی و حقارت اُسپر برس رہی تھی، جیسے برسوں کا کوئی مریض ہو، میرے چہرے کا رنگ زرد پڑگیا تھا، اور میری آنکھیں بیٹھ گئی تھیں، ناتوانی چہرے پر چھائی ہوئی تھی، مگر اس افسردگی و ناتوانی میں مجھے نورِ سعادت کی ایک جھلک نظر آتی، جسم کے ہر حصہ میں مجھے کمزوری محسوس ہوتی، مگر میرے گوشۂ قلب میں ایک مسرت کی لہر، ایک اطمینان و یقین، آسودگی و بشاشت کی لاقابلِ بیان کیفیت مجھے محسوس ہوتی، وہ احساس جس سے میرے خون میں حرارت پیدا ہوتی تھی، جسکے سہارے میں زندگی بسر کرتا تھا۔

تیسرے دن دوپہر کو مجھے تار ملا، شام کی گاڑی سے میرے ایک دوست کی آمد تھی، انھیں لینے میں اسٹیشن گیا، اسٹیشن کے راستہ میں محبوب منزل تھی جہاں جانے کو مجھے منع کیا گیا تھا۔ مگر میں کیا وہاں نہ جاؤں گا؟ ..... نہیں، تمام دُنیا کی مرضی کے خلاف میں وہاں ضرور جاؤں گا، تاکہ کسی کی ایک اُچٹتی ہوئی نظر میرے تمام نکان کو دُور کردے،

میں وہاں گیا، خستگی و بیچارگی کے باوجود میں انتہائی قوی اور مطمئن معلوم ہوتا تھا، میری تمام پریشانی میرے دل سے دور ہوگئی تھی، میں پھاٹک پر اپنی گاڑی سے اُترا، دروازہ پر میں نے ایک آٹھ برس کا لڑکا دیکھا، اختر؟ مگر نہیں، یہ کون ہے؟ یہ تو کوئی اور لڑکا تھا، مگر کوئی پوشیدہ قوت مجھے اطمینان دلاتی رہی، میں گھر کے اندر داخل ہوا، گھر میں خاموشی تھی، دالان میں میری وہ چچی تھیں جن کی یہ کوٹھی تھی، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، پاس کے کمرہ سے ایک معمر بدقطع و بدوضع خاتون نکلی، میں نے اس سے قبل شاید انھیں کبھی نہ دیکھا ہو مگر اب بھول چکا تھا میں زیادہ تر باہر رہا تھا اور اب کچھ دنوں سے گھر کی سکونت اختیار کی تھی، میں اپنے عزیزوں سے بہت کم واقف تھا، میری چچی نے میرا تعارف کرایا، یہ خاتون اُنکی رشتہ کی ایک بہن تھیں، یہی اشرف آباد سے آئی تھیں، ان کا نام میں نے اکثر سنا تھا،

میرے پیارے دوست! آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ٹریجڈی اپنے میں کتنے زبردست

مہلک اثرات پنہاں رکھتی تھی، میرا سر چکرانے لگا اور میں پاس کی ایک چوکی پر سر کے بل گر پڑا، میرا سر پھٹ گیا تھا اور میں بیہوش ہو گیا تھا۔"

شاہد نے اپنی کہانی ختم کی تو ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری، اسوقت تک نور صبح پھیلنے لگا تھا اور ہماری جدائی کا وقت قریب تھا، میں نے جلدی جلدی حوائج ضروری سے فراغت حاصل کرکے اپنے میلے کثیف کپڑے پہن لیے اور انجن میں کام کرنے چلا گیا۔

(علیگ)

کلام امیر

چارہ بیکار ہے اُس عشق کے دیوانے کا
زندگی جسکے یہاں نام ہے مر جانے کا

دوست غم کرتے ہیں ناحق مرے مر جانے کا
یہ بھی اک باب ہے اس زیست کے افسانے کا

ابتدا یہ ہے کہ نالوں سے بپا ہے محشر
دیکھیے حشر ہو کیا عشق کے دیوانے کا

اب نہ آہوں میں وہ گرمی ہے نہ نالوں میں وہ زور
غالباً حال کچھ اچھا نہیں دیوانے کا

تابِ گریہ نہیں آنکھوں کو تو خوں روئیگا دل
کام شیشے سے نکل جائیگا پیمانے کا

کھا گیا مجھکو غم عشق کہ غمخوار تھا میں
کیا یہی حسن بدل تھا مرے غم کھانے کا

جب سے آباد ہوے وحشت یاس و حرماں
دل کی بستی میں بھی کچھ لطف ہے ویرانے کا

کم نہ تھا سوز جنوں شمع میں پروانے سے
ہار تھا پروانے کا

تنگ پیری ہے یہ دیوانگی
شعر خوانی نہیں ہذیان ہے دیوانے کا

امیر بدایونی

آیولنیتھی

(سلسلۂ اسبق)

پانچواں منظر

(پہلے آیولنیتھی اور مارتھا اسکے بعد بادشاہ ریبی اور ابن یحییٰ اور سب کے بعد ایمرک آتے ہیں)

مارتھا (پشت مکان سے داخل ہوتی ہے اور آیولنیتھی کو دیکھ کر جلد جلد قدم بڑھاتی ہے) میری بچی! ارے تم جاگیں کیونکر، اور یہاں کس طرح آئیں؟

آیولنیتھی۔ مارتھا تم کہاں تھیں۔ میرے پاس آؤ۔

مارتھا۔ میں کھیت میں نوکروں کے ہمراہ تھی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمھیں ——— تمھیں جگایا کس نے؟

آیولنیتھی۔ میں آپ ہی جاگی۔

مارتھا۔ کیسے۔ خود سے؟

آیولنیتھی۔ اور طریقہ مجھے معلوم نہیں مگر سنو، یہاں اجنبی مہمان آئے تھے۔

مارتھا۔ تم ٹھٹھولی کرتی ہو۔ کون لوگ تھے؟

آیولنیتھی۔ دو اجنبی جنھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو پہلے یہاں کبھی نہیں آئے تھے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تم موجود نہیں تھیں۔

مارتھا۔ بیٹی تم خواب دیکھ رہی ہو۔ دو اجنبی! کہاں سے آئے کیونکر آئے۔ ممکن نہیں۔

آیولنیتھی کہاں سے آئے، میں نے یہ نہیں پوچھا کیونکہ تم نے مجھ سے اکثر تاکید کیا کہ جو مہمان آئیں انھیں سوالات کرکے پریشان نہ کرو۔

مارتھا۔ تو بیٹی وہ کون لوگ تھے؟

آیولنیتھی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے نہیں معلوم۔

مارتھا۔ کیا تم اُسوقت تنہا تھیں؟

آیولنیتھی۔ میں نے تمھیں پکارا اگر تم نے جواب نہیں دیا۔

مارتھا (علیحدہ) اے خدا کیا یہ ممکن ہے (باواز بلند) ہاں بیٹی کہے جاؤ۔

آیولنیتھی۔ مارتھا، اُن اجنبیوں کا ایسا کوئی شخص پہلے یہاں نہیں آیا۔ کم سے کم میری یہی رائے ہے وہ یقیناً کسی ایسی پُراسرار سرزمین سے آئے تھے جو یہاں سے مختلف ہے۔ ان کی گفتگو میں جوش تھا، اگرچہ آوازیں ہماری تمھاری طرح نرمی اور لہجہ لطف آمیز تھا۔

(بادشاہ ریبی اور ابن یحییٰ اچانک داخل ہوتے ہیں اور کچھ فاصلہ پر ٹھٹک کر سننے لگتے ہیں)

اُس نے ایک گیت سے میرا خیر مقدم کیا مارتھا، وہ ایسا گیت تھا جس میں حیرت انگیز مختلف معانی تھے۔ وہ گیت آنسوؤں کو پھسلا کر میری آنکھوں میں لے آیا، اگرچہ میں مطلب اُدھورا ہی سمجھی۔

مارتھا (علیحدہ) اے خدا میں یہ کیا سُن رہی ہوں (باواز بلند) لیکن یہ تو بتاؤ کہ اُس نے کیا گفتگو کی؟

آیولینتھی - اوہ! بہت کچھ! بہت کچھ! جو میرے لیے نیا اور عجیب تھا۔ اُسنے کہا، لیکن افسوس میں سمجھ نہیں سکی ـــ اُس نے کہا کہ ہم بہت سی چیزوں کو نگاہ کے ذریعہ سے پہچان لیتے ہیں۔

مارتھا - اے خدا!

آیولینتھی - مارتھا کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس کا مطلب کیا تھا؟

مارتھا (بادشاہ رینی اور ابن یحییٰ کو دیکھ لیتی ہے) ارے! بادشاہ سلامت!

رینی (آگے بڑھکر) میری بیٹی!

آیولینتھی (بادشاہ رینی کی گردن میں باہیں ڈالکر) میرے اچھے ابا جان آپ یہاں ہیں؟

رینی - تمہارے اتالیق ابن یحییٰ بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔

آیولینتھی - وہ بھی ہیں! کہاں! میں آپ کا بھی خیر مقدم کرتی ہوں۔

(رینی مارتھا کو علحدہ لیجاتا ہے اور ابن یحییٰ آیولینتھی سے باتیں کر رہا ہے)

رینی - یہ کیا واقعہ پیش آیا؟

مارتھا - اے خدا میں کیا جانوں۔ مجھے بھروسا تھا کہ جب تک وہ جگائی نہ جائے خود سے نہیں جاگے گی، لہذا ہم لوگ کھیتوں کو چلے گئے۔ اُسوقت - وہی کہتی ہے مجھے یقین نہیں کیونکہ ممکن نہیں۔ کوئی اجنبی یہاں آیا اور اُس سے بات چیت کی۔

رینی - یہ میری ہی بوکھلاہٹ کا ثمرہ ہے۔ میں حکیم یحییٰ کے پیچھے گیا اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

ہاں مارتھا، یہ اجنبی،

مارتھا - وہ بہکی بہکی باتیں کرتی ہے مگر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اُس اجنبی نے اُس سے اُس کے نابینا ہونے کا ذکر کیا۔

رینی - کیا - آنکھوں سے معذور ہونے کا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ قبل از وقت آگاہ ہو جائے - جو اُسکی مرضی۔

(ابن یحییٰ کو اشارہ سے بلاتا ہے)

ابن یحییٰ تم نے سُنا؟

ابن یحییٰ - یہ اتفاق نہایت مسعود تھا۔ ایک اجنبی نے اسے بیدار کر دیا۔ یہاں میز پر مجھے وہ نقش ملا۔ تاہم جو کچھ اسے اپنی حالت کے متعلق معلوم ہوا مبہم ہے۔ اب اُسے سب حال پورا پورا بتا دینا چاہیے۔

رینی - یوں ہی سہی! (آیولینتھی کے پاس جاتا ہے) میری پیاری بیٹی! جو کچھ میں کہوں اُسے غور سے سنو۔ یہ بات اب زیادہ عرصہ تک تم سے پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی کہ تمہاری زندگی کا وہ لمحہ آگیا ہے ـــ سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ کیا تم ـــ سنو گی؟ کیا تم کو اگر کوئی عیر ـــ پہنچے جو تمہاری روح کو زخمی کر دے، تم اُسے صبر و شکر کے ساتھ

برداشت کروگی۔

آیو لینتھی ۔ابا جان کیسے آپ کے منہ سے سننے میں اُسکی شدت بہت کچھ کم ہو جائے گی۔

ربنی ۔میں نہیں جانتا کہ اجنبی نے تم سے کیا کہا، لیکن میرا قیاس ہے کہ وہی کہا ہوگا جسکے پوشیدہ رکھنے میں ہم نے آج تک اتنی احتیاط کی کہ تمھاری روح میں ایک ایسی قوت کی کمی ہے جسکے بغیر تم اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتیں اور یہ بینائی کی عدم موجودگی ہے۔

آیو لینتھی اُس نے بھی یہی کہا تھا مگر میں سمجھی نہیں تھی

ربنی ۔ اچھا مجھ سے سنو۔ ایک ایسی شے ہے جسے انسان روشنی کہتے ہیں۔ ہوا اور طوفان کی طرح یہ بلندی سے ہم تک آتی ہے اور انکی طرح بے پناہ تیزی کے ساتھ جن چیزوں کو چھو لیتی ہے اُن میں ایک نئے معانی اور نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر اسکے ساتھ گرمی بھی شامل ہوتی ہے۔ ہم تک یہ آنکھوں کے راستہ سے پہونچتی ہے اور جب ہمیں اُسکو دیکھنے کی قوت ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم کیا ہے اور خدا نے اسے کیسا بنایا ہے اس طرح ہمیں اُسکے علم و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تک جن باتوں کو تم نے بہت محنت سے سیکھا اور محض قیاس کیا اُن کو آنکھوں کے ذریعہ آسانی دیکھ اور پہچان سکتی ہو کہ اُنکی صناعت کیا ہے اور شکل کیسی ہے (شاگرد کو) ابتدائے عمر میں تمھاری بصارت جاتی رہی اور تم اس خوبصورت دنیا اور نورانی سرزمین کو دیکھنے سے محروم ہو گئیں۔ باوجود امکانی کوشش کے اس نقصان کی معقول تلافی نہ ہو سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ ہم نے تم کو اس کمی کے علم اور صدمہ سے محفوظ رکھا۔

آیو لینتھی۔ ابا جان یہ الفاظ حیرت میں ڈالنے والے ہیں جنکا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ عالم! میں جانتی ہوں کہ دست قدرت نے اُسے بنایا۔ یہ بات مجھ سے کب چھپی ہوئی تھی۔ میں اپنے پروردگار کو بھی پہچانتی ہوں کیا یہ عالم اُسکی قدرت کا ثبوت نہیں ہے۔ کیا جنگھاڑنے والا طوفان اور نسیم کی ہلکی ہلکی سانس اور وہ گرمی جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ دنیا کی ایسی عمدہ ترتیب اور یہ صلاحیت کہ پودے پھیکیں اور پھولیں پھلیں، پتھر، دھات، بہتے ہوئے چشمے، چڑیوں کا سنگیت میں گانا، کیا یہ سب اپنے عظیم پیدا کرنے والے کا اعلان نہیں کرتے۔ کیا آپ نے مجھے نہیں سکھایا کہ خدا نے دنیا میں کیسا اور کس لیے پیدا کیا ہے۔ آپ نے یہ تک تو کہا تھا کہ آیو لینتھی تم خود اُسکی قدرت کا نمونہ ہو۔ میں جس طرف مڑتی ہوں فطرت کی طرف یا دوسرے لوگوں کی گفتگو کی طرف خود اپنی ہستی کی گہرائیوں میں اُن خیالات میں جو خیالات سے پیدا ہوتے ہیں اور جنکا سلسلہ ناقابل ہے اُن سب میں مجھے وہی آواز گونجتی سنائی دیتی ہے۔ اور یہ سب اُسکی عظمت کا بہ آواز بلند اقرار کرتے ہیں۔

ربنی ۔ (ابن کبیٰ سے علیحدہ) آہ ابن کبیٰ ہم نے اس خوبصورت عقیدہ کو مسمار کر دیا۔

آیولینتھی۔ ایک بات بتائیے۔ مجھے اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے اس دنیا کا علم حاصل کرنا چاہیے۔ اُس اجنبی نے بھی جو تھوڑی دیر پہلے یہاں آیا تھا اور جس کے عجیب و غریب الفاظ میرے دل پر نقش ہیں عبارت کا ذکر کیا تھا۔ ابّا جان دیکھنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا میں اُسکی آواز کو دیکھ سکتی ہوں جسنے میری روح میں خوشی والم کا طوفان ایک ساتھ برپا کر دیا؟ کیا میں ان آنکھوں سے بلبل کے چھپوں کو دیکھ سکتی ہوں جنپر میں نے اکثر غور کیا ہے اور تصور کے ذریعہ سے جہت دور تک اسکا کھوج لگانے کی ناکام کوشش کی ہے؟ شاید اُسکا نغمہ ایک پھول ہے جسکی خوشبو کا تو مجھے علم ہے مگر میں اُس کی جڑ اور شاخوں اور پتیوں سے بیگانہ ہوں۔

رینی۔ آہ میری پیاری بیٹی۔ تیرا ہر سوال میری روح کو تڑپاتا ہے۔ میرے کلیجے کے ٹکڑے۔ میرا اعتبار اور اُس نیک ساعت کا انتظار کر جب کہ ہر بات جو اسوقت تیری سمجھ میں نہیں آتی خود بخود آشکار ہو جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھ کہ مجھے اُمید ہے اور اسی امید نے مجھے اب تک سنبھالا ہے کہ تیری بینائی تجھے دوبارہ عطا ہوگی۔ تیری آنکھیں کھلیں گی اور روشنی کی شعاعیں نہایت مسرت سے اُنکا استقبال کریں گی۔ کاش خدا ایسا کرے کہ ہمارا شریف دوست اور تیرا مہربان اتالیق ابن یحییٰ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو اور وہ گھڑی آجائے جسکے واسطے وہ اپنے کمال کے زور پر تیاریاں کر رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ساعت بعید بہت دُور نہیں ہے۔ میری پیاری بیٹی، تو ابن یحییٰ پر اعتماد کر اور اُسکے ساتھ مکان کے اندر جا۔ تارتھا تیرے ہمراہ ہوگی۔ پہلے تجھپر غنودگی طاری ہوگی اور اُسکے بعد ..... اگر خدا کی مہربانی شامل حال رہی تو ..... (جذبات سے مغلوب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے)

آیولینتھی۔ ابا جان آپ کیسے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں رعشہ کیوں ہے۔ پیارے ابّا جان آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ مبارک وقت آگیا جسکا آپنے اس قدر بیچینی سے اتنی مدت تک انتظار کیا۔ کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ مایوسی کا سامنا ہوگا۔ فرض کیجیے کہ ایسا بھی ہوا تو کیا اس حالت میں میں آپ کی بیٹی چہیتی بیٹی نہ رہوں گی۔ وہ بیٹی جو اس وجہ سے خوش ہے کہ آپ اُس سے محبت کرتے ہیں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے۔ جانے کی اجازت دیجیے۔

رینی۔ آہ میری بیٹی! میری بیٹی!

آیولینتھی۔ ابا جان مطمئن رہیے۔ جس امر میں میرے دانا اور مہربان اتالیق نے اس قدر غور و فکر سے کام لیا ہے [illegible] کامیابی کی قطعی امید ہے۔ میں محسوس [illegible] اس وقت بھی اُس غیر معمو[illegible] ہوں جسکو آپ روشنی سے [illegible] یں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ قوت مجھ میں موجود ہے۔ آہ جس وقت

وہ حیرت ولانے والا اجنبی یہاں تھا۔
میرے دل میں ایک ایسے جذبہ نے جوش کھایا
جس سے میں پیشتر آگاہ نہیں تھی جو لفظ اُسکے
منہ سے نکلتا تھا اُسکی آواز بازگشت میری روح
میں گونجتی تھی اور اُس سے ایسے نئے نغمے بلند
ہوتے تھے جنکا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ کیا آپ
نے نہیں کہا تھا کہ روشنی کی قوت بہت تیز گام
ہوتی ہے اور جس شے کو چھو لیتی ہے اُس میں
ایک نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں اکثر
حدت شامل ہوتی ہے ـــــ دل کی حرارت۔ ابا جان
میں جانتی ہوں کہ روشنی کیا چیز ہے۔ اگر آپنے
مجھ سے روشنی کی صحیح تعریف کی ہے تو کوئی مجھ
سے کہہ رہا ہے کہ آج مجھپر اُسکا ظہور ہوگا۔ لیکن
ایک معاملہ میں آپ کی رے صحیح نہیں ہے آنکھیں
نہیں دیکھتیں بلکہ بصارت کی جگہ یہاں دل کے
قریب ہے۔ یہاں اسکی شیریں یادگار قائم ہے۔
اور اُس نور کو منعکس کر رہی ہے جو میری روح
میں در آیا ہے۔ بیتاب امیدوں کے ساتھ میں
اس روشنی سے ملنے جا رہی ہوں (مارتھا کے
ساتھ گھر کے اندر چلی جاتی ہے۔

رینی (ابن یحییٰ سے جو گھر کے اندر جانے والا ہے)
ابن یحییٰ ٹھہرو! کیا یہ راز کچھ تمھاری سمجھ میں آتا ہے
وہ اجنبی کہاں ہے جسنے اس طرح میری لڑکی کے
سکون قلب میں خلل ڈالا؟ اُسکے الفاظ جذبات
سے لبریز تھے۔ اسکے کیا معنی ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے۔

ابن یحییٰ۔ حضرت! عورتوں کا مزاج بھلا کون
سمجھ سکتا ہے؟ اور اُس کی موجودہ حالت میری
تدابیر کے چنداں موافق نہیں معلوم ہوتی۔

رینی۔ صاف صاف کہو!

ابن یحییٰ۔ فرض کیجیے کہ اُسکے تمام خیالات کا
مرکز یہ اجنبی شخص ہے، وہی اُسکی طبیعت پر
قابو رکھتا ہے، لہذا مجھے بہت شک ہے کہ میرا
فن اپنا پورا اثر کرے گا اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔
لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں قوتیں بجائے مخالف
ہونے کے متحد ہو جائیں اور ایک دوسرے کو
مدد پہونچائیں۔ اسی امید ضعیف پر اب دارومدار
ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

(گھر میں داخل ہوتا ہے)

رینی۔ خدا معلوم کون شخص آیا تھا۔ شاید برٹرانڈ
کو معلوم ہو۔ (الیمرک چور دروازہ سے آتا ہے)
الیمرک! تم یہاں!

الیمرک۔ بندگان عالی کے واسطے ایک خط لایا ہوں۔

رینی۔ ٹرسٹان کے پاس سے؟ (پھر توڑتا ہے)
اُسی کا خط ہے۔ یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں، الیمرک
یہاں آؤ! وہ ہمارے پاک معاہدہ کو توڑنا
چاہتا ہے۔

الیمرک۔ معاہدہ سے روگردانی!

رینی (پڑھکر) حیرت! سخت حیرت! وہ
اقرار کرتا ہے کہ وہ غلطی پر تھا۔ اور تلافی کی
شرائط کا انحصار مجھ پر کرتا ہے۔ تاہم آیولینتھی

کے ساتھ شادی سے انکار رہے۔ یہ خط لایا کون تھا ؟

ایلمرک۔ میں نے آجتک ایسی گستاخی نہیں دیکھی۔ ایلمرک۔ جیوفری کے ملازموں میں سے تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ٹرسٹان اُسکے یہاں مہمان ہے۔

رینی۔ آہ! ایلمرک۔ قسمت ہمیشہ میری مخالفت کرتی ہے۔ یہ ایک شگون بد ہے۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس شادی سے مجھے نہ معلوم کیا کیا امیدیں تھیں اور اسی سے آبولینتھی کے حصول بنیائی کی اُمید بھی وابستہ تھی۔ ایک اُمید تو منقطع ہوئی اور ..... اور شاید تھوڑی دیر داخل ہوگئے میں دوسری اُمید کا بھی خون ہو جائے گا۔ لیکن ہیں ایسی احمقانہ یا محبتانہ آہ وزاری سے اپنی ذلت نہیں کروں گا۔ وہی ہوگا جو خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے مقدر کر دیا ہے۔

رینی۔ جیوفری کے یہاں؟ ایسی صورت میں تو کچھ اُمید ہوتی ہے۔ شاید وہ ——— لیکن ——— یہ غل کیسا ہوا؟ یہ ورّہ میں تلواروں کی جھنکار کیسی ہے؟

ایلمرک (دروازہ کے پاس جاکر) وہ زبردستی

رینی۔ زبردستی! کون بدمعاش ہیں؟

ایلمرک۔ ہمارے چند نفر سپاہی ———

رینی۔ تلوار کھینچ لو۔ وہ بغیر سزا پائے! بادشاہ رینی لے منہ نہیں آسکتے (اٹھتی)

اثر (لکھنوی)

جذباتِ اکبر

اندوہِ انتظار سے فرصت نہیں مجھے
یہ کس طرح کہوں کہ محبت نہیں مجھے

ہے باعثِ سکونِ طبیعت خیالِ دوست
احساسِ بیقراریِ فرقت نہیں مجھے

تیری طرف سے ظلم کی غایت نہیں رہی
یہ ا... کہ شکایت نہیں مجھے

ناکامیِ وفا مجھے برباد کر چکی
...رت نہیں مجھے

یا تیری جستجو میں اذیت کہیں نہیں
...ذیت نہیں مجھے

اکبر غلام عابد رنگیں طرا... ہیں
ہر گز غرور حسن طبیعت نہیں مجھے

جلال الدین اکبر

ایشیا کا نشأۃ جدیدہ

جب ساری دنیا جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھی تو ایشیا میں تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ رفتہ رفتہ وہ آفتاب افقِ مغرب پر طلوع ہوا، علمی، مذہبی، اور سیاسی بیداری کی نسیم چلی اور سارے یورپ میں تہذیب کا اُجالا ہوگیا۔ مرورِ ایام کے ساتھ وہ آفتاب پھر ایشیا کی طرف بڑھ رہا ہے، اور یہاں روشنی اور حرارت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ جن اسباب نے مغرب میں تمدن کی بنا ڈالی تھی وہی آج مشرق میں کارفرما ہیں۔

اس دورِ جدید کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۸۵۳ء میں امریکہ سے کموڈور پری کا بیڑہ وھیل کی تجارت کے لیے جاپان آیا۔ مغربی تمدن اور مغربی خیالات کے نمونے دیکھ کر جاپان چونک پڑا، غفلت سے بیدار ہوا، اور نئی روشنی کے استقبال کو بڑھا۔ تجارتی منفعت کی امید پر مغربی کمپنیوں نے تمام جزائرِ جاپان میں اپنا جال پھیلا دیا۔ جاپان نے تجارت اور حکومت کا پہلا سبق انھیں سے لیا، اور بہت جلد شاہ متسوہتو کو رائے عامہ کے مطابق حکومت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس بادشاہ کے دورِ حکومت میں جاپان نے اتنی ترقی کی کہ شاید کبھی کسی دوسری قوم نے نہ کی ہوگی۔ متسوہتو نے بیرونی ممالک سے تیس ہزار معلم، انجنیر، طبیب، جہازراں، اور مشیر مملکت بلائے، جو تیس سال تک جاپان کی خدمت میں مصروف رہے۔ آخر جاپان نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ ۱۹۰۵ء میں روس ایسی عظیم الشان سلطنت کو جنگ میں شکست دے دی۔

مُردہ مشرق کی رگوں میں یہ خبر خونِ زندگی بنکر دوڑی، اور سارے ایشیا میں ترقی اور آزادی کی جد و جہد شروع ہوگئی۔ چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی سال مغربی طاقتوں کے گڈے، شاہِ ایران نے اپنی رعایا کو حکومت شروطہ کا فرمان عطا کیا، اور تیسرے سال سلطان عبدالحمید نے آزادیِ مطابع، جبری ابتدائی تعلیم، اور آئینی حکومت کا فرمان صادر فرمایا۔ ۱۹۱۲ء میں چینیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور سنچو خاندان کے نابالغ شہنشاہ کو جمہور کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں اہل ہند نے ہوم رول کی تحریک بڑے زور و شور سے اُٹھائی، برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان میں سُست رفتار مگر ترقی پذیر ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا جسکی پہلی قسط ۱۹۱۹ء میں مانٹیگ چیمسفورڈ کی مجوزہ اصلاحات کی صورت میں برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہوئی۔

اسی سال افغانستان نے بھی برطانوی اثر کا جوا اُتار پھینکا۔ یہ سب اُسی جذبۂ وطن پرستی کے ہاتھوں انجام پایا اور پا رہا ہے جسے مغرب نے ایشیا کے گوشہ گوشہ میں پیدا کر دیا ہے۔

ترقی کے لیے سب سے ضروری شے تعلیم کی عمومیت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایشیا میں تعلیم ابھی عام نہیں ہے۔ لیکن اس شعبہ میں بھی ہماری ترقی کی رفتار کچھ بُری نہیں۔ جاپان و روس کی جنگ کے بعد ہی چین نے جدید نظام تعلیم اختیار کر لیا تھا اور اسوقت وہاں نئے اسکول اور کالج اس رفتار سے قائم ہو رہے ہیں کہ اُنکے لیے کافی عمارتیں مہیا نہیں ہوتیں۔ اور مجبوراً مندروں کی عمارتیں اسکولوں کے مصرف میں لائی جا رہی ہیں۔ اسکے علاوہ تین ہزار چینی جاپان میں، ایک ہزار امریکہ میں، اور دو سو یورپ میں زیر تعلیم ہیں۔ جاپان کے پڑھانے والی عمر کے لڑکوں میں ۹۰ فی صدی تعلیم پا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی جبری عام تعلیم کا مطالبہ ہے۔ زنانہ تعلیم کے لیے جلد جلد اسکول اور کالج قائم ہو رہے ہیں۔ دو چار لڑکیاں لڑکوں کے دوش بدوش یورپین یونیورسٹیوں میں بھی نظر آجاتی ہیں، اور ٹرکی میں تو خود وزیر تعلیمات ایک عورت ہے۔ ایشیائی طلبہ نہ صرف تعداد میں بلکہ علمیت میں بھی ترقی کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جن کی قابلیت کا خود مغربی اُستادوں نے لوہا مان لیا ہے اور بہت سے تو یورپین اور امریکن یونیورسٹیوں میں درس دیتے ہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ جو طلبا اکتساب علم کے لیے ممالک یورپ کو جاتے ہیں وہ اپنے ساتھ اُن علمی جواہروں کے فوٹو، اُنکی نقلیں، اور اُن کی مطبوعہ کاپیاں اپنے ساتھ لاتے ہیں جنھیں یورپ ہماری غفلت کے زمانہ میں لوٹ لے گیا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایشیا کے مطابع علوم و فنون کی اشاعت میں یورپین نشأۃ الثانیہ کے مطابع سے بہت آگے ہیں۔ صرف ہندوستان میں اسوقت تین ہزار پانچ سو اخبارات مختلف زبانوں میں شایع ہو رہے ہیں۔ شنگھائی کا صرف ایک مشنری مطبع دس کرور صفحات سالانہ شایع کرتا ہے۔ بیروت کے عربی مطابع نے سنہ ۱۹۱۴ء تک دس پدم صفحات شایع کیے تھے اور جاپان کی سالانہ مطبوعات انگلستان اور امریکہ کی سالانہ مطبوعات کے قریب پہونچگئی ہیں۔

اخلاقی ترقی اس سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔ بیاسی لاکھ پونڈ کے نقصان کے باوجود افیون اور قمار بازی کے خلاف چین کا زبردست جہاد ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جسکی مثال مشکل سے ملیگی۔ ہندوستان میں عقد بیوگاں کے لیے جگہ جگہ [illegible] ہیں۔ بچپن کی شادی جدید تعلیم کے اثر سے تقریباً بند ہو جانے والی ہے۔ جاپان "پابندی" قانوناً مسدود ہو گئیں۔ تمام ایشیا میں عورتوں کا رتبہ بلند ہو رہا ہے۔ پردہ ہے، مگر پھر بھی بعض ملکوں نے

تو بالکل بے پردگی اختیار کرلی ہے، اور جہاں پردہ باقی ہے وہاں اندر ہی اندر آزادی کی حدود بڑھتی جاتی ہیں۔ زنانہ تعلیم اور اُسکے ساتھ ساتھ زنانہ تفریحی مشاغل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ الزام ایک حد تک صحیح ہے کہ مغربی اثر نے تعلیم یافتہ جماعت کو بے دین بنا دیا ہے۔ مگر اس شکایت کو رفع کرنے کے لیے پرانے مذاہب کو نئی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ چین میں طاؤزم، جاپان میں شنٹو، کوریا میں شامانی، ہندوستان میں آریہ سماجی اور برہمو سماجی مذاہب، اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ ذات پات کی قید سے آزادی، بُت پرستی کی مخالفت، مذہبی آزاد خیالی ان مذاہب کی اہم خصوصیات ہیں

اقتصادی حیثیت سے ڈاک، ریل، تار، اور جہاز نے عہد فلاحی کا خاتمہ کرکے دورِ صناعی کی ابتدا کی۔ اُنیسویں صدی کی دوسری ششماہی میں ہندوستان کی تجارت چوگنی، چین کی چھ گنی اور جاپان کی سات گنی ترقی کرگئی، اور موجودہ صدی میں اس سے بھی زیادہ ترقی ہو رہی ہے۔ چین میں دُنیا کی سب سے بڑی کوئلے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں، جن میں امریکہ کی کانوں کا بیس گنا کوئلہ موجود ہے۔ امریکہ اسٹیل کارپوریشن کو سن فرانسسکو میں، چین اور ہندوستان کا کوئلہ خاص فرانسسکو کے کوئلہ سے سستا پڑتا ہے۔ سن، چاول اور چائے کی برآمد میں ہندوستان دنیا کے تمام ممالک سے آگے ہے۔ اور چمڑہ، گیہوں اور روئی کی برآمد میں اُس کا دوسرا نمبر ہے۔ ہندوستان کا نظام آبپاشی دنیا میں بہترین مانا گیا ہے اور اسکی ۳۰ ہزار میل لمبی ریلوے ساری دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔

مختصر یہ کہ پیدائش گاہِ تمدن، مادرِ مذاہب، گہوارۂ اقوام، ایشیا دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کو گود میں لیے ترقی کے میدان میں گامزن ہے۔ اسکی مظلوم بچیاں اور غافل بچے بیدار ہو رہے ہیں۔ دنیا کا آباد ترین اور وسیع ترین خطہ یورپین نشأۃ ثانیہ کی برسوں کی راہ کو مہینوں میں طے کر رہا ہے ایشیا کا یہ نشأۃ ثانیہ یورپ کے دورِ ترقی سے زیادہ وسیع، زیادہ عمیق، اور زیادہ قوی ہے۔ اور یقین ہے کہ یورپین تہذیب سے زیادہ عظیم الشان تمدن کا بانی ہوگا۔

سید

مقدس ڈاکو

(۱)

مولانا محمد علی صاحب نے اپنے اخبار ہمدرد میں جسکی عنان ادارت اب علاً بھی اُن ہی کے ہاتھ میں ہے خواجہ حسن نظامی دہلوی، خواہرزادۂ حضرت محبوب الٰہیؒ، و فرزند دلبند حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہٗ و نبیسۂ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نبیرۂ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حال ہی میں یہ نہایت ہی معنی خیز لقب عطا فرمایا ہے۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جب مولانا ظفر علیخاں صاحب دوبارہ حیدرآباد میں بلائے گئے اور حضور نظام کے لطف و اکرام سے سرفراز ہوے، تو جن لوگوں کو اُن سے اختلاف تھا، یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جو لوگ اُن کو اس منزلت سے گرانا چاہتے تھے، اُنھوں نے حکومت ہند کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس سازش میں حیدرآباد کے کون کون لوگ شریک تھے، اس پر بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ البتہ دو اشخاص کے کارنامے اسوقت پبلک کے سامنے ہیں۔ شیخ ضیاء الحق صاحب ایڈیٹر ہمدرد جنکو خواجہ صاحب نے اب اپنے تبلیغی اخبار منادی میں "مہذب ڈاکو" کا لقب دیا ہے اور جنکی پمفلٹ بازی کبھی خاص شہرت رکھتی تھی خواجہ صاحب کو جو غالباً اُنکے پرانے رفیق کار رہے تھے، اپنے خاص ذرائع معلومات کی بنا پر یہ اطلاع بہم پہونچائی کہ ظفر علیخاں صاحب حضور نظام کو پان اسلامزم (ہمدردیِ اسلام) کا سبق پڑھا رہے ہیں، اور خواجہ صاحب نے چیف کمشنر دہلی کو جاکر بافراط اس حادثۂ عظیم کی خبر پہونچائی۔ چیف کمشنر صاحب نے حکومت پنجاب اور حکومت ہند کو اطلاع دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند روز میں مولوی ظفر علیخاں صاحب کو مع اُنکے صاحبزادہ عزیزی اختر علیخاں کے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اور حضور نظام کے متعلق حکومت ہند کا جو رویہ آج بتایا جاتا ہے، اگر اس میں کوئی واقعیت ہے تو ایک انگریزی اخبار کے مطابق وہ پان اسلامزم بھی اُنکی فہرست الزامات میں داخل ہے جس کا سبق مہذب و مقدس ڈاکوؤں کی شہادتوں کے بموجب ظفر علی خاں صاحب

خواجہ حسن نظامی صاحب سے ہمیں پہلی بار [illegible]
[illegible] تک خواجہ صاحب صرف ابن آدم تھے [illegible]
[illegible] دلبند، نبیسہ، نبیرہ کی

[illegible] عمل کرنے کا موقع ملا

خصوصیات کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔

المناظر کے اجراء کے بعد نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ اور حلقۃ المشائخ کے بانی کی حیثیت میں جب خواجہ صاحب نمودار ہوئے تو فروری کے المناظر میں نظرے خوش گذرے کے تحت حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا :-

"لیکن باوجود اُس حسن عقیدت کے (صوفیائے کرام اور اُن کے روحانی مشن کے ساتھ، نہ کہ خواہرزادہ حضرت محبوب الہیؒ کے ساتھ) ہم نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ کی روش کو اُس وقت سے نہیں دیکھتے جبکے وہ غلطی سے مستحق بتائے جاتے ہیں اور جبکی وہ بحالت موجودہ اُمید کر سکتے ہیں

. . . . . .

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ تار اور ڈاک کی بدولت رسل و رسائل اس قدر آسان تھے، عمدہ پختہ سڑکوں، تیز رَو ریلوں اور دخانی جہازوں کی وجہ سے نقل و حرکت کے ذرایع اس درجہ سہل الحصول نہ تھے اور دنیا کی تین چوتھائی آبادی حالانکہ اُسوقت یقیناً مشرب صوفیانہ سے نابلد محض تھی، صوفیائے کرام کی باطنی و اشراقی قوتیں دنیائے اسلام میں نورپیزی و ضیاگستری اور خیالات باطلہ و عقائد ناقصہ کی اصلاح و درستی کرنے سے عاری نہ تھیں، لیکن مقام تعجب ہے کہ آج ان آسانیوں کے باوجود اور فرقہ اہل باطن کے خودساختہ نائبوں کے دعوے کے بموجب دنیا کی آبادی میں تین چوتھائی حصہ صوفی مشرب لوگوں کا ہوتے ہوئے بھی محض ابلہ فریبی اور مغربی تقلید کے خیال سے علم تصوف کی درسگاہیں قائم کرنے اور صوفیوں کی اصلاح کرنے اور اگر سارے عالم کو نہیں تو تمام مشرقی ممالک کے مسلمانوں کو مشرب صوفیانہ کی دعوت دینے اور اُنکو ایک محیط جہالت و توہم میں غرق کرنے کی کوشش میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جاتا ہے اور زمانہ حال کی تمام علمی، تمدنی اور سیاسی ایجادات اس غایت تظلم و تعدی کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔"

خواجہ صاحب کے کارخانۂ تجارت کے بارے میں سطور بالا لکھنے کے بعد اسی سلسلہ میں مولانا محمد علی سے یوں شکوہ کیا گیا تھا :-

"قوم کے وہ برگزیدہ نفوس جو اپنی فطری سعادت اور ملکوتی ثقاہت کے باعث اس قسم کی نیرنگیوں اور بازیگریوں کی اصلیت سے بیخبر رہتے ہیں اُنکا تو ذکر نہیں، لیکن افسوس معلوم ہوتا ہے اُن حضرات پر

جو اپنی عالی دماغی و روشن ضمیری سے اِن شعبدوں اور ڈھکوسلوں کے پیچ در پیچ اسرار سے واقفیت رکھتے اور عملی تجربوں اور چشمدید واقعات کے بدولت اُن کی حالت و حیثیت کا صحیح اندازہ کرنے کے باوجود محض ہر دلعزیزی قائم رکھنے کی خواہش یا اخلاقی جرأت کے فقدان سے واقعات کے چہرے پر وہ اُٹھانے اور حقیقتِ راز کا افسانہ سنانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہمعصر کامریڈ نے اپنی ۱۳- جنوری کی اشاعت میں ایک دعوے باطلہ کی تردید کرتے ہوئے اس قسم کے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس سے ہمیں اتفاق کلی نہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے موقعوں پر بزرگان ملت کا سکوت کرنا یا "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کی قدیم ہدایت پر کاربند ہونا حالات موجودہ کے لحاظ سے کبھی مناسب نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ آجکل کے ذہین، ملباع اور پڑھے لکھے یار "الخاموشی نیم رضا" کا مفہوم خوب سمجھتے ہیں اور بڑے ناموں کی پرستش کرنے والوں کو اس طریقہ پر فوائد بیجا حاصل کرنے میں جو بدطوئی حاصل ہو اُس سے ملک و قوم کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا ہے اور پڑے گا"۔

ایک سال بعد جب خواجہ صاحب نے میرٹھ سے اخبار توحید جاری کیا تو مئی ۱۳ء کے الناظر میں اُسکے متعلق یہ عرض کیا گیا۔

"... اگر توحید کا ظاہری لباس تصوف کی باطنی تعلیم کے لیے مفید و کارآمد ہو سکتا تو مسلمانان ہند کے حق میں یہ اخبار ضرور نزول رحمت کا باعث ہوتا لیکن جب اہل باطن ظاہری تصنعات سے آراستہ ہو کر نمود و نمایش کو اکتساب برکت کا ذریعہ قرار دیں اور یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون کی دل ہلا دینے والی آواز پر کان نہ دھریں تو ظاہر ہے کہ مذہب اور اہل مذہب کے حق میں نتیجہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری آواز اِن معاملات میں نہایت مدھم ہوتی ہے لیکن پھر بھی جب کبھی ہمیں موقع ملے ہم اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار آزادی کے ساتھ کرتے رہیں گے اس لیے کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلیل اور پست حالت کا ذمہ دار زیادہ تر وہی گروہ ہے جو انانیت و خودی کی سعی دو آتشہ کا متوالا بن کر خدا و رسول کے ارشاد و تعلیم کو پس پشت ڈال کے ظاہری لباس سے آراستہ ہو کر سادہ لوح حلقہ گوشان مذہب کو سبز باغ دکھاتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ خاکی نژاد انسان جسکی تخلیق میں ایک ناقابل شمار حصہ وقت سے زیادہ اور ایک قطرۂ ناپاک کے سوا صرف نہیں ہوا ہے کتنی جلد اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی نیرنگیوں اور شعبدہ بازیوں سے اُس خالقِ ذوالجلال کی بیشمار مخلوق کو مصیبتوں میں پھنساتا ہے جسکی قدرت و طاقت کا اندازہ بھی امکان بشری سے خارج ہے اور پھر اپنی وقتی اور عارضی کامیابیوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اُس بصیر و علیم کو بھی دھوکے میں ڈال دیا ہے اور اُسوقت کو یاد کرکے نہیں لرزتا جبکہ یہ سراب، یہ بُلبُلا، یہ دھوکے کا طلسم باقی نہ رہے گا اور دلوں کے اندر کے راز ملشت از بام کردیے جائیں گے۔

ٹٹولتے ہیں یہاں حال کو شہ گوشۂ دل
یہاں نہیں ہے حکایت سے اور قیل سے کام (ظفر)

ہمارے متعلق توحید کے پہلے ہی پرچہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "ہم درویشوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی قرار دیتے ہیں"۔ اور اگر مذکور الصدر خیالات کا مفہوم یا جو کچھ ہم نے اس مسئلہ پر فروری ۱۲ء کے الناظر میں نظام المشائخ پر ریویو کرتے ہوے لکھا تھا اُسکا منشا و مطلب توحید کے طباع ایڈیٹر کی رائے میں اسی قدر ہے تو ہم کو اُن سے شکایت نہیں ہوسکتی۔ البتہ ہم دوسروں کی خدمت میں یہ عرض کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم اُن لوگوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی نہیں قرار دیتے جو واقعی درویش ہوں، مگر وہ لوگ جو خود پرستی و خودنمائی کے سکہ ہائے مقلوب کا تبادلہ عقیدت و ارادت سے کرنا چاہیں اور مذہب ایسی مہتم بالشان چیز کو اپنے مفروضہ کشف و کرامات سے بازیچۂ اطفال بنائیں اُنکے سامنے سر تسلیم و نیاز جھکانا البتہ ہمارے مذہب میں ایک گناہ عظیم ضرور ہے۔ اور خواہ ہر دلعزیز بننے کی ہمیں کیسی ہی سخت خواہش و ضرورت کیوں نہ ہو لیکن ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ امید و بیم کی کوئی حالت ہمیں اس معاملہ میں شکست نہیں دے سکتی"

سنہ ۱۹ء اور سنہ ۲۰ء میں بوہرہ فرقہ کے مشہور پیشوا ملا طاہر سیف الدین صاحب ..... کی ایک تصنیف کی بدولت خواجہ صاحب اور اُن جیسے دوسرے مقدس اور مہذب ڈاکوؤں نے خوب داد قزاقی دی اور بمبئی کے احمقوں کی زرپاشی نے ملک میں ایک طوفان بے تمیزی بپا کردیا تو تنگ آکر ہمیں فروری سنہ ۲۱ء کے الناظر میں سطور ذیل لکھنا پڑیں:-

ریل، ڈاک، تار، مطبع اور اخبارات بے شبہہ تمدن جدید کے بہترین ثمرات میں سے ہیں لیکن اُس قوم

کی قسمت کو کیا کیے جسکے افراد ان نفع بخش اور راحت دہ چیزوں کو بھی شرارت اور نفسانیت کا آلہ بنالیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کم وبیش ایک سال سے مسلمانوں کی ایک جماعت انھیں تمدن پرور آلات کے ذریعہ افراد قوم کے دلوں میں کدورت ونفرت کے جذبات مشتعل کرنے میں مصروف ہے اور اگرچہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس بحث میں ہم کسی قسم کا حصہ لیں لیکن وقت، روپیہ اور قوتوں کے بیجا اسراف کے ساتھ ساتھ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس جنگِ زرگری کی بدولت کثیر افراد قوم کے اخلاق بھی برباد ہو رہے ہیں تو ہم معاف کیے جائیں اگر ہم خاموشی کو گناہ سمجھ کر چند سطور تحریر کریں۔

ابتدا اسکی یوں ہوئی کہ ایک صاحب محمد اسمٰعیل سریادو اتے جنکے دل میں غالباً اسلام اور مسلمانوں کا درد تمام قوم سے زیادہ ہے، ایک طولانی تحریر بعض اخبارات میں اس مضمون کی شائع کرائی کہ بمبئی میں جو داؤدی بوہروں کے ایک سرغنہ طاہر سیف الدین صاحب ہیں اُنھوں نے "نور المبین" کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں تصنیف فرمائی ہے اور اُس میں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ توہین کی اور تمام فرق اسلام کے خلاف سخت زہر اُگلا ہے۔ قومی اخبارات ورسائل عموماً نکالے تو اس دعوے کے ساتھ جاتے ہیں کہ اُنکے ذریعہ سے قوم وملک کی خدمت منظور ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ایک بڑا حصہ اخبارات ورسائل کا محض اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو حصول معاش کی تمام کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد اس غریب پرور دروازہ پر آ بیٹھتے اور اپنی تن آسانیوں کی خاطر ملک وملت کا نام لیکر بداخلاقیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، مذہبی مناظروں اور سیاسی مجادلوں کی گرم بازاری میں تو خیر انھیں اصحاب کا بڑا حصہ تھا ہی مگر اب روز بروز نئے نئے دروازے اِن بندگانِ غرض کے لیے کھلتے جاتے ہیں۔

سریادو صاحب کا یہ مضمون چند اخبارات کے سوا تقریباً شمالی ہند کے اکثر اخبارات و رسائل میں شایع ہوا اور ہمیں ذاتی طور پر اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ جن اخبارات ورسائل نے اس مضمون کو شایع کیا، اسکی حمایت میں نوٹ اور مضامین لکھے اُنھوں نے نہایت معقول تجارت کرلی۔ تجارت بُری شے نہیں ہے، لیکن جو اخبار سوس کیے بغیر محض چند سکوں کے معاوضہ میں اس فتنہ کی پرورش کر میں ہم سے بہتر طریقہ پر بتا سکتا ہے کہ یہ تجارت ہے یا کیا؟

سرپاوا صاحب کا زور ختم ہوا تو ملا صاحب کے ارادتمندوں کی طرف سے اُنکی تردید اُسی دم خم کے ساتھ شروع ہوئی - اور انھوں نے ایک طرف تو بعض ایسے اخبارات ہی کو توڑ لیا جو سرپاوا صاحب کی زرپاشیوں سے کافی طور پر مستفید ہو چکے تھے حتیٰ کہ اُن میں سے چندنے اپنی رجعت اور احمق بنائے جانے کا بانگ دُہل اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی مخلص زر سے شمیمۃ الاخلاص کے نام سے ایک رسالہ لکھوا کر کثیر تعداد میں شایع کیا -

رد عمل کی یہ کوششیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ بمبئی کے زر و نقرہ نے دہلی کی منٹ سے ایک نیا سکہ "سیف بردین" ڈھلوا کر ملک میں رائج کرا دیا - اس رسالہ میں علما و فضلا، شاعر و ادیب، مصلح اور معلم، غرضکہ ہر طبقہ کے نمایندوں اور لیڈروں کے فتاوی کی صف بندی کرکے سرپاوا صاحب نے جو فساد برپا کیا تھا اُسکی حمایت کا سامان جمع کیا گیا - بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت دہلی نے اس پمفلٹ کو پریس ایکٹ کے رو سے ضبط کرکے پوری طرح شایع نہیں ہونے دیا - لیکن جو لوگ فریقین کو اُلو بنا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے اُنکی تشفی کے لیے یہ کافی نہ تھا لہذا جو نسخے اس رسالہ کے شایع ہو چکے تھے اُنکی تردید کے لیے اب تک کاغذ اور سیاہی فراوانی کے ساتھ ہمائی اور تاجران بمبئی کی دولت اس ٹٹی کی آڑ میں اُڑائی جا رہی ہے - چنانچہ کچھ دنوں پہلے خاص لکھنؤ سے ایک رسالہ اسی نوعیت کا شایع ہوا تھا - مطبع عالم افروز بمبئی نے اسکے بعد "آئینۂ صداقت" دکھایا اور اب ایک پمفلٹ "سیف الدین علیٰ رؤس المعتدین" میرٹھ سے وصول ہوا ہے -

ہم نہیں جانتے کہ یہ حماقتیں اور یہ قزاقیاں کب تک جاری رہیں گی، لیکن بلا لحاظ اسکے کہ جن بندگانِ زر کو ان ذرائع سے کافی مالی منفعت پہونچ رہی ہے وہ ہمیں بیشمار گالیاں دیں گے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملا طاہر سیف الدین کے ارادت کیشوں اور اُنکے فریق مخالف، دونوں کو آگاہ کر دیں کہ آپ دونوں کو اس جنگ زرگری سے کوئی نفع پہونچنے کی تو بظاہر امید نہیں، البتہ آپ کے پاس جو فاضل روپیہ ہے وہ ضرور اس حماقت میں آپ کی جیب سے نکل کر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گا جو آپ دونوں میں سے کسی کے دوست نہیں بلکہ آپ کے روپیہ کے دشمن اور اس قسم کی ڈاکہ زنی میں کافی مہارت رکھتے ہیں آپ دونوں اگر گانٹھ کے پورے ہیں تو ویسے ہی بدبختی سے عقل کے کورے بھی ہیں -

ہمیں نہایت افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث میں ڈاکٹر اقبال اور مسٹر عبد الماجد جیسے

قوم کے ایسے نامزد افراد بھی شریک کر لیے گئے ہیں اور اسکی تا مترقومہ داری جہاں تک ہمیں علم ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کے سر ہے۔

لہ طاہر سیف الدین کے حمایتیوں نے جو تردیدی رسائل شایع کیے ہیں اُنکی حقیقت و نوعیت سے ہم ناواقف نہیں، اور اگر اُن میں خواجہ صاحب کا نام صاف صاف نہ لکھا ہوتا تب بھی ہمیں یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود تھے کہ خواجہ صاحب بھی اس تجارتی کوٹھی کے شرکاء میں داخل ہیں۔

جب سے خواجہ صاحب کتابوں اور دواؤں کی تجارت میں باقاعدہ طور پر منسلک ہیں ہمیں توقع تھی کہ اس ذریعہ سے جو آمدنی اُنکو ہوجاتی ہوگی اس پر وہ اکتفا کریں گے۔ بلکہ ہم اُمیدوار تھے کہ وہ کسب حلال کے ان وسائل کی موجودگی میں اپنے کمالات تصوف و روحانیت کی نمایش کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیں گے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب

قناعت مس غیب را کیمیاست

کے فلسفہ پر یقین نہیں رکھتے۔ ورنہ اس گندے کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے۔" .....

اقتباسات بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ ہمیں خواجہ صاحب سے وہ قرب مکانی حاصل نہ تھا جسکی بدولت ہم اُنکے نہاں خانۂ خلوت کے "کاروبار" کا برائی العین مشاہدہ کر کے پبلک کو بروقت اُنکے کارناموں سے آگاہ کر سکتے، پھر بھی اُنکی خطرناک روش کو سمجھنے اور اُس سے موقع بموقع متنبہ کر کے پبلک کو اس جال میں پھنسنے سے بچانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اور جو رائے ہم نے اس قدر دور بیٹھ کر اور محض اُنکی تحریری کھیلوں اور کاغذی کھلونوں کو دیکھ کر قائم کی تھی تجربہ نے بخوبی اسکی صحت و صداقت ظاہر کر دی ہے۔ اگر مولانا محمد علی صاحب و دہلی کے دوسرے وہ اصحاب جنھیں اُن سے قرب حاصل ہونے کی وجہ سے اُنکے حالات کا زیادہ صحیح علم ہو سکتا تھا، ابتداہی میں اس فتنہ کو دبانے کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کو اُنکی مقدس ڈاکہ زنی سے کب کی نجات مل گئی ہوتی۔

ملک میں اور خاص دہلی میں ایسے متعدد "ڈاکو" موجود ہیں جنکے ساتھ مروت و نیک سلوک اگر روا نہ رکھا جائے تو اُنکی زہریلی زندگی کا نشو و نما ہزار پریشانی و تباہی کا موجب نہ بننے پائے۔

ظفر الملک

۱۳ - دسمبر ۲۶ء

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز مولانا عبدالحلیم شرر کا اہم تاریخی مضمون "سلطان عالم واجد علی شاہ" ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ سلطان عالم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دن رات ناچ رنگ میں مصروف رہا کرتے تھے اسکے خلاف یہ چشم دید شہادت ملاحظہ ہو:-

"بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ناچتے تھے، مگر یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ انتزاعِ سلطنت کے وقت بہت سی قلمی تصویریں ملک میں پھیلا دی گئیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ وہ محلات کے غسل میں کھڑے ناچتے اور بھاؤ بتا رہے ہیں، مگر مجھے خوب تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ سب وضعی اور جعلی ہیں۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور ہے اُسکی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہیں بلکہ کھیلتے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ کبھی لکھنؤ میں بعہدِ حکومت ناچے اور نہ کبھی مٹیا برج میں ناچے۔ یہ اور بات ہے کہ کثرتِ ناچ دیکھنے اور موسیقی کے اُستاد ہونے کے باعث فن رقص میں بھی اُنھیں اتنی بصیرت حاصل ہو گئی تھی کہ جب کوئی ناچنے والی ناچ میں غلطی کر جاتی تو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ اُٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں یوں۔

گانے میں البتہ کمال حاصل تھا، اگرچہ گلا اچھا نہ تھا مگر اصول موسیقی کو ایسا سمجھتے تھے کہ بڑے بڑے گویئے اُنکے سامنے کان پکڑتے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل اُستاد بتائے گئے ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں، جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں۔ اسکا نتیجہ یہ تھا کہ ولیعہدی سے لیکر آخر عمر تک ہمیشہ بڑے بڑے مستند گویوں کا اُنکے گرد ہجوم رہا، اور اُن کی قدردانی میں بادشاہ سے یہ افسوسناک بے اعتدالی ظاہر ہوئی کہ اُن میں سے بعض کو "دولہ" کا خطاب دے کر اُمرا و شرفا کے طبقہ میں داخل کر دیا .... لیکن یہ بھی بادشاہ کی قابلِ تعریف بات ہے کہ خطاب چاہے جیسا اعلیٰ درجے کا دیدیا ہو، دربار و سرکار کی کوئی خدمت یا داروغگی کبھی کسی ڈھاڑی کو نہیں دی۔"

معارف مولانا سید سلیمان ندوی، اپنے ہر سفر سے اُردو دنیا کے لیے ایک نیا تحفہ لاتے ہیں، اور وہ صحیح معنوں میں تحفہ ہوتا ہے۔ سفر حجاز سے لوٹ کر مولانا ممدوح نے معارف کے صفحات کے ذریعہ "حجاز کے کتبخانے" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور قیمتی مقالہ جمہور علمی کی نذر کیا ہے۔ کہ مظہر کے ایک کتبخانہ کے متعلق اس مضمون سے مختصر اقتباسات ناظرین الناظر کی ضیافت نظر کے لیے درج ذیل ہیں اور اسی ضمن میں ایک غلط بیانی کی تردید بھی ہوئی جاتی ہے۔ حرم کے دو مختلف پہلوؤں میں دو سرکاری کتبخانے ہیں۔

باب السلام کے قریب، باب الزیادۃ کی طرف، مدرسہ محمودیہ کے پاس جو کتبخانہ ہے اُسکے متعلق سید صاحب فرماتے ہیں
"حرم کی متفرق کتابیں اس میں یکجا کردی گئی ہیں، اور کچھ قسطنطنیہ سے سلطان نے بھیجوائیں،
بالفعل اس کتبخانہ میں میرے اندازہ کے مطابق چھ ہزار کتابیں ہونگی، ان میں مطبوعہ اور قلمی
کتابیں ہیں، یہ کتابیں .... ہر علم وفن کی ہیں اور ترتیب سے گھنی الماریوں میں چنی ہیں۔ کتبخانہ
کے موجودہ ناظر داغستان کے ایک عالم ہیں، جنھوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے۔ کتبخانہ کی ایک
پرانی فہرست ہے جو ایک ضخیم جلد میں ہے اور شکستہ ہو رہی ہے۔ داغستانی صاحب نے
نہایت محنت اور جانفشانی سے اسکی ایک نئی فہرست ترتیب دی ہے اور ہنوز وہ تمام نہیں ہوئی
کچھ حصہ زیر ترتیب ہے۔ شاید کہ اب تمام ہوگئی ہے۔

قلمی کتابوں میں سیکڑوں ایسی ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔ نادر کتابیں بھی اس میں متعدد ہیں
جن میں سے ایک فرقۂ ماتریدیہ کے امام ابو منصور ماتریدی کی تفسیر تاویلات القرآن ہے۔ یہ نسخہ
نہایت باریک فارسی خط میں بہت بڑی تقطیع پر ایک ضخیم جلد میں ہے .... اس کتبخانہ میں ایک
اور دوسری تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور کی متعدد جلدیں ہیں۔ اسکے مصنف امام
برہان الدین ابراہیم بقاعی ہیں۔ اس تفسیر کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں اور
سورتوں کا باہمی ربط و نسق بیان کیا ہے ....

مکہ کے قیام کے زمانہ میں ایک ہندوستانی مہاجر عالم صاحب جو بالفعل سلطان ابن سعود
کے مخالف ہیں اور روایتوں کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاط ہیں، اُنھوں نے مجھ سے فرمایا
کہ نجدیوں نے کہ معتقدے داخلہ کے وقت اس کتبخانہ سے ساٹھ آدمیوں پر یا ساٹھ اونٹوں پر
لاد کر کتابیں نجد بھجوادیں، اور فلسفہ و منطق اور امام غزالی کی سب تصنیفیں جلا ڈالیں۔ میں اس
کتبخانہ کو پہلے دیکھ چکا تھا، تاہم اُنکے کہنے پر میں نے جاکر دوبارہ کتبخانہ کا جائزہ لیا تو اس میں
فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضیات، تصوف، حتیٰ کہ رمل و جفر کی کتابیں بھی موجود پائیں۔ امام
غزالی کی تصنیفات بھی موجود تھیں، اور ساٹھ آدمیوں یا اونٹوں پر اگر کتابیں منتقل کی جاتیں
تو کتبخانہ کی الماریاں خالی ہوتیں۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ناظر صاحب سے دریافت کیا
انھوں نے ہنسکر نئی اور پرانی فہرستیں سامنے رکھ دیں۔ میں نے اپنی تحقیق یہیں ختم نہیں کی،
قاضی ابن لعبد صاحب جو قاضی القضاۃ ہیں اور جن سے ان چیزوں کا تعلق ہے، اُن سے
جاکر پوچھا کہ یہ افواہ ہے، اس میں کہاں تک صداقت ہے، انھوں نے نہایت غصہ سے اسکی
تردید کی اور کہا بحمداللہ ہم اہل نجد کو کتابوں کی حاجت نہیں ہمارے ملک میں سب کتابیں
موجود ہیں .....

وفد خدام الحرمین کی رپورٹ میں اسی سرکاری کتبخانہ کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ اُنکو
عینی شہادت ملی ہے کہ اس کتبخانہ کی فقہ و تصوف، فلسفہ [illegible] آہیں جلادی ہیں،
یہ قطعاً غلط اور کذب محض ہے، اور کتبخانہ میں آج بھ[illegible] نمونہ کی کسی
ہوئی عینی شہادت کی تکذیب کرنے کو تیار ہے اور ہند[illegible] لے دیکھنے والے

موجود ہوں گے۔

" جملہ معترضہ تھا جو اس لیے لکھا گیا تاکہ اسلام کا کوئی آئندہ مخالف مورخ اس واقعہ کو دوسرا کتبخانۂ اسکندریہ نہ بنا دے "

زمانہ

ستمبر کے زمانہ میں مسٹر علی عباس حسینی نے مرزا غالب کو جس محبت کے ساتھ مذہب اثنا عشری کا پیرو ثابت کر دیا، اُسکا حوالہ الناظر کے پچھلے نمبر میں دیا جا چکا ہے۔ اس مہینے کے زمانہ میں سید عاشق علی صاحب نے مسٹر عباس کے نتیجہ کے خلاف شہادتیں پیش کی ہیں۔ اب شاید مسٹر عباس کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا پڑے۔ ملاحظہ ہو:—

" ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو جامع مسجد جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں " (مکتوب بنام میر مہدی مجروح)

" .... میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مریدوں اس خاندان کا " (مکتوب بنام میر مہدی مجروح)

.... غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے، اگر شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے، جہاں اُسوقت کے تمام شیعہ امرا دفن ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں ..... اُنکی قبر بھی سُنّی طریقہ کی بنائی گئی ہے یعنی اُسپر اُونچا، اونٹ کے کوہان کی شکل کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں " (غالب کا روزنامچہ، مرتبہ حسن نظامی)

.... لہذا کوئی گنجایش نظر بحالات و دلائل سند یہ بالا تک وشبہ کی باقی نہیں رہتی جس سے غالب کو شیعہ کہا جا سکے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ غالب کو حقیقی اور سچی محبت و اہلبیت اطہار سے تھی۔ سیاسی محبت نہ تھی۔ اور یہی طریقہ و عقیدہ سنیوں کا ہے "

ہمایوں

اکتوبر کے ہمایوں میں مولوی محمد حامد دہلوی نے " ہندوستان کی پیکر نگاری " کے تحت میں مشرقی اور مغربی مصوری کے اہم اختلافات بیان کیے ہیں۔ اسے پڑھکر مشرقی اور مغربی صناعی کے نمونوں کو غور سے دیکھیے۔ شاید کچھ بصیرت حاصل ہو:—

" (۱) مغربی تصویر میں مختلف رنگوں کی دلکش آمیزش، نیز سایہ و روشنی کی صنعت قابل قدر ہے

(۲) مغربی مصور، سطح تصویر کی دلچسپ رنگ آمیزی، نیز اشکال مختلفہ کے اجتماع سے حیرت انگیز اور دل لبھانے والا نظارہ پیدا کرتا ہے اور اپنی مجموعی تصویر کی متفرق اشیا و بعینہ انھیں مواقع پر دکھاتا ہے جو ناظر کے خاص زاویۂ نگاہ میں نظر آتی ہے۔

(۳) مغربی تصویر میں مناظر کی حد بندی خطوط سے نہیں کی جاتی، حدود کی نسبت صرف قیاس قائم کر لیا جاتا ہے۔

(۱) برخلاف مغرب، مشرقی تصویر کی خوبی صحیح، سجل اور باریک خطوط کے وسیلہ سے

مجسم اشیا دکھا ظاہر کرتا ہے۔ دنیا کے سبھی ہمزباں ہیں کہ مشرقی مصور باریک خطوط کی کشش اور دستکاری میں یکتائے روزگار ہے۔
(۲) مشرقی مصور شبیہ کو خاص مدرسیہ طریقہ کی پیروی میں بناتا ہے
(۳) ہندوستان کی تصویر کام کی تازگی، نقوش کی صفائی، خطوط کی باریکی، اثبات دست اور دیگر برگزیدہ صفات میں بیمثل ہے۔"

جامعہ

مسٹر برٹرانڈ رسل کی قابل دید کتاب "مسئلۂ چین" کے ایک باب کا ترجمہ اس ماہ کے جامعہ میں شایع ہوا ہے۔ یورپ کا یہ چین دماغ چین کی اس پسندی کی داد ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"اگرچہ چین بہت سی جنگوں کا معرکہ گاہ رہا ہے، لیکن چینی قوم کی طبعی افتادِ مزاج بہت ہی امن پسند واقع ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی اور قوم ایسی ہے جسکا شاعر چینی شاعر پوچوئی کی طرح اپنی ایک نظم (بازو شکستہ مرد ضعیف) کا موضوع اور ہیرو ایک ایسے نوآموز فوجی سپاہی کو بناتا جسنے فوجی ملازمت سے گریز و گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے اپنے کو بے دست و پا کر لیا تھا۔ انکی اس امن پسندی کا راز انکے مفکرانہ مذاق طبیعت میں ہے۔ نیز اس میں اُنکے مزاج کی اس خصوصیت کو بھی دخل ہے کہ وہ قدرتی صورت حالات میں کوئی تغیر و تصرف کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ ..... وہ کہتے ہیں کہ جب تم بہترین چیز (لطف اندوز ہو رہے ہو تو پھر اُس کے بعد بھی ترقی کی تلاش میں لب تشنہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلی نظر میں دیکھنے سے ایک یورپین کو اس زاویۂ نگاہ میں ضرورت سے زیادہ کاہلی موجود معلوم ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ جبکہ عقل و دانش میں ترقی ہوتی جاتی ہے تو اُسکو اپنے خیال کے متعلق شکوک لاحق ہوتے جاتے ہیں اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ جس چیز کو ہم "ترقی" کہتے ہیں اُسکا غالب عنصر ایک ایسی قسم کی تغیر پسندی ہے جو ہم کو کسی مستحسن قسم کی منزل مقصود سے کچھ بھی قریب نہیں کرتی۔"

نیرنگ خیال

جناب سید حسن برنی نے "مسلمان عورتیں اور نیا زمانہ" کے عنوان سے نیرنگ خیال میں فرنچ مستشرق موسیو کراٹ دو کی ضخیم کتاب "محققین اسلام" کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ ترک عورتوں کے متعلق تو آپ بہت کچھ سن چکے ہیں۔ بعض دوسرے اسلامی ممالک کی عورتوں کے کچھ حالات حاضر ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مصنف یورپی نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔

"تاتاریوں نے عورتوں کی آزادی میں ترکوں سے بہت بڑھکر حصہ لیا ہے۔ کرغیزیا میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہے۔ علاقہ قفاز میں مدارس نسواں کھلے ہوئے ہیں اور انتخابوں کی تیاری میں عورتیں حصہ لیتی ہیں۔ علاقہ ما[illegible] نے اپنا اتحاد قائم کرکے کانگریس منعقد کی اور ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں [illegible] سیا کی عورتیں بھی آزادی پا چکی ہیں اور نقاب ترک کر چکی ہیں ..... یہ ماننا پڑ[illegible] اگر سرکیشیا کی عورتوں

میں بھی ناچ کا ایسا ہی شوق بڑھا ہوا ہے جیسا کہ اُنکی پیرس کی بہنوں کا تو واعظین کا یہ قول بالکل درست ہے۔ سرکیشیا کی عورتیں تعدد ازدواج کے خلاف ہیں، اس بات کو تسلیم نہیں کرتیں کہ کم عمر بچوں کی شادی کا کسی کو حق ہے۔ اُنکی خواہش ہے کہ شادی کے معاملہ میں انتخاب کی آزادی ہونی چاہیے۔ کرغز کے علاقہ میں تعدد ازدواج کے خلاف حال ہی میں ایک ڈگری ہوئی ہے ..... مصر کی بھی یہی حالت ہے اور وہاں پر اسکا بہت کچھ اظہار ہوا ہے۔ مصر کے سرکاری طبقہ میں اکثر امیرزادیاں اور خواتین یورپ میں سیاحت کرتی ہیں اور آزادی سے یورپین طرز معاشرت کے ساتھ بسر کرتی ہیں۔ سلطان مصر کی والدہ ملکہ نلیم کے ساتھ طوطن آمون کا مقبرہ دیکھنے گئی تھیں۔ سلطان مصر نے ۱۹۲۲ء میں ایک خاص نشان امتیاز قائم کیا ہے جو صرف عورتوں کے لیے ہے۔

شمالی افریقہ میں بہت سی خواتین موجود ہیں جو ہمارے ادب سے پورے طور پر مس رکھتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہمارے ملکوں میں سفر کرتی ہیں اور یورپین مستورات کے طریق پر لباس پہنتی اور زندگی بسر کرتی ہیں۔ اپنے ملک میں واپس ہونیکر وہ اپنا قومی لباس پہن لیتی اور اپنے خاندان کے طرز معاشرت کو پھر اختیار کر لیتی ہیں۔ انھیں اپنی فرانسیسی بہنوں کی آزادی اور خوش وقتی پر کسی قدر رشک آتا ہے"

سہیل

انجمن اُردوے معلّٰی علی گڈھ کے قابل قدر سہ ماہی رسالہ سہیل کا ستمبر نمبر، نومبر میں شایع ہوا ہے، مگر اتنی تاخیر ہو جانے پر بھی ہم سہیل کو اس بزم سے غیر حاضر نہیں کرنا چاہتے۔ اس میں سید محی الدین قادری کا ایک قابل دید مضمون "اُردو کے اسالیب بیان" شایع ہوا ہے۔ ایک جگہ مولانا نیاز فتحپوری کے اسلوب بیان پر یوں تنقید فرمائی ہے:-

"مولانا نیاز فتحپوری کے اسلوب میں بھی نامانوس الفاظ اور عجیب و غریب ترکیبوں کی وجہ سے کہیں کہیں ابوالکلام کا رنگ جھلک پڑتا ہے۔ مولانا ابوالکلام کا موضوع مذہب اور حضرت نیاز کا ادبیات، اسلیے موخرالذکر کی تحریروں میں رنگینی اور شوخی جگہ جگہ نمودار ہو جاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام کو باوجود اپنے نظری بانکپن کے سنجیدگی ضرور قائم رکھنا پڑتی ہے۔ نیاز ایک کامل فن ہونے کی حیثیت سے آزاد ہیں۔ وہ اپنے اسلوب میں جس قدر چاہیں رعنائی پیدا کر سکتے ہیں اور یہ رعنائی جس قدر بڑھی ہوئی ہوگی اُنکی ادبی شان میں اُتنا ہی اضافہ ہوگا۔ مولانا ابوالکلام کے بہ نسبت حضرت نیاز کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہے۔ ادبیات اُردو کا ہر طالب علم نیاز کی تحریروں کی طرف نظر شوق کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اور انکے مطالعہ کے بعد کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی وہ امر ہے جسکو مدنظر رکھتے ہوئے نیاز کی عجیب و غریب ترکیبوں اور نامانوس الفاظ سے خوف ہے کہ کہیں وہ اُردو اسلوب بیان کے لیے مضر ثابت ہوں آجکل اُردو کے دلدادہ اپنی انشاپردازی کو اکثر حضرت نیاز کے اسلوب کی پیروی کے ساتھ شروع کرتے ہیں، ..... اور لطف یہ کہ مضمون نگار حضرت نیاز کی طرح خود بھی نئے نئے

الفاظ ایجاد کرنے کے متمنی رہتے ہیں اور اس کوشش میں وہ اور بھی راہِ راست سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آجکل عربی میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور عربی زبان سے واقفیت حاصل کیے بغیر اس قسم کی "جرأتِ رندانہ" یقیناً "ایجادِ بندہ" سے کم نہیں ہو سکتی۔"

اسی پرچہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز سے "اُردو شعر و شاعری پر ایک نظر" ڈالی ہے شعر و شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے شاعر کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے بیان کو ان الفاظ میں سپردِ قلم فرماتے ہیں:

"بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ محض مقررہ اصول کے ماتحت خیالات کو موزوں کر دینا شاعری ہے۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محض الفاظ اور جملوں کو مقررہ اوزان میں ترتیب دینا شاعری ہے۔ کچھ لوگ اور ہیں جو اسکے قائل ہیں کہ دل میں جو خیال آئے اُسکو من وعن بیان کر دینا شاعری ہے۔ ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ترتیب خیال یا کلام میں اپنی انفرادی اور مخصوص حیثیت کو داخل کرنا ضروری سمجھتا ہو۔۔۔۔ پہلی اور دوسری جماعت کے لوگ تو مسلمہ طور پر لکیر کے فقیر ہیں۔ انکے متعلق کچھ کہنا بھی بیکار ہے۔ اور انکا کلام رلے سینا (دہلی) کی سرکاری عمارات ہیں جو اس درجہ یکساں اور سپاٹ واقع ہوئی ہیں کہ انکی امتیازی خصوصیت صرف انکی کثرت تعداد ہے..... تیسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر آسکے تو نہ آئے، مگر اُسے "صفحہ قرطاس" پر ضرور آنا چاہیے۔ یہی کمال انشاپردازی ہے جسمیں تغیر و تبدل کرنے سے آرٹ کا خون ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کے نزدیک انکی ہر لغزش پر بنگی کا جواز آرٹ میں مل سکتا ہے۔ انکے نزدیک دو اور دو کہنا بھی آرٹ ہے اور دو اور دو چار سو کہنا بھی آرٹ، اپنی کمزوریاں بھی آرٹ، اور دوسروں کی بیویاں بھی آرٹ۔ غرضکہ آپ کسی بے سُکے پن کو آرٹ بنا سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اپنی زبان و قلم، لب و لہجہ، صورت شکل، یا قول و فعل کو علی الرغم تقریرات ہند یا ایڈیٹر سنچ برسرکار لا سکیں۔ بالفاظ دیگر بنفس نفیس آرٹ بن جائیں!"

رسید کتب

۱۔ نفسیات ترغیب	پروفیسر وہاج الدین	مکتبہ دارالمصنفین اعظم گڈھ
۲۔ اقتباسات سیرۃ النبی	پروفیسر	مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
۳۔ براؤننگ	سید وقار احمد	منزل حیدرآباد
۴۔ آئین اُردو	مولوی زین العابدین	رشاد کوتانوی۔ میرٹھ

تنقیدیں

التربیۃ الاستقلالیہ مترجمہ مولوی عبدالسلام ندوی۔ حجم ۲۰۸ صفحے۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ۔ ملنے کا پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ قیمت ۸؎

ہندوستان میں اولاد کی تربیت کی طرف سے بہت بے توجہی برتی جاتی ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی پستی کی اصلی وجہ یہی بے توجہی ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ملک میں تربیت اولاد کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے کچھ لٹریچر شایع کیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ کتاب بھی آئی ہے۔

اصل کتاب فرانسیسی زبان میں الفونس اکیدوس نے لکھی تھی، شیخ عبدالعزیز افندی محمد قاضی محاکم المنصور نے اسے عربی میں ترجمہ کیا، اور مولوی عبدالسلام ندوی نے اسکے ضروری حصوں کو اردو لباس پہنا کر شایع کیا ہے۔ یہ کتاب افسانے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر اراسم کسی سیاسی جرم میں گرفتار ہوکر ایک طویل زمانے کے لیے اپنی بیوی سے جدا ہوگیا ہے، جسکی گود میں ایک بچہ ہے، اور اس بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق جیل کے اندر سے میاں بیوی کے درمیان خط و کتابت ہوتی ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے خطوط کو اخذ کرکے فسانہ کو خارج کر دیا۔ گویا فسانے کا ترجمہ انکی شان کے خلاف تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس ادبی چراحی کی بدولت کتاب کی دلچسپی میں کمی ہوگئی ہے۔ بہرحال زمانۂ حال سے عہد شباب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین اصول جمع کر دیے گئے ہیں جسسے بچوں میں آزادی اور استقلال کی روح پیدا ہو اور چیزاً تقلید کی عادتیں اُن میں نہ پیدا ہوں۔ الفونس سن تمیز سے پہلے مذہبی تعلیمات و تلقینات کو بھی ضروری نہیں قرار دیتا۔ یہ خیال شاید مشرقی دنیا میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے، مگر اسکے علاوہ پوری کتاب کا ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اسکو بار بار پڑھا جائے۔ شروع میں مترجم موصوف نے تعلیم قدیم و تعلیم جدید کے اختلافات پر ۹۶ صفحے کا پُرمغز اور مفید مضمون بطور مقدمہ شامل کر دیا ہے۔ جسکے مطالعہ سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں جو عظیم الشان علمی ترقیاں ہوئیں یا جیسے پاکیزہ سیرۃ لوگ پیدا ہوئے وہ کس طریقۂ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ چودھویں صدی میں اگر اُن طریقوں کا اتباع کامل دشوار و محال ہو تو کبھی کبھی اُس زمانہ کے حالات و خصوصیات پر تو نظر کر لینا چاہیے تاکہ اپنے اولوالعزم اور مایہ دار اسلاف کی یاد سے موجودہ تغیر شدہ حالات میں بھی کچھ نہ کچھ مدد مل سکے۔

بادۂ ناب مصنفۂ میر ولی اللہ وکیل ایبٹ آباد۔ ضخامت ۵۲ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔ طباعت و کتابت نہایت دیدہ زیب۔

یہ کتاب مولوی ولی اللہ صاحب کی فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں جو دکتور محمد علیخاں وکیل ایبٹ آباد کے قلم سے ایک دیباچہ ہے۔ میر صاحب نے حسن و عشق اور گل و بلبل کے مضمون کو چھوڑ کر اپنے قیمتی خیالات کو سادہ لباس پہنایا ہے۔ ان رباعیات میں مسلمانوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ

پھر اپنے اصلی مذہب کی طرف رجوع کریں۔ اور قرآن کریم کے سادہ اصول کی پابندی کریں :-

تیرہ شب کفر صبح ایماں روشن تاریک رو فلسفہ قرآں روشن
تا یہ کہ غلام شہ یثرب نہ کند کاشانہ دل بفیض یوناں روشن

مغربی تہذیب اُن کا خیال ہے کہ روحانیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس لیے جگہ جگہ اُس سے احتراز کی تعلیم دی ہے :

مرو بہ پیش بیکن و دل چہ حاصل باشد ترا سعی باطل
بیاموز حکمت از یونان و فارابی چراغ راہ خود خود باش ایدل

زیادہ تر میر صاحب کے کلام پر اقبال اور اکبر کا رنگ چڑھا ہوا ہے مگر سادگی بیان بالکل اور جنبل ہے۔ ان رباعیات میں شاعرانہ صنایع و بدایع نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی امراض کا علاج ضرور ہے۔

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اڑتیسویں اجلاس منعقدہ ۲۶-۲۷ دسمبر ۱۹۲۵ء بمقام علی گڈھ کی رپورٹ پیش نظر ہے۔ خطبۂ صدارت میں بجائے پُرشکوہ الفاظ کے کچھ کارآمد تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ جناب صدر نے تجارتی اور صنعتی تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔ اور بچوں کی اخلاقی تربیت پر مفید مشورہ دیا ہے۔ اُنھوں نے صاف صاف کہدیا کہ اسلامی درس گاہیں اس لیے قائم کی جاتی ہیں کہ نئی پود کی تہذیب اخلاق کا بھی سامان کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان اسلامی درسگاہوں کی پیداوار بھی دوسرے طالب علموں سے بہتر اخلاق کے ساتھ آراستہ نہیں ہوتی۔ اسی ضمن میں مذہبی تعلیم کی ناگفتہ حالت کا کھلے کھلے الفاظ میں اظہار کر دیا ہے کاش مسلم یونیورسٹی ان الفاظ کی روشنی میں اپنی حالت کا جائزہ لیتی!

اسکے بعد سکرٹری کی سالانہ رپورٹ ہے۔ کانفرنس کی علمی خدمات میں تعلیمی وظائف اور تعلیمی لٹریچر کی اشاعت خاص طور پر قابل مبارک باد ہے۔ گو مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کیلیے یہ کافی نہیں کہا جا سکتا۔ ممالک متحدہ کی تعلیمی رپورٹ میں سوائے گورنمنٹ سے خط و کتابت کرنے کے اور کچھ نہیں۔ مگر ممالک متحدہ کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ایک طویل نوم کے بعد جاگی ہے۔ آیندہ کچھ مفید خدمات کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ اسکے بعد کفایت شعاری اور مسلم یونیورسٹی اور ٹیکنیکل تعلیم پر دو مفید و پُراز معلومات لکچر ہیں۔ اس اجلاس کی اہم تجویزیں حسب ذیل ہیں :

ترقی تعلیم کے لیے کو اپریٹو سوسائٹیوں کا قیام۔ مسلم یونیورسٹی کو ابتدائی تعلیم کو مفت و جبریہ کرنا۔

ان تجویزوں کی تعمیل کے لیے "سلطان جہاں شنزل" اور مسلم یونیورسٹی لگی ہوئی ہیں۔

ندائے روح مترجمہ پنڈت پربھو دیال عاشق لکھنوی۔ ضخامت ۱۱۵ صفحے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ نولکشور پریس بکڈپو لکھنؤ یا سری مصر آشرم چھاؤنی نینی تال (صوبہ متوسط)

بھگوت گیتا ہندو فلسفۂ روحانیت پر سب سے مشہور کتاب ہے۔ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانوں میں اسکے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اُردو میں بھی اسکے ایک سے زائد ترجمے موجود ہیں۔ غذے روح بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے۔ نظم میں روانی کی کمی ہے لیکن لفظی ترجمہ کا یہ لازمہ ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اگر اُردو کو ہندی الفاظ سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی تو پھر ہندوؤں کا رہا سہا تعلق بھی منقطع ہو جائیگا۔ شروع میں ایک بسیط دیباچہ ہے جس سے نظم کے سمجھنے میں مدد ملیگی۔ آخر میں غیر مانوس سنسکرت الفاظ کے تلفظ اور معنی درج کر دیے گئے ہیں۔ اور کتاب میں جا بجا تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ مصنف صاحب اپنی جانفشانی پر مبارکباد کے مستحق ہیں مگر فلسفہ کی کتابوں کا لطف ترجمہ اور پھر منظوم ترجمہ میں کہاں ممکن ہے!

فتنۂ خلق قرآن — مترجمہ ملک یحییٰ امام خاں نوشہروی۔ حجم ۹۸ صفحے۔ ملنے کا پتہ: منیجر لکھنؤ بکڈپو گوجرانوالہ۔

اسلام کے اُس پُرآشوب زمانہ میں جبکہ خلیفہ مامون الرشید نے معتزلہ کی طلاقت لسانی کے فریب میں آکر مسئلۂ خلق قرآن کو گویا بطور قانون نافذ کر دیا تھا۔ امام عبدالعزیز سرکھب مکہ شریف سے بغداد پہونچے اور فتنۂ خلق قرآن کی پُرزور مخالفت فرمائی۔ اسی زمانہ میں آپ نے اس مسئلہ پر کتاب الحیدہ بھی تصنیف فرمائی جسکا اُردو ترجمہ آج پیش نظر ہے۔ مغربی تعلیم اور عیسائی مشنریوں کے اثر سے اسوقت نئے تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ انکے لیے اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

قادیانی نبی — مولفہ مولوی لیاقت اللہ خاں۔ حجم ۲۸ صفحے۔ مولف سے کشمیری محلہ، شملہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

اس رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے اقوال، الہامات آپس میں متضاد اور مختلف ہیں، لہٰذا اُن کا کلام الہام نہیں اور وہ خدا کے فرستادہ نہیں۔ بعض اقوال سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب دروغگوئی اور توہین انبیاء کرام کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کتاب میں کسی قسم کی بحث نہیں کی گئی ہے صرف وہ اقوال درج کر دیے گئے ہیں جنسے مذکورۂ بالا نتائج نکلتے ہیں

مصباح القوافی — مصنفہ مولوی سید محمد نقوی۔ چھوٹی تقطیع کے سولہ صفحوں پر ۳ر میں مصنف سے (دیوان خانہ سرسی ضلع مراد آباد) طلب فرمائیے۔

جناب مصنف نے ۶۸ اشعار میں تمام القاب حروف و حرکات قافیہ اور اُن سب کی تعریفات نظم کر دی ہیں۔ طلبا کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ نظم مجبوراً ہیت ثقیل ہو گئی ہے۔

میلاد نبیؐ — مولفہ مولوی سید نذیر علی ثاقب پانی پتی۔ ضخامت پاکٹ سائز کے ۲۲۴ صفحے۔ ملنے کا پتہ سید نذیر علی، وکیل راجگڈھ (بیکانیر)

اس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں۔ مگر سوانح رسول مقبول

مختصر ہیں کہ شاید محفل سماع میں بھی پڑھنے کے لیے ناکافی ہوں۔ البتہ پیشہ ور سماع خوانوں کے لیے دلچسپ ترانوں کا اچھا ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے۔

نغمہ اور اسلام مولفہ مولوی محمد علی شاہ سکیش۔ حجم ۴۷ صفحے۔ قیمت ۱۲ر

اس رسالہ میں مولف موصوف نے ساز اور سماع محضہ کے جواز پر بہت سے دلائل جمع کر دیے ہیں۔ اس مسئلہ پر اتنی بحث ہو چکی ہے کہ موافق اور مخالف تمام دلائل پبلک کے سامنے پیش ہو چکی ہیں اور ہر فرد اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اسلیے اب اس پر خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ شروع میں "اعتذار" کے عنوان سے مولف نے اپنی علالت کا حال بیان کیا ہے (؟) اور اسے ادبی فروگذاشتوں کا سبب قرار دیا ہے۔ شاید پڑھنے والوں کو اس حصہ سے بھی دلچسپی ہو!

تواریخ وصال مولفہ شاہ غلام جیلانی رزاقی بانسوی۔ مطبوعہ احمد المطابع کانپور، غالباً سید ممتاز احمد صاحب سجادہ نشین بانسہ شریف سے ۳ر میں مل سکتی ہے

اس میں مشاہیر اولیا و متقدمین و متاخرین کے وصال کی تاریخیں درج ہیں۔ مرشدوں اور مریدوں کے لیے کارآمد چیز ہے۔

یا رسولؐ مصنفہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب۔ مطبوعہ مرغوب الجنسی لاہور۔ ضخامت چھوٹے سائز کے ۸۰ صفحات۔ قیمت ۶ر

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں قومی اور ملی ہیرو کی اہمیت، اس کے اقسام پر بحث کر کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے روحانی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آپ کی تقلید و تابعیت کے لیے محافل سماع کو بہت ضروری قرار دیا ہے۔

دوسرے حصہ میں اسوۂ حسنہ رسولؐ اور تعلیمات نبوی پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اسی ضمن میں احادیث کے استناد پر بھی کچھ بحث آگئی ہے۔ عقائد کے صحیح اصول پر نشو و نما پانے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسکی زبان سلیس اور خیالات سلجھے ہوئے ہیں اگرچہ تفصیلی بحث نہ ہونے کی وجہ سے جا بجا تشنہ رہ گئے۔ دلائل کی تنقید کرتے وقت اگر مغربی اسلوب بیان بھی پیش نظر رکھا جاتا تو کتاب زیادہ قیمتی ہو جاتی۔

خیاباں سید کے نام سے سید شہنشاہ حسین رضوی ایم اے ایل ایل بی وکیل لکھنؤ نے ایک رسالہ اسی نو مہرسے جاری کیا ہے۔ ابھی پہلا ہی پرچہ نکلا ہے اس لیے کسی قسم کی رائے کا اظہار قبل از وقت ہوگا۔ البتہ دلی مسرت کے ساتھ نئے معاصر کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور جو توقعات کہ گذشتہ سال اکبر ... مقامی معاصر کے اجرائے وابستہ کی گئی تھیں اور جو افسوس ہے کہ نہیں پوری ہوئیں، وہ اس پرچہ سے ... بجا نہ ہوگا اس لیے کہ سید شہنشاہ حسین صاحب سے زیادہ اس کام کیلیے کون موزوں ہے ... حضرات کو عموماً اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو خصوصاً اردو کی خدمت پر آمادہ کر سکیں اور ان کے ... کا وہی جوش و ولولہ پیدا کر دیں جسکی آگ خود انکے قلب کو گرماتی رہتی ہے۔ سالانہ چندہ ۵ر ہے

ظفر الملک

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(نومبر ۱۹۲۶ء)

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ

معارف - اعظم گڈھ

(۱) حجاز کے کتبخانے
(۲) غار ایلورا
(۳) ارتقائے ادب فارسی عہد اکبر میں

زمانہ - کانپور

(۱) مورخین اُردو
(۲) کربلا
(۳) شہید نمایش

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) ہندوستان کی پکچر نگاری
(۳) نمبش تاتمام (فسانہ)

جامعہ - دہلی

(۱) ہندوستانی زراعت کی کمزوریاں
(۲) چینی و مغربی تہذیب کا مقابلہ
(۳) ہندوستان کی تعلیمی حالت

مرقع - لکھنؤ

(۱) شعرا و علم

ہزار داستاں - لاہور

(۱) چاند اور تارے
(۲) گردش ایام (فسانہ)
(۳) امرا کی شاعری

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) عالمگیر اعظم کا بومبیہ پروگرام
(۲) مسلمان عورتیں اور نیا زمانہ
(۳) ایک خواب کی تعبیر

پیمانہ - آگرہ

(۱) دول اتحاد کے قرضے اور دنیا کا مستقبل
(۲) قانون تمدن اور سیاسیات مدن
(۳) لسان العصر

سہیل - علی گڈھ

(۱) ایری ایڈنی (افسانہ)
(۲) قاصد سحاب
(۳) اُردو کے اسالیب بیاں
(۴) اُردو شاعری پر ایک نظر

علیگڈھ میگزین - (تعطیل نمبر)

(۱) فلسفۂ تمدن اور اسلام
(۲) یورپ ایک طالب علم کے نقطہ نظر سے

نظرے خوش گذرے

مولانا محمد علی کو ایڈیٹر الناظر سے شکایت ہے کہ ۱۹۱۸ء میں مہاراجہ صاحب محمود آباد نے انکو پانچ ہزار روپئے ارسال فرمائے تو اُس پر سختی سے اعتراض کیا گیا اور وہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مہاراجہ ہوں یا آغا خاں، کسی سے بھی مالی امداد قبول کرنے کے بعد وہ "متاثر" نہیں ہوتے۔ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ جس اخبار میں مولانا محمد علی کی یہ تحریر شایع ہوئی ہے اُسی میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کا وہ تار بھی شایع ہوا ہے جو اُنھوں نے بحیثیت صدر مظاہرہ عام لکھنؤ، شہنشاہ جارج پنجم کے نام بھیجا ہے اور جس میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ

"یہ مسلم رعایا یور امپیریل مجسٹی سے بطور شاہ مسلمانان ہند ملتجی ہے کہ یور مجسٹی اپنی گورنمنٹ کو ہدایت فرمائیں کہ جس انہدام کا خطرہ درپیش ہے اُسکو روکنے کے لیے وہ ضروری قدم اُٹھائے۔"

اور حجاز مقدس کے معاملات میں غیر مسلم حکومت کو مداخلت کرنے کی اس دعوت صریح کے متعلق مولانا محمد علی نے اسوقت تک اپنے اخبار میں ایک حرفِ انتباہ بھی شایع فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ حالانکہ اگر اسی قسم کی ملت فروشانہ اور غدارانہ التجا سر شفیع، سر علی امام، یا سر عبدالرحیم کی جانب سے کی گئی ہوتی، تو گمان نہ تھا کہ ہمدرد کے ضعیف و زبن کالم اس بے غیرتی و خباثت کے خلاف انتہائی غیظ و غضب کے اظہار کے لیے وقف نہ ہو جاتے۔ یہی نہیں۔ بلکہ جب ۵۔ دسمبر کو مجلس خلافت میں اُنکے ہمخیال اراکین تجاویز سازی کے دلچسپ مشغلہ میں مصروف تھے اور ایک تجویز اس مضمون کی تیار کی گئی کہ

"مسلمانان ہند، بقیہ دنیائے اسلام کے ساتھ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کو کسی ہیئت و صورت میں اور کسی بہانہ سے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔"

تو اُسوقت بھی نہ مولانا محمد علی صاحب کو اور نہ اُنکے متبعین اور رفقاء کو اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ مہاراجہ محمود آباد کی اس روش پر کم سے کم اظہا
مہاراجہ محمود آباد نے اپنے اس تار کے ذریعہ اسلام ا
ہند کے ساتھ جو بد دیانتی و بے وفائی کی ہے اُسکے مقابلہ میں

عالانکہ واقعہ یہ ہے کہ
، جو غداری اور مسلمانان
ب کی مجلس خلافت سے

"بغاوت" اور ابن سعود کی مسلمانان عالم سے وعدہ خلافی بھی ہیچ ہے۔

ابھی گذشتہ ستمبر میں لکھنؤ کی حجاز کانفرنس میں کس بلند آہنگی کے ساتھ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کو گوارا کرنے سے انکار کیا گیا تھا اور تین مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ خود حجاز کانفرنس کے کرتا دھرتا کی طرف سے مداخلت کی التجا پیش ہو گئی۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس مظاہرۂ عام کے صدر کی حیثیت میں یہ التجا پیش کی گئی ہے اُس نے نہ تو اس قسم کی کوئی تجویز منظور کی اور نہ صدر کو اس مضمون کا تار بھیجنے کی اجازت دی۔ مگر مہاراجہ صاحب جنھیں خدائے قادر و توانا کے حق بندگی اور اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حق غلامی سے زیادہ حکومت کے حق نمک کا پاس و لحاظ ہے دراصل مہینوں سے اسکے لیے بیتاب ہو رہے تھے کہ حکومت انگریزی کو معاملات حجاز میں جس قسم کی دخل دہی مطلوب ہے اُس کا سامان اُنکی معرفت مہیا ہو جائے اور جس طرح اُنکے ایک سالار قافلہ کی غداری نے عباسیوں کی حکومت بغداد کو تاخت و تاراج کرا دیا تھا اُسی طرح ملت عربیہ اور حجاز کی مقدس سرزمین کو تباہ و برباد کرنے کا طعمۂ امتیاز اُنکو حاصل ہو جائے۔ اسلیے نہ اُنھوں نے مجالس عام کے قواعد و قانون کی پروا کی، نہ حجاز کانفرنس کی قرارداد کا لحاظ کیا، نہ مسلمانوں میں اپنی رسوائی و بے آبروئی کا خوف کیا، نہ ملت اسلامیہ کے غیظ و غضب کا اندیشہ کیا اور جو کچھ دل میں ٹھانے ہوئے تھے اُسے ایک ذرا سا موقع پانے پر فوراً کر بیٹھے۔

انجمن خدام الحرمین کے باجبہ و دستار علما و مجتہدین سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے سرغنہ کی اس ملت فروشی و دین کشی کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کریں گے لیکن مجلس خلافت کے غیور اراکین اور علی برادران جیسے مردانِ راہ خدا کی خاموشی غایت درجہ المناک و دردانگیز ہے۔

حجاز کانفرنس کے موقع پر ہم نے "مسلمانوں کو مشورہ" دینے کے خیال سے ایک اعلان شائع کیا تھا اور اسے بعض قومی اخبارات میں بھی شایع کرا دیا تھا تاکہ مقامی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بیرونی مسلمان بھی ان خیالات سے آگاہ ہو جائیں۔ مولانا محمد علی کو بدنصیبی سے یا تو اپنے متعلق یہ حسن ظن پیدا ہو گیا ہے کہ اُنکی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے یا اس خادم کے بارے میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُسکی رائے میں صحت کا امکان ہی نہیں ہے، اس لیے اُنھوں نے اس اعلان کو محض اس گمان پر کہ اس میں خطرات کو بہت بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا گیا ہے اپنے اخبار میں درج کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ جس خاص خطرہ کا اس تحریر میں ذکر تھا وہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اب

خود اُنکے معاونِ دیرینہ و لطف فرمائے خاص کی بدولت مسلمانوں کے سامنے آگیا ہے۔
نامناسب نہ ہوگا اگر الناظر کی وساطت سے اُس خطرہ کو ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کے روبرو پیش کردیا جائے جس کا اس اعلان کے ذریعہ اظہار کیا گیا تھا۔ وہ ہو ہذا:—

"اور اگر حج کو بند کرنے کی تجویز سے قطع نظر کرکے ہمارے بھائیوں نے برطانوی حکومت سے اس معاملہ میں دخل دینے کی درخواست کی تو اُسکا بھی یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ عراق و فلسطین کی طرح خدانخواستہ حجاز و نجد بھی انگریزی تصرف میں آجائیں انگریزوں کی پالیسی صاف ظاہر ہے۔ وہ ہر نہج سے عربوں کو اپنے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ خلیج فارس کے تقریباً تمام چھوٹے چھوٹے عربی سردار انگریزوں کے ماتحت ہیں۔ یمن، عسیر، حجاز و نجد کے سوا باقی سارا جزیرۃ العرب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ کیا مسلمانانِ ہند کو اب یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ جزیرۃ العرب کے یہ چند صوبے بھی مسلمانوں کے قبضہ میں رہیں؟ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر نجد و حجاز پر انگریزوں کا تصرف ہوگیا تو پھر یمن و عسیر کے دن آزاد رہ سکیں گے؟

پس تاریخ میں جس طرح یہ واقعہ ہمیشہ یادگار رہیگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت شیر خدا کے جگر گوشہ امام حسین علیہ السلام اور خاندان رسالت کی اُن یادگاروں کو جو اُنکے ہمرکاب تھے میدان کربلا میں ایک مسلمان تاجدار کے ایما سے ایک اسلامی فوج نے شہید کردیا، اُسی طرح کیا ہندوستان کے مسلمان یہ تاریخی یادگار چھوڑنا چاہتے ہیں کہ جزیرۃ العرب کی چپہ چپہ زمین کو اُنھوں نے اپنے بدنصیب ہاتھوں سے مسیحیوں کے تصرف میں دیدیا؟"

مولانا محمد علی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی بار اُن سے (مہاراجہ محمود آباد سے) اختلاف کیا۔ ہمیں مولانا محمد علی کے دونوں اخبارات کامریڈ و ہمدرد کے مستقل مطالعہ کا [illegible] سے شرف حاصل رہا ہے اور جہاں تک ہمیں یاد ہے مولانا نے کبھی بھی مہاراجہ صاحب [illegible] ب فرمانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس طرح آغا خاں، امیر علی، سر شفیع [illegible] کو وہ مخاطب فرماتے رہے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جتنی ملت [illegible] داری، جتنی

اسلام دشمنی اور متبنی ایمان کشی مہاراجہ صاحب سے ظاہر ہوئی ہے ہندوستان کے مسلمان شاہیر میں سے کسی کا دامن بھی اس قدر داغدار نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حکومت کے شرائط کے مطابق اور مسلمانوں کے مطالبات عام کے علی الرغم کس کی دسیسہ کاریوں کا رہین منت ہے؟

مسلم لیگ میں ۱۹۱۸ء کے اجلاس کی اہم تجاویز کو پیش کرنے کا وعدہ کرکے کون فرار ہوا تھا۔ اور کس نے حکومت کو یاد کرانا چاہا کہ یہ چند شوریدہ سروں کی کارروائی ہے ورنہ نیازمندانِ وفاکیش کو ایسی ہرزہ سرائیوں سے کیا سروکار؟

۱۹۱۹ء میں جب لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی تو کس نے اُسکے دعوتی خط پر دستخط ثبت کرنے کے بعد اس بہانہ سے واپس لے لئے کہ علی گڈھ پارٹی کہیں اس اجتماع سے علٰحدہ نہ رہ جائے۔ اور جب شیخ عبداللہ کے دستخط اور محترم ایڈیٹر البشیر جیسے علی گڈھ والوں کی تحریر ہمدردی حاصل کرلی گئی تو کون چھپ کر گھر بیٹھ رہا؟

۱۹۲۰ء میں دوستوں، نیازمندوں اور اہل ملک کی رائے عامہ کے اصرار پیہم کے علی الرغم کون شخص تھا جسنے مسز اینی بسنٹ کے مقابلہ میں کانگریس کی صدارت کی امیدواری سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کیا۔ ۱۹۲۱ء میں کس نے لیگ کی صدارت پر اپنا دوبارہ انتخاب اس ضد سے کرایا کہ رفیق خاص کو قلمدان معتمدی بھی دیا جائے۔ اور پھر کس نے لاٹ صاحب کے اشارۂ چشم پر چل کر استعفا دیدیا؟

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران میں جبکہ ترکی حکومت کا وجود اور جزیرۃ العرب کی آزادی معرض خطر میں تھی، اور ملک کو لڑکوں اور نوجوانوں سے لیکر ادھیڑوں اور بوڑھوں تک ایک ایک فرد کی ضرورت تھی، کس نے قوم و ملک سے بے اعتنائی کرکے حکومت کی غلامی کا طوق زریں اپنی گردن کو تاد کے لیے پسند کیا؟ کس نے لاکھوں روپیہ اور سیکڑوں رنگروٹوں کی امداد دیکر اپنے دامن حریت کو خوں آلود کیا؟ اور کس نے حکومت کے ایک خونی جلاد کی طرح سیکڑوں ہزاروں خادمان ملک وملت کو جیل خانوں میں بھر دیا؟

اور ان تمام جفاکیشیوں اور غداریوں کے بعد آج جبکہ مسلمانان ہند باہمی تفریق و انتشار کی بدولت کشتی بے ناخدا کی طرح منجدھار میں پھنسے ہوئے ہیں، کس نے مارآستیں بنکر حجاز کی مقدس سرزمین پر فرنگیوں کو اپنا دام تزویر پھیلانے کی دعوت دی؟

کیا آغا خاں، امیر علی، سر شفیع یا سر عبدالرحیم وغیرہ میں سے کسی ایک وفا کیش حکومت نے بھی مسلمانوں کے جسم قومی پر اس طرح پے بہ پے تیر اندازی کی ہے؟ پھر اُن سب کے متعلق تو مولانا محمد علی کا قلم انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں روانی کے ساتھ ناراضی و بے اعتمادی حقارت و ملامت، کے اظہار سے دریغ نہیں کرتا۔ پھر یہ کیا ہے کہ جناب مہاراجہ صاحب کا معاملہ سامنے آیا اور سارا جوش و خروش رخصت ہوگیا اور سارا جذبۂ وولولہ سرد پڑ گیا؟ ہم جانتے ہیں اور دل سے یقین رکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی دام لیکر کام کرنے کے عادی نہیں، لیکن کیا انسانی فطرت کا یہ تقاضا نہیں کہ جو شخص کسی کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہو اُس کے دل میں اپنے محسن کے متعلق حُسن ظن راسخ ہو جائے اور جب کبھی کوئی نازک موقع آئے تو اُسی حُسن ظن کی بدولت انسان مغالطہ میں آجائے اور اپنے محسن کی کمزوریوں کا صحیح احساس کرنے سے قاصر رہے۔

یقین واثق ہے کہ جلد یا دیر مولانا محمد علی صاحب اسکو جان جائیں گے کہ مہاراجہ محمود آباد کے اعلانات وطن پرستی و قوم دوستی کی حقیقت کیا ہے۔ اسی التجائے مداخلت کے بارے میں جب وہ غور فرمائیں گے کہ اس نے حجاز کے لیے کن کن روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں کا دروازہ کھول دیا ہے، تو جس طرح اُنھوں نے آغا خاں کی امداد پر لات ماردی، انشاء اللہ ایک دن وہ مہاراجہ صاحب سے بھی منہ موڑ لیں گے، اور جس طرح آج وہ ایک پیشہ ور عیار کی قباء کیادی کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں، اُسی طرح بلکہ اس سے زیادہ قوت کے ساتھ وہ مہاراجہ صاحب کی بازیگریوں کو بے نقاب کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور جب تک وہ وقت نہ آجائے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً مولانا کو ٹوکتے رہیں۔

مہاراجہ صاحب کی التجائے مداخلت کے عواقب و نتائج کا اندازہ عام مسلمانوں کو تو ہو نہیں سکتا لیکن جن اصحاب کو برطانوی سیاست کا کچھ بخوبی جان گئے ہونگے کہ یہ کتنا بڑا فتنہ ہے۔ سلطان ابن سعود کے بارے میں ہ اتنی قوت نہیں رکھتے کہ برطانیہ سے لڑائی مول لیں۔ یہ بھی صاف ظاہ رت کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو سکتی کہ حجاز پر براہِ راست قبضہ کرنے پر آمادہ ہ ے۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ہر شخص کو معلوم ہے کہ حجاز اور سارے جزیرۃ العرب کو لطائف الحیل فرانس و اطالیہ کی آنکھ

بجا کر اپنے زیر اثر و اقتدار لانا اُسکی تمنائے دیرینہ اور سیاست موجودہ کا ایک ضروری مطمح نظر ہے شریف حسین کے زمانہ میں باوجودیکہ اُس بدنصیب نے خلیفہ سے غداری کر کے مسلمانوں کے خون سے انگریزوں کے خط غلامی پر اپنے دستخط ثبت کر دیے تھے، انگریزوں کو اتنی مداخلت بھی حاصل نہ ہو سکی کہ حجاج ہندی کی خدمت کے نام سے ایک اسپتال مکہ معظمہ میں قائم رہ سکتا۔ لیکن عرب کے دو سرداروں کی باہمی جنگ نے جو کمزوری پیدا کی اُسکے بدولت حکومت برطانیہ کی یہ تمنا تو اسی سال پوری ہوگئی۔ اور سمجھنا چاہیے کہ اندرون حجاز میں Peaceful penetration "مصالحانہ دخلیابی" کی بنیاد پڑ گئی۔ اب اسکے بعد دوسرا قدم اُٹھانے کے لیے کسی بہانہ کی ضرورت تھی جو مہاراجہ صاحب محمود آباد کی عنایت سے فراہم ہو گیا ہے۔

مہاراجہ صاحب کے تار کی آڑ پکڑ کر برطانوی نمائندۂ حجاز سلطان ابن سعود کو کس جال میں پھنسانا چاہے گا؟ اسکا علم ہمیں یا دوسرے اہل ہند کو شاید عرصہ تک نہ ہو سکے گا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ مہاراجہ صاحب نے جس طرف قدم اُٹھانے کی التجا کی ہے اُسکی طرف خواہ قدم اُٹھے یا نہ اُٹھے مگر قدم اُٹھانے کی ضرورت کا اعادہ کر کے ابن سعود کے وزیر خارجہ کو ابھی خاصی گھبراہٹ میں تو مبتلا کر ہی دیا جائے گا اور اسکے پردے میں عجب نہیں کہ اندرون ملک حجاز میں دخلیابی کا دوسرا رُخ بھی رکھ دیا جائے۔ مسلمانوں کی آنکھیں کہیں اُسوقت کھلیں گی جب اُنکو روئے پر روا رکھتے جانے کے بعد اصل عمارت کے در و دیوار نظر آنے لگیں گے۔ خدا نہ کرے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت بھی باقی نہ رہے کہ وہ حجاز میں برطانوی چالبازیوں کی مضبوط سے مضبوط بنیادوں کو بیک ضرب جڑ سے نہ اُکھاڑ سکیں، لیکن مسلمانوں کی مآل اندیشی اور مصلحت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اجانب کی مداخلت کا مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے قبل ہی وہ اُنکی ریشہ دوانیوں کا استیصال کلی کر دیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ دہلی میں ایک مخالف اجتماع کر کے مہاراجہ صاحب کے طریق کار سے بیزاری کا اظہار کر دیا گیا۔ لیکن ہم اسے قطعاً ناکافی سمجھتے ہیں۔ اس شرارت کا اگر کچھ انسداد ممکن ہے تو مسلمانوں کی ہر بستی سے اگر نہیں تو کم سے کم تمام بڑے بڑے مرکزوں سے اس تار کے خلاف صدا بلند ہونا چاہیے۔ اور شہنشاہ جارج پنجم اور سلطان ابن سعود دونوں پر بکرات و مرات اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہیے کہ مہاراجہ صاحب کے اس تار کی اصلیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک خائش حکومت کی ذاتی اور حد درجہ قابل نفرت خواہش ہے۔ تاکہ ایک طرف حکومت انگریزی کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے آلۂ کار کی مُلک میں اب کیا وقعت باقی رہ گئی ہے، اور دوسری طرف سلطان ابن سعود

بھی اس سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں کہ اس تار کے پس پشت کوئی قوت ایسی موجود نہیں ہے جس سے اثر پذیر ہو کر برطانوی حکومت کی ملائیت دہی کے لیے کوئی خاص کارروائی کرنے پر مجبور ہو۔ مولانا محمد علی سے بھی یہ درخواست غالباً بیجا نہ ہوگی کہ وہ مہاراجہ صاحب کے اس تار پر کم سے کم اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، خواہ اُنکا لب ولہجہ کتنا ہی نرم، دوستانہ اور نیازمندانہ ہو۔

---

۳ و ۴ - دسمبر کو مجلس مرکزیہ خلافت کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا - وفد خلافت کی رپورٹ، جس پر اس جلسہ میں بحث ہونا تھی اکتوبر کی آخری تاریخوں میں شایع ہوئی تھی، اور اسلامی پریس میں اُسپر کافی بحث ہو چکی تھی، اس لیے توقع کی جا سکتی تھی کہ جلسہ میں بیٹھکر اراکین خلافت رپورٹ پر فضول مباحثہ میں وقت ضایع نہ کریں گے بلکہ اس رپورٹ کی روشنی میں اور باہمی تبادلۂ خیال کے بعد یہ طے کریں گے کہ آیندہ مسئلۂ حجاز میں کیا کارروائی کرنا چاہیے۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے نظام قومی میں ذاتی رنجشیں اور کدورتیں اور شخصی تفوق و امتیاز کا خیال اس درجہ دائر و سائر ہوگیا ہے کہ ہمارے سب کام اسکی وجہ سے ابتر رہتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ مجلس خلافت کے جلسہ کا جن لوگوں کو تماشا کرنے کا موقع ملا اُنکے لیے مسلمانان ہند کی سب سے نامور مجلس کی کارروائیاں حد درجہ دردناک و مایوس کُن ثابت ہوئیں۔

اہل ہند عموماً اور مسلمان خصوصاً انضباطِ اوقات کے خوگر نہیں ہیں - جو حالت ہمارے شخصی و انفرادی کاموں کی ہے اُسی کا عکس ہمارے تمام اجتماعی کاموں میں نمودار ہوتا ہے - جس قومی مجلس میں جایئے یہی بات جو دل کو مکدر بنائے گی وہ اراکین وحاضرین کا وقت پر نہ آنا ہے - جلسہ کی کارروائی دیر میں شروع کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضابطۂ عمل کی تکمیل کے لیے یا تو وقت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے اور اگر اسکا موقع نہ ہو، جیسا کہ بالعموم واقع ہوتا ہے تو بس جلدی جلدی تمام کارروائیاں ختم کرنا ہوتی ہیں اور اس عجلت کے باعث اکثر و بیشتر معاملات پر یا تو کافی غور و بحث نہیں کر سکتے، یا بہت سی کام کی باتیں رہ جاتی ہیں - پھر اُس پر طرہ یہ ہے کہ بہت سے اراکین موقع اور محل کو نظر انداز کر کے فضول و لاطائل تقریروں اور لفظی و بے معنی نزاعوں میں قیمتی وقت ضایع کرتے ہیں۔

توقع تھی کہ ۲ - دسمبر تک یا زیادہ سے زیادہ ۳ - دسمبر کی صبح کی گاڑ[illegible] اراکین لکھنؤ پہونچ جائیں گے - اور چند کے سوا بیشتر اراکین ایسے وقت تک لکھ[illegible] ب قرارداد بعد نماز جمعہ جلسہ کی کارروائی شروع ہو سکتی تھی، مگر صدر صاحب [illegible] ۳ - دسمبر کو

کلکتہ میل سے پہونچوں گا، جلسہ کی ابتدا رات میں ہو۔ پہلی ہی بسم اللہ غلط کردی۔ اور ستم ظریفی یہ دیکھیے کہ اس تار کے بعد بھی جناب صدر تشریف نہیں لائے، بلکہ ایک دوسرا تار بھیجکر یہ اطلاع دیدی کہ میں روانہ نہ ہو سکا۔ اب انتظار نہ کیا جائے۔ اس طرح بہ کے صرف سے مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے لیے تو اس کشمکش سے یقیناً نجات حاصل کرلی۔ لیکن مجلس خلافت کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوگیا۔

بعد مغرب جناب مولوی عبد القادر قصوری نائب صدر کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا تو پنجاب کے ایک رکن نے یہ سوال اُٹھایا کہ رپورٹ پر رئیس وفد مولانا سید سلیمان کے دستخط ہیں یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ نہ صرف رئیس وفد نے بلکہ کسی رکن نے اس قدر بامنا بطگی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بے شبہ سوال محض منا بطہ کا تھا، لیکن منا بطے اگر محض نظر انداز ہونے کے لیے ہیں تو مغربی طرز کی مجلسیں بنانے کی کیا ضرورت ہے، جبکا دار و مدار ہی تمامتر منا بطوں پر ہے۔ بہر صورت اراکین وفد نے اپنی خفا کا ہی کا اعتراف کرلیا اور مجلس کے روبرو ایک مطبوعہ رپورٹ پر ——— کیونکہ مسودات یہاں موجود نہ تھے، وہ عجب نہیں کہ بعض حصے بیئی میں بھی نہوں ——— دستخط فرما دیے۔ رئیس وفد نے صرف دستخط ہی نہیں فرمائے بلکہ چند سطروں کا ایک اختلافی نوٹ بھی اضافہ فرمادیا۔ جسنے ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس بحث میں دو گھنٹے رائیگاں گئیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے نوٹ پر اب کچھ لکھنا فضول ہے، خصوصاً جبکہ اُنھوں نے جلسہ کے کئی دن پیچھے، اور خدا معلوم کتنے غور و تامل، فہمایش و سرزنش، شکوہ و شکایت، یا ملاطفت و استمالت کے بعد اس بس کی گانٹھ کے لیے ایک تریاق بھی مہیا کردیا ہے۔ البتہ اس بات پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ رپورٹ کے معاملہ میں رئیس وفد کا سارا طرز عمل غایت درجہ الم آگیں، یاس افزا، اور سزاوار ملامت تھا۔

اختلافی نوٹ کی بحث کے خاتمہ پر جب شمار آرا کا وقت آیا تو رپورٹ کو رئیس وفد کے پاس مزید توضیح و تصریح کی غرض سے واپس بھیجنے والوں اور انکے مخالفین کی تعداد مساوی تھی۔ صاحب صدر رات کو ایک دفعہ جماعت مخالف (پنجاب و بنگال کے اراکین) کی موافقت کرچکے تھے، اس دفعہ اُنھوں نے صوبجات آگرہ و اودھ و دہلی کے نمایندوں کے حق میں تصفیہ کرکے تلافی مافات کردی۔

تیسری نشست میں جب ایک جزوی مسئلہ پر رائے شماری ہوئی اور لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ بنگال و پنجاب کے اراکین اقلیت میں ہیں تو فوراً ہی یہ تجویز سامنے آگئی کہ رپورٹ بلحظہ منظور کرلیجائے۔

اور ۴ - دسمبر کی نصف شب تک جلسہ کا وقت اسی بحث کی نذر ہوگیا - اور اگر صدر جلسہ کا مال ایک گھنٹہ کے بحث و مباحثہ کے بعد معینہ تاریخوں کے آگے بھی جلسہ کی کارروائی جاری رکھنے پر رضامند نہ ہو جاتے تو یہ جلسہ بالکل ہی بے نتیجہ طور پر ختم ہو جاتا -

تیسرے دن جلسہ ہوا تو بسبب اسکے کہ موتمر کی شاخ ہند کے بنیادی جلسہ کا اہتمام متعلق تھا، ہمیں جلسہ کی کارروائی کے مشاہدہ کا موقع نہیں ملا، مگر احباب سے یہ معلوم ہوا کہ بحث کسی نتیجہ پر نہ پہونچنے پائی تھی اور جن مقررین نے رات کو اپنے نام لکھا دیے تھے اُنکی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ وقت تمام ہوگیا اور جلسہ کو ختم کرنے کی تحریک پر باہم ایسی کچھ رد و قدح ہوئی کہ صاحب صدر کو اب مقاومت نہ رہی اور وہ اپنی پگڑی دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے جلسہ سے اُٹھ گئے - اُنکے جانے کے بعد پھر جلسہ منعقد کیا گیا تو ہمارے دوست عبدالماجد صاحب منصب صدارت پر فائز ہوئے اور چند لمحوں کے اندر مستد و تجاویز پیش ہو کر منظور ہوگئیں اور قریب قریب اکثر بحث طلب امور کا تصفیہ بھی ہوگیا ——— نہیں کہا جا سکتا کہ اس سبک خرامی کے لیے صدر اودھ خلافت کمیٹی کو مبارکباد دی جائے یا اُن اصحاب کو جو اخبار زمیندار کی اصطلاح میں "خداوندانِ خلافت" سے موسوم ہیں -

مولوی عبدالقادر قصوری نے جو بیان اُس روز کی کارروائی کے متعلق شائع کیا ہے اور جسکے متعلق اخبار "ہمدرد" کا فتوے یہ ہے کہ

"باطل" است انچہ مدعی گوید

اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف جلسہ کو بجائے خود برخاست کرکے اُٹھے تھے - مگر شاید ملاحیوں کی باڑھ نے اس درجہ اُنکو مضطرب کردیا تھا کہ جس طمانیت قلب کے ساتھ نشست اول میں اُنھوں نے اپنا فیصلہ خلافت کمیٹی کے کارکن سید ذاکر علی صاحب کو املا کرادیا تھا، اس موقع پر وہ اپنے حکم کو معرض تحریر میں نہ لا سکے - اور صدر کی اس اضطراری فروگذاشت سے فائدہ اُٹھاکر تمام کارروائیاں بظاہر ضابطہ کے بالکل مطابق انجام دے لی گئیں -

---

جلسہ کی روداد، الناظر میں مزید گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے نہیں شائع کی جا سکی - باقی ہے - دسمبر نمبر میں جو انشاء اللہ ۱۵ - جنوری سے پیشتر ہی شائع ہو جائے گا، باقی رہ جائے گی -

۲۰ - دسمبر ۱۹۲۶ء

ظفر الملک

راقم۔ میں نے شعر کو جس طرح تحریر کیا ہے طرز کتابت سے بھی ذہن اصل مطلب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے خلاصہ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو مخاطب کرکے میرزا نے ایک سوالی قائم کیا ہے کہ مجھکو موت کا انتظار کرنا چاہیے یا تم سے معاشقہ کرنا چاہیے اور خود ہی اسکو اسطرح سے حل کیا ہے کہ موت کا انتظار کیوں نہ کروں کہ اُسکا آنا یقینی ہے۔ یعنے موت کا انتظار ضرور کرنا چاہیے۔ دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کیا میں تم سے محبت کروں (تمکو چاہوں) کہ اگر تم نہ آؤ تو میں بلانے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا یعنے بہ نسبت اِسکے کہ تم سے معاشقہ کروں یہ بہتر ہے کہ موت کا انتظار کروں جسمین وصل کا میسر آنا لابدی ہے اور تم سے معاشقہ کرنے مین وصل تو درکنار اگر تم نہ آؤ تو تمھارے بلانے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔ علامہ موصوف نے دوسرے مصرعہ مین چاہوں بمعنی خواہم لیا ہے حالانکہ (تمکو چاہوں) از شما محبت کنم کی جگہ ہے۔

مولانا حسرت نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس پر کسی مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

میرزا غالب کا وہ کلام جسکو بے معنی کہا جاتا ہے ہر قسم کی تنقید سے مستغنی ہے۔ شارحین دیوان غالب خواہ میرزا کی ہمدردی میں یا اپنی اعلیٰ ذہنیت کے اظہار مین متواتر کوشش فرما رہے ہین کہ میرزا کے اِس کلام کو معانی سے ہم آغوش کرین ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کسی حد تک کوئی شارح کامیاب بھی ہو جائے۔ لیکن مین میرزا کے اِس کلام کو اگر اُسمین معانی مستور بھی ہوں بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کرونگا۔ کیونکہ میرا نارسا ذہن اِس دشوار خدمت کی انجام دہی مین معذور ہے۔ مذکورہ بالا کلام کا تذکرہ مضمون ہذا مین آیندہ "مشکل کلام" کہہ کر کیا جائیگا۔ قارئین کرام اور ناقدین عظام خود فیصلہ فرمائین کہ یہ "مشکل کلام" اگر معانی سے بیگانہ بھی نہیں ہے تو بھی میرزا کو غزل اردو کا کامیاب شاعر ثابت کرسکتا ہے یا نہین۔ میرزا کے کلام کا نصف حصہ تقریباً ایسا ہے جسکو "مشکل کلام" کے تحت مین داخل کرسکتے ہیں مگر میں صرف ۱۴ شعر انتخاب کرکے نذر ناظرین کرتا ہوں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بیخودی بیدلی نومیدی جاوید آساں ہو
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

رنگ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

کاوشِ کاوِ دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادۂ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سایل باندھا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

جوشِ خمِ دلِ ہے چشم میں موجِ خندہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

ابرِ شگفتہ تیرا بسا دانہ دل
ابرِ بہارِ غم کدہ کس کے دماغ کا

لبِ خشک در تشنگیِ مرگاں کا
زیارت کدہ ہے آبروئے آزادگاں کا

ہے نا اُمیدیِ ہمہ بدگمانی
ہیں واں کا

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ لے لیلیٰ آشنا

گردشِ رنگِ طرب یک نالۂ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مارنے پیدا نہ شد آشنا

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرواز

رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع
ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بطرز اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع

ترے خیال سے روح حریف آتی ہے
یہ جلوہ ریزی بادو بہ برفشانی شمع

نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے بہشت گل خزانی شمع

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک تنجانہ ہم

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم

درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتہ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو
پر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے
دعوی جمعیت احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل
یک جہاں زانو تامل در قفائی خندہ ہے

کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے
آئینہ زانوے فکر اختراع جلوہ ہے

تا کجا ای آگہی رنگ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

دل خون شدہ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

مندرجہ بالا کلام اور اسی قسم کے دیگر کلام کی بابت خواجہ حالی کا فتویٰ بھی نظر انداز

کرنے کے قابل نہین ہے۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۱ "ان اشعار کو مہمل کہدیا بے معنی مگر اسمین شک نہین کہ میرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہونگے۔ جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگون کا دل دکھتا ہی تو میرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوے کیون نہ دکھا ہوگا۔ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنیکے قابل تھے اُن کے کاٹنے پر میرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُنکی نظرمین کھٹکے ہون مگر چونکہ دیوان چھپکر شایع ہوچکا تھا اِسلیے اُنھون نے اِن اشعار کا نکالنا فضول سمجھا" خواجہ صاحب اِس مشکل کلام کو جسکا مختصر نمونہ آپ دیکھ چکے موجودہ دیوان غالب میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور دیوان غالب کی اشاعت ہوجانے کے بعد خواجہ صاحب کی رائے مین میرزا ایک حد تک معذور تھے ورنہ اُن کا قیاس قوی ہے کہ خود میرزا اِس قسم کے کلام کو اپنے دیوان سے خارج کردیتے۔

لیکن اردو زبان کی بدقسمتی پر جسقدر افسوس کیا جائے وہ کم ہی یہان تو اِس مشکل کلام مطبوعہ ہی کی وجہ سے شارحین میں کشمکش تھی میرزا غالب کی محترم شخصیت کی وجہ سے اُنکے کلام کو مہمل کہدینا بھی نامناسب معلوم ہوتا تھا اور با معنی قرار دیا جانا بھی ناممکن نظر آتا تھا زمانہ حال مین بھوپال کی حمیدیہ لائبریری مین میرزا غالب کے کلام کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوگیا جو دیوان مطبوعہ کے انتخاب سے قبل ہی بھوپال پہونچ چکا تھا۔ اِس مجموعہ مین وہ کلام بھی شامل ہی جسکو میرزا نے اپنے احباب کے مشورے سے اپنی جوہر آفرین طبع کی ملکیت سے خارج کردیا تھا مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے میرزا پرست جوش نے ریاست سے کثیر رقم خرچ کراکر "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے اس کلام کو بھ[illegible] مین نے مختلف رسائل مین "نسخہ حمیدیہ" سے منتخب کیے ہوئے کلام کو پڑ[illegible] ت ڈاکٹر مرحوم کی اِس خدمت کو بہت ہی اہم قرار دیتی ہے اور مرحو[illegible] مین ادا کیا جاتا ہی

"اور اِس عظیم الشان ادبی اضافہ سے زبان کی محرومی کو مٹا دیا" مجھے حیرت ہو کہ اِس جماعت کی نظر میں معلوم نہیں کہ ادبی کامیابی اور ادبی محرومی کے کیا معنی ہیں۔ بہرحال اِس مضمون کو مکمل کرنے کی غرض سے میں ناظرین کو تصدیع دیتا ہوں کہ چند اشعار کو اور ملاحظہ فرمائیں اور ادب اردو کی کامیابی یا محرومی پر کوئی نہ کوئی رائے قائم کریں۔ وہو ہذا۔

نہ کہہ کہ طاقت رسوائی وصال نہیں
اگر یہی عرق فتنہ ہے مکرر کھینچ

دریا نشاط دعوت سیلاب ہو اسدؔ
ساغر بہ بارگاہ دماغ رسیدہ کھینچ

آئینۂ امتحاں نظر تغافل۔ اسدؔ
شش جہت اسباب ہو دہم توکل منوز

شکوہ و درد و داغ ای بیوفا معذور رکھ
خونہائے یک جہاں اُمید ہو تیرا خیال

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہیں پناہیں

طلسم ہستی دل آں سوئے ہجوم اشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

صد رنگ گل کترتا در پردہ قتل کرنا
تیغ ادا انہیں ہے پابند بے نیامی

اگر آسودگی ہو مدعائے رنج بیتابی
نثار گردش پیمانۂ مے روزگار اپنا

سر لمک حسن کر میخانہ ہا نذر خمار
چشم مست یار سے ہو گردن مینا پہ باج

تمثال گل از آئینہ ہے عبرت بینش
نظارہ تحیر چنستان بقا ہیچ

سادہ و پرکار تر غافل و ہوشیار تر
مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل منوز

خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں
خود آشیان طائر رنگ پریدہ ہوں

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

ہیں چشم و اکشادۂ گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

خواجہ حالی مرحوم کی چند شہادتیں اور درج کیجاتی ہیں اور اسکے بعد میرزا کے دوسرے قسم کے کلام کا انتخاب مختصر پیش کیا جائیگا۔

یادگار غالب صفحہ ۱۸ "بہرحال میرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع و سلامتی ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۴ "میرزا کی طبیعت اِسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے..... عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہانتک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۸ "اُنکی غزل مین زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہین کیا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے۔ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے"

خواجہ کی رائے مین میرزا کا آخرالذکر کلام جو بیراہ روی چھوڑکر لکھا گیا ہے میرزا کی شاعری کا مایۂ ناز ہے وہ نزاکتوں کا مخزن ہے عام خیالات و محاورات سے علیحدہ ہے مضامین کے لحاظ سے اچھوتا ہے۔ میں میرزا کے اِس کلام کا "آسان کلام" کہہ کر تذکرہ کرونگا۔

مجھے افسوس ہے کہ آسان کلام مین عموماً وہ خوبیاں نہیں ہیں جسکو خواجہ نے اپنے حُسن ظن سے میرزا کے کلام مین موجود فرض کرلیا ہے۔ میرزا کے کلام سے تخمیناً دوسو اشعار مین ایسے منتخب کرچکا ہون جنکی بندش اور تخیل عامیانہ ہے، مضامین پامال شدہ ہین، اور ندرت و جدت کا کہین پتہ تک نہیں ہے۔ بنظر اختصار اُن دوسو اشعار منتخبہ میں سے صرف چند اشعار منتخب کرکے قارئین کے ملاحظہ کیلیے پیش کیے جاتے ہین اور اپنی مختصر تنقید بھی اشعار کیساتھ شامل کردی ہے اگر یہ سلسلہ آیندہ کچھ اور طویل ہوگا تو کل اشعار بھی کسی نہ کسی موقع پر شرف ملاحظہ حاصل کرینگے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ — سبد ہائے پنہاں کا
تبسم ہائے پنہاں سے میرزا نے رقیب کی بغل میں — ں جدت کو فن

شاعری کی بیداری کہیے یا بدخوابی۔ لیکن شعر مین کسی قسم کی بلندی نہیں ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتے ہیں ہم
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

شعر... بہ لحاظ مضمون معمولی درجہ سے بھی گرا ہوا ہے عذر لانا۔ عذر آوردن کا ترجمہ ہے جو ابھی اردو زبان میں رائج نہیں ہے۔

ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہوا

قصہ حمزہ سے مراد مشہور داستان امیر حمزہ ہے جو ایک افسانہ ہے۔ شعر نہایت عامیانہ ہے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر مین بوریا نہوا

عاشق کے واسطے بوریا نشینی مضائقہ نہیں رکھتی لیکن فرش زمین اس سے زیادہ موزوں ہے۔ ہاں معشوق کے لیے چٹائی کی نشست اور اُسکے نہونے پر افسوس ضرور ایک جدت ہے

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہوا تھا

میرزا صاحب نے معلوم نہین کس دل سے رقیب کی وکالت و حمایت کی ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتو نکے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

دوسرے مصرعہ میں ایسی شدید تعقید ہے جو کسی طرح قابل درگزر نہیں ہے میرزا صاحب کہنا یہ چاہتے ہین "آدمی کوئی ہمارا ابھی دم تحریر تھا"، لیکن اس بھی کو ردیف کی خاطر کہاں پہونچا دیا۔

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

کسقدر عامیانہ تخیل ہے۔ اگر یہ شعر مبتذل نہیں ہے تو مبتذل کسے کہتے ہیں۔

مرے قدح میں ہے صہبای آتش پنہاں
بروئی سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

اردو زبان ابھی تک فارسی کے ایسے ترجمہ کو جذب کرنیکے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن اسے چھوڑیے یہ میرزا کے خصوصیات سے ہے میرزا نے محض آتش پنہاں کی خاطر سے سمندر کے

دل کا کباب بنا کر دسترخوان کو تو زینت دی مگر جو لوگ اردو زبان کا ذوق سلیم رکھتے ہین اُن کو بد مزہ کر دیا۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اِس عاشق بیمار کے پاس

ایک شعر اِسی مضمون کا میرزا صاحب پہلے لکھ چکے ہین بندش بہت سست ہے مضمون بینیہ ہے معلوم نہین میرزا خود کہہ رہے ہین یا کسی دوسرے کی زبان سے کہا ہے

حیراں ہوں دلکو روؤن کہ پیٹوں جگر کو میں ... مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

تخیل تو وہی ہے جو میر کے شعر میں ہے ؎

دلکو روؤں یا جگر کو میر اپنی دونوں سے آشنائی ہے

لیکن میرزا نے شاید لفظ "پیٹوں" کے اضافہ سے شعر میں کوئی ندرت پیدا کی ہو۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤن

بظاہر شعر بہت پست ہے اور مضمون مبتذل ہے لیکن میرزا کی اُپج کا کیا ٹھیک ہے ممکن ہے راہزن سے بھی معشوق مراد ہو اور پاچپی کی خدمت لازمۂ عشق ہو۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

کفن کے اندر خود بخود پاؤں ہلنے کا کوئی ثبوت نہین دیا اور معمولاً خلاف واقعہ ہے

ایک نہایت مبتذل شعر جو مشہور عام ہے معلوم نہیں کس نے کہا ہے ؎

مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان تختہ پہ بہر غسل لٹایا اکڑ گئے

شدت برودت سے اعصاب کا کھنچ جانا اور مردہ کا اکڑ جانا پھر بھی ممکن ہے لیکن میرزا نے جو کہا ہے وہ ناممکن محض ہے۔

واں پہونچکر جو غش آیا پے ہم ہے ہمکو صدرہ آہنگ ... س قدم ہے ہمکو

پیہم کی جگہ پئے ہم باضافت جائز بھی ہو لیکن وا ... ں یہ ثقیل بندش

سوائے اپچ اور ایجاد بندہ..... کے اور کوئی معنی نہیں۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

میرزا نے عاشقانہ مشرب مین جس رواداری کے اصول کی تلقین کی ہے دنیائی عاشقی مین اِس سے پہلے اِس کا وجود نہ تھا۔ اِس جذبۂ رواداری کو اچھ کہنا چاہیے اور میرزا کو مصوّر جذبات۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ اے آرزو خرامی　　دل جوشِ گریہ مین ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی کی ترکیب اور مضمون کا ابتذال دونون مکروہ ہیں۔ حاصل سے مراد لگان ہے۔ نادار کاشتکار کو ڈوبی ہوئی اسامی کہتے ہیں جس سے لگان ملنے کی کوئی اُمید نہین ہوتی لیکن اِس زمینداری و کاشتکاری کی تخیّل کو غزل اردو مین جگہ دینا غالباً میرزا نواز جماعت ایک اضافہ (اضافہ لگان) سمجھی ہوگی۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال　　دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

"ہائے ہائے" کو اِن دو شعرون مین بلکہ ساری غزل مین دیکھیے کسقدر لطف دے رہا ہے اسکے سوا شعرون مین اور کچھ نہیں ہے۔

پینس مین گزرتے ہین وہ کوچہ سے جو میرے　　کندھا بھی کہارون کو بدلنے نہیں دیتے

شعر بہ لحاظ عوام پسندی مزید تعریف سے مستغنی ہے۔

مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی　　کبھی کود کی مین جس نے نہ سُنی مری کہانی
یونہین دکھ کسی کو دینا نہین خوب۔ ورنہ کہتا　　کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

دونون شعرون مین اسقدر سادگی ہے کہ اگر میرزا اِن شعرون کو قادر نامہ مین شامل کر دیتے تو موزون تھا۔

جس بزم مین تو ناز سے گفتار مین آوے　　جاں کالبدِ صورتِ دیوار مین آوے
سایہ کی طرح ساتھ ہی ہے سرو و صنوبر　　تو اِس قد دلکش سے جو گلزار مین آوے

اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
غارت گر ناموس نہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

گفتگو کرنے کے بجائے گفتار میں آنا نظم کر مرزا ایک عطیہ زبان اردو کو دینا چاہتے ہیں لیکن زبان اردو نے آجتک بھی اِس عطیہ کو قبول و منظور نہیں کیا ہے۔ میرزا پرست ہر اختراع کے مداح ہیں جو میرزا سے منور ہو۔ لیکن کسی مقلد میرزا نے بھی گفتار میں آنے کو رواج نہیں دیا۔ بہ لحاظ مضامین [illegible] شعرا سقدر عام ہیں کہ ہر شاعر جو دل و دماغ پر زور نہ دینا چاہتا ہو ایسا ہی لکھتا ہے۔

حُسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے — لیکن اُس سے مرا خورشید جمال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

بظاہر اِن معمولی اشعار میں کوئی جدت اور اپج نہیں ہے۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اِس سے بھی سمجھا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — مُنھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

ہر شعر کے دوسرے مصرعہ کی بندش نہایت بھدّی ہے۔ میرزا کی جدت طراز طبیعت نے اگر اِن شعروں میں کوئی گلکاری کی بھی ہو تو ظاہر بین نگاہیں اُسکو ہرگز نہیں دیکھ سکتی ہیں

اِس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

شعر میں فحش کی جھلک موجود ہے اور قلق لکھنوی کا سا شعر معلوم ہوتا ہے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے — کام [illegible] نہ بنے

دونو مصرعے برابر کے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ [illegible] گرا ہے اور کیا کام درپیش ہے خیر مضمون کچھ ہو یا نہو۔ لیکن شعر کا نوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اُس نے ذرا میرا پانوں داب تو دے

ابھی مین راہزن کے پانوں دابنے پر میرزا صاحب کو ٹوک چکا ہوں معلوم نہیں میرزا منشی کے خلاف پانوں دابنے کی متبذل تخیل کی طرف میرزا کو اتنی زیادہ توجہ کیوں ہے۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تو بیجے — گر باغ گدائے مے نہیں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے — اُردی جو نہ تو دے نہیں ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

کیا اِن اشعار میں کوئی لطافت شعری ہے۔ کیا خواجہ نے جس اُپج کو میرزا کے کلام کی خصوصیت قرار دیا ہے اُسکا ان اشعار میں کہیں وجود ہے۔

قارئین کرام۔ ذوق اور غالب کے کلام کے مختلف نمونے آپ ملاحظہ فرما چکے موقع بموقع میں نے دونوں کے کلام میں مقابلہ کرکے دونونکے تخیل کے فرق کو بھی نمایاں کر دیا ہے اب اِس سوال کا فیصلہ کہ اُن محترم شخصیتون سے غزل اردو کس حد تک فیضیاب ہوئی زیادہ دشوار نہیں ہے میر اور سودا کی تعمیر میں بہت کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے تھے جنکی تکمیل اُنکی وفات کے بعد ہوئی اِس آخر الذکر تکمیل مین سب سے زیادہ نمایاں حصہ حضرت ذوق مرحوم نے لیا ہے۔ اُنھون نے زبان کی صفائی مین حد سے زیادہ کوشش کی۔ مضامین کی کثرت و ندرت سے زبان اردو کو ایک سرمایہ دار زبان بنا دیا۔ فارسی ترکیبون کو نہایت سلیقہ سے زبان اردو مین منتقل کیا اور جو کچھ کیا وہ خاص و عام مین مقبول ہو گیا۔ ذوق کے بعد بھی ان کے متلمذین نے اِس کوشش کو جاری رکھا۔ فصیح الملک داغ مرحوم کے مساعی بھی غزل اردو کے واسطے بہت کچھ قابل فخر ہیں اسلیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ حضرت ذوق مرحوم کے فیوض غیر فانی ہیں اور اردو شاعری خاقانی ہند کے احسانات سے آج بھی منکر نہیں ہو سکتی

میرزا غالب مرحوم کی بابت میں نے دعویٰ کیا تھا کہ اُنھوں نے اردو غزل کی شاعری کو نہایت بیدلی سے انجام دیا ہے۔ مالی ضرورتوں کی وجہ سے مجبوراً اُنھوں نے اردو شعرا کی فہرست میں شامل ہونا پسند فرمایا تھا۔ اس دعوے کو میں نے بہترین دلائل اور براہین سے ثابت کیا ہے جو بظاہر ناقابل تردید ہیں۔ میرزا کے مشکل کلام پر میں نے خود تنقید نہیں کی ہے لیکن معتبر اور متواتر شہادتوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ کلام زبان اردو کے واسطے باعث عار ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مشکل گوئی میں کم سے کم میرزا وحید اور فرید تھے! اور موجد و مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میرزا کے زمانہ میں عبداللہ خاں اوج اور مومن خاں مومن موجود تھے ان کی طبیعت بھی مشکل پسند واقع ہوئی تھی یہ حضرات بھی فارسی ترکیبوں سے اور کبھی کبھی بندش کی پیچیدگیوں سے اپنے شعر کو معنی سے بعید کر دیتے تھے۔ میرزا کے سہل کلام میں اگر کچھ اشعار جدت و ندرت کے حامل ہیں تو اس سے زیادہ تعداد میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو نہایت پست ہیں جن کو آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔ میرزا کے کلام میں تنافر۔ تعقید۔ ضلع کا بھی دخل ہے لیکن میں نے اس پر زور نہیں دیا ہے اگر آپ اسے تفصیل سے دیکھنا چاہتے ہیں تو طباطبائی کی شرح دیوان غالب پڑھیے۔ بعض میرزا پرستوں کا خیال ہے کہ جب تک باشوکت الفاظ شعر میں جمع نہ کیے جائیں شعر بلند درجہ حاصل نہیں کر سکتا لیکن اُن حضرات کو چاہیے کہ صفی لکھنوی اور عزیز لکھنوی کی شاعری کو دیکھیں کہ آسان الفاظ سے شعر اور مضمون شعر کس طرح بلند کیا جاتا ہے۔ زبان اردو میر کے زمانے میں جن منزلوں کو طے کر چکی تھی ذوق مرحوم نے اُس سے آگے کا راستہ صاف کیا تاکہ زبان اردو آئندہ مدارج کو طے کر کے اعلیٰ کمال پر پہونچ جائے۔ میرزا غالب نے اردو زبان کی طرز رفتار کو بہ نظر حقارت دیکھا اور موجودہ راستہ میں جھیل جھانکڑ ڈالکر اُسکو بند کرنا چاہا اور عنقریب ایک دوسرا راستہ تجویز کیا اگر زبان اردو اس نئے راستہ پر چلنا شروع کر پہنچ جاتی جہاں میرا اور سودا کی رہنمائی میں ابتدا اگر چلنا شروع کیا تھا۔ ذاتی عداوت

نہیں ہے میں نے جو کچھ گزارش کیا ہے وہ میری آزاد رائے ہے۔ ممکن ہے کہ میرزا نواز جماعت میرے اِس اظہار رائے کو بہت زیادہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے لیکن مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کو زبان اردو کے ساتھ سچی ہمدردی ہے وہ میری محنت کی قدر کرینگے اور میری راست گوئی کی عزت فرمائیں گے۔

قارئین کرام۔ مین آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میرزا نواز جماعت سے میں کونسی جماعت مراد لیتا ہوں اور وہ کن کن قسم کے اشخاص پر مشتمل ہے۔ اِس جماعت میں تین قسم کے لوگ شامل ہیں۔

قسم اول۔ یہ لوگ نہایت شریف النفس ہیں اور میرزا کی اردو شاعری کی حقیقت حال سے بخوبی واقف ہیں مگر حُسن عقیدت اور خلوص محبت کی وجہ سے میرزا کی شاعری کے تاریک پہلو پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور صرف اُنکے بہترین اشعار کو روشنی مین لانا چاہتے ہین یہ حضرات حق وصداقت سے زیادہ دور نہیں ہیں اِن میں سب سے زیادہ قابل الذکر خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ہیں جو میرزا کی تائید تو کرتے ہیں لیکن اُنکی تقلید نہیں کرتے مین ایسے لوگوں کو بھی قابل عزت جانتا ہوں اور اُنکا احترام کرتا ہوں۔ اِس قسم کے لوگونکی تعداد بوجہ وفات کے اب بہت کم ہے۔

قسم دوم۔ یہ حضرات میرزا کے شدید عقیدتمند ہیں اور میرزا کو اردو زبان کا بہترین شاعر سمجھتے ہین۔ لیکن زبان اردو کے ساتھ بھی سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس لیے میرزا کے مشکل کلام کو معانی کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ بجا طور پر اسکا داخلہ بزم اردو میں ہو سکے میرزا کی حمایت کے ساتھ ساتھ اُن کو موجودہ قواعد وضوابط زبان اردو سے بھی کافی ہمدردی ہے اور خلاف ورزی کو جائز نہیں سمجھتے ہیں اِسی وجہ سے میرزا کی لغزشوں کو تاویلات وتمثیلات سے حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ اپنی کوشش مین کامیاب ہوں یا نہوں لیکن اِن کی ہمت قابل مبارک باد ہے۔ گو میں ان کی رائے سے متفق نہیں ہوں لیکن

ان کے مساعی زبان اردو کے واسطے کسی طرح مضرت رساں نہیں ہیں اس قسم میں مولانا بیخود موہانی کی شخصیت بالخصوص قابل تذکرہ ہے۔

قسم سوم۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنھوں نے یورپ میں یا ہندوستان میں علوم مغربی کی تحصیل کی ہے۔ اکثر نہایت متمول ہیں۔ اردو شاعری سے انھیں اصلی ذوق نہیں ہے لیکن شیکسپیر اور گیٹے کی شاعری پر مفتون ہیں۔ اپنی وضع ولباس اور خورد نوش کو انگریزی تہذیب کے حوالے کر چکے اب اردو شاعری کو مغربی شاعری پر تبدیل کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں مشرق و مغرب کی شاعری میں بھی بعد المشرقین والمغربین ہے۔ یہ حضرات اپنے ارادہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کی رائے میں میرزا غالب ہی ایسا شاعر ہے جو زبان اردو کے قواعد کی خلاف ورزیوں میں جری ہے اور صرف میرزا ہی میں شیکسپیر بننے کی گنجایش ہے اسلیے یہ میرزا کو نبی اور اُسکے کلام اردو کو الہامی قرار دیتے ہیں یہ اپنی اکثریت اور دولت کی وجہ سے دنیائی شاعری کو مرعوب کر کے اپنا رنگ جمانا چاہتے ہیں۔ اکثر پریس اور رسائل ان کی ملکیت میں ہیں جو ملکیت میں نہیں ہیں وہ ان کے دست کرم سے مستفیض ہیں ایسی باقدار شخصیتوں سے اختلاف کرنا اور کامیاب ہو جانا کچھ آسان نہیں ہے لیکن میں مایوس نہیں ہوں حق ہمیشہ باطل پر فتح پاتا ہے۔ یہ حضرات زبان اردو کو دوستی کے پردے میں نقصان پہونچا رہے ہیں میں اِن لوگوں کا علمبردار ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری مرحوم کو قرار دیتا ہوں اور بجنوری مرحوم کے خیالات پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر موصوف کے جذبات عقیدت میرزا کے ساتھ نہایت راسخ ہیں مرحوم نے میرزا کے ایک شعر کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرزا اپنے دیوان اردو کو الہامی سمجھتے تھے۔

غالب اگر اس فن سخن دیں بودے — آں دیر بودے
میرزا تو نہایت لطیف طرز میں یہ کہہ رہا ہے کہ فن سخن — میرا دیوان

فارسی کتاب الہامی ہے۔ مگر ڈاکٹر بجنوری نے بغیر کسی شرط اور قید کے ستعاراً نہیں بلکہ حقیقتاً مقدس وید اور دیوان غالب (اردو) کو ہندوستان کی الہامی کتب قرار دیدیا۔

وید کی تقدیس اور الہامی تسلیم کو ہمارے مبحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اسکا شکوہ آریہ سماجیوں کو کرنا چاہیے۔ میرزا نے اپنے کلام فارسی کو کتاب ایزدی کہہ کر اوسکی فوقیت مین مبالغہ کیا تھا لیکن ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کے کلام اردو کو الہامی قرار دیکر میرزا کو پیغمبر سخن کہدیا۔ خدا بجنوری مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرمائے یہ اُنکا کہنا کوئی شاعرانہ تخیل نہیں ہے بلکہ غالب کے ساتھ جو اُنھیں حُسن عقیدت تھا اُسکا لازمہ یہی تھا۔ ڈاکٹر مرحوم اگر میرزا کے کلام فارسی پر الہامی ہونیکا فتویٰ دیتے تو بھی غلط تھا لیکن غالب کی شاعرانہ تخیل سے کچھ ملتا جلتا ضرور ہوتا ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کی تمام شاعرانہ لغزشوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اُن کو حُسن قرار دیا ہے ڈاکٹر بجنوری کہتے ہین "دیوان غالب مین ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبوراً واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے بہت سے نقاد اسکو کیف شراب پر محمول کرتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ گیٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر بھی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان نے دریافت کیا کہ اس اشکال کا کیا باعث ہے گیٹے نے جواب دیا یہی تاریکی تو ہے جسپر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ اِن مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال پر غور کرتے ہین اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اُکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اسکے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشت آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں"

ڈاکٹر بجنوری دوسرے موقع پر فرماتے ہین "میرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے اسکے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور

معقول اعتراضات کیے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے علم القواعد کا کام تقریر و تحریر میں صحت پیدا کرنا ہے کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں اسلیے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لیے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے ڈاکٹر موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں "کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبر سخن دنیا میں آتا ہے جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہے۔ شیکسپیر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ اُن کی پابندی کرے یا اُنکی خاطر سے اپنے دریات میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے" ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی رائے میں میرزا غالب نبی تھا اور اُسکے کلام کا اہمال۔ الہام تھا (اہمال کو الہام سے اگر کوئی اور نسبت نہیں ہے تو کم سے کم اُلٹ پھیر کر حروف تو واحد ہیں) اور دیوان غالب (اردو) سعہ نسخہ حمیدیہ کتاب آسمانی منزل من اللہ تھا (معاذ اللہ) ڈاکٹر بجنوری کو جو واہمہ پیدا ہوا ہے اسی قسم کا ایک دوسرا ابو طیب بن حسین کوفی عرب کے ایک مشہور شاعر کو پیدا ہو گیا تھا یعنے اُسکا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے ایک الہام الٰہی ہے اور ابو طیب دنیائی شاعری کا نبی ہے۔ لیکن اہل بصیرت نے اس دعائے باطل میں اسکی ہمنوائی نہیں کی اور آج تک وہ تمام دنیا میں متنبی (بنا ہوا نبی یا جھوٹا نبی) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ افسوس ہے ڈاکٹر بجنوری کے ہم خیالوں نے غالب کے نبی ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا بلکہ بغیر سوچے سمجھے بجنوری صاحب کی آواز پر لبیک کہا۔ باایں ہمہ بھی ڈاکٹر بجنوری کا طریقہ استدلال نہایت نادر ہے اُنکی رائے میں میرزا کا بے معنی یا مجہول المعنی کلام یہی معجزہ نبوت ہے (معاذ اللہ) قواعد زبان اردو کی خلاف ورزی بھی میرزا جیسے مہتم بالشان نبی (معاذ اللہ) کے واسطے لازمی تھی۔ میرزا روح القدس کا ترجمان ہے اور اُسکے

کلام کے لحاظ سے قواعد زبان میں ترمیم ہونا چاہیے ... استدلالات پر مولانا

بیخود بھی غور فرمائیں اگر اُنکی رائے میں ڈاکٹر صحیح ... نام کو بامعنی اور باقاعدہ

ثابت کرنے کی مساعی کوہ کندن و کاہ برآوردن ہیں ... ہی ہے کہ اگر میرزا کے

کلام پر سے الزام ہٹ گیا تو اُنکا کلام الہام کے درجہ سے گر جائیگا (معاذ اللہ) فی الحقیقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے نہایت آسان طریقہ سے تمام اعتراضات کا قلع قمع کر دیا جو میرزا کے کلام پر وارد کیے جاتے تھے اور میرزا کو مرتبۂ نبوت مغت میں حاصل ہو گیا۔

قارئین کرام۔ آپ کا تعارف میرزا نواز جماعت سے ہو گیا۔ اس جماعت کی جد و جہد نے نثر اردو پر بھی زبردست اثر کیا ہے اور عجب نہیں کہ وہ بھی الہام (اہمال) کا درجہ حاصل کرلے الناظر نومبر و دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایک مضمون "گلابی اردو" شایع ہوا ہے۔ فاضل نامہ نگار نے اپنے نام کو اشارات میں ظاہر فرمایا ہے لیکن ع۔ ہم سمجھ لیتے ہیں مضمون خط کا عنوان دیکھ کر

اس مضمون میں نثر اردو کے چند نمونے پیش کیے ہیں شایقین خود الناظر میں مضمون کو پڑھیں بہ تطویلات ان اوراق میں اُسکے نقل کرنیکی گنجایش نہیں ہے۔ غالباً اُس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچ جانا آسان ہوگا کہ اب اردو نثر کو بھی عام فہم معانی سے عار و ننگ ہے اور اگر یہ سلسلہ بغیر روک ٹوک کے جاری رہا تو کوئی شک نہیں ہے کہ زبان اردو کی حالت بد سے بدتر ہو جائیگی۔ اُس مضمون میں۔ ارتعاش ملتجی اور لرزہ مسترحم۔ تراکیب جدیدہ کو ملاحظہ فرمائینگے جو موجودہ انشاپردازوں کی خودروی اور ایجاد و جہاد کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک خادم زبان اردو کا فرض تھا کہ وہ عام و خاص کو اُن خطرات سے آگاہ کرے جو زبان اردو کی ترقی میں سدراہ ہیں ورنہ میرزا غالب کو دنیائے شاعری سے رخصت ہوئے، ۵ برس ہو چکے مرحوم کے کلام پر آج اسقدر سخت تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ قارئین کرام۔ میں اپنے دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے مضمون کو ختم کرتا ہوں اور فیصلہ آپکی رائے پر چھوڑتا ہوں "ذوق مرحوم میر علیہ الرحمۃ کے بعد اردو غزل کا سب سے زیادہ کامیاب شاعر تھا"

میر ہمایونی

حضرت امیر بدایونی کی دو کتابیں

اسلام بجواب ترک اسلام

عبدالغفور و مرپال جی برہمچاری نے اپنی کتاب "ترک اسلام" میں قرآنی تعلیم پر جو اعتراضات وارد کیے تھے، قاضی غلام امیر صاحب نے مہذب پیرایہ میں قانون فطرت اور کتب وید دونوں کی رُو سے اُنکا مدلل اور مفصل جواب اس نام سے شایع کیا ہے۔ ان اعتراضات کی تردید کے ساتھ ہی ہندو قوانین مذہب کے ناقابل عمل ہونے، گوشت خوری کے جواز، قیامت، بہشت، دوزخ، فرشتے، اور معجزات پر بہت اور پُر از معلومات بحث کی ہے، اور نہایت خوبی کے ساتھ تعلیم قرآنی کی افضلیت کا مسکت ثبوت پیش کیا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ نادر رسالہ لکھ کر محض ترک اسلام کی تردید ہی نہیں کی ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے آریہ سماجی مذہب سے ضروری واقفیت کا ذخیرہ بھی بہم پہونچا دیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

ریویو

اس کتاب میں قاضی صاحب نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند جی مہاراج کی سوانحعمری مع اپنی فلسفیانہ تنقید کے عوام کی واقفیت کے لیے شایع کی ہے اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ نہ سوامی جی نے توحید کا صحیح خیال پیش کیا، نہ ہندوؤں کو چھوت چھات اور ذات پات کی قیود سے آزاد کیا، نہ اُنکی وید کی تفسیر کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ اُنکا سماج عرصہ تک قائم رہنے والا ہے، اور نہ خود اُنھوں نے سنیاس کے سچے اصولوں کی پابندی کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سوامی جی خود مہارشی نہیں بن بیٹھے بلکہ ایک تعلیم یافتہ گروہ نے ہندومت کو قابل اصلاح دیکھ کر دیانند مہراج کو مہارشی کی منزلت پر پہونچا دیا اور اپنے اصلاحی اغراض کے لیے اُنکو آلۂ کار بنایا۔

یہ کتاب ہر حیثیت سے سنجیدگی کے ساتھ مطا قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ

الناظر بک ایجنسی۔

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ — نمبر ۶

پانچ ناول نگار		مولوی سید وزیر حسن دہلوی	۱
جذبات احسن		مولوی محمد نجم احسن بی اے۔ ایل ایل بی	۱۰
شعرالہند حصہ دوم	(ریویو)	پروفیسر محمد وحید مرزا ایم اے	۱۱
آیولنیتھی	(ڈراما)	مرزا محمد جعفر علی خاں اثر بی اے	۱۷
افکار تازہ		منشی سید انور حسین آرزو لکھنوی	۲۱
مقدس ڈاکو (۲)			۲۲
پچھلے مہینے کے رسالے			۳۰
اردو رسائل کے خاص مضامین			۳۸
نظرے خوش گذرے			۳۹
جزیرۃ العرب		مولوی نجم الغنی قریشی رکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن	۳۶

خطا

ناظرین الناظر سے التماس

الناظر بابت جولائی لغایت دسمبر ۱۹۲۶ء کی دفتر کو سخت ضرورت ہے۔ ایک کتاب کی اشاعت تقریباً چھ ماہ سے اس جلد کے نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ اگر متفرق پرچے مل سکیں تو امدپوری جلد کیجائی مل جائے تو ہر صورت میں دفتر کو درکار ہیں۔ قیمتاً علیحدہ نہ کرنا چاہیں تو کوئی صاحب مستعار دیدیں۔ مصارف ڈاک دفتر سے ادا کردیے جائیں گے، اور اپنا کام نکال کر جلد واپس کردی جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ احباب فوراً توجہ فرماکر ممنون بنائیں گے۔

ظفر الملک

نئی کتابیں

مضامین شرر

مولانا شرر مرحوم کے مشہور رسالۂ دلگداز کے تمام مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ مجلدات میں جمع کر دیے گئے ہیں اور صفائی کے ساتھ چھاپے گئے ہیں حسب ذیل مجلدات موجود ہیں :-

مضامین شاعرانہ و عاشقانہ - جلد اول عہ دوم عہ

آغاز و انتظام سال عہ

تاریخی و جغرافی مضامین - جلد اول عہ دوم عہ

مشرقی تمدن کا آخری نمونہ - یعنی گذشتہ لکھنؤ عہ

سیر رجال - مشہور اکابر کے حالات عہ

نامور خواتین کی سوانحعمریاں جلد اول عہ جلد دوم عہ

ادب و تحقیق مسائل عہ

اصلاح قوم و ملت عہ

تاریخی واقعات پر خیال آرائی عہ

نظم و ڈراما عہ

معتزلہ

معتزلہ اور اُنکے عروج و زوال کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے مسلم اکیڈمی لکھنؤ میں ایک محققانہ لکچر دیا تھا۔ اب اسے دلگداز پریس نے عوام کی واقفیت کے لیے شایع کر دیا ہے۔ لکچر کے اخیر حصہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے اعتزال سے نہایت مفید بحث کی ہے اور کارآمد مشورے دیے ہیں۔ قیمت ۱۲ر

تصانیف خواجہ عشرت

ہمجولی - عورتوں میں شریفانہ خیالات اور اصول تربیت و خانہ داری کی اشاعت کے لیے خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے عورتوں کی زبان میں بہت سے اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہمجولی کے نام سے شایع کیا ہے۔ ہمجولی کے قصے اتنے دلچسپ ہیں کہ کتاب کو دوبارہ شایع کرنا پڑا۔ اور مصنف کو اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کی ضرورت پڑی۔ قیمت حصہ اول ۴ عہ دوم ۴ عہ

مضمون تویسی - اُردو کی زباندانی اور علم بیان کے قواعد پر محقق زبان اُردو خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی نے یہ نادر کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ اسکا مطالعہ صحیح انشاپردازی اور بامحاورہ زبان لکھنے کے لیے بہت مفید ہے۔ قیمت ۸ر

چوتھی کتاب - مستند الشعرا خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی نے شاعری کے قواعد کی کئی مفید کتابیں لکھی ہیں جن سے بغیر اُستاد کے عروض و قافیہ کے اصول سمجھ میں آجاتے ہیں اور مبتدیوں کو صحیح تقطیع میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے۔ حسن شعر کے عیب و حسن، لفظی اور معنی ہے۔ یہ مفید سلسلہ ملکر ہو رہا ہے۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ :- منیجر النا طریک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۱ — دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

پانچ ناول نگار

ذرا انسان پر غور کیجیے کہ اُس نے سیکڑوں جیتی جاگتی ہستیاں یا کیرکٹر پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے سے اصلاً یا کلیتہً جداگانہ ہے۔ اور پھر یہ سب بالکل اصلی، سچ مچ زندہ اور بیحد دلکش اور کبھی کسی صورت میں کوئی بات ان میں خلاف فطرت نظر نہیں آتی اور معمولی ادب میں اس قسم کا ایک کیرکٹر بھی پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں، کہ آرٹسٹ ادب کی چیز پیدا کردی۔ ایسی شہرت حاصل کرلی جو صدہا سال باقی رہیگی۔ ایسا کارنامہ پیش کیا جو قدرت الٰہی کے لگ بھگ ہے۔ یہ وہ کام ہے جو ایک دیوتا کے کام کی طرح جان کا ڈالنا ہے۔"

Lafcadio Hearn, Interpretations of Literature volume II

"میں اس بات کا دعویدار نہیں ہوں کہ کسی بڑے مصنف میں بحیثیت مصنف کے کوئی بڑی خیال کی گہرائی یا نظر کی پہنائی یا فلسفہ یا دانشمندی یا فطرتِ انسانی کا علم یا انسانی زندگی کا تجربہ ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ ایسے اضافی عطیے ہیں جو اگر کسی بڑے مصنف میں ہوں تو وہ اُسکو اور بھی بڑا بنادیں گے۔ لیکن میں جس چیز کو بڑے مصنف کا امتیازی عطیہ سمجھتا ہوں، وہ وسیع معنوں میں اظہارِ خیال

کی قوت ہے۔ وہ قادر الکلام ہوتا ہے۔ یعنی کلام کے دونوں پہلو، خیال اور لفظ کا اُستاد ہوتا ہے۔ یہ دونوں پہلو اگرچہ بالکل جداگانہ ہیں، لیکن ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے ..... اُسکو ہر صحیح خیال کے لیے صحیح لفظ ہمیشہ مل جاتا ہے۔ اور اُسکی تحریر میں ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ اختصار پر آتا ہے، تو اس لیے کہ چند لفظ کافی ہیں۔ اگر لفظوں کی گنگا بہاتا ہے تو بھی ہر لفظ اپنے موقع سے ہوتا ہے۔ اور اُسکی فصاحت کے زبردست بہاؤ میں مدد دیتا ہے، رُکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ وہ وہی باتیں کہتا ہے جو سبھوں کے دلوں میں ہوتی ہیں لیکن سب ادا نہیں کر سکتے۔ اور اُسکے جملے لوگوں میں کہاوت بنجاتے ہیں اور اُسکے فقرے روزمرہ یعنی گھریلو بول چال اور محاورے بنجاتے ہیں"

Newman: Lectures & Essays on University Subjects: Lecture on Literature.

کہانی اور انسان

کہانی کہنے یا سُننے کی چاٹ خواہ کسی طرح بھی اولادِ آدم کو لگی ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہے مزے کی چیز! اِس چاٹ کی اگر منطقی موشگافی کے ساتھ ساتھ گہری جانچ پڑتال ہو، تو ممکن ہے ہمیں بہت سی باتیں کھُل جائیں، لیکن ایک تو مضمون "زلفِ یار" کا سا طول کھینچتا جائے گا، جس میں بقول ہمارے شعراء ایک مرتبہ اُلجھ کر نکلنا آسان نہیں، دوسرے یہاں پر مضمون کا اس پہلو سے پھیلایا جانا بھی بے جوڑ سی بات سمجھی گئی۔ یوں اگر سائنٹی فِک جہان بین نہ بھی ہو، تو ہمیں نہیں سمجھتا اسکے معنی ہو سکیں گے کہ کہانی کہنے یا سننے کی زبردست اور آفاقی (Universal) چاٹ سرے سے اتنی لچر ہو جائے کہ وہ ہمارے بھاؤں ہی نہ ہو۔ یہ روزمرہ ظہور میں آنیوالی سدا بہار ذہنی لپک قدیم الایام سے ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ تاریخ عالم کے ابتدائی سے ابتدائی صفحے بھی اس ذکرِ خیر سے خالی نہیں، پھر اس پاسداری کے تو یہ معنی ہیں کہ آپ بھی اور کچھ نہیں تو شرما شرمی ہی روا[illegible] یہ ضرور نہیں کہ ایک اتنی پرانی رفیقِ زندگی! کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہی پرکھ [illegible]ں ورنہ ایکدم سے مُنہ موڑ لیں۔ اُس کا پاس رفاقت تو دیکھیے کہ روزِ اول [illegible] دامنگیر ہے تو ہٹائے نہیں ہٹتی!

غرض فطرت انسانی کی یہ پرانی اور آفاقی چاٹ جو سایہ کی طرح لگی لپٹی چلی آتی ہے کبھی بھی بھلائے نہیں بھولی اور نہ بظاہر بھلائی جا سکتی ہے۔ بلکہ غور کیجیے تو زندگی کے ہر دور میں اس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ بچپنے کی معصوم گھڑیاں بھی خالی نہیں۔ جوں جوں انسان کا مذاق بدلتا جاتا ہے یہ بھی بھانت بھانت کے روپ بدلتی رہتی ہے۔ کون ایسا ہے جس نے بچپنے میں "چڑیا چڑے" کی سی تحفہ کہانی نہیں سُنی؟ اس کہانی کا خصوصاً وہ چٹخارے دار مکالمہ ——

"چڑا (گھی لیکر آتا ہے) چڑیا! چڑیا! کُنڈی کھول؟"

"چڑیا (کھچڑی کھاتی آنکھوں میں تیل ڈال لیتی ہے) دُور سُوے میری آنکھیں دکھتی ہیں ——"

عجب چٹپٹی چیز ہے! ایک زمانہ ہوتا ہے کہ یہ "کھچڑی" نہیں! اس کا مزیدار ذکر ہی خوش ذائقہ بریانی سے کہیں زیادہ اچھا معلوم دیتا ہے، واقعی اس کہانی کے قابل رشک طول زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا پکا ثبوت ہو سکتا ہے کہ گو عمر کے ساتھ ساتھ مذاق بدلتا جاتا ہے اور یہ سہانی کہانی حالانکہ بچکانی خوش فعلی نظر آنے لگتی ہے لیکن پھر بھی کچھ اتنی مجبوری سی ہو گئی ہے کہ خیال سے دُور نہیں ہوتی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو تو ہو کہ یہ کہانی سُنے اور اُسکے چہیتے سے اُتر جائے ورنہ تجربہ کی لکیر کی طرح جب دیکھو ہمہ شما سب کی یاد میں موجود!

کہانی کے درجے

خیر، تو ذکر تو یہ تھا کہ کہانی والی چاٹ بجید پرانی اور بید ابتدی ہے اور انسان جوں جوں ارتقائی کینچلیاں بدلتا رہا، یہ بھی بیسیوں روپ بدلتی رہی۔ اُردو بولنے والی دُنیا میں آج اسکی یوں رونمائی ہوتی ہے کہ بچپنے کے معصوم زمانہ میں "چڑے چڑیا" جیسی کہانیوں پر جی لوٹ لوٹ جاتا ہے: ذرا بڑھے۔ اور ذوق سخن بلا تو "انوار سہیلی" "باغ وبہار" اور "فسانۂ آزاد" کی سی کہانیاں سُن کر باچھیں کھلنے لگیں، جوانی دیوانی آتی ہے: تو ایک دم سے دنیائے ذوق ہی بدل دیتی ہے: یعنی طلسم شباب کی ہوش ربائیاں "ایک صنم آباد الفت دیر ستش" نظروں کے سامنے لے آتی ہیں، ہر مندر جبین نیاز کا طالب اور ہر بت تن من دھن چھین لینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ غرض چپہ چپہ سے ؎

"شہر یست پُر ز خوباں وز ہر طرف نگاریے
یاراں صلائے عام ست گرمی کنید کاریے"

کی گونج کانوں میں سما جاتی ہے۔ اسوقت انسان ایک ایسے عالم میں سے گویا گذرتا ہے جس میں بیخبری و حیرانی منٹ منٹ کو اپنا افسوں پھونکتی ہے۔ سرمستی جنون شباب کا ہاتھ پکڑ پکڑ کے ہوس

اور ولولوں کی مدبھری گلابیاں خالی کرائی جاتی ہے۔ مزاج کی جب یہ کیفیت ہو جائے تو جس قسم کی کہانیاں جی لبھا سکیں گی معلوم! اس لیے اگر میں غلطی نہیں کرتا اور آپ بھی بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں یعنی یہی کہ حضرات شرر اور حکیم محمد علیخاں کی قریب ساری موہنی کہانیاں، اُن کی اور خصوصیتیں جنھیں آگے دکھاؤں گا چھوڑ کر میری جانم میں تو یاروں کے لیے "صلائے عام" کا حکم رکھتی اور "رکام" کو گرا دیتی ہیں!

لیکن یاد رہے "زندگی ایک مسلسل ارتقا ہے"۔ "جسمانی، ذہنی اور روحانی"۔ عہد شباب کی صبح جس طرح بڑھتے بڑھتے دوپہر ہوتی ہے: ڈھل بھی جاتی ہے، اور یہی بڑھاپا ہے۔ "جسکے آنے پر کوتاہ خیال اور محض مسرت پرست اوسان باختہ ہو جاتے ہیں"۔ لیکن سوچیں تو پتہ چلے کہ "بڑھاپا انسانی زندگی کا بہترین زمانہ ہے، اس لیے کہ اس ارضی زندگی میں انسانی ارتقاء کا یہ وہ آخری پھل ہے" جسے سوچ سمجھکر چکھا جائے تو ایک دوسری ہی زندگی کا مزہ آنے لگتا ہے۔ اچھا، یہ عالمگیر کیف کالے کوسوں دُور بھی جس خوبصورتی سے محسوس ہوا، سننے کے قابل ہے۔ سات سمندر پار سے ایک بزرگ کی آواز ان الفاظ میں ہم تک پہونچی ہے۔ سنیے گا"

"ماضی کا زمانہ خواہ وہ بزم عیش ہو یا بزم غم تجربہ کا زمانہ تھا، جس سے میں تجربہ کار بنا، اور اب نفع و نقصان کی تمیز کر سکوں گا۔ جوانی کی خواہشات اور جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ نے اب تک آنکھیں خیرہ کر رکھی تھیں، وہ جل کر بھسم ہو گئی۔ جو کچھ اب باقی رہ گیا ہے راکھ نہیں! کردار کا خالص سونا ہے"

تو خلاصہ یہ کہ زندگی کے اس اسٹیج میں بچپنے کا بھولا پن ہی چمپت نہیں ہو جاتا، جوانی والے جذبات اور ولولوں کا پردہ بھی آنکھوں پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ نہ چڑیا چڑے ہی کی کہانیوں میں اب دل لگتا ہے اور نہ پُرجوش نازنین کی سی چُلبلی، چنچل اور جذباتی (Sentimental) داستانوں ہی میں مزہ آتا ہے، بلکہ یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو سوچ میں ڈوبا، جچا تُلا، ٹھیک ٹھیک ہو۔ اور ساتھ ہی ماضی کا تجربہ ہمارے ہر فعل کو جہاں تک ہو سکے کندن سا چمکاتا جائے: غرض طبیعت اپنے آپ اصلیت کی پرچول پر چل پڑتی ہے۔ عقل کی پختگی اور وسعتِ نظر کے لحاظ سے یہاں دوسری ہی قسم کی کہانیاں جی کو بھانے لگتی ہیں۔ لیکن ہر کلیہ کے چند مستثنیٰ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں ہو سکتا کہ جس طرح عالم جوانی میں جو ایسے نکل آتے ہیں جو شباب کے نگارخانے تک میں بھی سوچ میں ڈوبی ا ہتے اور خوش ہوتے،

یا اپنی طبع خداداد کے بل پر ایسی کہانیاں کہ کہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں - اسی طرح بڑھا بھی کم سواد بوڑھے بچوں اور بچکانہ منشوں سے خالی نہیں - مگر یہ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ایسے لوگ مستثنیات میں سے ہوتے ہیں - مجھے یہاں عام اصول اُبھار کر دکھانا مقصود تھا، عقل مندوں یا بیوقوفوں کی مردم شماری سے سروست کام ہی نہیں!

اچھا، خود یہ اوپر والی مستثنیات بھی اصولی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں - یعنی جوں جوں علم یا جہالت کی روشنی یا تاریکی سماج کو گھیر لیتی ہے، یہ بھی اٹل اصول بنتی جاتی ہیں - کوئی ایسا سماج لیکر دیکھ لیجیے جس پر پورا پورا علمی رنگ رچ گیا ہو، آپ دیکھیں گے کہ اس میں سلاست مذاق اور اصناف رسالے کے لحاظ سے بیسیوں جوان بوڑھے ہیں - گویا انکے شباب کا سارا اُبال آپ کو سلامتِ ذوق کے نازک نازک شیشوں میں جھلکتا اور چھلکتا دکھائی دیگا - برخلاف اسکے تصویر کا رخ "تیرگوں" آپ دیکھنا چاہیں گے تو ایک آدھ سماج ایسا بھی آپ کو ضرور مل جائے گا جو جہالت کی پسلی نکبت میں پڑا، ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو، اور جو میرے خیال میں سماج کی سب سے بڑی بدبختی ہے -

حضرت سیدؒ اور اُردو

اگر آپ اس اوپر والے استدلال کو مثال کے ذریعہ سے ذہن نشین فرماتے چلیں تو میرا خیال ہے زیادہ مناسب ہو - مثال کی تلاش میں بھی بظاہر زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں - کیوں؟ کہ خیر سے ہندوستان موجود ہی ہے! یہ اگر زندگی کا روشن رخ نہیں دکھا سکتا تو کیا تاریک رُخ سے بھی گیا گذرا ہوا؟ اچھا، اب ہم ہندوستان کو تمثیلاً لیے لیتے ہیں ہمیں اول اول تو یہ شناسا ہیئت کا ونگ جلاف پر متمکن نظر آتا ہے، جہاں غرب قرب ہر قسم کی چہل پہل ہے - مگر ساتھ ہی بربادی و تباہی کی مہلک دیمک بھی اس اونگ جلا تماب کو چاٹتی دکھائی دیتی ہے - اور بالآخر حوادث کے ایک زوردار تھپیڑے سے تو نیچے ہی آ رہتا ہے - چونکہ زیادہ اُنچائی سے گرا تھا، اس لیے "اسفل السافلین" کی تاریکی میں جا گڑیگا - اس پر ستم طریفی یہ ہوئی کہ ہیگا نہ قوتوں کے دباؤ نے اُس کا رہا سہا بھی زور توڑ ڈالا - بالخصوص زبان اُردو، جسکو پیدا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ روز سے زیادہ نہیں ہوئے تھے اور جس کا ابھی ادبی تتلانا بھی نہیں گیا تھا، کہ اس مصیبت میں مبتلا ہوگئی - مختصر یہ کہ واقعۂ غدر کی اُلٹ پلٹ میں کیا خود اُردو اور کیا اُردو بولنے والے دونوں کا کچومر نکل گیا - وہ تو خدا بھلا کرے ایک خوش اوصاف مردِ میدان اور سچے شیدائے وطن سیدؒ کا، جس نے اس ابتلائے عظیم سے خاص طور پر متاثر ہو کر ایک طرف تو ہمیں سہار سہار کر قعرِ ہلاکت سے اُبھارا، دوسرے علی گڈھ کی مبارک سرزمین میں ایک اور علمی کو لا کھڑا کیا - جس نے اپنی گود

میں تھپک تھپک کر ادبی گھنگی کو بھی دُور کیا اور ادھر ادب اُردو نے بھی چونچال ہو کر ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ سماجی چہرہ پر اُردو کے آثار صحت کا نور جھلکنے لگا۔ یہ پانچ ناول نگار جنکا اس مضمون میں تعارف کرانا مقصود ہے۔ اور انکے علاوہ بھی کئی اور مصنفین جنکا نام گنوانا یہاں ایک بیموقع بات ہے "سیّدی دَور" کے ہی پیداوار ہیں۔ پیداوار سے میرا مطلب اُس سوئی ہوئی پٹیک کا جاگ جانا ہے جس سے عام کلچر اور اس لیے زبان منجھتی جائے۔

ناول

غرض یادس بخیر! علی گڑھ کے آغوش محبت میں جب ادب اُردو اس طرح پَل کر بڑی ہوئی اور اُس نے نئی نئی ادائیں دکھانی شروع کیں، تو بڑے بڑوں کی رال ٹپکنے لگی۔ ہر ایسا شخص جو بے ادبی معاف! ادبی خواجہ سرا نہ تھا!! اس سے ہم کنار ہونے کی آرزو کرنے لگا، اور ہندوستان میں جابجا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سُنا گیا ہے غدر کے بعد سب سے پہلے اس نازنیں کا تعلق مقدس سرسیدؒ سے ہوا، جنکے فیض تصرف سے یہ اپنی بڑی بوڑھیوں یعنی علمی زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔ اس قدر افزائی سے ایک تو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسکے ادبی ناز و انداز انجان طور پر دن دُونی رات چوگنی ہوتے گئے۔ دوسرے، تھی بھی یہ بلا کی چرتر، چاہت کی جو بھر مار دیکھی، تو جو اور جہاں دلکش ادا ہاتھ لگی، اس نے جان بوجھ کر اُڑا لی۔ چاہنے والوں کی نت نئی فرمائشیں اسپر مستزاد تھیں۔ اس لیے کہ وہ زبان عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کی نازک خیال نازنینوں کے جھرمٹ میں سے جب ہوتے ہُواتے آتے تو اُنھیں ساری کی ساری اداؤں کو اُردو میں ڈھونڈتے، اَوروں سے تو یہاں بحث نہیں، پنڈت جی سرشار، حکیم محمد علیخاں، شمس العلماء نذیر احمد، مرزا رسوا، اور شرر جیسے خوش صفات حضرات پھسل پڑے۔ سُنا ہے، ان سب کو کہانی کہنے والی ادا نے بڑی حد تک لُبھا لیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ ناول (ادبی کہانی) کی طرف مائل ہو گئے۔

ادب اُردو میں "ناول" انگریزی زبان سے لیا گیا ہے۔ خود انگریزی میں یہ لفظ "نووِس" سے مشتق ہے: جو لاطینی زبان کے لفظ "نُووَس" کا مخفف ہے۔ نووس کے معنی "نئے" کے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ بھی اطالوی زبان کے لفظ "نُووِی لا" سے لیا گیا ہے: ادب انگریزی میں انسانی افعال و کردار کے مطالعہ کا نام ناول رکھا گیا ہے۔ ناول چونکہ گذشتہ یا روزمرہ واقعات پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اسکو "آئینۂ زندگی" کہا جا سکتا ہے

پلاٹ اگرچہ بیشتر
ذں کے حامل ہوا
ات میں سے سچی سچی

باتوں کی ایک خاص حیثیت سے نمایندگی، ناول کے مفہوم میں داخل ہے۔
یا یوں سمجھیے کہ ناول ایک ترقی یافتہ کہانی ہے، جو سماجی تعلقات پر مبنی ہے۔
اور نثر میں کہی گئی ہو۔ اور جو اگرچہ تاریخی نقطۂ نظر سے لفظ بلفظ تو صحیح نہیں ہوتی، تاہم اتنی لگ بھگ ضرور ہوتی ہے کہ ذرا سے ردوبدل سے وہ تاریخ بن سکتی ہے۔ فی زمانہ ناول ادب لطیف کے ڈھالنے کا نیا سانچا بنگیا ہے، لیکن اس سانچے کو ایسا شخص ہی خوبصورت بنا سکتا ہے اور اس میں ادب لطیف کو ڈھال سکتا ہے جو خود پوری طرح بھلمنساہیت میں بس گیا ہو، تاکہ وہ سماجی رسم و رواج کی نت نئی تصویریں اُتار اُتار کر انھیں متاملانہ اور ناقدانہ دیکھ سکے، اور تجربہ کے مختلف رنگوں میں ادب لطیف کا شوخ پن شامل کر کر کے تصویروں کا حسن دوبالا کرتا جائے: یوں ناول، ہجو، تعلیم، سیاسی اور مذہبی تلقین، اور اصطلاحی معلومات کا بھی ذخیرہ بن چکا ہے: لیکن یہ ساری اضافی باتیں ہیں، اسکا سیدھا سادھا اور براہ راست کام یہ ہے کہ سماجی زندگی کے مختلف سینوں کو یہ نفس کی پلیٹیں پر اس طرح اُتارے کہ ایک تو نیچر کے شوخ رنگوں کی قدرتی رنگا رنگی ہاتھ سے نہ جانے پائے، دوسرے یہ سارے کے سارے سین نہیں! دُر شہوار ہنرمندانہ زور قلم کے ساتھ حسن بیان کی ایک ہی نازک لڑی میں پرو دیے جائیں!

قول مذکور آج مغربی دنیائے ادب کا مکمل اور محبوب تصور ہے، جسے "ناول" کا نام دیا گیا، اس میں مخلبہ اور باتوں کے ناول کے صحیح تصور کے لیے جن اساسی اور اہم اجزاء کا پتہ چلا، وہ یہ ہیں:- پلاٹ، کیرکٹر، قوتِ اظہار۔

پلاٹ پلاٹ کو ناول کی داغ بیل کے نام سے تعبیر کیا جائے، تو میرا خیال ہے اسکی صحیح صحیح ترجمانی ہو جائے گی۔ واقع میں یہی مختلف راہوں کا وہ باکیف مجموعہ ہوتا ہے جن پر ایک ناول نگار کی پیدا کی ہوئی ہستیوں (کیرکٹرز) کو چلنا پھرنا ہے، اسکی سمجھداری اور کامیابی کی یہ نشانی ہے کہ وہ ان راہوں کو اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے مناسب موزوں بناتا جائے۔ اور ساتھ ساتھ جب ان سب کو ایک جا اکٹھا کرے تو پوری سلیقہ مندی سے بھی کام لے، تاکہ یہی مجموعہ باعتبار لطافت "ایک ایسا خوبصورت گلدستہ بن جائے، جس کی ساخت میں نہایت خوشرنگ اور نازک نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہوں" ایسے پھول پتیاں جن کی نزاکت و خوشرنگی بجائے خود بھی دل لبھا رہو، مگر بحیثیت مجموعی تو ایک پُرشباب دلدار کی طرح بے قابو بنا دے!

کیریکٹر کیریکٹر کے معنی "تخیلی پیکر" پیدا کرنے کے ہیں، انکی پیدائش کا ذکر امام ڈرامہ یعنی شیکسپیر نے کیا ہے، میں اسے محترمی جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے کی زبانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں، ذرا سنیے گا کیا چیز ہے!

"کوی کی نفیس آنکھ وارفتہ سی گھومتی
نظر ڈالتی ہے زمیں پر کبھی آسماں پر
تو جوں جوں تخیل میں ڈھلتی ہیں انجانی اشیا
کے پیکر۔ کوی کا قلم اُنکی شکلیں بنا کر
مقرر بھی کرتا ہے ان خواب سی ہستیوں کا
مقام ایک بسنے بسانے کو اور ایک نام"

تو اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے، اور اگر ایک ناثر بھی اپنے میں اتنی قوت رکھتا ہے کہ تخیلی پیکر پیدا کر دے تو میرے خیال میں اس اوپر والے نتیجہ کا بھی یہ نتیجہ ہوگا کہ ایسا ناثر بھی، پیدا کرنے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو، "شاعر نثر" کہا جا سکے گا: میں دیکھتا ہوں کہ یہاں پیدا کرنے کا ذکر چھڑ گیا ہے: اسکے سہانے پن کو دیکھتے ہوئے اگر میں آگے بڑھ جاؤں تو عجب نہیں جو قارئین کرام کو بار گذرے اس لیے لگے ہاتھوں ذرا اور تفصیل وار سنا دینا مناسب ہوگا۔

پیدا ہونے کی بہترین مثال افزائش نسل ہے۔ نر اور ناری دونوں جانب سے مادی اور نفسی عنصر میل کھاتے ہیں۔ اور اس میل کا جو نتیجہ ہوتا ہے، وہ ایک تیسری شے ہوتی ہے، یعنی یہ کہنا بجا ہے کہ بچے میں ماں باپ دونوں کا حصہ ہے۔ دونوں کے حصے کیا بلحاظ مادہ اور کیا بلحاظ نفس مل جل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں۔ بچہ ایک جداگانہ مستقل ہستی ہوتا ہے۔ یہ تصور ہے پیدائش کا۔ اب ادبیات کے میدان میں اس تصور کو نظر کے سامنے رکھ کر خیال دوڑائیے کہ یہاں پیدا کرنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ادب میں جو چیزیں پیدا کی جا سکتی ہیں وہ گوشت پوست سے مستغنی ہوتی ہیں۔ ایک مثال لے لیجیے۔ مولانا نذیر احمد نے "اصغری" کو ادبی ہستی دی ہے۔ اصغری ایک ایسی ہستی ہے جسنے گوشت پوست میں کبھی جنم نہیں لیا۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ اصغری پیدا تو ہوئی ہے مولانا کے

دماغ نے بغیر کسی بیوی کے اصغری کو پیدا کیا۔ اب آپ کے یہ ذہن نشین ہو گیا کہ افزائشِ نسل کے لیے نر اور ناری کا یکجا ہونا اٹل ہے۔ ادبی ہستیوں کے لیے اس قسم کی یکجائی ضروری نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اصغری محض ایک تخیلی پیکر ہے لیکن اس تخیلی پیکر کی خوبی یہی ہے، کہ اس میں گوشت پوست کے سوا اور ساری باتیں ایسی ہی ہوں، جو جیتے جاگتے، سانس لیتے انسانوں میں ہوتی ہیں۔ اصغری کا احوال ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی واقعی شریف بیوی کی سوانحعمری ہے، جو کسی زمانہ میں گذر چکی ہے۔ اس مادی دُنیا میں سانس لے چکی ہے۔ اسکی بات چیت، اسکی چال ڈھال، اسکے طور طریقے اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں اس طرح جان پھونکی گئی ہے کہ اُنکو پڑھ کر ہمارے تخیل کے پردے پر ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اور تصویر بھی ایسی ہستی کی گویا ہم نے کبھی اُسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——"

علو مطالب کی "مئے دو آتشہ" جسے ابھی ابھی آپ نے چکھا "ولایتی" کی نفیس خوبیوں سے ہے، اور جو ایسا معلوم دیتا ہے کہ ہارن کے خمخانہ سے ہم تک لنڈھائی گئی ہے: چنانچہ سر مضمون جو قول نقل ہوا اُس سے اس خیال کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔ بایں ہم حضرت خاں صاحب کی ادبی سلیقہ مندی اور لطافت ذوق نے جس آرٹسٹک انوکھے پن سے دو آتشہ سہ آتشہ کر کے اسے ادب اُردو کے جام میں چھلکایا ہے، قابلِ رشک ہے۔ بدستان ادب کے لیے تو میرا خیال ہے یہی جام "جامِ جمشید" سے کم نہیں۔ کیوں؟ کہ اسی میں انھیں چلتے پھرتے "تخیلی پیکروں" کی معنوی پرچھائیاں نظر آجائیں گی: جنھیں "مسہری کی جد و جہد" نے نہیں! "اِسی زمی چیز" کے انہماک ذہنی" نے پیدا کیا ہے!

اظہارِ خیال کی قوت

خوش کلام نیومن نے کیا خوب کہا ہے کہ خیال کی گہرائی یا نظر کی پہنائی یا فلسفہ یا دانشمندی یا فطرتِ انسانی کا علم یا انسانی زندگی کا تجربہ ہی ایک مصنف کو اچھا اور بڑا مصنف بنانے کے لیے کافی وافی نہیں۔ یہ ساری اضافی خوبیاں ہیں جن سے بیشک چار چاند لگ سکتے ہیں، لیکن ایک بڑے مصنف کی امتیازی جودت اسکے انہما، خیال کی قوت ہے: یعنی وہ اتنا قادرِ کلام ہو کہ ہر صحیح خیال کے لیے اُسے ہمیشہ صحیح لفظ بھی مل جائے۔ وہ لوگوں کے دلوں کی بات کہے مگر اس طرح کہ دلوں میں اُتر جائے۔ وہ

اختصار پر اُترے تو اُسی میں چھپکا دے اور اگر الفاظ کی گنگا بہائے تو قریب قریب ہر لفظ "گنگا جل" کی طرح لائقِ پرستش قرار پائے - یہاں تک کہ اُسکے جملے کہاوتیں بن بن جائیں-

سچ بھی ہے ادبی دنیا میں تو الفاظ کی وہ کیفیت ہے جیسے مصوری میں سنسل، کہ اُٹھایا، تصویر کا خاکہ اُتارا، اور اُس میں بھانت بھانت کے رنگ بھر بھرا کے ایک سندر صورت بنا کے کھڑی کردی- اچھا مثال کے طوریوں سمجھیے، فرض کیجیے آپ ایک ادبی مصور ہیں اور آپ کے ذہن میں ایک کیریکٹر اُبھرا اب آپ چاہتے ہیں کہ وہی کیریکٹر سجنبہ دوسرے کے ذہن میں منتقل ہو جائے، اس خیال سے آپنے ایک فن داں مصور کی طرح ان خاص خاص لائنز کو بھی چُن لیا، جنکے ڈریس کرنے سے آپ اس کیریکٹر کو دوسرے کے صفحۂ خیال پر منتقل کر سکتے ہیں- لیکن آپ کے پاس الفاظ کی ایسی پنسلیں نہیں جن سے آپ خاکہ تیار کر سکیں یا اُس میں رنگ بھر سکیں - تو فرمائیے ایسی صورت میں کیا خاک آپ کسی چیز کی تصویر اُتاریے گا؟ اور کیا خاک اُس میں جلت پھرت کی تدبیر کی جا سکے گی؟ غرض غرض یہ کرنا ہے کہ تخیل کی "عروس جمیل" جب حجلۂ دماغ سے باہر آئے تو کسی قسم کا گھونگھٹ نہ رہے کہ اُس سے سوا رکاوٹ کے اور کوئی حاصل نہیں! اور ساتھ ہی مناسب و موزوں الفاظ کا ایسا "لباسِ حریر" بھی زیب تن ہو کہ شوقین نگاہیں ملیں تو مل کر اس کا فرادا کا پورا پورا جائزۂ حُسن لے لیں!

(باقی)

سید وزیر حسن دہلوی

جذباتِ احسن

اضطرابِ دلِ پُرشوق سے مجبوری ہے
عشق والوں کے لیے قرب میں بھی دُوری ہے

نہیں واقف جو وہ کیا درد کی لذت جانے
راحتِ جاں خلشِ پیہم مجبوری ہے

کُلفتِ بُعد ہے لیکن گلۂ بُعد نہیں
اللہ اللہ یہ کیسا عالمِ مجبوری ہے

وہ تمنا نہیں جو خوگرِ تسلیم نہ ہو
وہ محبت نہیں جسکو گلۂ دُوری ہے

مذہبِ عشق میں دعوائے محبت ہے حرام
حال صورت سے جو کھلجائے تو مجبوری ہے

دل میں اُس نام سے اک حشر بپا ہوتا ہے
قُربِ منزل میں اگر دوری ہے

ہے محمدؐ کی غلامی کا شرف
دُور اُس سے خلشِ ناوک ر

محمد نجم احسن احسن

شعر الہند (حصۂ دوم)

کتاب شعر الہند کا دوسرا حصہ جو حال ہی میں چھپ کر یا اصطلاح قدیم زیور طبع سے مزین ہو کر شایع ہوا ہے، اسوقت میرے سامنے ہے اور ایڈیٹر صاحب الناظر کا فرمان واجب الاذعان پیش نظر۔ اس لیے ان چند سطور میں اُن خیالات کا اظہار مقصود ہے جو اس کتاب کے مطالعہ سے میرے ذہن میں آئے۔

حصہ دوم کی اشاعت سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ کتاب شعر الہند کے پہلے جزو کی اشاعت کے بعد بعض ایسے معمے جو کتاب کی نوعیت اور ترتیب کے متعلق ناظرین کے دل و دماغ کو پریشان کر رہے تھے خود بخود حل ہو گئے۔ یعنی اب سمجھ میں آیا کہ مصنف پہلے حصہ میں تو صرف شعرائے اُردو کا ذکر اور اُنکے ادوار کا بیان فرداً فرداً کرنا چاہتے تھے اور دوسرے جزو میں اُردو شاعری کی تمام مختلف انواع پر ایک عام تبصرہ۔ اور یہ تبصرہ یا ریویو بھی دو حیثیتوں سے یعنی تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مصنف اس ارادہ کا ذکر پہلے جزو کے دیباچہ میں کر دیتے تاکہ قارئین مختلف اور پراگندہ توجیہات اور ظنون سے اپنے دماغ کو پریشان نہ کرتے۔ دوسرا فائدہ یہ مرتب ہوا کہ کتاب مکمل ہو گئی اور جائے شکر ہے کہ مصنف کو اس قدر فرصت اور توفیق ہوئی کہ جس کام کا اُنھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا اُسے ساحل مقصود تک پہونچا دیا اور اُردو شاعری کے تذکروں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ لیکن کیا یہ اضافہ بہت بیش قیمت بھی ہے؟ یہ ایک دوسرا سوال ہے جس کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار جزو اول کی تنقید لکھتے وقت کر چکا ہوں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ جزو دوم کو دیکھ کر میرے اُن خیالات میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

کتاب شعر الہند کا جزو دوم ایک مختصر مقدمہ سے شروع ہوتا ہے، جس میں "اُردو زبان میں فن تنقید" کے عنوان سے یہ دکھایا گیا ہے کہ زبان اُردو میں تنقید ابتداءً صرف الفاظ و محاورات، بندش و اسلوب پر بحث تک محدود تھی۔ صرف آخری ایام یعنی دور جدید میں تنقید کے صحیح مفہوم کو سمجھا گیا اور حالی نے ایک نئے طرز تنقید کی بنیاد ڈالی جس میں معانی اور مطالب کی اہمیت کو کماحقہٗ تسلیم کیا گیا ہے اور اسکے بعد دیگر اُدباء مثلاً شمس العلماء امداد امام صاحب مرحوم اور شبلی مرحوم نے اُن کا تتبع کیا۔

اسکے بعد پہلے باب میں اُردو شاعری کی مختلف صنفوں پر تاریخی حیثیت سے فرداً فرداً ریویو کیا گیا ہے - ان اصناف میں غزل، رنختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری شامل ہیں - دوسرے باب میں انواع شاعری پر ادبی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے اور غزل، خمریات، قصیدہ، فخریہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، سہرا، وصف اور تشبیہ و استعارہ کا بیان ہے - اسکے بعد چند مختصر فصلوں میں مختلف مضامین کا ذکر ہے یعنی اجزائے شعر اور محسنات شعر - تیسرے باب میں "ملکی سرمایہ"، ہندوؤں کا تعلق اُردو شاعری کے ساتھ" اور "مربیان سخن" کے عنوانوں سے چند فصلیں لکھی گئی ہیں اور خاتمۂ کتاب فارسی اور دیگر زبانوں کی شاعری اور اُردو شاعری کے مقابلہ پر ہوتا ہے - اِن اصناف شاعری کی طویل فہرستوں پر نظر ڈالنے سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس بنا پر قائم کی گئی ہیں - اُردو شاعری کو مختلف قسموں میں مختلف اعتباروں سے تقسیم کیا جا سکتا ہے اور زیادہ تر دو لحاظ سے - یعنی مضمون اور شکل نظم - مضمون کے اعتبار سے یہ شاعری عشقیہ، خمریہ، صوفیانہ، اخلاقی، مدحیہ، ہجویہ وصفیہ مذہبی اور قومی وغیرہ وغیرہ ہو سکتی ہے اور شکل کے لحاظ سے غزل، قصیدہ، مربع، مخمس، واسوخت، مثنوی، رباعی، مسدس، وغیرہ - اور اقسام شاعری پر ریویو کرنے کے لیے یہی مناسب ہے کہ ایک خاص اعتبار سے اُنکو دیکھا جائے - یعنی یا تو مضمون مدنظر ہو یا شکل، ورنہ ان دونوں کو خلط کرنے سے سوائے اسکے کہ ایک اُلجھن پیدا ہو اور سلاست و وضاحت کتاب زائل ہو جائے اور کوئی مفید مطلب پورا نہیں ہو سکتا - مدح غزل میں بھی ہو سکتی ہے اور قصیدہ میں بھی، ہجو بھی کسی خاص شکل کی قید سے آزاد ہے - شراب کا بیان ۱۲ عیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور لمبے چوڑے قصیدوں اور طویل غزلوں میں بھی - اسی طرح سب اصناف شاعری جو مضمون کے لحاظ سے متصور ہو سکتی ہیں مختلف شکلوں میں لکھی جا سکتی ہیں - اور دونوں اصناف کو ملانے کا نتیجہ بے ضرورت اعادہ اور ناپسندیدہ طوالت ہے جو کسی طرح پر بھی کتاب کی وقعت کے لیے باعث افزونی نہیں ہو سکتی -

علاوہ ازیں مصنف نے بعض ایسے مضامین کو ایک مستقل صنف شاعری قرار دیا ہے جو ہرگز اس عزت کے مستحق نہیں - یہ سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ چونکہ غالب اور ذوق کے دو سہرے اُردو شاعری میں موجود ہیں اسلیے سہرے کو رتبہ حاصل ہو گیا کہ وہ غزل کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو اور مرثیہ و مثنوی سے دعوے ہمسری کرے - اگر سہرے لکھنے والے نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسکو یہ درجہ نصیب نہ ہو، اور مہند ہے تو منڈھے پر اس عزت سے

محروم رہے۔ اسی طرح اُردو شعرا نے اگرچہ شراب کی تعریف میں بہت کچھ روانی طبع دکھائی ہے لیکن اُردو شاعری میں کوئی خاص صنف اس مضمون سے متعلق نہیں ہے۔ اُردو کا دامن اس ناقابل فخر قسم شاعری سے آلودہ نہیں ہے اور نہ کسی اُردو شاعر ہی نے نبت عنب کی توصیف و مدح کو کلیۃً اپنا مطمح نظر بنایا، یا پرانے یونانی شاعروں کی طرح شراب کے دیوتا بیکخس کے قدموں میں شرابی، قصیدوں کے پھول اور انگوری، غزلوں کے جواہر نثار کیے۔ پھر معلوم نہیں کہ مصنف کو یہ مضمون اس قدر اہم کیوں معلوم ہوا کہ اُسکو ایک علیحدہ فن شاعری تصور کرکے اسپر ادبی ریویو ضروری سمجھا۔ اگر خمریات اُردو شاعری کی ایک نوع قرار پا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عشقیات، بہاریات، خزانیات اور شتائیات کا شمار بھی اسی زمرہ میں نہ ہو۔ لیکن سب سے حیرت خیز اور اچھوتی صنف شاعری جسکا بیان مصنف نے باب دوم میں کیا ہے تشبیہ و استعارہ ہے۔ یہ قسم ایک عمولی عقل و فراست کے انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور اس لیے اسپر زیادہ لکھنا بے سود ہوگا۔

باب اول اور باب دوم کی فہرستوں کے مقابلہ سے ایک اور تعجب خیز حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اقسام شاعری تو ایسی ہیں کہ اُن پر ادبی حیثیت سے ریویو ہو سکتا ہے لیکن تاریخی حیثیت سے بالکل ناممکن ہے اور بعض اصناف ایسی ہیں کہ تاریخی اعتبار سے تو ہم اُن پر تنقید کر سکتے ہیں لیکن ادبی لحاظ سے نہیں۔ 'خمریات' کے متعلق تو یہ متصور ہو سکتا ہے کہ یہ صنف چونکہ مشرب تصوف سے گونا گوں تعلقات رکھتی ہے اس لیے اسکا شمار "علم سینہ" میں ہے اور تاریخ یا روایت سے اسکو کوئی سروکار نہیں۔ لیکن وصف تو غالباً (باوجود ایک لفظی مماثلت کے) کبھی تصوف کا جزو نہیں سمجھا گیا کہ اسکو بھی اسی زمرہ میں شامل کیا جائے۔ رختی تو شاید اس قابل نہ ہو کہ ادب میں اسکو جگہ دی جائے، لیکن کیا ڈراما اور واسوخت وغیرہ بھی ایسی مبتذل اور ساقط قسمیں ہیں کہ اُن پر ادبی ریویو کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو؟ ممکن ہے کہ بعض نوعیں شاعری کی ایسی ہوں کہ انکے متعلق کافی تاریخی مسالہ ہم نہ پہونچ سکتا ہو اور اس لیے مصنف نے تاریخی ریویو کے وقت انکو نظرانداز کر دیا ہو، لیکن ایسا کرنا ایک مصنف اور محقق مصنف کے لیے خصوصاً کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اور ادبی ریویو میں تو کسی صنف شاعری سے پہلوتہی کرنے کی بظاہر کوئی بھی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخی ریویو کا نام سُن کر ہر شخص کے دل میں یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اُردو شاعری کی مختلف قسموں کے تدریجی نشو و نما کا ایک پُر لطف مرقع اور ایک پُر رنگ نقش ہوگا۔ لیکن باب اول کی ورق گردانی سے اُس کی توقع کو مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس باب میں جو تاریخی ریویو ہے وہ تاریخ سے اسی طرح بے نیاز اور بے تعلق ہے جس طرح الف سے لام یا لام سے میم۔ مصنف بظاہر ادبی اور تاریخی ریویو کی حدود فاصلہ کو قائم نہ رکھ سکے اور ایک کو دوسرے سے ملا دیا۔ مثلاً غزل میں وہی پرانے دقیانوسی چار دور مذکور ہیں جنکی چار دیواری میں مولانا آزاد مرحوم کے زمانہ سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اردو شاعری محدود و مقید ہے۔ اور ان ہی دوروں کے مشہور اساتذہ کے کلام کے نمونے انکے زمانہ کی خصوصیتوں کے اظہار کے لیے پیش کر دیے گئے ہیں۔ انکے کلام کے عیوب اور محاسن بھی بہت تشریح اور تدقیق سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ کس سنہ میں غزل کی ابتدا ہوئی کس حصۂ ملک میں اور کس بادشاہ کے عہد میں، کس طرح اور کن کن وقتوں میں اس میں بتدریج ترقی ہوئی، تو وہ اس باب سے بہت کم بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ اور اسکو یا تو ڈی ٹاشے کے تذکرہ کا رخ کرنا پڑے گا یا کسی آیندہ تذکرہ کا انتظار۔ ان چار دوروں کا بیان اور انکی خصوصیات کا ذکر تو مصنف بہت شرح وبسط کے ساتھ جزو اول میں بھی کر چکے تھے اس لیے جزو دوم میں ان ہی باتوں کو کچھ اضافہ کے ساتھ دوہرا دینا کتاب کی 'جامعیت' میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ غزل پر جو ریویو ادبی اور تاریخی حیثیت سے باب اول و دوم میں کیے گئے ہیں اُنکا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ یعنی جو شخص اس زحمت کو گوارا کرے وہ دیکھے گا کہ جا بجا ایک ہی قسم کے خیالات دونوں میں موجود ہیں اور بہت سے اشعار جو تمثیل کے لیے دیے گئے ہیں مشترک ہیں۔

ادبی ریویو میں غزل اور قصیدہ وغیرہ کے متعلق اصول و قوانین قائم کرنے کے لیے ادبا عرب مثلاً ابن قدامہ اور ابن رشیق کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ میرے خیال میں اردو شاعری پر یہ ایک ظلم ہے کہ اسکا معیار عرب کی شاعری کو قرار دیا جائے اور اس زرہندی کو پرکھنے کے لیے عرب سے کسوٹی مستعار لی جائے۔ اردو شاعری عربی شاعری کی بہت کم مرہون احسان ہے، اس لیے کہ اردو کے شاعروں نے جو کچھ بھی لیا فارسی کے شعراء سے لیا، اور فارسی شاعری عربی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ شاید قصیدہ کے سوا اور کوئی بھی صنف اسکی قدیم شاعری سے مماثل نہیں ہے دور آخر یعنی خلفاے بنی عباس اور انکے مابعد کی عربی شاعری بیشک فارسی شاعری سے بہت مشابہ ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں نے ایرانیوں کی تقلید [illegible] انکے طرز شعر کا تتبع کیا۔ غزل

تو کبھی بھی عربی شعر میں کوئی صنف مستقل نہیں سمجھی گئی اور [illegible] ں اور اردو قصائد
سے بہت مختلف ہے۔ موخر الذکر میں مقام شکر ہے کہ لیلیٰ [illegible] فی اور مٹنی اور

امرأ القیس کا گھوڑا کہیں مذکور نہیں۔ معشوق کے لب جاں بخش، رخ رنگیں، اور زلف پیچاں کے پہلو بہ پہلو کہیں اونٹ کے کٹکے ہوئے ہونٹ، بھرے ہوئے گالوں یا اُلجھی ہوئی پشم کا ذکر نہیں ہے۔ اردو کا شاعر کبھی بھیڑیے اور چرخ کے ساتھ نہیں سویا۔ اُس نے جلتے ہوئے میدانوں میں جھلسے ہوئے گرگٹ کو نہیں دیکھا اور نہ اپنے ممدوح یا معشوق تک پہونچنے کے لیے لق ودق میدانوں میں ببول اور جھاؤ کے درختوں کے درمیان کوسوں کے سفر ہی طے کیے۔ صرف یہی نہیں کہ اردو غزل عربی غزل (اگر اسکی مستقل ہستی مان بھی لی جائے) سے بالکل بے نیاز ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فارسی غزل سے بھی بہت مختلف ہے۔ اسکا اندازہ ہر صاحب نظر کو ہو سکتا ہے جو فارسی کے کسی مشہور غزل گو مثلاً حافظ کا مقابلہ کسی اُردو کے اُستاد مثلاً میر یا داغ سے کرے۔ دریں صورت یہ عقدہ حل ہونا مشکل ہے کہ مصنف کو اُردو غزل اور قصیدہ کا بیان لکھنے میں ان ادبائے عرب کی کتابوں کا جائزہ لینے اور اُنکے مقرر کردہ اصولوں کو اُردو شاعری کی عمدگی یا رذالت کا معیار بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ قصیدہ کے متعلق ابن رشیق کے خیالات نقل کرکے لکھتے ہیں کہ "لیکن ہمارے شعراء کے قصائد بشکل ان شرائط کے معیار پر پورے اُتر سکتے ہیں" (ص ۳۳۲)

کتاب کا آخری حصہ یعنی اجزائے شعر وغیرہ کی بحث، مضمون کتاب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا بہتر ہوتا کہ مصنف اس فن پر کوئی علیحدہ کتاب تصنیف کر دیتے۔ مگر خیر جامعیت نہ ہو تو تفنن ہی سہی۔ لیکن "ہندوؤں کا تعلق اُردو شاعری کے ساتھ" میری رائے میں ایک بالکل بے معنی فصل ہے شاعری قید مذہب وملت سے آزاد ہے اور سیاست سے بے نیاز۔ اُردو شاعری ہندوستان کے ایک طبقۂ کثیر کی مشترکہ شاعری ہے۔ جس طرح اردو انکی مشترکہ زبان ہے۔ اور اس طبقہ میں ہندو مسلمان سب شامل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ خاص طور پر ایک فرقہ کا تعلق اس شاعری سے بیان کیا جائے اور وہ بھی اس حسن اختصار سے کہ تین چار صفحوں اور دو تین ناموں تک محدود رہے

تمام کتاب کو دیکھنے کے بعد مجھے ایک افسوسناک حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ مصنف نے اگرچہ اسکو بلاشبہ بہت محنت وجاں کاہی سے مکمل کیا ہے، لیکن اس میں کوئی نئی بات، کوئی خاص خصوصیت جو اسکو دوسرے تذکروں سے ممتاز کرے اور اُردو شاعری کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہو نظر نہیں آتی۔ مصنف نے اپنی طرف سے بہت ہی کم لکھا ہے اور زیادہ تر اوروں کی رائے پر اکتفا کیا ہے۔ چنانچہ مرثیہ کا بیان تقریباً تمام وکمال اور حرف بحرف مولانا شبلی کی کتاب "موازنۂ انیس ودبیر" سے نقل کر دیا گیا ہے۔ اور اگر کہیں اُردو اُدبا کی کتابوں

سے مدد نہ لی سکی تو عرب مصنفین سے استفادہ ضروری خیال کیا گیا۔ یہ فقدان رسائی اور عدم تحقیق اس زمانہ کے کسی مصنف کے لیے باعث فخر نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے شاید دو ایک جگہ پر ہی اپنی رسائی کے اظہار کی جرأت کی ہے۔ مثلاً خاتمۂ کتاب میں مختلف زبانوں کی شاعری کا مقابلہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ: (اُردو شاعری) کلیتہ فارسی شاعری کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ..... عشق و محبت کے متعلق جس قدر لطیف و نازک اشعار فارسی میں ہیں اُردو میں نہیں مل سکتے۔ فلسفہ اور تصوف بھی جس قدر فارسی میں ہے اُردو شاعری میں نہیں ہے۔ مولانا روم، فریدالدین عطار، سنائی، عراقی، اوحدی، نظامی، امیر خسرو، اور خیام، وغیرہ کے مقابلہ میں کون اُردو شاعر پیش کیا جا سکتا ہے" لیکن افسوس ہے کہ مجھے اس رائے سے بھی اختلاف ہے۔ میرے خیال میں اُردو شاعری باوجود اپنی صغرسنی کے فارسی شاعری سے کئی میدانوں میں سبقت لے گئی ہے اور بحیثیت مجموعی اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ عشق و محبت کی باریکیاں اور فلسفہ و تصوف کے دقائق اس میں فارسی سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ اور اگر کسی فارسی نظم میں یہ مضامین اردو کی نسبت زیادہ اچھی طرح اور کثرت سے بیان ہوئے ہیں تو وہ مولانا روم اور اوحدی وغیرہ کی نظم نہیں ہے بلکہ نظیری اور عرفی وغیرہ کی شاعری ہے۔ یعنی وہ فارسی شاعری جس نے اُردو ہی کے ملک میں جنم لیا اور نشو و نما پائی۔ لیکن یہ ایک طویل بحث ہے اور اس مختصر ریویو میں اسکا چھیڑنا غیر موزوں۔

آخر میں مصنف کی ایک قابلیت کی داد ضرور دینا چاہتا ہوں، یعنی اُنکے ذوق شعر کی۔ کتاب شعرالہند میں جو اشعار انھوں نے مختلف شعرا کے کلام سے لیے ہیں وہ اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اس طرح پر کتاب اُردو شاعری کی مختلف اصناف کے نمونوں کا ایک بہت اچھا مجموعہ ہے اور یہی ایک خوبی کتاب کے بہت سے نقائص کی تلافی کر سکتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اسکو بحیثیت ایک ادبی کتاب کے پڑھے گا تو یقین ہے کہ بہت کچھ روحانی حظ اور ادبی فائدہ حاصل کر سکے گا۔ اور اسی وجہ سے مجھے اُمید ہے کہ قابل مصنف کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور کتاب شعرالہند بہت سے علم دوست اصحاب کے کتبخانوں کی زینت کا باعث بنے گی۔

محمد وحید مرزا

آیولینتھی

چھٹا منظر

(بادشاہ رینی، ایمرک، ٹرسٹان جو مکمل طور پر مسلح ہے مع اپنے سپاہیوں کے۔ اُسکے بعد جیوفری مع اپنے سپاہیوں کے)

(یہ وقت وہ ہے کہ آسمان پر شفق پھول رہی ہے)

ٹرسٹان - اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ جو درّہ کی حفاظت کرتے تھے اُنھوں نے ہتھیار رکھ دیے۔ کیا تم بھی اُنکی پیروی کرتے ہو؟

رینی - کیا کہا؟ تو کون شخص ہے جسکے شریر ہاتھوں نے مسلح ساتھیوں کے بل پر اِس سرزمین کو ناپاک کیا۔ آگے قدم نہ بڑھانا ورنہ خاک پھانکتا نظر آئیگا

ٹرسٹان - بوڑھے شخص، ذرا اپنے الفاظ کا خیال رکھ۔ میں ڈرتا نہیں لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ یہ جگہ کسی موذی اور ناپاک طاقت کے پنجے میں ہے اسی وجہ سے تو کانپ رہا ہے (رینی دراصل غصے سے کانپ رہا تھا) اور میرا دل شیر ہے۔ اگر تو جادوگر ہے اور یہ امید ہے کہ سحر تیری مدد کرے گا تو اسکے برستے پر نہ بھولنا۔ حضرت پوپ نے اِس تلوار کو متبرّک کیا ہے اور یہ رومال بھی پاک ہاتھوں نے آویاں کی نانقاہ سینٹ میری میں تیار کیا ہے اور اس زرہ کے نیچے وہ مصمم عزم ہے جو تجھ پر غلبہ حاصل کرے گا جس طرح سینٹ جارج نے اژدر کو ہلاک کیا تھا۔

رینی - گمراہ شخص! تو یہاں کس لیے آیا ہے؟

ٹرسٹان - تو میری بات کا جواب دے۔ کیا تو اس وادی کا مالک ہے؟

رینی - بیشک، اور اسی پر میری ملکیت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ لیکن تو کون ہے؟

(جیوفری مع اپنے ساتھیوں کے داخل ہوتا ہے)

جیوفری - میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ شاہ رینی! (زانو ٹیک کر) میرے بادشاہ!

رینی - جیوفری، تو بھی! اپنے بادشاہ کے خون کا شریک ہے!

جیوفری - خداوند! کیا ارشاد ہوتا ہے! وہ پہلے روانہ ہوگیا۔ مجھے دیر میں اطلاع ہوئی۔

رینی (ٹرسٹان سے) بتا تُو تم کون ہو۔

ٹرسٹان - میرا نام ٹرسٹان آف دومانٹ ہے۔ آپ اس نام سے اچھی طرح واقف ہیں۔

رینی - کیا ٹرسٹان! (جیوفری سے) کیا یہ سچ ہے؟

جیوفری - حضور ایسا ہی ہے۔

رینی (کچھ سوچ کر) تو شاید تمھیں تھے جو آج ایک مرتبہ پیشتر بھی یہاں آچکے ہو؟

ٹرسٹان - ہاں جناب! اگر اتفاقیہ نہ کہ بالقصد مجھے خواب میں بھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ یہاں آپکی عملداری ہے۔

رینی۔ لیکن تم دوبارہ کس نیت سے آئے؟
ٹرسٹان۔ آپ جانتے ہیں۔
رینی۔ نہیں، میں نہیں جانتا۔ تم بتاؤ۔
ٹرسٹان۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس پھولوں سے لدی ہوئی وادی میں جہاں کی ہر چیز حیرت خیز ہے اُن سب سے زیادہ عجیب و خوبصورت ایک لڑکی ہے۔ پر دہ الس کے تمام ڑوبیڈور متفقہ کوشش کریں تو بھی کما حقہٗ اُسکی تعریف نہ کرسکیں۔
رینی۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ خوبصورت لڑکی ــــ کہو کیا کہتے ہو!
ٹرسٹان۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اُس لڑکی نے مجھ پر ایسا گہرا جادو کردیا ہے کہ میں ہمیشہ کے واسطے اُسکا غلام ہوگیا ہوں۔
رینی۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ کون ہے؟
ٹرسٹان۔ نہیں۔ لیکن اُسکے چہرہ اور اُسکے الفاظ سے نمایاں ہے کہ وہ شریف و عالی نسب ہے۔
رینی۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ قدرت نے اور تمام باتوں نے اُسکے ساتھ نہایت فیاضی برتی مگر ایک ــــ"
ٹرسٹان ہاں! افسوس وہ نابینا ہے۔ تاہم اُسکی روح میں ایک موج نور رواں ہے جو ہر تاریک شے کو منور کردیتی ہے۔
رینی۔ باوجودیکہ تمھیں علم ہے کہ وہ نابینا ہے ــــ
ٹرسٹان۔ تاہم میں اپنا تاج شاہی نہایت خوشی سے اُس کے قدموں پر رکھنے کو تیار ہوں
رینی۔ کلیرولے میں جو پاک مورت ہے اُسی کی قسم کہ تم عجیب و غریب شخص ہو۔ تم یہاں مسلح ہوکر زبردستی اُس چیز کے لیجانے کو داخل ہوئے جو مدت سے تمھاری تھی۔ تاہم تم نے حقارت آمیز طریقہ سے انکار کردیا۔
ٹرسٹان۔ آپ نے کیا فرمایا؟
رینی۔ تمھیں جاننا چاہیے کہ یہ خوبصورت لڑکی جسنے تمھارے دل کو اسیر کرلیا ہے میری بیٹی ہے۔
ٹرسٹان۔ وہ آپ کی بیٹی ہے؟
رینی۔ ہاں اے نوجوان کاؤنٹ، میری بیٹی ہے اور وہی ہے جسکو تمھارے خط سے واضح ہوتا ہے تم کبھی بطور ملکہ کے قبول نہیں کرسکتے۔ وہی ہے جسکے سبب سے تمھارے دل میں ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ تم نے اپنی گلو خلاصی کے لیے لورین کے پورے صوبہ سے دست بردار ہونے پر آمادگی ظاہر کی۔ وہی ہے جسکے دل پر تم نے ایسا قبضہ کرلیا ہے کہ مجھے شک ہے وہ غریب لڑکی تمھیں آسانی بھول جائے گی۔
ٹرسٹان۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب والا ایسی غیر مترقبہ خوشی کی بلاوجہ خوشخبری نہیں سناتے۔
رینی۔ خ ــــ انہیں کہا۔
ٹرسٹا ــــ
رینی۔ ــــ رکھی گئی؟ یہ تمھیں

عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ تمھیں شاید اس امر سے آگاہی نہیں کہ تم ایک نہایت نازک موقع پر یہاں آئے ہو۔ میری پیاری بیٹی آیو لنتھی، شاید اسی وقت جبکہ ہم باتیں کر رہے ہیں ہمیشہ کے واسطے تاریک ترین شب میں داخل یا دن کی پُر از آب و تاب روشنی میں بیدار ہو رہی ہے۔

ٹرسٹان۔ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں۔

رینی۔ اسی وقت حکیم ابن یحییٰ دیکھ رہا ہے کہ آیا مارتھا۔ وہ دیکھ سکتی ہے۔

رینی۔ کیا مارتھا؟ دیکھ سکتی؟

ٹرسٹان۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

مارتھا۔ خاموش! خاموش! وہ آ رہی ہے۔

(ابن یحییٰ آیو لنتھی کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوتا ہے اور لوگوں کو اشارہ کرتا ہے کہ نظر سے اوجھل ہو جائیں)

آیو لنتھی۔ آپ مجھے کہاں لیے جاتے ہیں۔ اے خدا میں کہاں ہوں۔ مجھے سنبھالیے۔ آہ مجھے سنبھالیے۔

ابن یحییٰ۔ بیٹی۔ گھبراؤ نہیں۔

آیو لنتھی۔ مجھے سنبھالیے۔ ٹھہر جائیے۔ میں یہاں پہلے کبھی نہیں آئی۔ اس غیر مانوس جگہ میں کس طرح رہوں گی کیا کروں گی۔ یہ کیا ہے؟ مجھے سنبھالیے۔ یہ مجھ پر ڈھایا پڑتا ہے۔ مجھے تکلیف پہونچ رہی ہے۔

ابن یحییٰ۔ بیٹی اپنے دل کو ٹھکانے کرو۔ زمین کی طرف دیکھو۔ یہی ہمیشہ تمھاری بہترین دوست رہی ہے اور اب بھی خندہ پیشانی سے تمھارا خیر مقدم کرتی ہے۔ یہی! باغ ہے جس کی تم نے ہمیشہ نگہداشت کی۔

آیو لنتھی۔ میرا باغ! میرا! افسوس میں اسے نہیں پہچانتی۔ یہ پودے کس قدر خوفناک معلوم ہوتے ہیں۔ ہوشیار رہیے! وہ ہم پر گرے پڑتے ہیں!

(مکان کے قریب جاتا ہے)

خاموش! میرا خیال ہے کہ اندر کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔ سب خاموش رہیں، وہ بول رہی ہے۔ آہ ٹرسٹان سنو! آیو لنتھی بول رہی ہے۔ آہ تم سنو اور مجھے بتاؤ کہ اُسکے لہجے سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے یا غم کا ——— لیکن کوئی آ رہا ہے۔

ساتواں منظر

(علاوہ اُن لوگوں کے جو موجود ہیں پہلے برٹرانڈ اور اسکے بعد مارتھا، آیو لنتھی اور ابن یحییٰ داخل ہوتے ہیں)

رینی (برٹرانڈ سے جو مکان سے آیا ہے) برٹرانڈ فوراً بتاؤ کہ کیا حال ہے!

برٹرانڈ۔ افسوس میں نہیں جانتا۔ وہ بیدار ہوئی اور سب عمل ختم ہو گیا۔ لیکن میں خوفزدہ ہو کر چلا آیا۔

(مارتھا تیزی سے داخل ہوتی ہے)

ابن یحییٰ بیٹی ڈرو نہیں - یہ شاندار درخت کھجور کے ہیں جنکی ٹہنیوں اور پھلوں کو تم ایک رات سے جانتی ہو -

آیولنیتھی - آہ نہیں میں انکو نہیں جانتی (آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھاتی ہے) یہ چمک جو مجھے گھیرے ہوئے ہے اور وہ گنبدِ عظیم جو ہمارے سروں پر ہے اُف! کس قدر بلند ہے - یہ کیا ہے؟ کیا یہی خدا ہے - کیا یہی اُسکی روح ہے جو آپ کہتے تھے تمام دُنیا پر چھائی ہوئی ہے -

ابن یحییٰ یہ چمک روشنی کی ہے - اس میں بھی خدا ہے جس طرح ہر شے میں ہے - یہ گہرا نیلا رنگ جو اس ہوائی گنبد میں بھرا ہوا ہے آسمان ہے - جہاں ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کا عرش عظیم ہے -

میری بیٹی - اپنے گھٹنے ٹیک دو اور درگاہ باری میں ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگو!

آیولنیتھی مجھے سکھائیے کہ کس طرح دعا مانگوں - آج تک مجھے کسی نے یہ طریقۂ دعا تعلیم نہیں کیا -

ابن یحییٰ میری پیاری بیٹی، مودب ہو کر کہو کہ اے پُر اسرار خالق تو نے مجھسے گفتگو کی جب میری آنکھوں پر تاریکی کی نقاب تھی، اب اپنی روشنی کی شعاعوں میں جو اس دنیا کو منور کرتی ہیں میری رہبری کر اور مجھے سکھا دے کہ میں کس طرح تیرے دامن رحمت سے لپٹی رہوں -

آیولنیتھی (مندرجۂ بالا الفاظ کو دہراکر) ہاں! اُس نے میری سُن لی - میں محسوس کرتی ہوں کہ اُس نے سکون و امن کو میرے دل پر مسلط کر دیا - صرف وہی مجھ سے گفتگو کرتا ہے اور سابق کی طرح مجھپر مہربان ہے، گو نظر نہیں آتا -

ابن یحییٰ اُٹھو! میری بیٹی اُٹھو اور اپنے چاروں طرف دیکھو!

آیولنیتھی - بتائیے وہ کون لوگ ہیں جنکے قد ایسے شاندار ہیں -

ابن یحییٰ - تم اُن سب کو جانتی ہو -

آیولنیتھی - آہ نہیں - میں کچھ نہیں جانتی -

رینی - (آگے بڑھ کر) آیولنیتھی میری طرف دیکھو تم میری بیٹی ہو -

آیولنیتھی ابا جان - اے میرے خدا! اب میں آپ کو پہچانتی ہوں، آپ کی آواز اور آپ کے ہاتھ کی گرفت سے اب آپ نہ جائیے گا - میری خبرگیری اور رہنمائی کیجیے - میں اس روشنی کی دنیا میں بالکل اجنبی ہوں - جو کچھ میرے پاس تھا مجھ سے چھین لیا گیا ہر شے جس سے پیشتر آپکی بیٹی خوش ہوتی تھی -

رینی - بیٹی میں نے تیرے لیے ایک رہبر انتخاب کیا ہے -

آیولنیتھی آپ کا مطلب کس سے ہے؟

رینی (ٹرسٹان کی طرف اشارہ کرکے) وہ دیکھ وہ تیرا منتظر ہے -

آیولنیتھ - کیا وہ اُن جنس میں سے ہے جنکا فرشتوں کیا وہ ر ایک مرتبہ ذکر کیا تھا آسمان سے نازل ہوا ہے -

رینی - یاد کرو - تم اُسے جانتی ہو اور اُس سے باتیں کر چکی ہو -

آیولینتھی - اُس سے ؟ اُس سے ؟ (اپنے اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کی آڑ کر کے) اباجان اب میں سمجھی - اُسی کے شاندار جسم سے وہ آواز مشابہ ہے جو کچھ دیر اُدھر میں نے سُنی تھی متین مگر قوی - صرف وہی آواز تمام فطرت میں دَورہ کر رہی ہے -

اے مہربان و خوشخو ملکہ !
سُنئے ! آہ سُنیے ! انھیں دلکش لفظوں کے
ساتھ روشنی کی پرلطف شعاعیں مجھ تک پہونچیں اور
یہی شیریں الفاظ میرے دل کی حرارت کے ساتھ
اس طرح مل گئے کہ ایک دوسرے سے جدا
نہیں ہو سکتے -

ٹرٹسان (آیولینتھی کو گلے سے لگا کر) آیولینتھی ! سب سے زیادہ عزیز !

رینی - تم دونوں کو خدا برکت دے - وہ خدا جسکی حیرت انگیز صناعیوں کے لیے ہم سب سر عبودیت خم کرتے ہیں -

(ختم شد)

اثر - لکھنوی

افکارِ تازہ

جانشین جلال جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی

دَم گھٹتے گھٹتے ضبط سے دیوانہ ہو گیا
چُپ رہتے رہتے رازِ دل افسانہ ہو گیا

دل حُسنِ عارضی کا بھی دیوانہ ہو گیا
ناداں چراغِ صبح کا پروانہ ہو گیا

سرسبزیاں ہیں دیدۂ اہلِ وطن میں خار
سبزہ لہک کے باغ سے بیگانہ ہو گیا

ہر جا مرا مزار ہے اور پھر کہیں نہیں
یوں مٹ کے خاکِ کوچۂ جانانہ ہو گیا

حالِ مریضِ ہجر نے بدلی یہ صورتیں
شکوہ سے ذکر ذکر سے افسانہ ہو گیا

ساقی رُکا تو بڑھ گئی تاثیرِ جذبِ شوق
منہ تک بلند ہاتھ سے پیمانہ ہو گیا

مدت کے بعد اُٹھا ہے زنداں سے کچھ غبار
آزاد آج آپ کا دیوانہ ہو گیا

جب کہہ چکا تو رکھ کا تھا ڈھیر قصہ گو
لو ختم سوزِ عشق کا افسانہ ہو گیا

جب ہوں گے اُنکے جور تو کیا ہوگا آرزو
اب تک تو کچھ نہ ہونے پہ کیا کیا نہ ہو گیا

مقدس ڈاکو

(۲)

گذشتہ نمبر میں صرف الناظر کے اقتباسات پیش کیے گئے تھے جن سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خواہر زادۂ حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلق ہم شروع ہی سے کیا رائے ظاہر کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے جب مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کی جاسوسی کا پردہ فاش کرنے والی تحریر کا اشاعت سے قبل ایک موقع پر ذکر کیا تو کم سے کم مجھے اسپر ذرا تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ جس شخص کا سالہا سال سے یہ شیوہ رہا ہو کہ علانیہ تصوف کے فریب آمیز بہروپ میں مسلمانوں کو دھوکا دیکر اپنی گرم بازاری کا سامان مہیا کرتا رہے اور دن دہاڑے بھولے، بامروت اور نیک دل لوگوں کو لوٹ لیا کرے اُسکے لیے مخبری و جاسوسی کے خفیہ جرائم کچھ زیادہ سنگین نہیں ہو سکتے۔ خدا معلوم گذشتہ پندرہ سال کے اندر ایسی ہی کتنی وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا ہوگا جنکی تفصیلات اور نتائج سے اہل ملک ہنوز بے خبر ہیں۔

ہمدرد میں اس واقعۂ مخبری کے سلسلہ میں جو طولانی مضامین شائع ہوئے ہیں اُنکو ہمنے بالاستیعاب پڑھا اور اس راز کے فاش ہو جانے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو جس رسوائی کا سامنا ہے اُسکے دفعیہ کے لیے "غریبوں کا اخبار" جو نکالا گیا اُسکے اکثر پرچے بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اور خواجہ صاحب کا مفصل جواب جو اخبار سے علٰحدہ بھی شائع کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اور غالباً یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا جو خط شائع کیا ہے اُسکی موجودگی میں نہ ہمدرد کے طولانی مقالات کی تائید مزید درکار تھی نہ خواجہ صاحب کے لاطائل جوابات سے مغالطہ کھانا ممکن ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی چور عین ارتکاب سرقہ کے وقت یا روداد جرم بیان کرتے ہوئے یا مال مسروقہ کو بغل میں دبائے گرفتار ہو جائے۔ لیکن جب کبھی ایسی صورت پیش آ جائے تو پھر چور خواہ کتنے ہی ہاتھ پاؤں اٹھائے یا سرقہ کے محرکات اور مال مسروقہ کے قبضہ میں آنے کے اتفاقات کی کتنی ہی عا[illegible] لت مجبور ہوگی کہ ایک بات کو بھی باور نہ کرے اور مجرم کو قانون مروجہ کے [illegible] سزا جو اُس کے اختیار میں ہو بے تکلف دیدے۔ خواجہ صاحب، اگرچہ عین [illegible] ت نہیں گرفتار ہوئے

مگر اُنکے جُرم کی داستان خود اُنکے مصورِ فطرت قلم کی لکھی ہوئی رائے عامہ کی عدالت میں پیش ہوچکی ہے - اب اُنکے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں - اور اُن جیسے طباع و ذہین شخص کا اتنی سی بات کو نہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ارحم الراحمین نے جو ڈھیل چھوڑ رکھی تھی اُسکی میعاد ختم ہوگئی اور منتقم حقیقی کی سزا دہی کا وقت آگیا - ان اللہ لیملی ولا یہمل - اب نہ خواجہ صاحب کے حلف اُن کی بیگناہی کا یقین دلا سکتے ہیں نہ اُنکے رفقاء و شرکاء کی عیاریاں و حیلہ فریبیاں اس بدنما داغ کو اُنکی پیشانی سے چھڑا سکیں گی - نہ مہذب ڈاکو کا مجرم عادی ہونا اُنکی معصومیت کی دلیل بن سکتا ہے اور نہ مولانا محمد علی پر آریوں سے سازباز، لیڈروں سے رقابت، لامذہبیت، ملت فروشی، اور چندوں کے خورد و بُرد کرنے کے انواع و اقسام کے بے حساب الزامات عائد کرنے سے اُنکی قبائے تصوف و عبائے تقدس پاک و صاف ہوجائیں گی -

خواجہ صاحب کی قسمت میں خدا کی لاٹھی سے بچنا لکھا ہوتا تو وہ اس راز کے فاش ہوتے ہی یا تو اعتراف تقصیر کرکے رائے عامہ سے طالب عفو ہوتے یا کم سے کم اس تلخ گھونٹ کو پی جاتے اور کچھ دنوں کے لیے گمنامی و خاموشی میں زندگی بسر کرتے - لوگوں کا حافظہ عموماً بہت کمزور واقع ہوا ہے کچھ عرصہ کے بعد بات آئی گئی ہوجاتی - مگر غرور و انانیت یا حرص و آز نے انھیں اسکی اجازت نہ دی - اور وہ "چوری" کھُل جانے پر اور سینہ زوری کرنے لگے - جس سے نہ صرف اُنکے گناہوں میں اضافۂ کثیر ہوا بلکہ اُنکے تعلیم یافتہ اور دردمند لوگوں کی نفرت و حقارت میں زیادتی ہوگئی - چنانچہ خود اُنکے اخباروں میں جن بے عقل سادہ لوحوں اور چالاک ہوشیاروں کی بکثرت تحریریں شائع ہوئی ہیں اُنھیں سے ہر شخص نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ تعلیم یافتہ، معاملہ فہم اور بے لاگ لوگوں نے کہاں تک اُنکی ہمدردی و غمخواری سے اجتناب کیا —— حالانکہ ان تحریروں کے حصول میں خواجہ صاحب نے اڑی چوٹی کا سارا زور صرف کردیا اور بہت ممکن ہے کہ اُن کا بیشتر حصہ بھی اُن کی اپنی دوکان کے کاریگروں کی تخلیق ثابت ہو -

جو اخبارات یا اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر اُنکے لیے سینہ سپر کیے ہوئے ہیں اُنکے متعلق اتفاق سے وہ خود اپنے اخبار منادی میں اعلان کرچکے ہیں کہ تبلیغ فنڈ سے اُنکو ماہوار اور وقتی امداد ملتی ہے - جسکے بعد ایسے لوگوں کی تائید کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی - کیونکہ کچھ لوگوں کو تھوڑے دنوں تک دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے مگر ساری دنیا نے ہمیشہ کے لیے آنکھوں اور کانوں کو بیکار رہنے دینے کی قسم نہیں کھائی ہے -

روزانہ اخباروں میں لکھنؤ کا وہ بے حقیقت اخبار جسکے اجراء کا گناہِ عظیم راقم الحروف کے سر ہے خواجہ صاحب کی اگر لیس پوت کر رہا ہے تو کچھ مقامِ تعجب نہیں کہ خود منادی کے اعلان کے بموجب اُسے پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تبلیغی راجہ یا مقدس ڈاکو کی سرکار سے ملتا ہے۔

دین و دنیا کے ایڈیٹر کی خوش فہمی کا راز بھی اُس قرطاس الحساب سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے جو تبلیغی جریدۂ درویش میں چھپا کرتا ہے۔ اور ایڈیٹر پیشوا کے متعلق خواجہ صاحب اور پیشوا صاحب دونوں کی تحریریں خود ہمارے پاس موجود ہیں جنسے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام روشن کرنے والا یہ گوہرِ شب چراغ 'علی بابا' کے جتھے کا مستقل رکن ہے اور جس شخص نے اُنکی گندی اور غلیظ تحریریں پڑھی ہیں وہ بآسانی اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا کہ مقدس ڈاکو کی بساطِ شطرنج پر یہ ڈھائی گھر چلنے والا مُہرہ کیا منزلت رکھتا ہے۔ اور یہی صورت تقریباً اکثر مؤیدین و معاونین خصوصی کی ہے جو بجا طور پر علی بابا کے "چالیس چور" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو محض خواجہ صاحب کے دامِ ابلہ فریبی کا شکار ہوں یا مولانا محمد علی صاحب سے کبھی کا بدلہ نکالنے کے لیے، دانستہ اس جال میں پھنس گئے ہوں۔

خواجہ صاحب نے اگر یہی ارادہ کیا تھا کہ اپنی اشتہار بازی اور پمفلٹ سازی سے دھول اُڑا کر مسلمانوں کو اندھا بنا دیں گے تو اُنھیں صاف انکار کر دینا چاہیے تھا کہ مہذب ڈاکو نے جو خط مولانا محمد علی کو دیا ہے وہ اُنکا نہیں بلکہ مہذب ڈاکو نے کسی اُن سے زائد چالاک جعل ساز سے اُنکو بدنام کرنے اور لوٹنے کی غرض سے لکھوا لیا ہے۔ ممکن تھا کہ خود مولانا محمد علی تھوڑی رد و قدح کے بعد اسے باور کر لیتے کیونکہ شیخ ضیاء الحق ہاپوڑی اپنی پمفلٹ بازی کی وجہ سے بہت ہی ساقط الاعتبار ہیں اور بدا چھا بدنام بُرا کی مشہور مثل کے مطابق خواجہ بیسیے "مقدس بزرگ" کے مقابلہ میں اُن پر اعتماد کرنا آسان نہ تھا۔ اور اگر مولانا محمد علی کو ذرا سا بھی شک پیدا ہو جاتا تو غالباً وہ اس تحریر کی اشاعت میں بہت تامل کرتے۔ مگر خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ جب پردہ داری کا دور تمام ہوتا اور پردہ دری کا وقت آ جاتا ہے تو چالاک سے چالاک مجرم کی عقل و ذہانت جواب دے جاتی ہے۔

مقدس ڈاکو کا جو خط "مہذب ڈاکو" نے مولانا محمد ؐ

ہے :-

۷۸۶

از درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی - دہلی　　۱۲-اگست ۱۹۱۸ء

مکرمی - سلام علیکم - دو خط پہونچے - ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہے اسکے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا - لکھائی کا حساب رجسٹر میں دیکھ کر مطلع کروں گا - کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو - میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دیے تھے اور نظام کو پان اسلام زم کے جو سبق دیے جاتے تھے اُن کی باضابطہ اطلاع دیدی تھی - اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُنھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا - (یہ خط بالکل خانگی ہے - اسکو چاک کر دیجیے اور اسکی اطلاع کسی کو نہ دیجیے - یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو)

حسن نظامی

خواجہ صاحب نے اس خط کی اصلیت یا اسکی تحریر سے انکار نہیں کیا ہے، اس لیے اسکے مطالب و منشا کے بارے میں خواجہ صاحب اور اُنکے چیلی چاپڑوں کی حاشیہ آرائیوں کی حاجت نہیں رہتی - خط یونانی، عبرانی یا قدیم مصری زبان میں نہیں ہے کہ اُس کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو - ہر اُردو داں شخص بآسانی اسکا مطلب سمجھ گیا ہوگا - البتہ اگر کوئی اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو اس میں کہ یہ مخبری کس کس کے خلاف تھی اور کون کون اس ناوکِ جاسوسی کا ہدف بنے -

خواجہ صاحب کی تحریر مندرجۂ بالا کو پڑھ کر یہ حقیقت سب سے پہلے اور نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کو مفصل حالات سُنا کر باضابطہ اطلاع دیدی کہ نظام کو پان اسلامزم کے سبق دیے جا رہے ہیں - سبق پڑھانے والا کون ہے؟ اسکا تحریر سے صاف پتہ نہیں چلتا، البتہ پنجاب گورنمنٹ کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی پنجاب سے تعلق رکھنے والا شخص ہوگا - مگر مخبری کا راز کھلتے دیکھ کر خواجہ صاحب نے اس خیال سے کہ جرم کی اصلی نوعیت پر شاید پردہ پڑ جائے، اس معلم کا نام خود ہی ظاہر کر دیا - ظفر علی خاں صاحب اپنی سابقہ لغزشوں کی بنا پر قوم کی ایک بڑی جماعت کے مغضوب رہ چکے ہیں اور اگرچہ بعد کے دورِ ابتلا

میں اپنی ثابت قدمی اور مسلسل قربانیوں سے اُنھوں نے بہت کچھ اپنی غلط کاریوں کی تلافی کردی لیکن مسئلۂ حجاز میں جو اختلافات ۲۵ء اور ۲۶ء میں رونما ہوئے اُنکی وجہ سے بہت سے لوگوں کو آج بھی اُن سے شدید بیزاری و مخالفت ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب نے غالباً سمجھا کہ اُنکا نام ظاہر کرکے وہ اپنی شیطنت کو لوگوں کی نگاہوں میں بہت کم وزن اور اس بنا پر ناقابلِ لحاظ بنا دیں گے۔ مگر خواجہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ مخبری کرتے وقت پیشِ نظر مقاصد کی بدولت اُن کا دل نورِ ایمان سے اور دماغ عقل و ہوش سے قطعاً خالی تھا اسلیے وہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے جو انسانوں سے ممکن تھا کہ پوشیدہ رہے مگر انسانوں کے خالق سے جو علیم و بصیر ہے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس لیے اُسکا داغ ابدالآباد تک اُنکی پیشانی سے نہ چھوٹے گا۔

خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کے سامنے ظفر علی خاں صاحب پر ایک ایسا الزام لگایا جو درحقیقت اگر سچا ثابت ہو جائے تو ظفر علی خاں کی تمام لغزشوں کا کفارہ کردیگا۔ اسلیے کہ کسی تاجدار یا والیِ ریاست کو اخوت و ہمدردیِ اسلام کا سبق پڑھانا بجائے خود ایک ایسی سعادتِ عظمیٰ ہے کہ اُسکے صلہ میں خدا کے فضل و کرم سے بہترین نعمتوں کی توقع رکھنا چاہیے۔

خواجہ صاحب نے اپنے بیان میں اور اُنکے جتھے کے لوگوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کے ثابت کرنے پر ساری قوت صرف کی ہے کہ چیف کمشنر صاحب سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف ظفر علی خاں کے خلاف تھا۔ حضور نظام کی شکایت نہ تھی بلکہ حضور نظام کی بھلائی کے لیے یہ زحمت بھی گوارا کی گئی ورنہ کہاں مقدس ڈاکو کی محترم شخصیت اور کہاں اس قسم کی مخبری و شکایت۔ خدانخواستہ وہ یا اُنکے باپ دادا کوئی پولیس کے تنخواہ یاب ملازم تو نہ تھے۔ اب یہ محض اتفاق ہے کہ ۱۸ء میں ظفر علی خاں سے مقدس ڈاکو محض اس بنا پر ناراض تھا کہ وہ دعویدارانِ تصوف کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے تھے۔

مگر ان بدنصیبوں سے کوئی پوچھے کہ جو شخص پان اسلامزم کے سبق پڑھانے کو جُرم قرار دے اُسکو اسلام سے بھی کوئی تعلق باقی رہتا ہے۔ کیا دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی بدبخت غدارِ ملت ہو سکتا ہے جو خود اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم کی اشاعت کو ایک فرنگی کے سامنے جا کر قابلِ گرفت قرار دے۔ کیا صریح بے دینی و لامذہبیت کے اس مظاہرہ کے بعد بھی حسن نظامی کا یہ مُنہ ہے کہ اُس خدائے واحد کے نام کی قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں کو ں دلائے۔ جسکی تعلیم کی قلعی کے گلے پر خود اُنکی سرشت کی خباثت اور نفس کی غداری پوری پھیری جا چکی ہو۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جسوقت یہ مقدس ڈاکو اپنے آقائے ولی نعمت کے پاس ظفر علیخاں کی شکایت کرنے گیا تھا اُسوقت اسکا یہ منشا شاید نہو کہ رئیس حیدرآباد کو وہ کسی آفت میں مبتلا کرے۔ لیکن اس سے کون شخص انکار کرسکتا ہے کہ ہوا و ہوس کی بندگی میں اُسکے ہوش و حواس بجا نہ رہے تھے اور جو کچھ اُس نے ظفر علی خاں سے انتقام لینے کی غرض سے دہلی کے فرنگی حاکم کے سامنے گفتگو کی اُسکے عواقب و نتائج پر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے غور نہیں کیا۔ اور وہ ایسا کرتا ہی کیوں۔ اُس کا تو زندگی بھر پیشہ ہی مسخرگی و عیاری کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اُس نے دیکھا کہ مسلمان مذہب و تصوف کے نام سے زیادہ آسانی و فراوانی کے ساتھ لوٹے جا سکتے ہیں اسلیے اُس نے شروع ہی سے اپنا یہی وطیرہ بنا رکھا تھا۔ آج جو کچھ وہ اپنی مدافعت میں کہنے پر مجبور ہے اُس کا سبب تو صرف یہ ہے کہ اُمید کے خلاف اہتمام کے باوجود یہ تحریر جس پر اسلام، ظفر علیخاں اور نظام حیدرآباد، تینوں کے خونِ ناحق کی مہر لگی ہوئی ہے چھپ نہیں سکی اور اخبار ہمدرد کے افق پر شفق بنکر اُسکی خونخواری و غداری کی ایک عالم میں تشہیر کر رہی ہے۔ حیدرآباد سے اپنی برأت کی فکر اگر ہے تو صرف اس خیال سے کہ وہاں سے اُسکو کثیر آمدنی تھی اور اب اُسکا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہوا جاتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی عنایات بے غایات کے باوجود نظام حیدرآباد کی مخبری کا خون اُسکے چہرہ کو داغدار بنائے رہا تو ظاہر ہے کہ دکن کے بھولے بھالے لوگوں پر اسکا داؤ نہ چل سکے گا۔

لیکن درحقیقت اس کا سب سے بڑا قصور یہ نہیں ہے کہ نظام کو یا ظفر علی خاں کو اُسنے نقصان پہونچایا، بلکہ اُس کا اصلی جرم یہ ہے کہ اُس نے خود اسلام سے غداری کی اور ایک غیر مسلم کے سامنے اُس چیز کو جرم و معصیت ظاہر کیا جو ایک مسلمان کے لیے بہترین عبادت و نیکی ہونا چاہیے۔

ظفر علی خاں صاحب کی شکایت سے اگرچہ مقدس ڈاکو نے انکار نہیں کیا ہے لیکن رئیس حیدرآباد کی خیر طلبی کی آڑ میں وہ اس الزام سے بھی بری ہونا چاہتا ہے۔ اور اسکی تائید میں فخریہ کہتا ہے کہ

"میں نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نسبت یہ نہیں کہا کہ وہ بم بنا رہے ہیں، انکو پھانسی دیدو۔ بلکہ یہ کہا کہ انکی صحبت حضور نظام کے لیے مفید نہیں ہے۔ یہ کہنا بے شک مولانا ظفر علی خاں کے مالی مفاد کے لیے تو مضر ہوا مگر انکو اور کوئی نقصان نہیں پہونچا"

گویا مقدس ڈاکو کے نزدیک کسی شخص کو جب تک وہ پھانسی کے تختے تک نہ پہونچا دے تب تک مخبری کی ملعون خدمت پوری طرح سرانجام نہیں پاتی —— اس سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس مصنوعی خواہرزادہ کی خباثتِ طینت کا اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک مسلمان کو شدید مالی نقصان پہونچانے اور ریاست حیدرآباد سے نکلوا دینے کے باوجود اسے اپنی بدبختانہ شیطنت پر شرم نہیں آتی بلکہ وہ ریاست حیدرآباد کا خیرسگال بنکر اس مکروہ عیب کو بھی اپنے لیے ہنر بنا دینا چاہتا ہے۔ اور سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ابھی تک یہ امر پردۂ خفا میں ہے لیکن اسکو موقع ملا ہوگا تو اس نے مولانا محمد علی اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنکو وہ بجائے خود اسلام کا دشمن سمجھتا ہے اس قسم کی خفیہ اطلاعیں بھی ضرور دی ہونگی جنسے مولانا محمد علی اور دوسرے قومی کارکنوں کو مالی نقصان اُٹھانے کے بجائے اپنی عزیز جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے

کہ خبثِ نفس نہ گردد بسابہا معلوم

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ چیف کمشنر سے شکایت کرتے وقت ممکن ہے کہ مقدس ڈاکو حضور نظام کو نقصان پہونچانے کا خواہاں نہ ہو اور یہ زیادہ سے زیادہ حُسن ظن ہے جو اس غدارِ اسلام اور مجسمۂ شیطنت کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کچھ چیف کمشنر سے کہا گیا اُس سے حضور نظام کو نقصان نہیں پہونچا۔

حیدرآباد کے معاملات پر کچھ ایسے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے ہیں کہ کم سے کم راقم الحروف کو اس بارے میں کچھ لکھتے ہوئے مزور پس و پیش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نیا واقعہ نہ بھی پیش آتا اور وہاں کے حالات میں آج بھی ویسا ہی سکون ہوتا جیسا کہ چند سال قبل تھا، تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظام کو پان اسلامزم کا سبق پڑھائے جانے کی اطلاع کسی انگریز کو دیجائے تو اس سے انگریزوں کے دلوں میں نظام کی طرف سے کوئی بدگمانی اور سوءظن پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یورپ کے مدبرین عموماً اور انگریز خصوصاً پان اسلامزم سے حد درجہ بیزار اور خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ مقدس ڈاکو نے خود اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ

"پان اسلامزم کی تحریک یورپ کی گوری قوموں کو خوفناک ہوا، اور گوری اقوام کو نگل جانے والا اژدہا نظر آنے لگی"

جو چیز انگریزوں کے خیال میں کہ وہ بھی گوری قوم ہونے سبب اگر اُنکے کسی یارِ وفادار کو دیے جاتے ہوں اور اُم

ہا نظر آتی ہو اُسکے
یا مخبر پہونچائے

جو دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ بانیِ اسلام علیہ السلام کا نواسہ ہے اور اُنکے مقربین بارگاہ سے قرابتِ قریبہ کے تعلقات اختصاصی رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کے دلوں میں اپنے یا وفادار کی طرف سے حسنِ ظن نہ بڑھے گا بلکہ وہ اگر اپنے یا روفادار کے دشمنِ جانی نہ بن جائیں بت بھی اس میں ذرا شک نہیں کہ اُنکے دلوں میں بدگمانی اور خوف کا جاگزیں ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی اسلامی خدمت ہے جو مقدس ڈاکو کے ہاتھوں انجام پا سکتی تھی۔

حسن نظامی کا یہ خط بہت مختصر ہے۔ چیف کمشنر صاحب سے مفصل گفتگو ہونے کا ذکر اسمیں موجود ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ چند سطروں کے خط میں جب اس قدر زہر بھرا ہوا ہے کہ خود راقم تحریر کی دلی تمنا یہ ہے کہ خط پڑھ کر فوراً چاک کر دیا جائے اور کسی کو اطلاع نہ ہونے پائے، تو مفصل گفتگو میں خدا معلوم ظفر علی خاں اور حضور نظام کے تعلقات کو کس کس پیرایہ سے بیان کیا گیا ہوگا۔ اور چیف کمشنر نے پان اسلامزم کے اژدہے سے خوف کھا کر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گورنر جنرل اور پنجاب کے لاٹ صاحب کو دونوں کے خلاف کتنا بھرا ہوگا۔

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

الناظر کے نئے دور میں، جو جنوری ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے، ذاتی افکار و تردوات اور مشاغل کے ہجوم و کثرت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ خواجہ صاحب کے اُن کارناموں پر کوئی تبصرہ کیا جا سکتا جنکی بدولت مولانا محمد علی نے اُنکو تبلیغی راجہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسکے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ خواجہ صاحب کی بازی گریوں اور شعبدہ بازیوں پر ہماری نظر نہیں رہی یا خدانخواستہ خواجہ صاحب نے اس عرصہ میں پارسائی کی قسم کھالی تھی۔ اب جو یہ سلسلہ چھڑ گیا ہے تو خدا نے چاہا خواجہ صاحب کے اس نئے اور بظاہر نہایت کامیاب سوانگ سے بھی ناظرینِ الناظر روشناس ہو جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ

۲۲-جنوری ۱۹۲۷ء

ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز نومبر کے دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شرر (مرحوم) کا ایک پُرمغز مضمون "اسلام اور فلسفہ کا سابقہ" کے زیرعنوان شایع ہوا ہے، جس میں قوم کو ایک بڑے خطرہ سے متنبہ کرکے مناسب مشورہ دیا گیا ہے۔ ناظرین الناظر کی اطلاع کے لیے یہاں اُسکا اندراج ضروری معلوم ہوتا ہے:-

"یورپ میں مسیحیت کا نشاۃ ثانیہ ظہور پذیر ہوا تو اُنھوں نے اُن علوم (علوم معقول وفلسفہ) کو مسلمانوں سے لیکر رواج دینا شروع کیا تو وہی فتنہ جو اُنھوں نے پروپیگنڈا کرکے اسلام میں پیدا کرنا چاہا تھا خود مسیحیت میں پیدا ہوگیا۔ سچ یہ ہے کہ اُس نے مسیحیت کو بالکل پامال کرڈالا۔ فی الحال دین عیسوی برائے نام اور ایک طرزِ معاشرت کی حیثیت سے موجود ہے مگر اُسکی سچائی پر یقین شاذونادر ہی وہاں کسی کو ہو .....

جو علوم مسیحیت کو مٹا چکے اب اسلام کو مٹا رہے ہیں۔ علمائے اسلام نے اس آفت سے بچنے کے لیے جو کچھ کیا صرف اسی قدر ہے کہ اپنے چند جداگانہ مدارس قائم کردیے مگر اس سے انگریزی پڑھنے والوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ بلکہ جو خلیج انگریزی اور اسلامی تعلیم کے درمیان ہے روز بروز زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے اور فرزندان اسلام کے دو متمائز و متضاد گروہ تیار ہوتے جاتے ہیں، جو دونوں ایک دوسرے کو ذلیل اور جاہل تصور کرتے ہیں۔ ایک دین پرست ہے اور ایک سائنس پرست۔

علما اور دیندار اُمرا کا کام ہے کہ اس مشکل کو حل کریں ورنہ نہایت خراب نتیجوں کے برآمد ہونے کا قطعی اندیشہ ہے"

زمانہ نومبر کے زمانہ میں سید اطہر حسین جعفر (مرزاپوری) نے ایک دلچسپ مضمون عراق کے آثار قدیمہ پر سپرد قلم فرمایا ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں تلاش آثار کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ اس دلچسپ حصہ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"اہل برطانیہ کو بابل کے آثار قدیمہ کی طرف توجہ دلانے کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ہوئی تھی۔ چنانچہ کمپنی مذکور نے رزیڈنٹ متعینہ بصرہ کو حکم بھیج کر وہاں کی اینٹوں کے نمونے لندن میں منگوائے تھے۔ لیکن جس شخص نے کہ اول اول بابل اور نینوا میں تحقیقات کی بنیاد ڈالی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رزیڈنٹ متعینہ بغداد تھا۔ جسنے ۱۸۲۱ء میں بعارضۂ ہیضہ شیراز میں انتقال کیا۔ اسکے بعد دیگر مشاہیر مثلاً کوپرز، چزلی، رالن سن، لیبرڈ جارج اسمتھ، رسام، اور کنگ وغیرہ اُنھی کے نقش قدم پر چلے۔

اہل جرمنی کی جانب سے تحقیقات کی ابتدا ۱۸۸۶ء میں مقام سرغول اور الجبہ میں ہوئی جو تلو سے بالکل نزدیک ہے۔ لیکن کالڈیوی نے بابل کے ویرانوں کے کھودنے کی ابتدا ۱۸۹۹ء میں کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو خذنصر (۶۰۴-۵۶۱ ق م) شہر کا ایک بہت بڑا حصہ برآمد ہوا۔

۱۸۸۱ء میں اہل امریکہ نظر آئے جہاں اُنھوں نے کھدائی کا کام نہایت جانفشانی سے شروع کیا اور اگرچہ درمیان میں اکثر رکاوٹیں پڑیں لیکن پھر بھی بہت درجہ کامیاب رہے، مگر جنگ چھڑتے ہی اُن کا کام بالکل رک گیا۔

پچھلی نصف صدی میں ترکی حکومت کی بدولت عراق کی وہ حالت ہوگئی کہ سائنسدانوں کی تحقیق اور تفتیش کے کاموں میں بیحد دشواریاں پڑنے لگیں .... جبوقت کہ بائے صاحب خورس آباد کے ٹیلوں کو کھدوا رہے تھے اُنکو زر کثیر صرف کرکے بتیاں منگوانی پڑیں تاکہ دونوں شہر کی دیواروں کو اُنکے سہارے سے کھڑا رکھا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ قرب وجوار کے قریوں کے باشندے ایک ایک کرکے اُن لکڑیوں کو چُرا لیگئے۔ جسکی وجہ سے دیواریں سمار ہوگئیں۔ ترکی گورنر کا خیال تھا کہ بائے صاحب سونا نکالنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ اُسنے وہاں پہرہ لگا دیا۔ اور جب سونا نہ نکلا تو بائے صاحب کے آدمیوں کو قید کردیا ....

اسی پر مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ بہت سے عجائب روزگار جو خورس آباد میں نکلے تھے مع ۶۰ عدد صندوقوں کے جن میں اشوربنی پال کے محل واقع نینوا سے برآمد شدہ ہونے کی تصویریں تھیں، دجلہ میں کشتی کے غرق کردیے جانے کی وجہ سے ضایع ہوگئے۔ علاوہ اسکے وہ سارا سامان جو آبرٹ صاحب نے بابل میں کھود کر نکالا تھا یا اوروں سے مول لیا تھا مع عہد نرم سین (۳۵۰۰ ق م) کی قیمتی سنگ مرمر کی چھوٹی سی کشتی کے قرنا دریا کے قریب بصرہ جاتے ہوئے غرقاب ہوگیا۔

اہل امریکہ کو مقام نفر میں بڑی بڑی دقتیں جھیلنی پڑیں۔ ایک مرتبہ تو عربوں نے یہ غضب ڈھایا کہ اُنکے کیمپ میں آگ لگادی۔ جس سے نصف سے زیادہ گھوڑے جلکر مرگئے۔ اور ایک ہزار ڈالر نقد عربوں کے ہاتھ آئے۔ بہرحال کچھ عرصہ تک کھدائی کا کام قوی رہا۔ لیکن غنیمت ہوا کہ برآمد شدہ اشیاء سب بچ گئیں۔

اگر ملک عراق کی یادگاروں کو محض سطحی نظروں سے دیکھا جائے تو بھی یہ پتہ چل جائیگا کہ مورخین، علماے آثار قدیمہ، سیاحوں اور مساوزوں کے لیے قدیم اور دلچسپ اشیاء کا کتنا بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔"

معارف

گذشتہ ماہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مضمون "حجاز کے کتبخانے" سے کہ معظمہ کے ایک مشہور کتبخانے کا کچھ اقتباس درج کیا گیا تھا۔ اب کی بار اُسی مضمون کی دوسری قسط

سے مدینہ منورہ کے مشہور ترین کتبخانے کا کچھ بیان پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کتبخانہ مسجد نبوی سے متصل باب جبریل کے قریب قبلہ کی سمت میں واقع ہے اور عارف حکمت بے کا کتبخانہ کہلاتا ہے :۔

"کتبخانے کے کمرے کے باہر والی دیوار پر عربی، فارسی، ترکی کے مختلف قطعات اور رباعیاں نہایت خوشخط و صلیوں پر لکھی ہوئی آویزاں ہیں۔ قدیم ترکی سلطنت، حجاز ریلوے اور مسجد نبوی کے نقشے بھی آویزاں ہیں۔ قطعات میں بعض قطعے خود شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے طبعزاد ہیں منجملہ ان عربی، فارسی، اور ترکی کے منظومات کے یہ دیکھ کر کسقدر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اردو کی نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوشخط لکھی ہوئی شیشے میں جڑی ہوئی آویزاں تھی۔ نیچے اردو کے اس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ کر اور تعجب ہوا کہ یہ دکن کے ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرشاد (مدارالمہام دولت آصفیہ) تھے۔ مطلع اور مقطع یہ ہے :۔

ہی کہتے ہیں مدح خوانِ محمدؐ — جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمدؐ
شفاعت تری شاد کیونکر نہ ہوگی — کہ دل سے ہے تو مدح خوانِ محمدؐ

کتبخانے کے واقف عارف حکمت بے تیرہویں صدی کے مشہور ترک علما میں تھے .... انھوں نے یہ زمین خریدی، اس پر یہ مختصر سی مگر نہایت صاف اور نکھری ہوئی عمارت بنوائی۔ کتابوں کے بڑے شائق اور عاشق تھے۔ اپنی جائداد کا بڑا حصہ انھوں نے ان پر صرف کیا تھا۔ یہ کتابیں اسی عمارت میں رکھیں۔ پھر مقدونیہ اور ایشیائے کوچک میں اپنی جائداد اس کتبخانے کی بقا و ترقی کے لیے وقف کی .... کتبخانے میں عربی، فارسی، ترکی کی کتابیں ہیں، زیادہ تر حصہ عربی کتابوں کا ہے۔ جلدوں کی تعداد مجھے سترہ ہزار بتائی گئی۔ ہر کتاب عمدہ جلد بندھی ہوئی، صاف ستھری، اور خوشخط ہے۔ اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور قلمی ہیں اور مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں .... کتبخانے میں قدامت کے اعتبار سے جسکی تاریخ معلوم ہے سب سے پرانی کتاب غالباً حضرت ابن عباسؓ کی روایاتِ تفسیر، جو تفسیر ابن عباس کے نام سے ملتی ہے، اُنکے آخری چند اوراق ہیں۔ یہ سورۂ فلق اور الناس وغیرہ آخری سورتیں ہیں۔ ختم پر اُسکی کتابت کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲ - رجب المرجب ۳۱۶ھ مرقوم ہے۔ یہ ہرن کی کھال کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔ ہرن کی کھال کو اس قدر پتلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ موٹا کاغذ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا ایک چھوٹی تقطیع کا نسخہ ہے جو پورا شتر مرغ کی کھال کے کاغذ پر ہے۔ ابتدائی اوراق ضایع ہو گئے ہیں۔ شتر مرغ کی کھال کا کاغذ [illegible] کی کھال پر لکھکر لگا دیے گئے ہیں۔ شتر مرغ کی کھال کا کاغذ [illegible] کا خط کوفی ہے اور اعراب اور شاید نقطوں سے بھی خالی [illegible] یا ہی ہے اُس پر اعراب اور نقطے لگا کر اُس کی خوبی کو بڑھا دیا [illegible] پر بھی ہے

مگر کسی نے پہلے صفحے پر لکھدیا ہے کہ بخط عثمانؓ - یہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر اعراب اور نقطوں کے سبب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعراب اور نقطوں کی ایجاد کے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ اعراب اور نقطے حجاج کے زمانہ میں لگائے گئے ہیں"

ہمایوں نومبر کے ہمایوں میں مسٹر حامد حسین اعظمی نے محمد تغلق پر ایک محققانہ مضمون تحریر فرمایا ہے جس میں محمد تغلق پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں اُن کا نہایت مدلل جواب دیا گیا ہے لائق مضمون نگار نے محمد تغلق پر الزامات عاید کیے جانے کی یوں توجیہ کی ہے :-

"جس طرح سترہویں صدی میں انگلستان میں وگ (Whigs) اور ٹوری (Tory) کے نام سے ملک میں دو جماعتیں قائم تھیں جن کے اختلاف نے ملک میں شور و شر برپا کر رکھا تھا بعینہ محمد تغلق کے دوران حکومت میں ہندوستان میں بھی دو جماعتیں تھیں جو سلطنت کی باگڈور کو دو متضاد سمتوں میں کھینچ رہی تھی - ایک جماعت اُن لوگوں کی تھی جنکا خیال تھا کہ ہندو یا مسلمان، پارسی یا یہودی، جو بھی حکومت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو اچھے سے اچھے عہدے پر جسکو وہ بخوبی نباہ سکتا ہو مقرر کیا جائے اس جماعت کا سب سے بڑا رکن خود محمد تغلق تھا ..... دوسری جماعت اُن دلائلوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ جتنی طرفداری ممکن ہو پردیسی مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے - "خطرناک" ہندیوں کو ملک کے کسی انتظام میں حصہ نہ دیا جائے - اسی جماعت کے نمک خواروں میں سے برنی بھی تھا، جو اپنے وقت کا سب سے معتبر مورخ مانا جاتا ہے - ظاہر ہے کہ محمد تغلق کا انتظام سلطنت برنی کی خواہش کے مطابق نہ تھا اور یہ محمد تغلق کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ اُسکے عہد کا بہترین مورخ برنی ہے - ؎ ولیکن قلم در کفِ دشمن است ؎

یہ انصاف پرست مورخ اُسکو ظالم و بے رحم بتاتا ہے کیونکہ اُس نے خراج میں اضافہ کیا، دارالخلافہ کی جگہ بدل دی، تانبے کے سکے جاری کیے - اور ظلم تو یہ ہے کہ وہ اُسکو سخی بھی کہتا ہے - مگر اسی سخاوت کو عنوان بنا کر جس قدر اُسکی بُرائی کر سکتا ہے نہایت صفائی کے ساتھ بیان کر جاتا ہے - اسکی انصاف پرستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ وہ کسی قدر مصنف مزاج یا کسی قدر جوابے علم و عمل بھی تھا - اُسکے یکطرفہ فیصلے کا ہی نتیجہ ہوا اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ بہت سے مورخین کو سونے میں سہاگہ ملانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا"

آگے چل کر دوآب پر خراج بڑھانے کے الزام کا یہ جواب دیا ہے :-

"محمد تغلق نے صرف دوآب بنارس اور دوآب دریائے سندھ و گنگا ہی میں خراج کا اضافہ کیا تھا اور کہیں اس تغیر کا اثر نہ ہوا، اس موقع پر سوال یہ ہے کہ کیا

محمد تغلق کی حکومت ان تمام ضروریات سے بے نیاز تھی جن سے مجبور ہو کر آج کی متمدن سے متمدن حکومت آئے دن رعایا کی جیبیں ٹٹولتی ہے۔ اگر وہ بے نیاز نہ تھا اور یقیناً نہ تھا تو یہ بتاؤ کہ علاقۂ دوآب سے نہیں تو اور کہاں کے لوگوں سے یہ خراج لیا جاتا۔ کیا چٹیل میدانوں اور ریگستانی علاقوں سے؟ اگر یہ سچ ہے کہ ٹیکس زیادہ تر زرخیز مقامات ہی کے لوگوں پر بڑھایا جاتا ہے تو اب اس سوال کی گنجایش ہی نہیں کہ دوسری جگہ خراج کیوں نہیں بڑھا۔ سب سے اہم بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ اتنا خراج نہیں بڑھایا گیا تھا کہ رعایا کسی حالت میں ادا نہ کر سکتی۔ لیکن بادشاہ و رعایا دونوں کی بدقسمتی سے اسی سال قحط پڑ گیا۔ رعایا مجبور ہو گئی اور خراج کے ادا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں ورنہ بذات خود خراج میں اضافہ کرنا جبکہ حکومت کو اسکی ضرورت ہو نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ کوئی ظلم۔ یہ تو ایک منحوس موقع تھا جو آخر الذکر جماعت کو خوش قسمتی سے مل گیا جسکی بنا پر انھوں نے ملک میں جا بجا بغاوتیں پھیلانے کی کوشش کی اور جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو جنگل کو بھاگ کھڑے ہوئے مگر محمد تغلق نے ان مفسدوں کو گھیر لیا اور "شاہی تعزیرات" کے مطابق سزائیں دیں۔ غالباً یہ بعض مورخین کی دانستہ غلط فہمی ہے کہ محمد تغلق نے اپنی بھاگی ہوئی معصوم رعایا کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے یہ فوج بھیجی تھی۔ بادشاہ کو اپنی مصیبت زدہ، بیگناہ، اور امن پسند رعایا کا اتنا خیال تھا کہ اس نے چار مہینے تک خیرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جسکے باعث غربا اور مفلسوں کا طبقہ زمانۂ قحط کو قحط نہ سمجھ سکا۔ رہے کسان جو خیرات نہ لے سکتے تھے انکو آیندہ فصل کی ترقی اور عمدہ فصل کی غرض سے سلطنت نے تقاوی تقسیم کی۔ اس سے ہم تو یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس نے فوج بھیجی تو مفسدین کے خلاف اور پرامن رعایا کی ہر طرح مدد کی۔ لیکن برنی اور برنی کے غیر متعصب، بے لوث اور منصف پیرو شاگرد بتائیں کہ یہ محمد تغلق کے متضاد کیریکٹر کا نتیجہ ہے؟"

نگار انگلستان کے ایک ادیب مسٹر الڈوئنس نے سیر ہندوستان کے بعد "دی نیشن اتھینیم" میں تاج کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ سارے مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) عمارت سستی کاریگری کا نمونہ ہے (۲) چاروں مینار نہایت غیر موزوں بنائے ہیں (۳) تخیل کی فراوانی اس میں نہیں ہے (۴) اسکے نقش و نگار غلط ہیں۔ نومبر کے نگار میں حضرت نیاز نے ان الزامات پر مختصر تبصرہ فرمایا ہے۔ اور مشرقی "ہندستہ الفناء" کے ماہروں کو مسٹر اولڈنس کے خیالات کی تنقید کی دعوت دی ہے۔ فی الحال حضرت نیاز کے تبصرہ کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے (حالانکہ یہ بہت غیر مکتفی ہے):

"پہلے اعتراض کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر اولڈنس کا بیان کہاں تک صحیح ہے

کیونکہ اول تو اندر سے کھوکھلا کرمیں نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو بھی میں نہ سمجھ سکتا تھا کہ اسکو سستی کاریگری کا نمونہ سمجھوں یا بیش قیمت عرق ریزی کا - علی الخصوص اُسوقت جبکہ تاریخ سے یہ امر پوری طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اُس عہد میں جبکہ محنت و مادہ دونوں ارزاں اور بہت ارزاں تھے اسپر موجودہ سکے کے لحاظ سے لاکھوں روپے صرف ہوے تھے - میناروں کی مخروطی شکل کو ناموزوں سمجھنا اُنکو نامناسب حد تک پتلا ظاہر کرنا اُنکے برآمدوں یا چھجّوں کو بدنما بتانا اگر اسکا تعلق نظر اور ذوق سلیم سے ہے تو ہمیں تعجب نہیں کیونکہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ وہی چیزیں جو دنیا کے اکثر افراد کو اچھی معلوم ہوتی ہیں بعض کے نزدیک بُری ہوتی ہیں - لیکن اس سے نفس تاج کی تعمیر پر کوئی حرف نہیں آسکتا -

.....

یہ صحیح ہے کہ تاج میں تخیل کی فراوانی نہیں ہے اور نہ ہوسکتی تھی، فاضل نقاد نے اس امر پر غور نہیں فرمایا کہ یہ عمارت مقبرہ کی ہے اور قبر یا مزار کے ساتھ انسان کا جو خیال وابستہ ہوتا ہے وہ جدت پسند نہیں ہوتا اور نہ اُسکو تنوع کی ضرورت ہوتی ہے - اس کا تعلق اک ایسے انعطاف سے ہوتا ہے جو صرف تشائم ہے اور اس میں بہار کی رنگینی مجلس نشاط کی چہل پہل کی جستجو کرنا یقیناً نقاد کی بے بصیرتی پر دلالت کرتا ہے -

رہا یہ امر کہ نقش و نگار غلط ہیں، ممکن ہے اس الزام میں کچھ صحت ہو، کیونکہ جن پھولوں کو بیلوں کو پچی کاری کے ذریعے سے دکھایا گیا ہے اُن میں وہ سایہ دکھانا جو اُسکو حقیقی پھول یا بیل کی صورت دیسکے ناممکن تھا - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُبھرے ہوے پھولوں کو بڑی حد تک اصل کے مماثل بنایا گیا ہے اور سترہویں صدی کی عمارتوں میں مشکل سے کوئی عمارت ایسی نظر آسکتی ہے جس میں اس درجہ فن و نزاکت نقش کا لحاظ رکھا گیا ہو"

جامعہ اُردو رسائل کے خلاف دستور جامعہ نے اپنے نومبر نمبر میں مولوی سعید انصاری کے قلم سے اورنٹیل کانفرنس کے مفید خطبۂ صدارت کا ترجمہ شایع کیا ہے - جناب صدر شمس العلماء ڈاکٹر جیون جی جمشید جی مودی، مہابھارت کے مطالعہ کی تاریخ پر بحث کرتے ہوے فرماتے ہیں :-

"پونہ میں جس طرح کا عملۂ ادارت بنایا گیا ہے اُسی طرح کا ایک عملہ آج سے تین سو برس پیشتر شہنشاہ اکبر نے بھی مہابھارت کی تالیف و ترجمہ کے لیے قائم کیا تھا - اُس دور اندیش بادشاہ کا خیال کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا کہ میکس مولر نے ظاہر کیا ہے - یعنی یہ کہ تمام ہندوستانیوں کو مہابھارت پر فخر کرنا چاہیے اور اسکے متعلق ہر شخص کو کچھ نہ کچھ واقفیت رکھنی چاہیے - چنانچہ اسکی کوشش یہ تھی کہ مہابھارت کے مضامین تمام فارسی بولنے والوں تک پہونچ جائیں - ابوالفضل اور بدایونی نہایت تفصیل کے ساتھ اکبر کے اُس شوق کا ذکر کرتے ہیں جو اُسے ہندوؤں کی اس اہم کتاب کے متعلق تھا اور جس کا نام اُس نے "رزم نامہ" رکھا تھا - ابوالفضل نے ہندوستان کے علوم و فنون کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے -

انھوں نے یہاں کے فلسفہ کے نو ہندو مذاہب کا تفصیل ذکر کیا ہے۔ غرض ہم کو ابوالفضل کی "آئین اکبری" اور بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے مہا بھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک عملہ تیار کیا تھا جس میں یہ اشخاص شریک تھے: نقیب خاں۔ مولانا عبدالقادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری، ملا شیری، اور شیخ فیضی۔ ترجمہ کا پورا کام ان اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور انکی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام خود یہ بیدار مغز بادشاہ انجام دیتا تھا۔ ان میں سے ایک کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اچھی طرح سنسکرت جانتا ہو، لہذا انکی امداد کے لیے انھیں لایق پنڈت دیے گئے۔ یہ پنڈت سنسکرت کی عبارت کو سمجھاتے جاتے اور یہ اس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ بعض وقت اکبر خود بول اٹھتا اور بتاتا کہ پنڈتوں کے مفہوم کو فارسی میں بہتر طریقہ پر کس طرح ادا کرنا چاہیے۔ وہ اس اہم کام میں کم سے کم چار سال برابر لگے رہے جسکے متعلق ان ارکان میں سے ایک کا بیان ہے کہ "حرف وہ ہزار سالہ را بزبان حال موافق می سازم"۔

شہنشاہ اکبر کی اس کوشش کے متعلق میں نے یہاں اس قدر تفصیل کے ساتھ اس وجہ سے ذکر کیا ہے، تاکہ میں اس بڑے کام کے لیے جسے اکبر اور ملیس مولا جیسی دو بڑی شخصیتوں نے اس قدر سراہا ہے، آپ سے اپیل کروں۔ ایرانی فضلا بھی مہا بھارت سے بہت کچھ دلچسپی رکھتے ہیں اسوجہ سے کہ اس کے بعض واقعات شاہنامہ سے ملتے جلتے ہیں۔ انکی شاہنامہ گویا ایران کی مہا بھارت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر کی توجہ مہا بھارت کی طرف اُسوقت سے منعطف ہوئی جبکہ وہ اپنے ہاں شاہنامہ سنا کرتے تھے"۔

شمع

اکتوبر و نومبر کا شمع ایک ساتھ شایع ہوا ہے۔ اس نمبر میں "محمود کی سیرت اور کارنامے" پر پروفیسر محمد حبیب کا عالمانہ مضمون جو انگریزی میں لکھا گیا تھا، بعد ترجمہ شایع کیا گیا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمود کی حملوں کی غرض مذہبی نہ تھی۔ ملاحظہ ہو:—

"غزنوی فوج مجاہدین کا اجتماع نہ تھی جو مذہب کی خاطر لڑنے پر آمادہ ہوتی۔ وہ تو تربیت یافتہ ماہرین فن کی بھرتی شدہ تنخواہ دار فوج تھی جو ہندو مسلمانوں سے یکساں لڑنے کے عادی تھے۔ صرف ..... دو حملوں میں رضا کاروں کا وجود پایا جاتا ہے اور وہ بھی اس قدر قلیل تعداد میں کہ افواج باقاعدہ کے مقابلہ میں انکا شمار فضول ہے۔ علاوہ ازیں تیزگامی اور باقاعدگی کے ساتھ دھاوے مارنے میں بھی جیسا محمود چاہتا تھا وہ لشکر کام کے نہ تھے۔ سلطان میں بھلا جمہوری مشیر ہونے کی صلاحیت کہاں تھی کہ وہ جوش مذہبی سے لبریز افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتا، اور نہ کبھی اُ[illegible] ۔ محمود میں وہ تبلیغی جوش قطعاً مفقود تھا جس کی وجہ سے وہ بشیار" [illegible] کی تمت پر غم کے دو آنسو بہاتا، یا ہندوستان کو دین محمدی کی اشاعت [illegible] ن کی حیثیت

سے دیکھتا۔ اُس کا نصب العین بہت ہی حقیر تھا جو آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ تو صرف اس پر قانع تھا کہ کافروں کا مال و متاع چھین لے۔ اُس نے کبھی لوگوں کو تبدیل مذہب کے لیے مجبور نہیں کیا اور ہندوستان کو بعینہٖ اُسی حالت کفر میں چھوڑا جس میں پایا تھا۔

.... ہندوستانی مناد رمیں بھی یورپ کے کلیسیا ے روم کی طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی طاقتور من چلے کو تصرف بیجا کی تحریص سے باز رکھا جا سکتا اور نہ اسی کی توقع کیجا سکتی تھی کہ محمود جیسی سیرت کا شخص اپنے آپ کو حصول زر سے روکتا، محض اس خاطر کہ اسلام مذہبی رواداری کی تلقین کرتا ہے در انحالیکہ اُسکا دل دولت کی طرف اس طرح جاتا تھا جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچ آتا ہے ..... اس زمانہ کے معاصرین کے نزدیک دشمن کی عبادت گاہ کو برباد کرنا جنگ کا جائز فعل خیال کیا جاتا ہے اور یہ شکست کا بدیہی نتیجہ ہوا کرتا تھا .... اُس نے اُنکو ایک ایسا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جس پر اُنکا اعتقاد نہیں تھا۔ اُسکے ہندوستانی سپاہیوں کو دارالخلافہ غزنین میں سنکھ بجانے اور بتوں کی پرستش کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ مذہبی رواداری کا اصول جس محدود شکل میں اُسوقت رائج تھا محمود بھی اُسکا قائل تھا۔ محمود کو یہ الزام دینا کہ وہ اپنے ماسبق یا آئندہ پیشتوں کے اخلاقی معیار تک نہیں پہونچ سکا کارِ عبث ہوگا۔"

"سید"

رسید کتب

(۱) سیرت ازواج النبی	مولانا عبد الرؤف قادری	کمالی پریس کلکتہ۔ قیمت	۲ر
(۲) کائنات روحانی	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	کتبخانہ اقاسم دیوبند	۵ر
(۳) دشنیت و شکنتلا	اقبال ورما شرر بنگالی	زنانہ بک ایجنسی کانپور	۸ر
(۴) قواعد اُردو (طبع ثانی)	مولوی عبد الحق بی اے	انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد	۴ر
(۵) انتخاب کلام میر	〃	〃	۴ر
(۶) مثنوی خواب و خیال	خواجہ سید محمد میر اثر	〃	۸ر

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(نومبر ۱۹۲۶ء)

دلگداز - لکھنؤ

(۱) اسلام اور فلسفہ کا سابقہ

معارف - اعظم گڈھ

(۱) حجاز کے کتبخانے
(۲) ارتقائے ادب فارسی
(۳) منار ایلورا

زمانہ - کانپور

(۱) عراق کے آثار قدیمہ
(۲) کربلا (ڈرامہ)

ہمایوں - لاہور

(۱) محمد تغلق
(۲) ایثار (افسانہ)

نگار - بھوپال

(۱) میر تقی میر اور خارجی حالات کی ترجمانی
(۲) تاج بدترین عمارت ہے۔

جامعہ - دہلی

(۱) ہندوستان اور علوم مشرقی
(۲) ہندو بسبت دوامی

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) تاریخ نسل انسانی
(۲) پادری نارکیسوس (افسانہ)

قوس قزح - لاہور

(۱) مطائبات (افسانہ)
(۲) عہد تیموریہ میں فن مصوری

مرقع - لکھنؤ

(۱) کارثواب (افسانہ)
(۲) گمراہ رہبر

شمع - آگرہ

(۱) محمود کے
(۲) ہند۔ ہے

بابر داری کے ذرائع

نظرے خوش گذرے

گذشتہ جلسۂ خلافت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جب تک پھر کوئی سامان قدرتِ الٰہی سے ایسا فراہم نہ ہو جائے کہ قوم کے دردمند اصحاب باہمی اختلافات اور رقابتوں کو فراموش کر کے ہمہ تن اُس مصیبت کے مقابلہ میں مصروف ہو جائیں، آپس کی لڑائیاں ختم نہ ہونگی اور ایک جماعت کی قوت دوسری جماعت کو زک دینے کے لیے رائیگاں ہوتی رہیگی۔

اجتماعی کاموں میں کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب مختلف کارکن جمع ہو کر تبادلۂ خیال کے بعد قوم کی فلاح و بہبود کی تجاویز سوچیں اور اُنکو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری یکدلی کے ساتھ جدوجہد کریں۔ لیکن جب ساری جدوجہد کا ماحصل یہ رہ جائے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو نیچا دکھائے اور اپنی بات کو بالا رکھنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگائے تو قومی فلاح و بہبود کی توقع رکھنا فضول ہے۔

جب تک حکومت کے مقابلہ میں آزادی کی جنگ جاری رہی مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت باوجود طبائع اور عقائد کے اختلافات کے یکجہتی اور پوشیدگی کے ساتھ مصروفِ کار رہی، مگر جیسے ہی جنگ ملتوی ہوئی، کارکنوں کے طبعی اختلافات بالائے سطح آنا شروع ہوے۔ کارکنانِ خلافت ہی میں سے ایک گروہ کثیر شدھی کے مقابلہ کے لیے تبلیغی میدان میں صف آرا ہو گیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس خلافت کو کچھ عرصہ کے لیے قریب قریب معطل ہو جانا پڑا۔ تبلیغی جوش جب ذرا مدھم پڑا تو تنظیم کے نام سے ایک نئی جماعت بنی جس نے مجلس خلافت کو اور کمزور بنا دیا۔ اسکے بعد ہی مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی سے مسئلۂ حجاز نے ایک نزاعی صورت اختیار کر لی اور خدام الحرمین کے قیام نے کارکنانِ خلافت کی رہی سہی قوت کو فنا کر دینے کی کوشش کی اور بالآخر انحطاط و زوال کی تکمیل کے لیے خود اُس جماعت میں شدید اختلافات رونما ہو گئے جو خدام الحرمین کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد بھی مجلس خلافت کے بقا میں ساعی تھی۔

جلسہ کے انعقاد سے قبل ہر کارکن کو اِن اختلافات کا پورا پورا علم تھا، اور اس بنا پر کم سے کم مجھے توقع نہ تھی کہ اس موقع پر ہر فریق اسکے لیے تیار ہوگا کہ حتی الامکان دوسرے فریق کے ساتھ مفاہمت کی انتہائی کوشش کی جائے اور مجلس خلافت کو تباہی سے بچا لیا جائے۔ مگر

آں غلط بود انچہ ما پنداشتیم

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں اتفاق سے مولانا شوکت علی اور مسٹر شعیب قریشی انتخاباتِ کونسل کے سلسلہ میں یہاں آئے اور اُن سے گفتگو آئی تو اس اجتماع کے متعلق میرے تمام خیالات یاسی سے بدل گئے۔ اور اس لیے میں نے بجائے خود یہ ٹھان لی کہ اگر باہمی مفاہمت کی کسی کوشش میں اعانت ممکن ہو تو کروں ورنہ کم سے کم میں اپنا دامن اس جنگ زرگری سے ملوث نہ ہونے دوں۔ چنانچہ ارا کینِ خلافت کے جمع ہو جانے کے بعد پہلا موقع مولوی ظفر علی خاں صاحب سے گفتگو کا آیا تو میں نے اس بنا پر کہ مسئلۂ حجاز میں مجھے اُنکی رٹے سے بہت کچھ اتفاق تھا اُن سے درخواست کی کہ وہ بجائے مقابلہ و جنگ کے سپر انداز ہو جائیں۔ کیونکہ اس طریقہ پر سلطان ابن سعود کے خلاف جنگ و جہاد کی ساری ذمہ داری علی برادران کے سر پڑ جاتی اور مجھے اُمید تھی کہ باہمی صدر کا قدم درمیان سے اُٹھ جانے تو وہ خود اپنی غلط روی کا احساس کر لیں گے —— لیکن افسوس ہے کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب اسکے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ دوسرے روز میں نے ایک تجویز مفاہمت تیار کی جسکو میں سمجھتا تھا کہ دونوں جماعتیں اگر قبول کر لیتیں تو کم از کم اس بدمزگی کا بخیر و خوبی خاتمہ ہو جاتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ مجلس خلافت جس نے مؤتمر اسلامی میں شرکت اور ہندوستان میں اُسکی شاخ قائم کرنا گوارا کیا عملاً اُسی راہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو اس مفاہمت میں تجویز کی گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے ایک نہ سُنی، اور میں نے جلسہ کے روبرو اس تجویز کو لانا فضول سمجھا۔

چونکہ میں نے اس باہمی جنگ میں شرکت سے محترز رہنے کا ارادہ کر لیا تھا اسوجہ سے جب تک جلسہ میں شریک رہا میری حیثیت ایک میزبان اور تماشائی ہی کی رہی حتیٰ کہ رائے شماری کے وقت بھی میں نے کسی جانب ہاتھ نہ اُٹھایا۔ حالانکہ مولوی ظفر علی خاں صاحب کو اس بات کی شکایت کرنے کا بھی موقع ملا کہ اگر میرا ووٹ اُن کی طرف ہوتا تو اُن کی جماعت کامیاب ہو جاتی۔ اور غالباً اسی قسم کی شکایت مولانا محمد علی اور اُنکے ساتھیوں کو مجھ سے رہی۔

مغربی تعلیم اور مغربی نظامات ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ تمام قومی اور ملکی کام دھڑے بندی کی بنیاد پر انجام پائیں۔ اور اب یہ وبا یہاں تک عام [illegible] آج اسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اور ہم میں سے کوئی فرد ایسا نہیں [illegible] نہ ہو۔ لیکن انسان اگر اپنی قوتِ تمیز کو بالکل ناکارہ نہ بنا دے [illegible] ترفع کے خیال

کو چھوڑ کر محض قوم و ملک کے فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھے تو بہت کچھ دھڑے بندی کے اثرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

یورپ کی پارلیمنٹوں اور اکثر مجلسوں میں اسی دھڑے بندی کے بدولت اب ہاتھا پائی کی نوبت تک آجاتی ہے جسکی بنا پر کبھی کبھی پولیس کو دست اندازی کرنا پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں بھی بعض اوقات یہی رنگ نظر آتا تھا۔ مگر غنیمت ہے کہ لوگ اس حد تک بے قابو نہیں ہوئے۔ اور اس بارے میں سب سے المناک طرز عمل جو میں نے مشاہدہ کیا وہ بہار کے پُرجوش کارکن سید فضل الرحمٰن اور جناب مولانا محمد علی کا تھا۔

سید فضل الرحمٰن کا حد سے زیادہ متجاوز ہو جانا اور مولانا محمد علی جیسے رہنمائے قوم کا احترام ملحوظ نہ رکھنا از سکہ نہایت درجہ قابل ملامت ہے

چوں حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

لیکن اس سے زیادہ لائق ماتم مولانا محمد علی کی حالت ہے۔ انکے ذیابیطس نے معلوم ہوتا ہے کہ اب انھیں بالکل بے بس کر دیا ہے۔ مشکل سے ایک منٹ بھی وہ کسی مقرر کو خاموشی کے ساتھ تقریر کرنے دیتے تھے۔ اور اس خفیف وقفہ میں بھی شاید ہی وہ کسی وقت خود خاموش رہتے ہوں۔ کم سے کم جو شخص انکے قریب ہوتا تھا وہ اسی سے کچھ نہ کچھ اس تقریر کے متعلق کہتے رہتے تھے۔ پھر صدر جلسہ کے لیے جس قدر صبر آزما ان کی روش تھی شاید ہی کسی دوسرے کی ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حالات موجودہ میں مناسب ہوگا کہ مجلس خلافت انھیں کو صدر منتخب کرے یا کم سے کم کسی ایسے شخص کو صدر بنائے جسے انکے مقابلہ میں اپنی خودداری کے تحفظ کی ضرورت نہ ہو۔ مولانا عبدالقادر قصوری کو جن حالات میں صدارت کرنا پڑی خدا نہ کرے کہ کسی شریف انسان کو اس مصیبت کا سامنا ہو۔۔۔ اگر مولانا ابوالکلام نے اسی خیال سے پہلو بچایا اور اس جلسہ میں شرکت سے احتراز کیا ہو تو کون انکی موقع شناسی پر حرف گیری کر سکتا ہے۔

ناظرین الناظر کو بخوبی اندازہ ہے کہ سیاسی اور مجلسی کاموں کی وجہ سے الناظر اور اسکے متعلقہ کاروبار کو کس قدر نقصانات پہونچے ہیں۔ گذشتہ سولہ مہینے میں میرا جس قدر وقت ان کاموں پر صرف ہوا اس نے کاروبار کی ابتری کو آخری درجہ پر پہونچا دیا ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں الناظر کے تین پرچے شائع نہیں ہو سکے۔ اور الناظر بک ایجنسی کی سالانہ فہرست جس پر بہت کچھ کتابوں کی اشاعت

کا دار و مدار ہے قطعاً شایع نہیں ہوئی - ایک طرف یہ ذاتی ضرورت اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ سارے ملک میں خانہ جنگی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اندیشہ ہے کہ اسکی بدولت نہ صرف اس ملک کے باشندوں کی غلامی کی میعاد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عجب نہیں جو ہم عرب کے بقیہ تین آزاد ملکوں نجد - حجاز و یمن کو بھی یورپین طاقتوں کی غلامی میں ڈھکیل دینے کا ذریعہ بنجائیں -

نیشنل کانگریس اور خلافت دونوں جماعتوں سے میرا تعلق تھا، لیکن میری اصل خدمت شروع سے خلافت کمیٹی کے تحت رہی - موجودہ حالات میں نہ کانگریس کے سامنے کوئی ایسا نظام عمل ہے جسکی نسبت میرے لیے ممکن ہو اور نہ اُس طریق کار کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے میں تیار ہوں جو مسئلۂ حجاز میں محترم علی برادران نے اختیار کیا ہے - اس لیے میں نے کم سے کم سال رواں کے لیے مقامی کانگریس کمیٹی کی مجلس منتظمہ اور مرکزی خلافت کمیٹی دونوں کی رکنیت قبول کرنے سے احتراز کیا - اور چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک ساری توجہ اپنے کاروبار پر صرف کروں -

مجھے امید ہے کہ جو احباب عرصہ سے مجھ پر زور ڈال رہے تھے کہ میں ہمہ تن ادبی خدمت کے لیے وقف ہو جاؤں، وہ اس اعلان سے خوش ہوں گے اور مجھے الناظر اور انجمن اُردو کے کاموں میں فراخ حوصلگی کے ساتھ ہر قسم کی مدد دیں گے -

---

۲۴ - دسمبر روز جمعہ کی صبح کو تین روز کی علالت کے بعد اُردو کے نامور انشا پرداز و موٴرخ جناب مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی ایڈیٹر دلگداز نے انتقال فرمایا - اِنا للہ وانا الیہ راجعون -
مرحوم کی عظیم الشان خدمات اور آپ کے مفصل حالات انشاء اللہ بعد میں لکھے جائینگے اس وقت صرف اس حادثہ پر دلی حزن و ملال کا اظہار کرتا اور اُنکے بڑے صاحبزادے منشی صدیق حسن صاحب اور دیگر پسماندگان کو الناظر اور اُسکے ناظرین کرام کی طرف سے دلی ہمدردی کا پیام پہونچانا مقصود ہے -

---

توقع ظاہر کی گئی تھی کہ یہ نمبر ۱۵ - جنوری تک شایع ہو جائیگا، مگر ماہ صاحب محمود آباد کے تارے خاص لکھنؤ کے مسلمانوں کا اظہار برات ضروری تھا اس لیے ایک جلسۂ عام کے انتظام کی وجہ سے تقریباً دو ہفتے کے لیے پرچہ اور پچھڑ گیا - خدا کرے کہ آیندہ یہ صورت نہ ہو -

۲۶ - جنوری ۱۹۲۶ء ظفر الملک

جزیرۃ العرب

عرب کو اہل عرب "جزیرۃ العرب" جزیرہ نما (جزیرہ) عربوں کا" یا مخفف طور سے "جزیرہ" کہتے اور اسی کو ایرانی اور ترک عربستان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسکے شمال میں ایشیا کا براعظم ہے، مغرب میں بحر احمر، مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان ہے اور جنوب میں بحر ہند۔ صرف خاکنائے سوئز کے ذریعہ اس کا تعلق افریقہ سے ہے اور فقط باب المندب کی آبنائے اسکو افریقہ سے جدا کرتی ہے۔ مشرق کی طرف ملک عرب فارس کے ساحل تک چلا گیا ہے۔ عرب کا رقبہ یورپ کے چوتھائی رقبہ کے برابر ہے لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک رقبہ بتانا قریب قریب ناممکن ہے، اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ شمال میں اس کی حدود بہت کچھ مختلف ہیں۔ بعض نے اسکی حد حلب اور دریائے فرات تک بتائی ہے۔ اگرچہ عراق عرب کے میدان میں عربی قبائل صدیوں سے آباد چلے آتے ہیں پھر بھی کسی جغرافیہ نویس نے عرب کا حال دریائے فرات کی حد سے آگے نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اس علاقہ کو جو حجاز کے نام سے موسوم ہے عرب کے ملحق سمجھنا چاہیے گو وہ عربوں سے آباد ہے بلکہ اسکو شام سے متعلق خیال کرنا چاہیے۔ برخلاف اسکے جزیرہ نمائے سینا جسکو اکثر عربی اور یورپی عالم مصر کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، جغرافیائی حیثیت سے عرب سے متعلق ہے۔

مغربی عرب (طول تقریباً ۱۶ درجہ ہے) اسکے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک حصہ کو حجاز اور دوسرے کو یمن کہتے ہیں۔ حجاز کے لغوی معنی حجز کے ہیں۔ یہ ملک ٹھیک ٹھیک وہ سلسلۂ کوہ ہے جو تہامہ (وہ نشیبی علاقہ جو ساحل کے برابر برابر چلا گیا ہے) کو نجد (بلند علاقہ) سے جدا کرتا ہے۔ اصل میں حجاز اس سرزمین کا نام ہے جسکے مغرب میں بحر احمر ہے اور مشرق میں نجد۔ اور یہ علاقہ خلیج عقبہ کے آخری سرے سے لیکر مکہ کے جنوب میں اس مقام تک پھیلا ہوا ہے جہاں سے یمن کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ پہاڑ کا سلسلہ شمال سے جنوب کی طرف پار کرنے کے بعد حجاز کا انتہائی شمالی علاقہ (تبوک تک) حسما کہلاتا ہے۔ یہ کوئی زرخیز علاقہ نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس میں بہت سی وادیاں ہیں۔ سخت بارش ہونے کے بعد ان وادیوں میں سے پہاڑی چشمے بہہ کر سمندر میں جا کر گرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ علاقہ زیادہ تر خشک ہی رہتا ہے۔ پہلے اس علاقہ میں جرہم قبیلہ کے افراد آباد تھے لیکن اسوقت وہ لوگ آباد ہیں جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ

قدیم نبطی نسل سے ہیں۔

عقبہ سے مدینہ کو جانے والی سڑک۔ یہ وہ حجاج والی قدیم سڑک ہے، جو مصر سے آکر، ساحل کے کنارے ینبوع یا اور تھوڑی دور الجار تک چلی گئی ہے۔ یہ مدینہ کا قدیم بندرگاہ ہے اور مدینہ سے یہاں تک دو دن کے سفر کا راستہ ہے۔ خلیج عقبہ پر صرف مقنا کا مقام قابل ذکر ہے۔ یہاں کے باشندوں نے ۹ ہجری (۶۳۱-۶۳۰) میں نبی کریم صلعم سے ایک عہدنامہ کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بافندے اور مچھیرے تھے۔ اب ہم الوجہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں سے بالی عربوں (۹) کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور یہاں چھوٹے چھوٹے جہازوں کے لیے ایک اچھا بندرگاہ بھی بنا ہوا ہے۔ اسکے قریب ہی وادی اعظم اور اسکی بہت سی شاخیں ہیں۔ اب اسکو وادی احمد کہتے ہیں جو خیبر کے جنوب مشرق سے شروع ہوتی ہے اور وادی رما کے دہانے سے بہت قریب ہے۔ وادی احمد پہلے جنوب مشرق کی طرف مڑتی ہے، مدینہ کے قریب گذر کر ایک بڑا چکر لگاتی ہوئی شمال مغرب کی طرف چلی جاتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ وادی ضرور بہت مشہور ہوگی۔ اب جبکہ بارش بہت زیادہ ہوتی ہے تو اس میں اکثر پانی پایا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر خشکی میں لیکن زیادہ تر شمال کی طرف جاکر مدین کے کنڈر ملتے ہیں، مدین سے بادا میں ہوکر ایک سڑک سیدھی وادی القریٰ کو جایا کرتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں قریٰ خاص مقام تھا۔ اس مقام پر وہ سڑک جو مصر سے مکہ کو گئی ہے، حاجیوں کی اس سڑک سے مل جاتی ہے جو دمشق سے آکر حسما کے پہاڑوں کے مشرق کی طرف، معان، تبوک، حجاز اور مدائن صالح کو جاتی ہے۔ اسپرنجر نے الوجہ کو حجر کا بندرگاہ بتایا ہے جو اسٹرابو کے مقام Egra سے مطابقت کرتا ہے۔ ساحل پر اس مقام کے جنوب میں الحورا واقع ہے۔ قبیلہ بانی کے عربوں کا علاقہ یہاں ختم ہوتا، اور اسی قبیلہ کے ہم رشتہ قبیلۂ جہنیہ کا ملک شروع ہو جاتا ہے حجر اور وادی القریٰ کے درمیان قبیلۂ عذرا کا علاقہ واقع ہے۔ یہ قبیلہ اب تک اپنے جذبہ کی بنا پر مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔

مدینہ کے اطراف کا تمام ملک آتشیں مادہ سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پالمیرہ سے مکہ تک کوہ آتشیں کا رقبہ ہے اور زمانۂ قدیم میں کئی مرتبہ آتشیں مادہ [illegible] کا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے آخری مرتبہ ۶۵۴ء میں آتشیں مادہ نے خروج [illegible] سیاہ آتش فشاں پہاڑوں کو حرّہ یا لابہ کہتے ہیں۔ یہ بات تو مشہور بھی ہے کہ "تو [illegible] فشاں پہاڑوں کے درمیان آباد ہے" ان آتشیں پہاڑوں کے درمیان جو وادیاں ہیں [illegible] سرسبزی اور شادابی

کے لیے مشہور ہیں۔ گذشتہ صدیوں سے ان میں خاص طور پر کھجور کی کاشت ہوتی چلی آرہی ہے۔
مدینہ کے شمال میں اُحد کی پہاڑی ہے۔ مدینہ سے اس پہاڑی تک ایک گھنٹے سے بھی کم کی مسافت کا فاصلہ ہے۔ خیبر کا بڑا کوہ آتش فشاں (جو وادی القریٰ کے مشرق میں ہے) جہاں سے وادی رُمّا شروع ہوتی ہے شہر مدینہ کے علاقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ صحرائے نفود کی مغربی سرحد پر، تبوک کے مشرق میں مقام تیما نیز دومہ کا نخلستان (دومۃ الجندل جسکو اب الجوف بھی کہتے ہیں) واقع ہیں۔ مدینہ سے یہاں تک تیرہ دن کے سفر کا راستہ ہے اور دمشق سے دس دن کا۔ ان مقامات کو عرب جغرافیہ نویسوں نے مدینہ کے علاقہ میں شمار کیا ہے۔

ینبوع سے جدہ تک ساحل کے کنارے کنارے سفر کیا جا سکتا ہے۔ اور جدہ سے سیدھا مشرق کی طرف مکہ تک دو روز کے سفر کا راستہ ہے۔ یہ مقدس علاقہ (جسکو اب الحدود، حدود الحرم بھی کہتے ہیں) مقام تنعیم سے شروع ہو جاتا ہے اور مکہ کے اُس مقام سے جہاں مسجد عائشہؓ واقع ہے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ہے۔ دوسری سمتوں میں حرم کی حدود مکہ سے دُور دُور واقع ہیں۔ حرم کی حدود کو پار کرنے سے پہلے ہی احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ نجد اور یمن سے جو زائرین آتے ہیں، وہ مقام قرن المنازل سے احرام باندھا کرتے ہیں۔ اس مقدس مقام کے نواح میں کسی زمانہ میں عکاظ کا مشہور و معروف بازار لگا کرتا تھا جہاں شاعروں میں علمی مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ قرن المنازل سے قریب قریب ۳۶ میل کے فاصلہ پر بجانب جنوب غزوان کی بلند پہاڑی پر طائف واقع ہے۔ مکہ کے متمول لوگ گرمیوں کا زمانہ یہیں بسر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس مقام کی آب و ہوا صحت بخش ہے اور وہ تمام میوے جو جنوبی یورپ میں ہوتے ہیں یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہاں کے انگور اور کشمش خاص طور سے مشہور ہیں۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ حجاز میں صرف طائف ہی ایسا مقام ہے جہاں جاڑوں میں پانی منجمد ہو جاتا ہے۔ گلیسر نے بھی اس بیان کی تائید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ یمن کے بہت سے پہاڑوں پر بھی پانی برف کی شکل میں منجمد ہو جاتا ہے۔

وہ پہاڑیاں جو مکہ کے جنوب میں واقع ہیں۔ ان میں زمانۂ قدیم سے ہذیل کا قبیلہ آباد ہے، اس قبیلہ میں بہت سے ذکی و ذہین شاعر پیدا ہو چکے ہیں۔ انکے قرب و جوار میں اب بھی مشفق لوگ آباد ہیں اور پہلے طائف انھیں کا تھا۔ یہاں پر پہاڑ کا وہ سلسلہ جو آگے جا کر سراۃ کہلاتا ہے، چوڑا ہو کر بہت ہی سرسبز و شاداب علاقہ ہو گیا ہے۔ یہ حجاز کا نہایت زرخیز حصہ ہے۔ ان پہاڑوں پر یمنی عرب آباد ہیں جن کو ابن المجاور نے انکی غیر مہذب رسوم کی وجہ سے بہیمیہ کہا ہے۔

انکے متعلق جو مثالیں اُس نے لکھی ہیں اُنکی پرک برڈ نے بھی تھوڑی تائید کی ہے۔ تیرہویں صدی تک انکو بجیلہ کے نام سے یاد کرتے تھے مگر اب انکو عسیر کہتے ہیں۔ حجاز کے سرسبز و شاداب بلند علاقہ کے مشرقی حصہ میں بنی قحطان کے افراد آباد ہیں جس میں زیادہ تر جمّال ہیں۔ یہ بہت ہی قدیم قبیلہ ہے اور اب بھی قوی اور طاقتور مشہور ہے۔ بیشتر یمنی عرب اپنے آپ کو اسی قبیلہ کی نسل سے بتاتے ہیں۔

یمن کا ملک "داہنی جانب والا" "جنوبی علاقہ" اور "زرخیز" کے ناموں سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ نہایت قدیم زمانہ سے اپنی زرخیزی اور شادابی کے لیے مشہور چلا آرہا ہے۔ اور دو غیر مساوی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ کو تہامۃ الیمن کہتے ہیں اور دوسرے کو نجد الیمن۔ اور اسکا جائے وقوع یہ ہے:

شمال میں نجد کا میدان مرتفع ہے اور مشرق میں مأرب۔ وسط میں صنعا واقع ہے اور جنوب میں تعز۔ تہامۃ الیمن، حجاز کے ساحلی علاقہ کا سلسلہ ہے۔ گلیسر نے موقع کا مشاہدہ کرکے لکھا ہے کہ سمندر کا پانی چونکہ بتدریج پیچھے ہٹتا جاتا ہے اس لیے یہ علاقہ دن بہ دن وسیع ہوتا جاتا ہے۔

مکہ سے یمن کی بلندیوں تک جو سڑک گئی ہے، وہ اُن پہاڑوں کے اطراف ہوکر جاتی ہے جنپر طائف واقع ہے اور مشہور مقامات تربہ اور تباکہ سے ہوتی ہوئی بیشہ کو چلی جاتی ہے۔ وادی بیشہ کے زرخیز علاقہ کا بیشہ ایک خاص شہر ہے اور یہ علاقہ جنوبی عرب تک مسلسل چلا گیا ہے۔ حجاز سے یمن کی طرف سفر کیا جائے تو یہ زرخیز علاقہ تثلیث کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اور مقام تثلیث قریب قریب اسی عرض البلد پر واقع ہے جس پر السرین اور جرش واقع ہیں۔ یہاں سے ایک بڑی سڑک سیدھی سعدہ کو چلی گئی ہے اور اسی کی ایک شاخ مشرق کی طرف نجران کو جاتی ہے۔

سعدہ سے بجانب جنوب یمن کے دارالسلطنت صنعا کو ایک سڑک جاتی ہے۔ صنعا کے مشرق میں مأرب واقع ہے۔ وہ علاقہ جسکا مأرب صدر مقام ہے، اب الجوف کہلاتا ہے۔ الجوف کا علاقہ نجران سے مأرب کے جنوب مغرب کی طرف وادی بیحان تک چلا گیا ہے۔ اسوقت بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کسی زمانہ میں خوشحال و سرسبز و شاداب رہا ہوگا۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ زمانۂ قدیم سے برقش ایک مشہور و معروف شہر چلا آرہا ہے۔ ان مقا[illegible] سے پہلے جن یورپی سیاحوں نے اپنی جانوں کو سخت خطرہ میں ڈال کر دیکھا، اُ[illegible]ی ہیں۔ جنوب کی طرف اور آگے بڑھ کر یمن کے علاقہ کا ذکر حال ہی میں نیبڈ[illegible] وہ یہ ہے۔

صنعا سے خمار (اس مقام کے گھوڑے اچھی نسل کے ہوتے ہیں) ہوکر مقام یریم پہونچتے ہیں۔ یہاں سے نصف دن کا سفر طے کرنے کے بعد حمیریوں کے صدر مقام ظفار کے کھنڈرات آجاتے ہیں۔ یہ مقام صنعا کے طول البلد اور زبید کے عرض البلد میں واقع ہے۔ یہاں سے سحول ہوکر ایک سڑک جند کو چلی گئی ہے۔ سحول کا کپڑا بہت مشہور تھا۔ جند زمانۂ قدیم میں یمن کا دوسرا صدر مقام رہا ہے۔ اور معاذ بن جبل کی مسجد کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ مقام جند تعز سے قریب ہی واقع ہے سحول کے قرب وجوار میں المذیخرہ کی مشہور گڑھی ہے جسکی نسبت یہ خیال تھا کہ قرمطی لوگ اسی گڑھی پر قابض رہنے کی وجہ سے یمن پر حکمراں رہے۔ جنوب کی طرف آگے بڑھکر پہاڑوں میں تعز واقع ہے۔ زمانۂ متوسط سے لیکر اب سے ایک صدی قبل تک تعز رسولیوں کا مشہور و معروف صدر مقام رہا ہے مگر اب شکستہ حالت میں ہے۔ یہاں کے پہاڑ صبر کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن المجاور نے ان پہاڑوں کو "یمن کے پہاڑوں کا بادشاہ" لکھا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ پہاڑ کافی اوقات کی کاشت اور آبپاشی کے اچھے انتظام کے لیے مشہور ہیں۔ قات کے پودوں کی کونپلیں دافع سکر میں بہت قیمتی ہوتی ہیں اور تہامہ کے تمام شہروں میں بکثرت بھیجی جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کے شمال کی جانب بحر احمر اور بحر ہند کے درمیان اب اور جبلہ کے بیچ میں جبلہ کا بلند اور پہاڑی علاقہ ہے جسکو ذوجبلہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے دو چشمے مدامی طور پر بہتے رہتے ہیں۔ ایک کا نام وادی زبید ہے جو بجانب شمال بہتی ہے اور دوسری وادی تبا ہے جو قدیم مخلاف میں سے بہتی ہوئی جاتی ہے اور وادی متیم یا وادی یمن کے دہانہ کے مشرق کی جانب خلیج عدن میں گر جاتی ہے۔ سنزوفی نے لکھا ہے کہ ایک اور سڑک یریم سے بالکل جنوب کی طرف عدن تک چلی گئی ہے۔ گلیسر نے بیان کیا ہے کہ حدیدہ اور صنعا کو ساحہ ہوتی ہوئی ایک اور سڑک گئی ہے۔ ساحہ قہوہ کی تجارت کی خاص منڈی ہے۔

جنوبی عرب یمن کے مشرق میں حضرموت واقع ہے۔ اب اسکا تلفظ عام طور پر حضرموت کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جس میں بہت سی وادیاں (گھاٹیاں) ہیں۔ ان گھاٹیوں کے محنتی، جفاکش اور حوصلہ مند باشندے بہت سی باتوں میں سوئزر کے باشندوں سے ملتے ہیں۔ بہت ہی قدیم زمانہ سے یہ لوگ ہر سال نوجوان مردوں کو دوسرے ملکوں میں روزگار کی تلاش کے لیے بھیجتے چلے آرہے ہیں۔ اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ یہاں کے باشندے نہ صرف عرب کے آباد بندرگاہوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ مصر، برطانوی اور ولندیزی ہند میں بھی موجود ہیں۔ ان

دونوں آخرالذکر مقامات میں جو عرب موجود ہیں وہ حضرموت ہی کے باشندے ہیں۔ جنوبی عرب کو مغرب سے مشرق کی طرف وادی الکسر برابر برابر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس وادی سے ایک چشمہ دوامًا بہتا رہتا ہے جو سیحوت کے قریب مشرقی سرحد پر سمندر میں گر جاتا ہے۔ دو سب سے بڑے مقامات شبام اور ریم بھی یہیں پر واقع ہیں۔ ریم کے جنوب مشرق کی طرف وادی برہوت کے منبع کے قریب (بلہوت، برہوت نامی یہاں ایک کوہ آتش فشاں بھی ہے جس میں اب تک آتشیں مادہ نکلتا رہتا ہے اور اس وادی کا نام اسی پہاڑ کے نام پر مشہور ہو گیا ہے) حضرت ہود علیہ السلام و علیٰ نبینا کی قبر پائی گئی ہے۔ یہ بہت مشہور پیغمبر ہوئے ہیں اور ان کا ذکر کلام مجید میں بھی آیا ہے۔ یہاں سے صحرائے اعظم شروع ہوتا ہے جو حضرموت کو شمال مغرب۔ شمال اور مشرق کی طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جنوبی عرب کا بہترین بندرگاہ مکلا ہے (مکلا کے معنی محض بندرگاہ کے ہیں) اغلب ہے کہ یہ مقام وہ ہی ہو جسکو عرب جغرافیہ نویسوں نے لسا (اوسا) لکھا ہے۔ جس طرح یمن کے متعدد کھنڈرات اور مقبرے وہاں کی گذشتہ خوشحالی اور دولتمندی کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح حضرموت میں بھی اسی قسم کے آثار سے یہاں کی فارغ البالی اور دولتمندی کا پتہ چلتا ہے۔

سیحوت کے مشرق کی طرف (سیحوت کا پرانا نام شاید خیرن ہے) ساحل شروع ہوتا ہے اسکو عرب جغرافیہ نویسوں نے مہرہ اور اکثر شہر کے نام سے بھی تحریر کیا ہے۔ جنوبی عرب کی قدیم زبان میں مہرہ یا شہر کے معنی ساحل کے ہیں۔ شہر کا نام اب پہلے اس بندرگاہ کے لیے مخصوص ہے جو بجانب غرب واقع ہے۔ مرباط کے مشرق میں مشرقی سرحد ہاسک کہلاتی ہے مرباط کا ایک بہت اچھا بندرگاہ تھا مگر اب وہ ایک غیر مشہور گاؤں رہ گیا ہے۔ شہر جو اب مرباط کہلاتا ہے اس بندرگاہ کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں مرباط قدیم صدر مقام ظفار کا بندرگاہ تھا۔ مقام ظفار اب بالکل غیر آباد ہے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ شہر ظفار ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں تباہ و برباد کیا گیا تھا۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہ ایک مشہور شہر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ یہاں (سارڈین کی قسم کی) مچھلیاں بہت ہوتی ہیں لوگ انکو کثرت سے پکڑتے اور اونٹوں کو کھلاتے ہیں۔ ان مچھلیوں کو یہاں ورق یا عِدّ کہتے ہیں۔ پہاڑی سلسلہ میں جو ساحل کے متوازی چلا گیا ہے لوبان کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ اسکے ز[illegible] اور عمان کے درمیان ہر جگہ کھاریوں کی کاشت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ بنسبت جو کچھ لکھا ہے اُس سے ابن المجاور کے بیان کی تائید ہوتی۔ قہ کی سوں کی کاشت

اب بہت محدود ہوگئی ہے۔ گرا (Gara) کے پہاڑوں اور سمندر کے بیچ میں، اس سرسبز و شاداب ساحل پر جو لوگ آباد ہیں اُنکا کچھ حصہ غیر متمدن ہے۔ ہاسک کے مشرق میں عمان تک جو ساحلی علاقہ چلا گیا ہے اُسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس میں درخت اور جھاڑیاں مطلق نہیں ہیں اور اس سرزمین کے اندرونی حصہ کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔

مشرقی عرب | عمان، عرب کا بالکل مشرقی صوبہ ہے، اسکا بیشتر حصہ بہت زرخیز پہاڑی علاقہ ہے اور اسکے ساحل پر بہت سے بندرگاہ ہیں۔ خلیج عمان میں مچھلیاں کثرت ہوتی ہیں اور ساحل کے باشندے زمانۂ قدیم سے فن جہازرانی میں مشہور ہیں۔ شہر قلہات، جسکی تعمیر کی بنا بارھویں صدی میں پڑی تھی اور کسی زمانہ میں خوبصورت اور مستحکم شہر رہا ہے، اب شکستہ حالت میں ہے۔ برخلاف اسکے مسقط زمانۂ متوسط میں غیر مشہور رہا ہے، مگر اب اس ملک کا نہایت مشہور شہر ہے۔ اور خلیج فارس میں اسکے لیے نہایت عمدہ بندرگاہ بنا ہوا ہے۔ المقدسی نے مسقط کو خوبصورت شہر لکھ کر بتایا ہے کہ یہاں میوے کثرت سے پیدا ہوا کرتے تھے مگر اس شہر کا ابن بطوطہ نے ذکر بھی نہیں کیا۔ یوروپین سیاحوں نے لکھا ہے کہ بہ نسبت عدن کے یہاں گرمی بہت پڑتی اور قریب قریب ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بادشاہ یا تو الرستاق میں رہا کرتے ہیں یا نزوہ میں۔ یہ دونوں مقام سرسبز و شاداب پہاڑ (جبل اخضر) میں واقع ہیں۔ ویسٹنڈنے نزوہ کو خود دیکھا ہے، جو قدیم شہر ہے مگر اب بھی ترقی پر ہے۔ مسقط کے شمال میں قدیم صدر مقام صہار واقع ہے۔ اس شہر کا نام بالکل اسی طرح عمان پڑ گیا جس طرح دمشق اب عام طور پر الشام کہلاتا ہے۔ صہار میں مشرق سے بکثرت تجارت ہوا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے المقدسی نے اس شہر کو "چین کا دروازہ" لکھا ہے۔ المجاور نے تحریر کیا ہے کہ یہ شہر اُسکے زمانہ میں ابتری کی حالت میں تھا۔ ممکن ہے کہ اسکے زمانہ کے بعد اسکی حالت اچھی ہوگئی ہو کیونکہ ویسٹینڈنے نے اسکو مضبوط و مستحکم شہر لکھا ہے اور تھوڑی بہت اہمیت بھی دی ہے۔ صہار کے شمال میں جزیرہ نما کے مشرق کی طرف، راس مسندم پر شہر دبا (یا دما) آباد ہے۔ یہ شہر رسول کریم صلعم کے عہد میں بہت مشہور تھا۔ اور اب بھی شمالی عمان کا صدر مقام ہے۔ جزیرہ نما کے مقابل میں مغرب کی طرف شرجہ کے بندرگاہ کا شہر واقع ہے جو ترقی پر ہے۔ عمان کی قدیم آبادی کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ روایات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بند مآرب کے ٹوٹنے کے بعد قبیلۂ ازد کے افراد عمان میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے مازون تھے، اس لیے کہ عمان کو بعض اوقات اس نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ امویوں کے عہد میں اگرچہ یہاں کی کثیر آبادی عراق کو

چلی گئی تھی پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ازد کا قبیلہ بڑھتا ہی رہا۔ قبیلہ طے کے افراد بھی عمان میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انھیں کا ایک خاندان جسکو بنہان کہتے تھے، عرصۂ دراز تک بالادست رہا۔ شمالی عرب کے لوگ (بنو غافر) بھی بعد میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ کھجور یہاں کی بہت مرغوب غذا ہے اور دوسرے ملکوں کو بکثرت بھیجی جاتی ہے

وہ علاقہ جو عمان کے مغرب اور شمال مغرب کی طرف عراق کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ عربوں کے بہترین عہد میں البحرین (اب البحرین، اوال کے جزیرہ کا نام ہے) کہلاتا، یا دار السلطنت ہجر کے نام پر ہجر کے نام سے موسوم تھا۔ دسویں صدی کے آغاز میں قرمطیوں نے اپنے رہنے کیلیے ایک مقام الاحسا (اسکا تلفظ لحسا بھی کیا جاتا ہے) کے نام سے بنوایا تھا جو ہجر سے قریب ہی تھا یہی الاحسا (یا لحسا) اِسوقت اس علاقہ کا نام ہو گیا ہے۔ اس علاقہ کے انتہائی جنوبی حصہ کا نام اس قبیلہ کے نام سے موسوم ہے جو اس میں آباد ہے اور اس قبیلہ کا نام قواسم ہے جو مشہور بحری قزاق ہیں۔ مغرب کی طرف آگے بڑھ کر قطر کا جزیرہ نما واقع ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہاں کے باشندے غواص اور خوفناک بحری قزاق مشہور چلے آرہے ہیں۔ آجکل جو صدر مقام ہے اُسکا نام یا تو الحسا ہے یا ہفوف اور یہ نام عرب جغرافیہ نویسوں نے نہیں لکھا ہے۔ مشرق کی طرف اور آگے بڑھ کر چند گھنٹوں کی راہ پر عقیر کا بندرگاہ واقع ہے۔ معلوم نہیں کہ مبرز، جو ہفوف کے شمال میں اس سے قریب ہی واقع ہے، قدیم شہر مشقر سے مطابقت کرتا بھی ہے یا نہیں اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے اسلیے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس علاقہ کے متعلق جو واقفیت لکھی ہے وہ بہت ناکافی ہے۔ علاقہ لحسا کے شمال کی طرف مقام القطیف واقع ہے۔ اور یہ نام ایک مشہور بندرگاہ کے نام پر مشہور ہو گیا ہے پہلے یہاں کے ساحل کو اُس بندرگاہ کے نام پر الخط کہا کرتے تھے، جہاں سے عرب لوگ اپنے نیزوں کے لیے بانس لایا کرتے تھے۔ اور اس بندرگاہ میں ہندوستان سے بانس آیا کرتے تھے۔ علاقہ لحسا میں کھجور بکثرت پیدا ہوتی ہے چنانچہ ایک عربی مثل ہجر (لحسا) کو کھجور لیجانے کے بارے میں بالکل انھیں معنوں میں مشہور ہے جس طرح نیوکیسل کو، کوئلہ لیجانے کے متعلق ہمارے ہاں ایک کہاوت زبان زد عوام ہے۔ عبد القیس اور تمیم کے قبائل میں صدیوں تک بالادستی کے لیے جنگ رہی۔ بالآخر تمیم کا قبیلہ تقریباً دو سو برس تک برسر اقتدار رہا۔ یعنی جتنے عرصہ تک [illegible] لوگ برسر حکومت رہے

اتنے ہی زمانہ تک یہ بھی صاحب اقبال رہا۔ القطیف [illegible] ساحل کے متعلق
کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ علاقہ بالکل ہمو [illegible] کے معنی گڑھی کے ہیں

اسکو قُرَین بھی کہتے ہیں۔ اب اس کا تلفظ گرین (Gren) کیا جاتا ہے اسی وجہ سے انگریزی میں اسکے ہجے (Grane) لکھے ہیں۔ یہ مقام ایک خلیج کے جنوبی آغاز پر واقع ہے اور غالباً آیندہ زمانہ میں ایک مشہور تجارتی منڈی بنجائے گا اس لیے کہ مملکت شمر کے لیے یہ بندرگاہ مشرق سے تجارت کے لیے سب سے قریب ہے۔ اس علاقہ کا شیخ اب عملی طور پر خود مختار ہے (پہلے یہ ترکی سیادت میں تمام اس خلیج کے مغرب کی طرف کا خطہ واقع ہے۔ یہ نہایت مشہور مقام ہے اور اس سڑک پر واقع ہے جو بصرہ سے لحسا اور وہاں سے یمامہ تک چلی گئی ہے۔

وسط عرب یمن کے مشرق کی جانب، حضرموت اور مہرہ کے شمال کی طرف اور عمان کے مغرب میں وسط عرب تک وسیع رگستان ہے جسکی صرف حدود ہمیں معلوم ہیں مگر وہ بھی نامکمل طور سے۔ یہ رگستان نفود کے رگستان (جو شمالی عرب میں ہے) کی طرح معلوم ہوتا ہے یہاں پانی بمشکل ملتا ہے۔ بارش ہونے کے بعد زمین سبزہ زار بنجاتی ہے اور کثرت سے چراگاہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر تو بدو لوگ اندرونی علاقہ میں اپنے اونٹوں، بھیڑوں اور تمام خاندان کو لیکر آجاتے اور یہاں تین یا چار مہینے تک مقیم رہتے ہیں۔ انسانوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ انکے جانوروں کو، اس لیے کہ انسان تو دودھ پر گذارہ کرتے ہیں اور چونکہ سخت سے سخت دھوپ کی تپتی ہوئی زمین پر بھی سبزہ اس قدر رس دار ہوتا ہے کہ چوپایوں کو پانی کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر انکو پانی پینے کے لیے دیا بھی جاتا ہے تو نہیں پیتے۔ جب گرمیوں کی دھوپ سے یہاں کا سبزہ سوخت ہو جاتا ہے تو پھر بدو لوگ اپنے اپنے اصلی مقامات پر واپس چلے جاتے ہیں۔ رگستان کے کنارے جو بدو آباد ہیں اُن کا ہمیشہ یہی طریقہ رہتا ہے۔ یہ بات کہ اندرون رگستان وہ ٹھیک ٹھیک کہاں تک جاتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں۔ اس لیے کہ رگستان کے کئی نام ہیں۔ مشرقی یمن اور شمال مغربی حضرموت کے درمیان کا حصہ صہید کہلاتا ہے۔ حضرموت کے شمال اور مشرق کی طرف والا علاقہ الاحقاف کے نام سے مشہور ہے۔ مہرہ کے شمال کی طرف جو سرزمین ہے اسکو عرب لوگ دبار کہتے ہیں مگر یہ علاقہ عموماً الدہنا کہلاتا ہے، یعنی سرخ زمین کا علاقہ۔ یہاں کی مٹی کا رنگ سرخ ہے اسلیے یہ علاقہ اس نام سے مشہور ہوگیا۔ نقشوں میں اسکو "الخالی" بتایا جاتا ہے۔ یہ بات کہ آیا اس علاقہ کے اندرونی حصہ میں کم ازکم جانوروں کے لیے بھی پانی ملتا ہے یا نہیں، بالکل غیر یقینی اور خلاف قیاس نہیں ہے اس لیے کہ مہرہ کے بدو، جنکے اونٹوں کے جہاز کا بیڑہ دُنیا بھر میں مشہور ہے، اس بات کو واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ انکی اونٹنیاں بعض اوقات

جن کے اونٹوں سے جفتی کھا جاتی ہیں - اس سے قیاس کو راہ ہوتی ہے کہ اندرونی علاقہ میں اب بھی جنگلی اونٹ رہتے ہیں کیونکہ عرب لوگ ان اونٹوں کو حوشیہ (جنگلی) کہتے ہیں - غالبا یہ ہی بات مغربی عمان کے اونٹوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو اتنے ہی مشہور ہیں جتنے کہ یہ - اور یہ واقعہ، کہ اس علاقہ میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو نامعلوم زبان بولتی ہے، صحیح نہیں ہے - ابن المجاور نے لکھا ہے کہ یہاں کے بدووں نے تیرہویں صدی میں اس رگستان کو پار کرکے بالکل داہنی جانب مرباط اور ظفار کو جانے کی جسارت کی تھی تاکہ اپنے ہاں کی پیداوار سے عراق کی پیداوار کا تبادلہ کریں اس وسیع رگستان کی شمالی مشرقی سرحد پر، (جو یامہ کے جنوب میں تین دن کے سفر کی دوری پر واقع ہے اور بحرین سے قریب قریب اتنی ہی دور ہے) قدیم سرسبز و شاداب اور سیراب یرہین کا نخلستان واقع ہے جسکو قرمطیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا - نخلستان کے نام پر رگستان کا یہ حصہ بعض اوقات "یرہین کی ریت" کہلاتا ہے - عمان سے مکہ کو جو سڑک گئی ہے وہ اسی نخلستان میں ہوکر جاتی ہے - یہاں سے شمال کی طرف بحرین اور یامہ کے بیچ میں رگستان کا ایک ناگوار حصہ پھیلا ہوا ہے جو الدہنا یا نفود بھی کہلاتا ہے اور بعض وقت اسے "عالج کی ریت" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں - بیان ہوا ہے کہ اس میں چراگاہیں کثرت ہیں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کے سلسلے اس علاقہ میں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے چلے گئے ہیں - یہاں کی آب و ہوا خوشگوار اور صحت بخش ہے - اس رگستان اعظم کے مغرب اور شمال مغربی کنارے پر قحطان کا علاقہ بہت نشیب میں واقع ہے جسکو پہلے فلج کہتے تھے مگر اب اسکو ایک عرب قبیلہ کے نام پر وادی دواسر کہتے ہیں - یامہ کے جنوب مغرب میں اسی وادی کا سلسلہ وادی افلاج کہلاتا ہے (اسکو پہلے فلج الافلاج) بھی کہا کرتے تھے) -

اس رگستان کے شمال کی طرف وسط کا بلند علاقہ (نجد) شروع ہو جاتا ہے - یہ بلند علاقہ جزیرہ نما کا قلب کہلاتا ہے اور واقعی نہایت صحت بخش اور عربوں کے لیے عرب کا بہترین حصہ ہے - جنوبی مشرقی صوبہ یعنی یامہ بہت زرخیز علاقہ ہے (اسکو اکثر اصلی نجد میں شامل نہیں کرتے) یامہ اور بحرین کو ملاکر العروض کہتے ہیں -

یامہ سے دو پہاڑی درّے (عینہ اور ہرملیہ) ثر — قام وثم (وشوم)
میں واقع ہے - اور پھر وہاں سے شمال مغرب کی طرف — یہ اس صوبہ کا
نماص شہر ہے - یہاں سے عنیزہ کو نو گھنٹے میں پہونچتے ہیں — یم کے صوبہ کا خاص

شہر ہے۔ اس صوبہ کے شمال میں شمر کا علاقہ واقع ہے۔ اور بجانب مغرب مدینہ کے علاقہ میں خیبر ہے۔ ہم ڈوٹی کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے اس ملک کا مفصل حال تحریر کیا ہے۔ عنیزہ کے شمال مشرق میں دو گھنٹے کے راستہ پر شہر بریدہ واقع ہے۔ قصیم کے داہنی جانب بڑی وادی رُمّہ چلی گئی ہے جو خیبر کے کوہ آتش فشاں سے شروع ہو کر آئی ہے۔ یہ پہاڑ چھ ہزار فٹ بلند ہے اور نواح بصرہ تک چلا گیا ہے۔ وادی رُمّہ میں اس مقام پر پستی واقع ہو گئی ہے اور اسکی اغلب وجہ معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ تاریخ سے بھی قبل یہ مقام کسی دریا کا گذرگاہ رہا ہو گا۔ اگرچہ اس وادی میں بہت سے دریا گرتے ہیں اور گو دریاؤں کے تیز دھارے کی وجہ سے اس وادی میں پانی اچھی خاصی مقدار میں آجاتا ہے لیکن پھر بھی یہ وادی، جسکی چوڑائی کہیں کہیں ایک دن کے سفر کی مسافت کے برابر ہے، عام طور پر خشک ہی رہتی ہے۔ ایک صدی میں صرف دو یا تین مرتبہ اس میں حقیقی دریا کی شان پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسکے پانی اسکی تہ میں جذب ہو جاتا اور بعض مقامات پر دکھائی بھی دیتا ہے۔ قصیم کے علاقہ میں جو سرسبزی اور شادابی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اس صوبہ کے مغرب کی طرف یہ وادی، ابان کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر گئی ہے (شعرائے قدیم نے اس مقام کا بیشتر ذکر کیا ہے)۔ شمالی پہاڑی سیاہ پہاڑی کہلاتی ہے اور جنوبی سرخ۔ یہاں پر اس وادی کی چوڑائی دو سے تین عربی میل تک ہے۔ نجد کا وہ حصہ جو انتہائی جنوب مشرق کی طرف واقع ہے، اب سُدَیر کہلاتا ہے۔ (بعض اسکا تلفظ مُدَیر، سِدر کرتے ہیں ڈوٹی نے سِدَیر لکھا ہے) جہاں نما میں زائرین کی اس سڑک پر جو بصرہ سے چلی گئی ہے اسی کا نام کا ایک مقام مذکور ہوا ہے۔ زمانۂ قدیم میں نجد کے مختلف علاقے مختلف قبائل کے نام پر مشہور تھے۔

صوبۂ قصیم کے مغرب میں شمر کا ملک واقع ہے۔ اس ملک کا نام طے کے بڑے قبیلہ کے ایک خاندان کے نام پر مشہور ہوا ہے اور اسی خاندان کے نام پر یہ علاقہ "طے کے دو پہاڑوں" کے نام سے موسوم ہے۔

شمر کے پہاڑ نجد کو نفود یا الدہنا سے جدا کرتے ہیں۔ نفود کے اصلی ریگستان کی ٹھیک ٹھیک وہی خصوصیات ہیں جو جنوب کے بڑے ریگستان کی ہیں۔ بارش ہونے کے بعد اس ریگستان کی سرزمین بھی سرسبز و شاداب اور رس دار سبزہ سے لہلہانے لگتی ہے۔ انسان اور جانور کثرت سے آکر یہاں پر چند ہفتوں تک آباد رہتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب دھوپ ہر چیز کو

جلس دیتی ہے تو پانی کا قحط ہو جانے کی وجہ سے ملک بالکل خشک اور ویران ہو کر پھیکے ہوئے مسافروں کے لیے سخت خطرناک ہو جاتا ہے۔ چند انگریزوں نے اس لق و دق صحرا کو عبور کیا ہے جن میں لیڈی بلنٹ اور یوٹنگ قابل ذکر ہیں۔ یوٹنگ نے لکھا ہے کہ اس علاقہ کی مٹی سرخی مائل ریت کے مثل ہوتی ہے اور اُس پر نشانات بنے ہوتے ہیں "گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے قد آور گھوڑوں کے گلہ نے مشرق سے مغرب تک اُس میدان کو پامال کر دیا ہے"۔ بلند ریتیلا علاقہ، جسے نفُد یا نفُد کہتے ہیں اور جسکی جمع نفود (انفاد) ہے اس سے تمام ریگستان کی تعریف ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح جنوبی ریگستان کے متعلق احقاف کا لفظ رائج ہے اور اس سے وہاں کے ریگستان کی قسم کا پتہ چلتا ہے۔ لفظ نفد جسکا کسی مستند زبان میں پتہ نہیں چلتا، شاید کثرت استعمال سے لفظ فند یا فند (جس کی جمع افناد یا فنود ہے) رائج ہو گیا ہے۔ حائل سے جوف تک (مخالف سمت میں) یوٹنگ نے آٹھ دن کے سفر میں رستہ طے کیا تھا، اور لیڈی بلنٹ نے دس دن میں۔ تین دن کے سفر کے بعد جبّہ کا نخلستان آجاتا ہے۔ یہاں کی چٹانوں پر بہت سے کتبے اور نقوش پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے اس مقام پر اکثر لوگ آتے رہے ہیں۔ جوف سے نو دس گھنٹے کے سفر کے بعد شقیق کا کنواں ملتا ہے اسکو یوٹنگ نے ۱۸۸۳ء میں دیکھا اور اُسوقت یہ کنواں اُٹا ہوا تھا۔ الجوف کا اسکے قدیم نام (دومہ) سے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ مقام وادی سرحان پر واقع ہے۔ یہ وادی کاف میں ہو کر حوران تک پتھریلے ریگستان کے داہنی جانب آر پار چلی گئی ہے۔ یہ مقام اسوقت حماد کہلاتا ہے۔ یہ ایسا نام ہے جسکا کسی زبان میں پتہ نہیں چلتا۔ والن نے لکھا ہے کہ شاید اسکی اصلی شکل حماد ہو جو حمد کے فعل سے مشتق ہے اور اسکے معنی "بنجر" کے ہیں۔

عراق عرب

اہل عرب اسکے مغربی حصہ کو بادیۃ الشام کہا کرتے تھے۔ مشرقی حصہ کو جو جنوب کی طرف ہے بادیۃ عراق کے نام سے پکارتے تھے اور شمالی حصہ کو بادیۃ الجزیرۃ عراق عرب کا ریگستان اور خساف بھی کہتے تھے۔ جنوبی علاقہ کو اکثر سماوہ کے نام سے یاد کرتے تھے اس بادیہ کے ڈھالوں کو جو مغرب اور شمال کی جانب سے مشرق اور جنوب کی طرف چلے گئے ہیں بہت سے چھوٹے چھوٹے نالے قطع کرتے ہیں۔ جنکا پانی کچھ تو الابو[illegible] ہو جاتا ہے اور کچھ بڑے بڑے چشموں میں چلا جاتا ہے اور یہ سب جا کر دریائے فرات سے گھانس اُگ آتی ہے اور کنوؤں کے قریب نخلستان [illegible] ہو جاتے ہیں بعض مقامات پر زیادہ برہنہ یا پتھریلی زمین جس پر ریت [illegible] بالکل بنجر رہتی ہے۔ اس سم بہار میں یہاں کثرت

علاقہ کو عبور کر کے عراق سے شام کی طرف ۱۲ھ مطابق ۶۳۴ عیسوی میں حضرت خالد بن ولیدؓ اپنی سوارہ فوج کے ساتھ ایک مہم پر گئے تھے۔ یہ مہم درحقیقت نہایت پُرخطر تھی۔ اس علاقہ کی حدود کا گھٹنا یا بڑھنا، ان متمدن ریاستوں کی طاقتوری یا کمزوری پر منحصر ہے جو اسکے اطراف واقع ہیں۔ سائکو نے لکھا ہے کہ اسوقت الحص کے پہاڑ جو حلب کے جنوب میں واقع ہیں، اس علاقہ کی شمالی حد قائم کرتے ہیں پھر بھی گرمیوں کے موسم میں بدو لوگ اپنے گلوں کو لیکر مرغش تک چلے جایا کرتے ہیں۔

آب وہوا اور پیداوار

فی الجملہ عرب میں بہ نسبت سردی کے گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم مرتفع میدانوں کی راتیں گرمی میں بھی اکثر سرد ہوا کرتی ہیں اور جاڑوں میں برف کی سرد شمالی ہوا نہایت ناگوار ہو جاتی ہے۔ شعرا، مشرقی ہوا (صبا) کو نہایت خوشگوار خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے سموم کا بہت خوف ہوتا ہے۔ اب اس کا تلفظ عام طور پر سموم کیا جاتا ہے۔ یہ زہریلی جھلس دینے والی خشکی کی ہوا ہوتی ہے۔ ہر قسم کی خوشحالی بارش پر منحصر رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر بارش کو "خدا کی رحمت" کہا جاتا ہے اور پانی اور فیاضی کے خیالات اکثر مترادف ہوا کرتے ہیں۔ بارش کے موسم کے بعد، ربیع کا زمانہ سال کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں ہری ہری جھاڑیاں اور گھانس جانوروں کے لیے پیدا ہو جاتی ہے۔ اونٹ خاص طور پر کٹیلے پودوں کو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ان پودوں میں سعدان کا پودا انکو بہت مرغوب ہوتا ہے۔ انسانوں کو کھانے کے لیے اس بادیہ میں جو اناج پیدا ہوتا ہے اُسکو فِث کہتے ہیں۔ اب عام طور پر اسکو سمح کے نام سے پکارا جاتا ہے (غالباً یہ نام قمح سے ماخوذ ہے)۔ اس غلہ کے سرخی مائل دانوں کا آٹا جَو کے آٹے سے بہتر ہوتا ہے۔ جو حلوا پکانے کے لیے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ ضرورت کے وقت حنظل کے بیجوں کا آٹا بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ اس ریگستان میں کُمبہ بھی پیدا ہوتا ہے لوگ اسکو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اور مشہور و معروف سنا بھی کھائی جاتی ہے۔ گیہوں صرف یامہ، یمن، اور چند نخلستانوں میں پیدا ہوتا اور ہمیشہ گراں رہتا ہے اس لیے اسکی روٹی عموماً عیش وطرب کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ جَو کی کاشت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے کہ اسکو گھوڑے کھاتے ہیں۔ جوار، باجرہ اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہوتا ہے۔ لحسا اور عمان میں چاول خوب پیدا ہوتا ہے۔ وہابیوں کے عہد میں تمباکو کی کاشت کم ہو گئی تھی اس لیے کہ انھوں نے اس مفعول چیز کی کاشت کی ممانعت کر دی تھی لیکن اب پھر اسکی کاشت میں ترقی ہو رہی ہے۔

اس بادیہ میں جو درخت پیدا ہوتے ہیں، ان میں طلح کے درختوں کے مانند گوند کے درخت

کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی اقسام کا بیان کرنا بہت ضروری ہے۔ ان سے صمغ عربی نکلتا ہے اور انکی اقسام حسب ذیل ہیں :- سلم، سمر، سیال، اثل، نبک، عضاہ (اس درخت کی لکڑی کا کوئلہ بہت عمدہ ہوتا ہے) جنگلی کھجور اور مہندی کے درخت بھی اس بادیہ میں ہوتے ہیں۔ عرب لوگ کھجور کے درختوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اور یہ درخت واقعی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ عربوں کی خاص خوراک کھجور ہے۔ مدینہ کے علاقہ میں کھجور کی قسمیں سو سے بھی زائد شمار کی جاتی ہیں۔

قدیم شعرانے شیروں کا سلسل ذکر کیا ہے اور ہمدانی نے تو اُن علاقوں کے نام تک بتائے ہیں جن میں وہ پائے جاتے تھے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ صنعا کے شمالی پہاڑوں میں اُسکے زمانہ میں بھی چند شیر موجود تھے۔ اورڈوٹی نے بھی یہی اطلاع وسط عرب میں سُنی تھی۔ چیتے، تیندوے، چرغ، اور لومڑیاں بڑے شکاری جانور ہیں۔ شکار کے متعلق ہم نے ضروری باتیں اس مضمون کے اُس حصے میں لکھی ہیں جس میں ہم نے عربوں کی نسل اور طرز معاشرت کا ذکر کیا ہے۔ شکاری پرندوں میں دو قسم کے عقاب، شاہین، شکرے اور اُلو ہوتے ہیں۔ بندر یمن میں زیادہ ہیں اور غالباً دوسرے حصوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کوّے عام طور پر ہر جگہ ہوتے ہیں۔ دوسرے پرندوں میں ہُدہُد، چنڈول، بلبل، چند قسم کے کبوتر، اور خصوصاً قطا قسم کے تیتر پائے جاتے ہیں۔

چوپاؤں میں سب سے زیادہ قابلِ قدر اونٹ ہیں، بغیر انکے ریگستان عملی طور پر ناقابلِ رہائش ہو جاتا ہے۔ شعرانے اسکو "خشکی کا جہاز" واقعی ٹھیک کہا ہے اس وجہ سے کہ ریگستان میں نقل و حرکت کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ یہ قصہ کہ انسانوں کو جب پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے تو وہ اونٹوں کو مار کر وہ پانی بھی پی جاتے ہیں جو انکے پیٹ میں جمع رہتا ہے۔ اس قصہ کو حبیب نے "پریوں کا قصہ" بتایا ہے۔ لیکن طبری کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کا یہ واقعہ بالکل اختراع بھی نہیں ہے (ملاحظہ ہو طبری صفحہ ۲۱۲۳) جہاں گھوڑوں کو اسی طریقہ سے پانی پلایا جاتا ہے۔ عربی اونٹ کے صرف ایک کوہان ہوتا ہے۔ باربرداری کے اونٹ کو بعیر کثیر تعداد کو ابل کہتے اور سواری کے اونٹ کو ذلول (پالتو) یا (ہجین) شریف کہتے ہیں۔ اونٹ کا گوشت بہت زیادہ کھایا جاتا ہے، اسکا دودھ بازائقہ اور مفرح ہوتا ہے، بہت پیا جاتا ہے لیکن گھی کے کام کا نہیں ہوتا۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ سے گھی نکالتے ہیں بھیڑ اور بکری کے بچے عرب میں عموماً رکھے جاتے ہیں لیکن گائے بھینس شاذ۔ ۔۔۔ دریائے فرات کے نواح میں گایوں کے گلے پائے جاتے ہیں جن کو بقارہ کہتے ہیں دنیا بھر میں مشہور ہے۔ چھوٹا ہوتا ہے مگر بہت خوبصورت۔ بہت تیز اور محنتی ہے بہت محبت رکھتا ہے

صرف دولتمند لوگ ہی گھوڑا رکھ سکتے ہیں اس لیے کہ یہ گھوڑے صرف لڑائی، یا تفریحی کھیل، دوڑ اور شکار کے موقع پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے اخیر صرفہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مکمل طور سے تربیت یافتہ ایک گھوڑی ۲۵ اونٹوں کی قیمت کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اسکے لیے جَو اور پانی زیادہ صَرف ہوتا ہے۔ قزاقانہ تاختوں میں گھوڑوں کے واسطے اونٹوں پر پانی لیجایا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت اکثر انکے لیے گھر کے اثاثہ کا بیشتر حصہ صرف کردیا جاتا ہے۔ لیڈی بلنٹ اور فان اپن ہیم کے سفرناموں میں اسکے متعلق بہت سے واقعات بالتفصیل درج ہیں۔ صرف نجدی میں گھوڑوں کو پرورش نہیں کیا جاتا بلکہ یمن کے چند حصوں مثلاً ضمار اور جوف وغیرہ میں بھی انکی پرورش ہوتی ہے۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں عربی گھوڑے آتے رہے ہیں۔ حاکم شمر ہر سال چند گھوڑے براہ کویت ہندوستان بھیجتا رہتا ہے۔ اگرچہ حجاز، لحسا اور یمن کے باشندے، نیز وسط عرب میں قبیلۂ صلیب کے افراد بھی خچروں کو سواری کے کام میں لاتے ہیں لیکن بدو اسکی سواری کو کسرشان سمجھتے ہیں۔ دریائے فرات پر سجور کے وادی میں نیم بدو خچروں کے بہت سے گلے رکھتے ہیں۔

پالتو جانوروں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:۔ معمولی کُتّے، جن سے دیکھ بھال (چوکیداری) کا کام لیا جاتا ہے، بہت زیادہ گیدڑ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور شکاری کُتّوں کو سلوکی کہتے ہیں (یہ لفظ سلوق سے ماخوذ ہے) بلّیاں، یورپی بلّیوں سے بڑی ہوتی ہیں۔ شہروں میں مرغیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اگرچہ بادیہ میں وہ کثرت سے موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یمن میں کسی زمانہ میں بندروں سے گھر کا کام کاج کرایا جاتا تھا

عرب میں یہ بات تو مشہور ہی ہے کہ ٹڈیاں بہت نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں کہتے ہیں کہ انکا دورہ ہر ساتویں سال ہوتا ہے۔ جس وقت ٹڈیوں کا دَل بادَل چھا جاتا ہے تو پھر بچے سے لیکر بوڑھے تک گھر سے نکل آتے ہیں۔ ان کا صرف یہ ہی مقصد نہیں ہوتا کہ انکا خاتمہ کردیں بلکہ وہ انکو بہت شوق سے کھاتے بھی ہیں۔ یہ لوگ ٹڈیوں کو نمک کے ساتھ اُبال کر یا بھون کر کھاتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں کو پرورش کرنے کا یہاں قاعدہ نہیں ہے، البتہ بیشتر حصوں میں جنگلی شہد پایا جاتا ہے جو خدا کی نعمت سمجھا جاتا ہے۔

نسل اور طرز معاشرت

عرب شجرہ نویسوں نے تمام عربوں کی نسل کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں، شمالی عرب تو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام)

کی نسل سے ہیں اور جنوبی عرب قحطان کی نسل سے - اور اس نظریہ کی بنیاد توراۃ کے بیان پر ہے۔ اس کلیہ سے یہ بھی متعلق ہے کہ "اصلی عرب" (العرب العاربہ) عاد و ثمود، عملیق وغیرہ کے قبائل فنا ہو چکے ہیں نیز وہ قبائل جو قحطان کی نسل سے تھے وہ بھی باقی نہیں رہے اور یہ کہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل "العرب المستعربہ" کہلاتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو باہر سے آکر عرب میں آباد ہوئے اور رہتے رہتے عرب بن گئے - وہ بدو بھی اصلی عرب کہلاتے ہیں جو خالص عربی زبان بولتے ہیں جمع کے الفاظ "اعراب" اور "عربان" بھی ضمناً انکے لیے استعمال کیے جاتے ہیں - بدوی اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو بادیہ (کھلے میدان) میں رہتے ہیں - انکے مقابلہ میں اہل الحضرہ لوگ کہلاتے ہیں جو مستقل سکونت رکھتے ہیں - انھیں لوگوں کو اہل الوبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اونٹ اور بکروں کی اُون کے بنائے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں - انکے مقابلہ میں اہل المدر (یا الطین) مٹی کے گھروں میں رہتے ہیں -

یہ تو ایک بدیہی واقعہ ہے کہ اہل عرب شمالی اور جنوبی قبائل میں منقسم ہیں - جنوبی قبائل یمنی کہلاتے ہیں اور شمالی بنی نزار - عہد نبوی صلعم میں بھی بہت سے یمنی قبائل عرصہ سے شمالی علاقوں میں آباد چلے آرہے تھے اور جنوب میں بنی نزار کے قبائل کے کچھ حصے - روایت چلی آرہی ہے کہ سدّ مآرب کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے یمنی قبائل خانماں برباد ہو کر شمالی اور درمیانی عرب میں جاکر آباد ہو گئے تھے - معلوم نہیں کہ یہ بات تاریخی حیثیت سے کہاں تک صحیح ہے اس لیے کہ جو سنین ہم تک پہونچے ہیں اُن سے ہم اس واقعہ کی صحت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے - بہرصورت نقل وطن کے کچھ نہ کچھ دیگر اسباب ضرور معاون ہوئے ہوں گے جنکی وجہ سے اور لوگوں کو بھی ترکِ وطن کرنا پڑا ہوگا -

خود مُلک عرب کی طبعی حالت، اونٹوں کو پرورش کرنے والے عربوں کو ہمیشہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے - وسطِ عرب کے شمال، مشرق اور جنوب کی طرف جو ریگستان ہے، وہ موسم باراں کے بعد غیر معمولی طور سے کوئی تین مہینے تک سرسبز و شاداب چراگاہ بنا رہتا ہے - انسان اور جانور آکر کثرت سے اس میں آباد ہو جاتے ہیں - لیکن جب زمین بنجر ہو جاتی ہے تو یہ لوگ اپنے اہل و عیال اور سامان کو لیکر پھر اپنے اپنے اصلی [illegible] جاتے ہیں - اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب انکے خاص علاقہ میں پورے قبائل کے [illegible] جاتی ہے تو قبائل کے چند حصے دوسرے علاقوں میں جاکر بعض اوقات زبردستی [illegible] بدو بہت ہی کثیر الاولاد

ہوتے ہیں اور حالات کی مساعدت میں خاندانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بہت ہی قلیل عرصہ میں ایک طاقتور قبیلہ بن جاتا ہے۔ پھر اس صورت میں قرب وجوار کے قبائل کے لیے ترک وطن ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ بدوؤں کا وہ جنوبی علاقہ جو رگستان اور ساحلی ریاستوں کے درمیان واقع ہے، محدود ہے۔ اس لیے جنوب کے باشندوں کو بہ نسبت شمالی باشندوں کے زیادہ دور جاکے آباد ہونا پڑا۔ عہد نبوی صلعم سے بھی صدیوں قبل طے کے طاقتور یمنی قبیلہ نے شمالی نجد میں ایک علاقہ فتح کیا تھا اور اس بنا پر قضاعہ کے قبائل کو شام کے مشرق اور جنوب میں جاکر آباد ہونا پڑا تھا۔ پس شمالی قبائل، جنوب کی طرف، صرف استثنائی حالات ہی میں نقل وطن کیا کرتے ہیں۔

جنوبی اور شمالی قبائل میں مخالفت کی، ممکن ہے، سب سے پہلی وجہ یہ ہو کہ آخرالذکر نے اول الذکر کو اپنے رسم ورواج اور معاملات میں مخل سمجھا ہو۔ جنوبی ریاستوں (یمن، حضرموت، عمان) کے باشندوں کے میل جول سے، شمالی باشندوں نے انکی زبان سیکھی اور شاید انکے رسم ورواج کی خصوصیات سے شمالی عرب مانوس نہ تھے، اس لیے وہ جنوب والوں سے ناراض ہوگئے۔ بعد میں یہ ناراضی بہت زیادہ بڑھ گئی یہاں تک کہ آخر کار اہل مدینہ، انصار (جو یمنی الاصل ہیں اور اہل مکہ قریش (جو نزاری الاصل ہیں) میں رفتہ رفتہ نسلی دشمنی قائم ہوگئی۔ یہی دشمنی عربی حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہوئی اور اب تک چلی آتی ہے۔

خاندان قبیلہ کی بنیاد ہوتا ہے۔ ایک عرب کے لیے قابل فخر یہ بات ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ تعداد میں مضبوط اور بہادر پوت پیدا کرے۔ انکے ذریعہ سے اس کا خاندان مشہور ہو کر، اپنے چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر بالادست ہو جاتا ہے جو اسکو اپنا بڑا (شیخ) سمجھتے اور اپنے تئیں اُس کا بچہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے افراد کا ایک قبیلہ بن جاتا ہے۔ اگر یہ قبیلہ طاقتور اور دولتمند ہے تو دوسرے کمزور قبائل بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر قبائل بھی اکثر امداد باہمی یا بڑی بڑی مہموں کو سر کرنے کے لیے آپس میں مل جایا کرتے ہیں۔ اس قسم کے قبائل کے مرکب یا مجموعہ کا ایک عمومی نام رکھ لیا جاتا ہے جو عموماً کسی خاص اور مشہور قبیلہ کے نام پر ہوتا ہے نیز یہ نام اکثر بلا سوچے سمجھے بھی رکھ لیے جاتے ہیں مثلاً بنی انمار یا بنی کلاب وغیرہ۔ تمام ماتحت قبائل کو ایک اپ یا ایک ماں کی اولاد کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ زمانۂ قدیم میں یمنی اور نزاری قبائل میں اتنی سخت دشمنی نہ تھی جتنی کہ بعد میں ہوگئی اس لیے اکثر خاص شمالی عرب کے قبائل میں ہمکو واقعی چند یمنیوں کے خاندان ملتے ہیں اور یمنیوں میں شمالی عرب کے خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔

محققین نے قحطان کو تمام یمنیوں کا مورثِ اعلیٰ بتایا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قحطان ایک مشہور و معروف قبیلہ کے نام سے اُس علاقہ میں اب تک موجود ہے جو جنوبی حجاز کے مشرق اور یمن کے شمال میں واقع ہے اور ریگستانِ اعظم تک چلا گیا ہے (بنیٹ نے قبیلہ قحطان کو اس علاقہ کا باشندہ بتایا ہے جس میں خوشبو کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ ہمارا قحطان بنیٹ کے (Kathan) سے مطابقت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اور میں اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا) اس علاقہ کے جنوب میں قبیلہ کہلان آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ سے یمنی قبائل کی دو نہایت مشہور شاخیں نکلی ہیں:

قبیلۂ کہلان سے (یہ دونوں جماعتیں) متعلق ہیں یا تھیں حسب ذیل ملاحظہ ہو:۔

۱۔ قبیلۂ طے تقریباً دو ہزار برس تک اجاء اور سلمیٰ کے پہاڑوں پر قابض رہا۔ اس قبیلہ کے دو افراد کے نام پر یہ دونوں پہاڑ اس نام سے مشہور ہوئے۔ شامی اور ایرانیوں نے اسی مشہور و معروف قبیلہ کے نام پر تمام عربوں کو طے کے نام سے یاد کیا۔ بنی طے کا ایک خاندان (شمر نامی) جب برسرِ حکومت آیا تو اس حکمراں خاندان کے نام پر اس علاقہ کے باشندے شمر کہلانے لگے۔ خاندان شمر کے جد اعلیٰ اجاء کے پہاڑوں میں توارن نامی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اسوقت عراق عرب میں صرف پانچ چھوٹے چھوٹے قبائل کو قبیلہ طے کے افراد کہا جاتا ہے جو حاکم شمر کے ماتحت ہیں لیکن ان لوگوں کو جزیہ نہیں دینا پڑتا اس لیے کہ یہ لوگ خاندان شمر کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں۔ قبیلۂ شمر کو ریگستانِ شام سے عنزہ کے قبیلہ نے نکال دیا تھا اور یہ لوگ عراق عرب میں جہاں وہ اس وقت حکمراں ہیں سترہویں صدی کے اختتام کے بعد آئے تھے۔

۲۔ ہمدان اور مذحج کے قبائل بہت عرصہ تک یمن میں آباد رہے۔ مذحج سے قبیلۂ بلحارث جو طائف کے جنوب مشرق میں آباد تھا، متعلق ہے۔ قبیلۂ سنجلہ کے افراد بھی مذحج ہی کی نسل سے ہیں۔ سنجلہ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق عرب کی تسخیر میں زیادہ حصہ لیا تھا۔

۳۔ بنی عاملہ اور بنی جذام کے قبائل فلسطین میں آباد ہوئے تھے۔ بنی لخم نے دریائے فرات پر حیرہ کی سلطنت قائم کی تھی۔ بنی کندہ صرف اپنے خاص وطن حضرموت میں برسرِ حکومت رہے بلکہ انھوں نے یمامہ میں بنو اسد پر بھی حکومت کی تھی (حکمراں) نے بادشاہ کا لقب بھی اختیار کیا تھا۔ مشہور و معروف شاعر امرا ان سے تھا۔

۴۔ ازد کے طاقتور قبیلہ نے (جس میں بہت سے ن فتح کر کے سرات کے

پہاڑوں میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ اسی قبیلہ کے ایک خاندان نامی غسان نے مشرق میں ایک حکومت قائم کی تھی۔ اس خاندان کی دوسری شاخیں خزاعہ کہلاتی ہیں جو کسی زمانہ میں مکہ پر حکمراں رہی تھیں۔ یثرب (مدینہ) میں جو دو قبیلے اوس اور خزرج (انصار) آباد تھے وہ بھی خزاعہ کی نسل سے ہیں۔

قحطان سے جو دیگر نسلیں چلی ہیں اُن میں محققین قبیلۂ حمیر کو سب سے پہلے جگہ دیتے ہیں۔ اس سے قضاعہ کا بڑا میل جول ہے۔ اور قضاعہ میں ہبرا اور تنوخ کے قبائل بھی شامل ہیں۔ یہ قبائل شمالی شام میں بہت زمانہ قبل آباد ہوئے تھے۔ جہینہ حجاز کی وادی اعظم میں آباد تھا اور اُس کا ہم رشتہ قبیلۂ عذراء اسکی نواح میں بسا ہوا تھا۔ قبیلۂ عذرا کے افراد عاشق مزاجی میں مشہور ہیں بنی کلب ریگستان شام میں آباد تھے اور قبیلۂ بلی شمالی حجاز میں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں بلی اور جہینہ کی بڑی بڑی جماعتیں مصر میں جاکر آباد ہوگئی تھیں۔

شمالی عربی قبائل اپنے اسلاف کے نام پر نزاری یا معدی کہلاتے ہیں۔ معدی کی نسبت روما کی تاریخ میں مذکور ہے کہ وہ قبائل کا ایک مجموعہ تھا اور نزاری کا پتہ ۳۲۸ء کے کتبہ سے چلتا ہے جسکو دسود نے النمارہ میں (حوران کے مشرقی جانب) صفا کے نواح میں دریافت کیا تھا۔ اس کتبہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امرء القیس بن عمرو "بادشاہ عرب" نے اسد اور بنی نزار پر حکومت کی تھی۔ اس کتبہ میں ایاد کے قبیلہ کا نام مذکور نہیں ہے جو کسی زمانہ میں بہت طاقتور تھا مگر اسلام سے قبل ہی معدوم ہو چکا تھا۔ قبیلۂ آیاد دو بڑی جماعتوں میں منقسم تھا۔ ایک کو ربیعہ کہتے ہیں اور دوسرے کو مضر۔ یہ دونوں گروہ عہد اسلام سے قبل ہی فنا ہو چکے تھے۔ نیز یہ دونوں حکمراں قبیلے تھے جو عراق عرب کو نقل وطن کر کے چلے گئے تھے، جہاں ان دونوں قبائل کے نام پر دو صوبوں کے نام بہت عرصہ تک قائم رہے۔ ایک صوبہ کا نام تو دیار ربیعہ تھا جو دریائے دجلہ پر آباد تھا، اور دوسرے صوبہ کا نام تھا دیار مضر جو دریائے فرات پر واقع تھا۔ بعد میں ان صوبوں پر بنی تغلب اور بنی نمیر کے قبائل قابض ہوگئے تھے۔

عنزہ اور اُسکے قریبی رشتہ دار قبیلۂ اسد کے افراد جو وادی رمہ کے شمال میں ایک دوسرے کے قریب قریب آباد تھے قبیلۂ ربیعہ سے متعلق ہیں۔ بصرہ سے مدینہ کو جو زائرین کی ٹرک جاتی ہے وہ اُنکے علاقہ میں سے ہوکر جاتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں عنزہ کے افراد، قضاعہ کو عرب سے نکال کر یہاں برسر حکومت رہے ہیں اور سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اُنھوں نے قریب قریب

تمام گیسان شام کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ شمال مشرق میں بنو سباعہ اور مغرب میں قبیلۂ رلہ کے افراد آباد تھے اور یہ دونوں قبیلے عنزہ سے متعلق تھے۔ عراق میں قبیلۂ اسد کے افراد اب تک موجود ہیں۔ اس قبیلہ سے وائل کا قریبی رشتہ ہے۔ وائل کی دو مشہور جماعتیں ہیں۔ ایک کو بکر کہتے ہیں اور دوسری کو تغلب۔ کلیب، وائل کے افراد پر حکمراں تھا، اسکے قتل کی وجہ سے بکر اور تغلب میں جو جنگ ہوئی اُس نے ان دونوں قبائل کو فنا کر دیا۔ چنانچہ بکر اور تغلب اپنے حلیف قبیلۂ نمیر کو لیکر عراق عرب کو نقل وطن کر کے چلے گئے تھے۔ بکر تو شمالی حصہ میں جاکر آباد ہوئے تھے جو انکی وجہ سے دیار بکر کہلایا۔ صدر مقام آمد اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ تغلب اور نمیر جنوبی علاقہ میں آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور اس وجہ سے انکو عہد اسلام میں دوگنا جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے قبائل میں بنو حنیفہ، یمامہ کے امراء اور وہ قبیلے جو شیبان کے پڑوس میں آباد تھے، بکر بن وائل سے متعلق ہیں۔ نیز عبد القیس کے افراد جو بحرین میں آباد تھے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی قبیلہ ربیعہ میں شامل تھے۔

مضر کے گروہ میں ابتداءً سب سے ممتاز قبیلۂ قیس ہوا۔ اس قبیلہ نے ایسی شہرت پائی تھی کہ اکثر تمام غیر یمنی عرب بھی اس قبیلہ سے متعلق کہلانے لگے تھے۔ اسوقت دریائے فرات پر قیس ایک چھوٹے سے نیم چرواہوں کے قبیلہ کا نام ہے جو حاکم شمر کو خراج ادا کرتا ہے۔ اس قبیلہ کے مشرقی جانب عدوان کا قبیلہ آباد ہے اور یہ بھی حاکم شمر کا ماتحت ہے۔ پہلے اس قبیلہ کے افراد فہم کے قریب آباد تھے اور ہذیل کا قبیلہ جنوبی حجاز میں آباد تھا۔ ہوازن اور سلیم کے قبائل بھی قیس ہی کے قبیلہ سے ہیں جو نجد کے مغربی حصہ سے لیکر مکہ اور مدینہ کے مشرقی علاقہ تک قابض و متصرف تھے۔ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے اوائل میں قبیلۂ سلیم اور اُنکے پڑوسی ہلال کے افراد کثرت تعداد کی بنا پر ایسے ضرر رساں اور مقدس مقامات کے لیے اس قدر خطرناک ہوگئے تھے کہ جبراً انکو مطیع کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ان دونوں قبائل نے مصر کو نقل وطن کرنے کا فیصلہ کر کے پہلے تو دریائے نیل کے دوآبہ میں جاکر آباد ہوئے پھر وہاں سے انکو شمالی مصر میں جبراً بھیجا گیا تھا۔ پھر ۴۴۴ھ ہجری میں انھیں فی کس ایک اونٹ اور ایک دینار دیے جانے کی ترغیب دیکر دریائے نیل کے پار شمالی افریقہ میں آباد کیا گیا تھا۔ حال [illegible] افریقہ کے بدوی عرب اکثر اپنے آپ کو انھیں دو قبیلوں کی نسل سے ہونے کے مدعی [illegible] تک وسط عرب میں موجود ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد امیر بن صعصعہ کے [illegible] تھے۔ جس سے

کلاب، قشیر اور عقیل کے افراد بھی علاقہ رکھتے تھے۔ قبیلہ عقیل نجد میں اب تک مشہور و معروف قبیلہ ہے۔ شام سے بغداد کو جو کاروان جاتے ہیں اُنکے لیئے زیادہ تر اونٹ اور حفاظتی دستے یہی قبیلہ مہیا کرتا ہے۔ عقیل کا ایک خاندان منتفق کہلاتا ہے جو چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں بھی طاقتور تھا اور اب بھی ہے۔ ان کا علاقہ دریائے فرات کے زیریں حصہ میں ہے۔

قبیلۂ غطفان بھی قیس کی ایک شاخ ہے۔ جماعت قیس کے دو خاص قبیلے عبس اور ذبیان باہمی جنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان قبیلوں میں یہ جنگ گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کے سبب سے ہوئی تھی جو "داحس اور غبرا کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ ذبیان کی خاص شاخ فزارہ تھی۔ غطفہ اور قیس کے قبائل بھی مضر سے متعلق تھے جو نجد کے ان علاقوں میں آباد ہو گئے تھے جن میں پہلے بکر اور تغلب جا کر آباد ہوئے تھے۔ تمیم کا بڑا قبیلہ تھا اور اُسکے افراد ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اس نام کے خالص بدو اب عرب میں موجود نہیں ہیں (گو تھوڑے سے دریائے دجلہ کے زیریں علاقہ میں آباد ہیں) تاہم نجد کے شہروں میں آبادی کی بیشتر تعداد اپنے آپ کو اس قبیلہ سے بتاتی ہے۔ نجد میں بڑے بڑے بدوی قبائل آباد ہیں جو تمام و کمال قبیلۂ مضر سے ہیں۔ ان میں قبیلۂ حرب (مزینہ) کے افراد حجاز کے مشرق میں دونوں مقدس شہروں کے درمیان والی سڑک پر آباد ہیں۔ انکے مشرق میں عتیبہ کا طاقتور قبیلہ آباد ہے ان دونوں قبائل کو وادی رمہ ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ان قبائل کے مشرق کی طرف مطیر کا قبیلہ آباد ہے۔ یمامہ کے مشرق میں بنو خالد بسے ہوئے ہیں اور یہ بھی مضر سے متعلق ہیں۔ وہابیوں کے عہد میں انکی شہرت جاتی رہی۔ قبیلہ ہذیل کے افراد بھی بالآخر قبیلہ مضر سے متعلق ہیں۔ ہذیل کے لوگ زمانۂ قدیم سے مکہ کے قرب و جوار کے پہاڑوں میں آباد چلے آرہے ہیں اور قبیلہ کنانہ بھی قبیلۂ مضر کی ایک شاخ ہے۔ کسی زمانہ میں کنانہ جنوبی حجاز کا بہت طاقتور اور مشہور قبیلہ تھا اور اس سے قریش کا قدیم حکمراں قبیلہ بھی متعلق ہے۔

اسلامی فتوحات نے بدوی دنیا کی کایا پلٹ کر دی تھی۔ بدو لوگ جنگ کے لیے بہت مضبوط فوجی دستے فراہم کیا کرتے تھے اور جب عراق اور شام میں پہلے پہل بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں تو ان فوجی مرکزوں کی امداد کے لیے مشرق اور مغرب میں دوسری چھاؤنیاں بھی قائم کر دی گئی تھیں جہاں بدوؤں کے اور امدادی فوجی دستے بھیجے جاتے تھے۔ اس بنا پر بعض قبائل ایسے کمزور ہو گئے کہ دوسرے قبیلوں میں شریک ہو کر وہ عرب میں اپنی خود مختاری کو کھو بیٹھے۔

ربیعہ اور مضر کے قبیلوں میں نسلہا نسل سے اس درجہ دشمنی چلی آرہی تھی کہ ربیعہ کے افراد

قبیلۂ مضر کے خلاف اکثر یمنی قبائل سے طالبِ امداد ہوا کرتے تھے۔

قبیلہ تمیم کے افراد کو، جو حجاز اور نجد میں منتشر طور سے آباد ہیں، خالص عربوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ بہت اچھے شکاری ہیں، جانوروں کے چھوٹے چھوٹے گلّے رکھتے ہیں اور اُن میں اکثر لوہار کا پیشہ بھی کرتے ہیں۔ اس قبیلہ سے شرارات کے افراد کو بھی منسوب کیا جاتا ہے جو ریگستانِ شام کے جنوب و مغرب میں آباد ہیں اور سواری کے اونٹوں کو پرورش کرنا انکا پیشہ ہے۔ انکے علاقہ سے آگے بڑھ کر صلیب کے افراد "ریگستان کے خانہ بدوش" بسے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کسیرے ہیں اور کم و بیش شکاری بھی۔ سواری گدھے پر کرتے ہیں۔ قدیم عربی ادب میں ان کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

ایک شریف بدوی ہنر کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسکے خیال میں جانوروں کو پرورش کرنا، تجارت کرنا، شکار کرنا ایسے پیشے ہیں جو انسان کو اختیار کرنا چاہییں۔ زراعت اور جہازرانی کو بھی وہ قابلِ توجہ نہیں سمجھتا۔ تمیم کے افراد ازد کے قبیلہ کے لوگوں کو اکثر حقارت سے "ملّاح" کہا کرتے تھے اس لیے کہ اُنکے خویش و اقارب عمان میں ملاحی کا کام کیا کرتے تھے۔ قریش بھی مدینہ والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اس لیے کہ اہلِ مدینہ زراعت پیشہ تھے۔ بدوؤں کی خاص خوراک دودھ ہے۔ دودھ کو پکا کر وہ اکثر دہی کی شکل جما لیا کرتے ہیں۔ جو پانی ملانے سے پھر اپنی اصلی صورت میں آجاتا ہے۔ اس قسم کا منجمد دودھ سفر میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔ گھی کو صاف کرکے اسی طرح رکھتے ہیں۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ بدوؤں کو پنیر بنانا نہیں آتا۔ بدو لوگ سولے اُن مواقع کے جبکہ اُنکو جانور مجبوراً ذبح کرنا پڑیں، اور وہ صرف دعوت یا مہمانوں کے لیے جانوروں کو ذبح کیا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ خوشحال بدو شیخ کے پاس اکثر و بیشتر مہمان آتے رہتے ہیں اس لیے اُسکے گھر والوں کو روزانہ گوشت کھانے کو مل جاتا ہے۔ گھی، اونٹ، اور بکروں کے اُون سے بُنے ہوئے کپڑے اور خاص کر اُس مقام کے جانور اور گھوڑوں کو (جہاں وہ پرورش کیے جاتے ہیں) بدو لوگ بازار میں لاتے اور اُنکا تبادلہ کھجور، غلّہ، کپڑوں اور گھر کی روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے کرکے لے جایا کرتے ہیں۔ اب کافی اور تمباکو کا استعمال بدوؤں کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ پرانے سے پرانے خیال کے لوگوں کو بھی دنیا کی موجودہ روش کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ گمان کی جگہ اب بدوؤں نے لے لی ہے۔ جب تک وہابی لوگ برسر ت میں تمباکو نوشی کی سخت ممانعت رہی۔

بدوؤں نے تجارت میں بڑے پیمانہ پر، صرف قافلوں سے۔ یہ اونٹوں کی فراہمی اور دشمن

کے حملوں سے اُنکو محفوظ رکھنے کی حد تک، حصہ لیا تھا۔ اس خدمت کے لیے انکو معاوضہ ملا کرتا تھا۔ اب بھی طاقتور بدوؤں کو، جو شاہراہوں پر آباد ہیں حکومت کی طرف سے "تمغیاں" یا معاوضہ ملا کرتا ہے۔ شہری لوگ جو ان بدو قبائل کے علاقہ میں سفر کرتے ہیں تو انکو (Brokkaroo) "اخوۃ" کا عہد و پیمان ان بدووں سے لازمی طور پر روپیہ کے ذریعہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ کمزور قبائل کو بھی اپنی حفاظت کے لیے اس "اخوۃ" کو مول لینا پڑتا ہے۔

شکاری کتوں اور شکروں کے ذریعہ زیادہ شکار کھیلا جاتا ہے۔ بڑے شکاروں میں یہاں ہرن، پہاڑی بکرے، جنگلی ہرن (جنکے وزنی اور سیدھے سینگ ہوتے ہیں) اور صحرائی گدھے ہوتے ہیں۔ عرب لوگ جنگلی گدھے کا خاص طریقے سے شکار کرتے ہیں۔ یہ جانور بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ ہر شخص کا یہ ہی مقصد ہوتا ہے کہ خاص طور پر جنگلی گدھے ہی کا شکار کرے۔ چھوٹے شکاروں میں چند قسم کے تیتر، خرگوش، اور ایک قسم کی چھپکلی (رگوہ) ہوتی ہے جسے عرب کھاتے ہیں۔ شتر مرغ کا شکار خاص طور سے مہتیم اور صلیب کے افراد کرتے ہیں۔ یہ جانور اب عرب کے شمالی ریگستان میں رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

حملہ آور ہونا، بدووں کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی امیہ کے ابتدائی زمانہ میں ایک شاعر القطامی نے کہا ہے کہ "ہم حملہ کر بیٹھتے ہیں ضباب (مضاریوں) کے خیموں پر اور پھر انکو وہی واقعات پیش آجاتے ہیں جنکو آنا چاہیے اور بعض وقت ہم لوٹ لیتے ہیں بکر (بن وائل) پر جو ہمارے ہی بھائی ہیں"۔ ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ بدووں کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی قبیلہ کے اونٹ، عورتوں اور بچوں کو پکڑ لیجائیں، اگر دشمن کے ہوں تو سب سے بہتر ہے اور جہاں تک ممکن ہو خونریزی نہ کی جائے تاکہ انکے قتل سے لڑائی نہ پیدا ہو۔ عورتیں اور بچے رہا کیے جاسکتے ہیں، مال غنیمت کو مقررہ قوانین کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ شیخ کو چونکہ قبیلہ کی عظمت قائم رکھنی پڑتی ہے اور اسکے لیے ذرائع بھی ضرور ہونے چاہییں اس لیے اسکو بڑا حصہ ملتا ہے۔ برخلاف اسکے لٹے ہوئے قبیلہ کے افراد کو نقصان کی تلافی کرنی پڑتی ہے اور اس نقصان کی تلافی میں شیخ سے زیادہ حصہ کی توقع ہوتی ہے۔ خصوصاً انھیں حملوں کے لیے گھوڑوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ حملہ میں حصہ لینے والے افراد اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں، لڑائی یا پسپائی کے وقت گھوڑوں پر سواری کیجاتی ہے ہر ایک اچھا گھوڑا اپنے آقا کے لیے باعثِ فخر ہوتا ہے لیکن اُسکے لیے زیادہ خرچ برداشت

کرنا پڑتا ہے - یہ بات صرف اس واقعہ ہی سے سمجھ لو کہ اُسکو ہر وقت اپنے گھوڑے کے لیے لازمی طور پر افراط سے پانی مہیا رکھنا پڑتا ہے - قزاقانہ تاختیں بالکلیہ ریگستان کے باشندوں کے افلاس کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہیں - یہ لوگ اکثر دُور دراز کے مقام پر حملہ آور ہوتے ہیں، اس لیے انسانوں اور جانوروں کو یہاں تک کا سفر تھکا دیتا ہے - جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر وہ گھر کی طرف، دشمن کے تعاقب سے بچنے کے لیے بے تحاشہ بھاگتے ہیں۔ اس طریقہ سے نہ صرف حملہ آور بلکہ غنیمت میں آئے ہوئے انسانوں اور جانوروں کا بھی بہت نقصان ہوتا ہے - اگر تعاقب کنندگان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تب بھی اُنکو اور اُنکے جانوروں کو جلد جلد منزلیں طے کرنے میں نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے - نیز ان خوش قسمت افراد کو دوسری طرف سے بھی حملہ ہونے کا خوف لگا رہتا ہے - ان اسباب کی بنا پر ایک کمزور قبیلہ کو مجبوراً کسی طاقتور قبیلہ میں شریک ہو جانا پڑتا ہے - ان حملوں کے نتائج اکثر خطرناک بھی ہوتے ہیں مثلاً اگر خونبہا ادا نہ کیا جائے یا کوئی قبیلہ اسکو منظور نہ کرے تو پھر خون کا بدلہ لینے کے لیے جنگ چھڑ جاتی ہے جس سے پورا قبیلہ فنا ہو جاتا ہے -

کسی قبیلہ کا سیّد (آقا) یا شیخ (بڑا، گو یہ اکثر جوان آدمی ہوتا ہے) اپنے قبیلہ کے سیاہ و سپید کا قطعی ذمہ دار ہوتا ہے - اسکے عہدہ یا رتبہ کا مسئلہ موروثی نہیں ہے - جب تک اُسکے لڑکے قابلیت اور دولتمندی میں بڑھے ہوئے رہیں اُسوقت تک یہ عہدہ اُسی کے خاندان میں رہتا ہے - قاعدہ کے مطابق، لڑائی کے وقت، امیر قبیلہ فوج کا افسر یا قائد ہوتا ہے - قائد کو اب عام طور پر عقید کہتے ہیں - آمیر کا خطاب صرف حاکم صوبہ کے لیے مخصوص ہے مثلاً حاکم شمر - علاوہ اس کے شیخ، منصف یا قاضی بھی ہوتا ہے اور اُسکا عہدہ عموماً موروثی ہوتا ہے - مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے جو شریعت اسلامی سے اس حد تک مطابقت کرتا ہے کہ شریعت اسلامی کی قانونِ رائج الوقت سے مطابقت ہو جائے - لیکن چونکہ شیخ صرف مشورہ دیتا ہے، وہ کوئی حکم صادر نہیں کرتا اس لیے قاضی کا فیصلہ صرف اخلاقی حکم کی نوعیت رکھتا ہے -

قبیلہ کے استحکام اور پورے قبیلہ کے ہر واحد رکن کی ذ... نظر رکھ کر، امیر قبیلہ کو نگرانی کے لیے ایک قسم کی پولیس بھی رکھنی پڑتی ہے - اگر قبیلہ ... حرکت کر بیٹھے جو قبیلہ کے لیے ناقابل برداشت ہو، یا یہ کہ وہ اپنے ہی قبیلہ ... اسکو قبیلہ سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی دوسرا قبیلہ اُسکو جگہ نہ دے تو پھر ... میں رہتا - قبیلہ کے

استحکام اور اُسکے قیام و ترقی کے فرائض میں حتی الوسع دلچسپی رکھنے کے احساس کو عصبیہ کہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ احساس فرقہ واری جھگڑوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کے انتہائی تخیل کے حد تک بدو لوگ معاملہ کے پکے اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں یہ لوگ نہ صرف بے پروا بلکہ غافل اور بے اعتقاد بھی ہیں۔ جس مقام پر وہابیوں کا تھوڑا سا بھی اثر رہا وہاں کم از کم بیرونی طور پر احکام اسلامی کی تعمیل کی جاتی رہی مثلاً جس طرح اب نجد میں کیجاتی ہے برخلاف انکے مستقل طور پر سکونت رکھنے والے عرب مذہبی ہیں اور اُن میں آسانی سے مذہبی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

بدوؤں کے اکثر ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔ جب پہلی بیوی بانجھ ہو جاتی ہے تو حسب قاعدہ وہ دوسری کر لیتے ہیں۔ مگر پہلی بیوی کو طلاق دینا پسند نہیں کرتے۔ شیوخ کے اکثر تین یا چار بیویاں ہوتی ہیں۔ اکثر وہ اتنی بیویاں سیاسی وجوہ سے کر لیتے ہیں تاکہ با اثر خاندان سے انکا تعلق رہے اور بعض اوقات عورت کو پرورش کی خاطر بھی اپنے نکاح میں لے آتے ہیں مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی اکثر بارہ برس کی عمر میں شادی کر دی جاتی ہے۔ اسوجہ سے، اور چونکہ عورتیں بچے کو دو یا تین برس تک دودھ پلاتی رہتی ہیں، جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ علاوہ اسکے اُنکو کام بھی بہت کرنا پڑتا ہے مثلاً وہ جلانے کا ایندھن فراہم کرتی اور پانی بھر کر لاتی ہیں، جانوروں کا دودھ نکال کر مکھن بنانا پڑتا ہے، عموماً کھانا پکاتی ہیں، خیمے، کمبل، اور کپڑے بُننے پڑتے ہیں۔ اُن سے ذرا دولتمند عورتیں نوکروں سے گھر کا کام کاج کراتی ہیں، تاہم بدوی عورتوں کی حالت شہری عورتوں سے بہت بہتر ہوتی ہے اس لیے کہ بدوی عورت آزادانہ طریقہ سے زندگی بسر کرتی اور عموماً اُسکی عزت کی جاتی ہے۔ قبیلہ کی نیک عورت (کریمہ) کو لوگ بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بڑی بوڑھی عورتوں کو ضروری معاملات کے فیصلہ میں کافی دخل رہتا ہے۔ عام طور پر برقع نہیں اوڑھا جاتا۔ بچوں کو بہت ہی سادہ طریقہ سے پرورش کیا جاتا ہے لیکن غیر تربیت یافتہ سے غیر تربیت یافتہ قبائل کے بچے بھی اپنے ماں باپ کے فرماں بردار اور اپنے سے بڑے کا احترام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

تمام مسافر متفقہ طور سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بدوؤں میں فطرتی طور سے عظمت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ خلیق اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور عام طور پر فیاض۔ یہ ہی انسانی برتری کا راز ہے اور اسکو عرب لوگ مروہ (نیکی) کہتے ہیں۔ مالِ غنیمت کے حاصل کرنے

میں تو یہ لوگ بہت تیز ہیں مگر چوری انکی نظر میں جُرم ہے - بدو، مہمان نواز ہوتے ہیں گو اکثر اسوجہ سے بھی مہمان نوازی کرتے ہیں کہ انکے مہمان انکی تعریف کیا کریں - ایک دولتمند عرب کا انتہائی نقطۂ خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ مشہور و معروف آدمی بنجائے، لوگ اُسکو شریف کہکر ہر جگہ اُسکی تعریف میں رطب اللساں ہوں، اُسے بہادر اور فیاض مشہور کریں، ہر شخص اُس سے ڈرے اور اُسکی تعریف کرے۔

رگستان کے اطراف کی تمام ریاستیں بدوؤں کے نواح سے ہر وقت خطرے میں رہتی ہیں - ان ریاستوں کو قوی بننا پڑتا ہے تاکہ بدووں کو اُنکے علاقہ میں بلا اجازت آنے کی جرأت نہ ہو - اگر یہ ریاستیں کمزور ہیں تو اُنکو امن و امان خریدنا پڑتا ہے، اور اگر اُنھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر بدو لوگ لازمی طور پر انکی سرحدوں کو عبور کر کے ملک کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں مزروعہ زمینوں کے بڑے بڑے رقبے پھر چراگاہیں بن جاتی ہیں - مثلاً جس طرح اسوقت عراق کا بڑا حصہ اور ریاض و حلہ کے آگے کے علاقے چراگاہیں بنے ہوے ہیں - یا یہ ہوتا ہے کہ سرحد پر پھر عربوں کی نئی حکومتیں قائم ہو کر تدمر اور حیرہ کی قدیم حکومتوں کے مانند یا شام والی غسانیوں کی حکومت کی طرح، متمدن سلطنتیں بن جاتی ہیں - یا ایسی سلطنت قائم ہو جاتی ہے جیسی کہ بنی لخمیون کی حکومت، عراق میں، عہد اسلامی سے کچھ زمانہ قبل قائم ہوئی تھی - عرب کے اندرونی علاقہ میں، وہابیوں نے اپنی سلطنت میں اچھا نظم و نسق قائم کر لیا ہے - حاکم شمر کا نجد اور رگستان کے جنوبی حصہ میں بدووں پر اچھا خاصا اثر ہے - سرحدی علاقوں میں بدو لوگ عموماً نصف خانہ بدوشی کی حالت میں ہیں - وہ یا تو چرواہے ہیں یا جانوروں کو پرورش کرنا اُنکا پیشہ ہے، اب بالآخر اُنھوں نے زراعت کا کام بھی شروع کر دیا ہے - یہ اُلٹی ترکیب کہ کاشتکار خانہ بدوش بھی ہو جاتے ہیں بہت ہی کم واقع ہوتی ہے اس لیے کہ رگستان میں انکی زندگی بہت ہی مشکل سے بسر ہوتی ہے اور اور اُنکو نقصان بھی بہت برداشت کرنے پڑتے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ رگستان میں تو صرف بدو لوگ ہی رہ سکتے ہیں جنکو قدرت نے ایسا ہی بنایا ہے۔

دوسرے قبائل کے ساتھ متحد ہو کر، تعلقات کو مضبوط و مستحکم کرنے کا خیال عام طور پر پیدا ہوتا ہے مگر اسکی تکمیل نہیں ہوتی - اس لیے کہ ایک ہی قبیلہ نہیں رہتا - صاحب حکومت کو اس وجہ سے بہت آسانی سے موقع مل جاتا ہے میعاد مقررہ کے اندر ان سرکش قبائل کو یکے بعد دیگرے مفتوح و مغلوب کر ذاتی کی وجہ سے وہ کسی مشترکہ مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی اپنی فوج سے ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے - مسلمہ خرابیاں

جو استحاد عمل سے بآسانی رفع ہوسکتی تھیں، سالہا سال تک باقی رہتی ہیں اور پھر لوگ خود خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

عربوں کا باورچی خانہ بہت سادہ ہوتا ہے۔ پہلے انکی روزمرہ کی خوراک، آٹے کا مرکب یا بھنا ہوا اناج اور کھجور یا دودھ کا مرکب ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ عموماً ہر غول (فارسی لفظ ہے) کھاتے ہیں۔ یہ بھنے ہوئے گیہوں یا ہندوستانی اناج کا ہوتا ہے۔ اسکو پانی میں ڈال کر اُبال لیتے ہیں۔ جب کوئی معزز مہمان آتا ہے تو وہ اس کھانے کے اوپر مکھن، گھی، یا کچا دودھ ڈال دیتے ہیں۔ یا بعض وقت پکا ہوا گوشت بھی اُسکے اوپر رکھدیتے ہیں۔ گیہوں کی بہت پتلی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ دودھ بہت پیا جاتا ہے۔ حصول فرحت کی خاطر کچا دودھ بھی پیتے ہیں۔ بہت سے عربوں کی خاص خوراک کھجور ہے۔

عربوں کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا ہے۔ غربا، صرف قمیص پہنتے اور اُسکے اوپر پٹی باندھکر عبا پہن لیتے ہیں۔ ذرا متمول عرب قمیص (جو ایک قسم کی کفتان ہوتی ہے) پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں اسکے اوپر دھاریدار صدری پہنی جاتی ہے۔ اکثر لوگ اس کے بجائے پوستین پہنتے ہیں۔ غرب لوگ عمامہ باندھتے ہیں جسکا نام کوفیہ ہے (اب عموماً اسکا تلفظ کفیہ کیا جاتا ہے) کیفیہ بالعموم سر پر باندھا جاتا ہے یہ ایک کپڑے کا ٹکڑا ہوتا ہے جو کالے فیتہ کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ عرب پاجامہ نہیں پہنتے صرف متمول عرب جوتے اور زیرپائی پہنتے ہیں۔ پانی عموماً کمیاب ہے۔ اس لیے کپڑے نہیں دھوئے جاتے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے عرب لوگ پابندی سے اپنے جسم کو نہیں دھو سکتے۔ جب کسی عرب کو کوئی تالاب مل جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ نہاتا ہے لیکن چونکہ ایسا واقعہ کم پیش آتا ہے اسلیے شریعت اسلامی نے ریگستان کے باشندوں کو پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی سے تیمم کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

ہر قبیلہ اپنے اونٹوں کی پہچان کے لیے ایک خاص علامت مقرر کردیتا ہے جس سے ہر شخص اُنکو شناخت کرلیتا ہے۔ اسی قسم کی علامت اکثر قبیلہ کے علاقہ کی شناخت کے لیے چٹانوں پر بنا دی جاتی ہے۔ جو عرب لکھنا جانتے ہیں وہ اس علامت کے قریب اپنا نام کچھ اضافی عبارت کے کے ساتھ یا فقط نام لکھ دیتے ہیں۔ پہلے عرب مصوری کرتے تھے مگر اسکو دیکھ کر اُنکی ذہانت کے متعلق کوئی اعلیٰ درجے کی رائے قائم نہیں ہوتی۔ نہ انھوں نے فن تعمیر کو اعلیٰ پیمانہ پر حاصل کیا۔ البتہ عربوں نے فن زیبائش میں بہت زیادہ کمال حاصل کیا اور فن موسیقی کی طرف بھی متوجہ ہوئے تھے مگر اسلام نے اسکو اچھا نہیں بتایا ہے۔ یہ لوگ تقریر کے مالک ہوتے ہیں اور اس فن میں

اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے

تاریخ قدیم عرب کے متعلق عہد اسلامی سے قبل اور اس سے بھی بہت پہلے یعنی عہد مسیحی سے بھی قبل ہمیں جو کچھ علم ہے وہ قدرتی طور سے دو خاص حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ کا خالص تاریخی واقعات سے تعلق ہے اور دوسرے کا غالباً تمدن اور مذہب سے۔

تاریخی حیثیت سے ہمیں جو علم ہے، وہ کچھ تو ملک کے کتبات سے معلوم ہوا ہے، کچھ معاصرین کی ان اطلاعات سے جو وہ ادبیات میں تحریر کر گئے، کچھ دیگر اقوام کی دیگر یادگاروں (مثلاً بابلی، اسیری، مصری، عبرانی، یونانی اور رومانی) سے اور کچھ (بعثت نبوی سے قریب ہی قبل کی صدیوں کے واقعات سے متعلق) عہد اسلام کی ابتدائی روایتوں سے بھی معلوم ہوا ہے۔ اگر (معلومات کے متعلق) ہمارے ذرائع زیادہ مکمل ہوتے اور خصوصاً علم تواریخ زیادہ قابل یقین ہوتا تو پھر ہم ایک ہزار برس قبل مسیح کے بعد سے یا اس سے بھی پہلے کے زمانہ سے غالباً ایسی تصویر پیش کرتے جو کم و بیش تاریخی معلومات سے پُر ہوتی لیکن ہم کو یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ ہم جنوبی عرب کے بہت سے کتبات کی گذشتہ تاریخ کے متعلق کہاں تک لکھ سکتے ہیں۔

عہد مسیحی سے دو ہزار برس سے بھی قبل کے بابلی کتبوں میں ایک بادشاہ کا نام منیم (مَنَیم) لکھا ہوا ہے جو (Magan) یا مشرقی عرب کا بادشاہ تھا۔ (اسکے نام کی زیادہ مکمل صورت منو۔ دنو بھی ہے)۔ اس خیال کے متعلق زیادہ تر یہ کہا جا سکتا ہے کہ (Magan) سمیری زبان کا لفظ تھا جسکو عربی میں معان بنا لیا گیا اور یہ کہ اسی مرکز سے (ایک ایسے زمانہ میں جس کا ہمیں علم نہیں) معان والی جنوبی عربی سلطنت قائم ہوئی تھی (جو بعد میں مَعِین کے نام سے مشہور ہوئی تھی) یا ممکن ہے کہ یہ معینی سلطنت ہو، جس نے غالباً شروع ہی میں تمام جنوبی عرب کے علاقہ کو (بشمول قتبان اور حضرموت) اپنی مملکت میں شریک کر لیا ہو۔ اسکے علاوہ ان کتبوں میں مَلُخ (ی) ایک علاقہ کا بھی ذکر ہے جو اس ریاست سے آگے واقع تھا اور اس علاقہ میں غالباً وسطی اور شمالی عرب شامل تھا۔ مَلُخ کے علاقے نیز سرزمین (Magan) سے سمیریوں نے (تقریباً ۲۳۵۰ قبل مسیح یہ) لکڑی، پتھر، اور دھاتیں بڑی مقدار میں اپنے مندروں کی تعمیر کے لیے منگائی تھیں۔ ہربرٹ گرم نے مَلُخ کے نام کی نسبت لکھا ہے کہ (جو مضر و نام مخلوق کی ناموزوں جمع ہے)۔ اُسکا یہ خیال قا کے تعلیق سے ماخوذ ہو تا۔

جنوبی عرب کے کتبات کا آغاز کم از کم ۸۰۰ برس قبل لیکن بہت غلب

ہے کہ اس سے بھی چند صدی پیشتر سے ہو۔ ان کتبات سے زیادہ صحیح معلومات، نہ صرف علم صرف و نحو کے متعلق حاصل ہوتی ہیں بلکہ خصوصاً اصل مضمون کے بارے میں بھی ان سے صحیح واقعات کا پتہ چلتا ہے یعنی نہ صرف ان میں عہد اسلام سے قبل کی تاریخ کے صحیح واقعات مندرج ہیں بلکہ انکو دیکھ کر سامی آثار کے متعلق بھی نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان آثار قدیمہ سے صحیح صحیح واقعات جو گذشتہ نصف صدی تک بہت ہی نایاب تھے (مگر اب ان کے متعلق ہمارے پاس تقریباً دو ہزار کتبے موجود ہیں) سب سے زیادہ ہمیں جوزیف ہالوی اور ایڈورڈ گلیسر کی سائنٹفک تحقیق تلاش سے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتبات منطقی طور سے دو بڑی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ صحیح معنوں میں کچھ کتبات تو معینی جماعت سے متعلق ہیں اور کچھ جماعت سبا سے۔ جو کتبے معینی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بہت سے کتبے تو نہ صرف شاہان معان کے عہد کے لکھے ہوئے ہیں (نام کے متعلق اوپر کا بیان ملاحظہ ہو) جن کے صدر مقامات قرناؤ اور ثیل، جوف کے جنوب میں جدا جدا واقع تھے (قرناؤ تو صنعا کے شمال مشرق میں تھا اور ثیل، مأرب کے شمال مغرب میں)۔ بلکہ ان میں شاہان قتبان کے عہد کے کتبے بھی زیادہ تعداد میں ہیں جن کو گلیسر نے دریافت کیا تھا اور چند کتبے حضرموت کے ہیں جو اب تک دریافت ہوسکے۔ حضرموت کے دریافت شدہ کتبات کو ساتھ رکھ کر مقام شبوت کو جانا چاہیے، اس لیے کہ یہ اطلاع ملی ہے کہ وہاں اب بھی سیکڑوں کتبات دریافت کرنے کو باقی ہیں۔ یہ مقام حضرموت کا قدیم صدر مقام تھا اور یہاں بغرض تحقیق و دریافت کتبات کوئی اب تک نہیں گیا۔ برخلاف اسکے جو کتبات جماعت سبا سے متعلق ہیں وہ صحیح معنوں میں سبا کے مذہبی بادشاہوں (کرب یا کروب یا مکرب یا مکرب) کے عہد، تقریباً ۷۰۰ - ۵۰۰ قبل مسیح میں لکھے گئے ہیں (یہ قدیم شاہان سبا کا زمانہ ہے اس میں مطلق العنان شاہی کا پہلا عہد بھی شریک کرسکتے ہیں)۔ مطلق العنان بادشاہت کا زمانہ تقریباً ۵۰۰ - ۱۱۵ قبل مسیح تک رہا۔ اس زمانہ میں سرکاری حیثیت سے مأرب کے بادشاہ "شاہ سبا" کا لقب اختیار کرتے رہے۔ انکے بعد کے بادشاہ صرف قتبان اور حضرموت کے بادشاہ رہے۔ انکے بعد حمیریوں کا نیا عنصر نمودار ہوا جنھوں نے غالباً پہلے قتبان پر قبضہ کیا اور پھر مأرب کے ہوگئے تھے۔ انکے بادشاہ نے "شاہ سبا" اور "ذوریدان" کا لقب اختیار کیا تھا۔ تقریباً ایک چھوٹے سے حملہ کے بعد سے جو چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں ہوا تھا حکومت کرتے رہے ۳۷۵ عیسوی سے ۵۲۵ عیسوی تک اپنے بڑے خطابات کے ساتھ۔

یہاں تک کہ وہ اکسومیوں سے مغلوب ہوگئے۔ ان بادشاہوں کے عہد کے متعلق بھی ہمارے پاس جنوبی عرب کے قدیم کتبات موجود ہیں۔ خصوصاً سدّ مآرب کے ٹوٹ جانے کا واقعہ ایک بہت ہی قدیم قدیم کتبہ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کتبہ کو گلیسر نے دریافت کرکے شایع کرایا ہے۔ اسکے سنین ۵۴۳-۵۴۲ء سے مطابقت کرتے ہیں اور یہ کتبہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے:۔

"بہ قدرت و فضل و عنایت رحمانی و مسیح و روح القدس، اس کتبہ کو ابرہا، گورنر نے نصب کرایا ہے جو (گورنری پر) متعین تھا منجانب اکسومی بادشاہ رہیس زبیان (Zubirqaman) شاہ سبا اور ذوریدان اور حضرموت اور یمانت اور اُن عربوں کا جو بلندی اور پستی کے علاقوں میں رہتے ہیں"

اس کتبہ میں اور دوسری باتوں کے علاوہ اُن سفارتوں کا حال بھی لکھا ہے جو شاہ روم، شاہ فارس، شاہ المنذر، شاہ حارث اور بادشاہ ابوکرب نے بھیجی تھیں۔ عہد نبوی صلعم سے تھوڑے زمانہ قبل جو دو بڑی سلطنتیں تھیں یعنی روم کی مشرقی سلطنت اور مملکت فارس، ان کا ذکر بھی اس کتبہ میں موجود ہے اور ان دونوں حریف قوتوں نے عرب کی سرحد پر حیرہ اور غسانیوں کی حکومتوں کو بطور چوکیوں کے قائم کیا تھا، اُنکا حال بھی لکھا ہے اور ان تمام حکومتوں کے مفاد اور باہمی اتحاد و تعلقات پر بھی پوری پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔

حبشیوں کے عہد حکومت میں مذکور الصدر ابرہا نے نہ صرف حمیریوں کے آخری فرمانروا ذونواس کو شکست دیکر معزول کیا بلکہ سیدھا مکہ کی طرف اپنے مشہور ہاتھی کو لیے بڑھا ہوا چلا گیا۔ اسکے بعد تقریباً ۵۷۵ء میں فارس کے بادشاہ خسرو اول نے یمن کو فتح کرکے، اپنے ایک وزیر کو وہاں کا گورنر (حاکم) مقرر کیا تھا۔ لیکن آخرکار اسلام کی فتحمند قوت کے سامنے یمن بھی فتح ہو گیا تھا۔ خسرو پرویز ثانی نے فارس کی طرف سے جو آخری گورنر مقرر کیا تھا اُس کا نام باذان تھا۔ اسنے حسب مذکور کی وفات (۶۲۰ء عیسوی) کے بعد اسلام قبول کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیا تھا۔

حکومت سبا کے آغاز کا زمانہ ۷۰۰ قبل مسیح کے زیادہ بعد نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ (علم الآثار کے بہت سے نامکمل مواد سے جو واقفی کسی زمانہ بادشاہوں کے ناموں کی پہلے تحقیق کرچکے ہیں اُن کا ذکر تو اب یہاں کر بھی نہیں وقت میں اکثر باپ، بیٹے، اور بھائی برسر حکومت رہے اس پر بھی ہم کتبوں۔ ں کے سلسلے قائم کرسکے

ہیں (اکثر دادا، باپ، بیٹے اور پوتے کے سلسلے میں) اور ہر عہد کے متعلق تاریخی واقعات بھی ہم پہونچا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر واقعات قدیم سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ چار یا اس کے قریب کی حکومت کا سلسلہ اوسطاً ایک صدی کو پورا کر دیتا ہے۔ لہٰذا مذکورالصدر تخمینوں (قدیم شاہان سبا کے بعد ۷۰۰ ... ۵ ق م وغیرہ) کو غالباً کم سے کم سنین سمجھنا چاہیے خصوصاً (اور یہ زمانہ واقعی شاہان سبا اور ذوریدان کے دوسرے دودور پر عائد ہوتا ہے) اس وجہ سے کہ ہمیں اب تک تمام بادشاہوں کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ پس بحالت موجودہ اس سے صرف کم یا بیش نقص نتائج نکل سکتے ہیں۔

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معینیوں کے شاہی کتبات تاریخ کے کون سے سلسلہ میں سبائیوں کے شاہی کتبات سے مطابقت کرتے ہیں۔ اب سے ذرا کچھ زمانہ قبل ڈی۔ ایچ مُلر نے ان دونوں کتبات کے ہمعصر ہونے کے امکان کا خیال ظاہر کیا تھا۔ گلیسر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ شاہان معینی کا عہد شاہان سبا سے پہلے گذرا ہے (اور یہ کہ سبا کے پرستار بادشاہوں سے بھی پہلے یہ حکمراں رہے ہیں)۔ ہوگو وِنکلر اور راقم الحروف کی تحریر کا ماخذ خصوصاً گلیسر ہی کی کتاب ہے۔ پس یہ ایک قیاس ہے جسکی بنا پر قدرتی طور سے شاہان معینین کی حکومت کے متعلق ذرا زیادہ قبل کا زمانہ (۱۲۰۰ - ۷۰۰ ق م) پیشتر ہی سے فرض کر لینا پڑتا ہے) مگر اسکے باوجود بھی بعد میں ان دونوں کے ہمعصر ہونے کے قیاس کی بھی بہت سے عالموں نے تائید کی ہے۔ اور خاص طور پر، ماہر زبان عربی مارٹن ہارٹ مین اور مورخ ایڈورڈ میر نے اس قیاس کی حمایت میں زور قلم صرف کیا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہارٹ مین اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ شاہان معینی کا بہترین زمانہ شاہان سبا کے عہد سے پہلے گذرا ہے اور پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نہایت قدیم معینی اور سبائی کتبات ایک ہی زمانہ کے ہیں اور اس خیال کی تائید میں بوضاحت لکھتا ہے کہ معینیوں کا ایک کتبہ سبائی کتبہ کا ہم عہد ہے اور اس کتبہ میں یہ مذکور ہے کہ اہل معین، مصر، اعشور، اور عبر نہران سے خوشبو کی چیزوں کی تجارت کیا کرتے تھے اور اسی کتبہ میں ۵۲۵ قبل مسیح کی اس جنگ کا حال بھی درج ہے جو مصر اور ایک قوم نامی (Mahay) کے درمیان ہوئی تھی۔ اس نے (Mahay) قوم کے افراد کو ایرانی بتایا ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ معینیوں کے سب سے پرانے کتبات، سبائیوں کے نہایت قدیم کتبات کے ہم زمانہ ہوں۔ اس اعتبار سے ہمیں معینی کتبوں میں جنکو دیگر

وجوہ سے بھی سب سے بعد کے سمجھتا ہوں، ایسے سبائی افراد کے متعلق اشارات ملتے ہیں جو پہلے
مین میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک قدیم معینی کتبہ کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے
کہ جماعتِ سبا کے افراد (خولان کے ایک اور دوسرے قبیلہ کے ساتھ مل کر) شمالی یمن میں آوارہ
پھرا کرتے تھے یہ لوگ اس عام سڑک پر چلنے والے معینی قافلوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے جو
رجران) (Raqmat) اور سبان کے درمیان تھی۔ اسیریوں کے شاہی کتبوں سے یہ بھی
ظاہر ہوتا ہے کہ ۷۰۰ قبل مسیح سے کچھ زمانہ قبل سبا کا ایک بادشاہ نامی تیمرہ گذرا ہے۔ کتبہ
کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ وسطِ عرب میں رہا کرتا تھا۔

ممکن ہے کہ شاہان معین نے اپنے عطر کی تجارت کی حفاظت کے لیے مدین کی سرزمین میں
ایک نوآبادی قائم کر دی ہو۔ اس نوآبادی کا نام کتبات میں مُصران لکھا ہے۔ اس واقعہ کی تصدیق
اُن معینی کتبات سے ہوتی ہے جنکو یوٹنگ نے (مقام) العُلا میں دریافت کیا ہے۔ معینی حکومت
کے خاتمہ کے بعد (تقریباً ۱۱۰ ق م میں) غالباً اہل سبا، معینیوں کی مدین والی اس نوآبادی
کے وارث قرار پائے ہونگے۔ ہربات اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ لحیانیوں کا عہد شمال مغربی
عرب میں معینی سبائی عہد کے بعد شروع ہوا اور یہ کہ نبطیوں کے عہد حکومت سے قبل شاہان لحیانی
برسرحکومت رہے اس لیے اُنکا زمانہ تقریباً ۵۰۰ - ۳۰۰ ق م سمجھنا چاہیے۔ یہ تو ایک تاریخی واقعہ
ہے کہ ۳۱۲ ق م میں انٹی گونس نبطیوں سے برسرپیکار ہوتا ہے جو غالباً اسوقت مصری سیادت
میں تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح کے بعد سے تمام نبطی بادشاہوں کے نام ہمیں معلوم ہیں جو قریب
قریب بلا کسی وقفہ کے برسرحکومت رہے یہاں تک کہ آخرکار ۱۰۶ء میں انکی سلطنت کا رومیوں
نے خاتمہ کر دیا۔ نبطیوں کا صدر مقام پیٹرہ (رقیم) تھا لیکن مدین بھی انکی سلطنت کا ایک جزو
تھا۔ اس عہد میں الیوس غالوس نے بحکم اغسطس یمن پر حملہ کیا تھا۔

سب سے قدیم عربی کتبہ جو اب تک مشرقی حوران میں دریافت ہوا ہے، وہ مقام نمارہ
کا ہے۔ اس کتبہ میں بصرہ کا سنہ ۲۲۳ مندرج ہے جو ۳۲۸ عیسوی سے مطابقت کرتا ہے
اور یہ کتبہ بطور یادگار کے ایک بادشاہ نامی امرء القیس ... پر نصب کیا گیا تھا۔
جو بادشاہ تھا تمام عربوں کا اور سربند پہنا کرتا تھا او... کا (یعنی جبل شمر کے
قریب وسط عرب میں اسد اور طے کے قبائل کا) او... مالی مغربی عرب کا)۔
کتبہ کی عبارت سے آگے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے ... ربران تک اپنی فتوحات کو

وسعت دی تھی۔ اس بادشاہ کا نام غالباً حیرہ کے اُس بادشاہ کے نام سے ملتا ہے جسکا زمانۂ حکومت عربی روایتوں میں ۲۵۰ - ۳۳۰ عیسوی بتایا گیا ہے۔

اب ہم بنی لخمیون کے متعلق لکھتے ہیں جن کے بادشاہوں کا ذکر قدیم عربی نظم میں موجود ہے۔ بنی لخمیوں کے بادشاہوں کو مملکتِ ایران نے قدیم بابلی عربی سرحد پر، بطور سرحدی چوکیوں کے عربوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے بالکل اسی طرح تخت نشیں کیا تھا جس طرح رومیوں کی مشرقی سلطنت نے وادی جودی کے شمالی علاقہ میں غسانی خاندان کے بادشاہوں کو متعین کیا تھا تاکہ سرحد کی حفاظت ہو اور اُنکی سلطنت، عربوں کے حملوں سے (اور اُنکے پیچھے ایرانیوں کی تاخت سے) محفوظ رہے۔ بنی لخمیوں اور غسانیوں کے متعلق بلکہ خصوصاً بنی لخمیوں کے بارے میں، نیز چھٹی صدی عیسوی اور اُسکے بعد ساسانیوں کی حکومت کے خاتمہ اور فتوحاتِ اسلامی کے زمانہ تک، زیادہ صحیح واقفات ہمیں عربی روایتوں سے معلوم ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس شاہانِ حیرہ کے مختلف درباری شعرا کی مسلسل نظمیں اور کتبوں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔

عہد اسلامی سے قبل کی سیاسی تاریخ کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم تھا، اُسکا ہم نے مختصر سا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن مشرق قدیم میں عربوں کو بہت زیادہ اہمیت اُنکے تمدن اور مذہب کی وجہ سے نصیب ہوئی۔

عہد اسلام فتح مکہ کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سیادت کو استوار کر دیا تو اُسوقت قریب قریب تمام سرداران قبائل اور جزیرہ نمائے عرب کے چھوٹے چھوٹے فرمانرواؤں نے اظہار اطاعت کی غرض سے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں اپنے اپنے وفود بھیجے۔ اس لیے اس سال یعنی نویں ہجری مطابق ۶۳۰ - ۶۳۱ عیسوی کو مورخین "وفود کا سال" کہتے ہیں۔ پھر بھی عربوں کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ اپنی خود مختاری کو خیرباد کہدیتے چنانچہ ۶۳۲ عیسوی میں رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ہی اُنھوں نے خیال کیا جاتا تھا کہ اس ناگوار سیادت کے جوے کو اُتار پھینکنے کا وقت آگیا ہے۔ عہد نبوی صلعم ہی میں حنفیہ کے سردار مسیلمہ نے وسط عرب میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اسی قسم کی کوشش بنی اسد میں طلیحہ نے کی تھی۔ یمن میں قبیلۂ عنس کے ایک شخص نامی اسود عنسی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اسی قسم کی حرکت قبیلۂ تمیم کی ایک عورت سجاح نے کی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خالد بن ولیدؓ کو طلیحہ کے مقابلہ میں بھیجا تھا، اُنکے جاتے ہی اس فتنہ کا استیصال

ہوگیا تھا مگر سجاح مسیلمہ سے جا کر مل گئی تھی۔ مسیلمہ ایک خونریز جنگ میں کام آیا اور پھر بنو حنیفہ بھی مطیع و فرمانبردار ہوگئے تھے۔ یمن میں اسود خود اپنی ہی قوم کے افراد کی سازش کا شکار ہوا۔ ۶۳۳ء میں جب اسلامی فوجیں یمن پر حملہ آور ہوئیں تو بغاوت کا بہت جلد خاتمہ ہوگیا تھا۔ غرض اس سال اسلامی ہستی کے متعلق جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں بہت فتوحات ہوئیں۔ اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسلام واقعی عربوں کو متحد کرکے ایک طاقتور قوم بنا دینے کے معاملہ میں کامیاب ہوگیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کے جانشیں حضرت عثمانؓ نے اپنے خاندان کی طرفداری میں دلچسپی لی تھی اور اس بناء پر پہلی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اب یہ بات صاف ظاہر ہوگئی تھی کہ عرب لوگ، کسی سیاسی نظام جمہوریت کو اختیار کر لینے کے بجائے اپنے جداگانہ مفاد اور فرقہ واری جنگ و جدل کو ترجیح دینے لگے تھے۔ یہ سچ ہے کہ بنی اُمیہ کے پہلے فرمانروا حضرت معاویہ، خانہ جنگی کو ختم کرنے اور تمام عرب پر اپنی سیادت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن اُنھوں نے اپنے صدر مقام کو شام میں منتقل کر دیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکے فرزند اور جانشیں یزید اول کے عہد میں مدینہ اور مکہ کے مقدس شہر کے باشندوں نے حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت شروع کر دی تھی اور اس بناء پر دوسری خانہ جنگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب یہ بات بہت زیادہ واضح ہوگئی تھی کہ اسلام فرقہ واری اختلاف سے نجات نہیں پا سکتا۔ اس بات نے شیعہ اور خارجیوں میں مذہبی مخالفت پیدا کرکے، اُنکے فرقہ واری اختلاف کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ خصوصاً خارجیوں کے اصول، عربوں کے مذاق کے تھے۔ اور یہی اصول بعد کے اموی خلفا کے عہد میں مسلسل فتنہ و فساد کا باعث رہے یہاں تک کہ عبدالملک نے ۷۳ھ (۶۹۲ عیسوی) میں مخالفوں کو شکست دیکر عرب میں امن و امان قائم کیا تھا۔ بالآخر خارجیوں کے اصول نے عرب کے بعض حصوں خصوصاً عمان میں قیام کی صورت اختیار کر لی تھی اور اب تک وہاں اُن کا وہی اثر باقی ہے۔

ملک عرب بنی اُمیہ اور اسکے بعد عباسیوں کے عہد [illegible] کے ایک صوبہ کے برابر رہ گیا تھا۔ اور نظم و نسق کے اعتبار سے بھی اس [illegible] سا لیے کہ کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور نہ کوئی صدر مقام کا شہر تھا۔ [illegible] میں مختلف شہروں اور اضلاع کے نائب حکومت خود مجدد امجد اُٹھے جنکا تقرر خود خلیفہ کیا کرتا تھا۔ المتوکل کی وفات

(۱۸۶۱ء) کے بعد جب خلافت کا اثر جاتا رہا تو پھر ہر صوبہ دار کے لیے یہ بات ناگزیر ہو گئی کہ کہ وہ خود مختارانہ حکومت کرے۔ مثلاً یمن میں، جو صدر حکومت سے بہت دُور تھا، اس قسم کا میلان پہلے ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس قسم کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مذہبی حیثیت سے اکثر فرقے بھی آپس میں متحد ہونے لگے۔ مثلاً فرقۂ زیدی کے افراد سعدا اور صنعا میں متحد ہو گئے اور قرمطی لوگ بحرین میں۔ القصہ، عرب کی تاریخ کا بحیثیت مجموعی کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔ وہاں تو صرف خاندانوں، قبائل اور سرداران قبائل کی تاریخ ہے جو عرب کے مختلف حصوں میں نام پیدا کر کے پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ بغداد کی مرکزی حکومت کا اثر انتہا سے انتہا طور پر مکہ اور سرحدی علاقوں میں کبھی کبھی خود محسوس کرایا جاتا رہا لیکن جب ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں خلافت کو زوال ہوا تو پھر اُسوقت سے مصری سلاطین، مکہ (پر اُسوقت جب کوئی حادثہ پیش آجاتا تھا) اور بحر احمر کے ساحلی مقامات پر اپنی تھوڑی بہت حکومت جتاتے رہے۔

سلطان سلیم اول کے عہد (۹۲۸-۹۱۸ ہجری = ۱۵۲۰-۱۵۱۲ عیسوی) میں عثمانی تُرک نمودار ہوئے اور اُنھوں نے مقامات مقدسہ اور یمن پر اپنی سیادت کو قائم کر دیا۔ لیکن یہاں ترکوں کو زیدیوں کے مقابلہ میں قدم جمانا مشکل ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنے اماموں کی قیادت میں بالآخر (۱۰۴۳ھ = ۱۶۳۳ء میں) ترکوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ عرب کے باقی حصوں میں ترکی سیادت حسب سابق بحال رہی یہاں تک کہ وہابی لوگ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں، وسط عرب میں اُٹھے اور اس قدر جلد قوت پکڑ گئے تھے کہ باب عالی کو مجبوراً محمد علی سے امداد طلب کرنی پڑی تھی۔ اس امداد کے باوجود بھی وہابیوں کی قوت کو بڑی کوششوں کے بعد توڑ سکے مگر ترکوں کی سیادت عرب میں حسب سابق محض برائے نام رہی تھی۔ ترکوں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں اپنی سیادت کو حقیقی سیادت بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی اور عسیر اور یمن کی تسخیر کے لیے ۱۸۷۱-۷۲ء میں بھیں روانہ کی گئیں۔ مدحت پاشا نے تو ۱۸۷۲ء میں یورش کی تھی اور رؤف پاشا نے ۱۸۷۶ء میں مشرق کی طرف سے بڑھ کر یہاں کے باشندوں کو مطیع و منقاد کر لیا تھا۔ اس حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یمن ایالتی ولایت میں شریک کر کے صنعا کو اُس کا صدر مقام قرار دیا تھا۔ اور مشرقی عرب کے اُس علاقہ کو جتنا کہ اُسوقت تک فتح کیا جا چکا تھا بصرہ کی ولایت میں نجد کے نام سے شریک کر دیا گیا تھا۔ لیکن یمن کی نئی ولایت صرف تحریر میں آئی تھی اس لیے کہ وہاں کے عرب علانیہ طور سے باغی ہو گئے

تھے اور ترک مسلسل کوششوں کے باوجود بھی اُنکو مطیع نہ کر سکے تھے۔ برخلاف اسکے انگریز تمام جنوبی ساحل پر عدن سے لیکر مسقط تک اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خلیج فارس میں اپنی سیادت کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور اُنکی سیادت کو تاہم حقیقی سمجھنا چاہیے اس لیے کہ انگریزوں کی مخالفت علانیہ نہیں کی جاتی ہے۔

بحالت موجودہ جزیرہ نمائے عرب کی مردم شماری نہیں مل سکتی۔ رشید بے نے اپنی کتاب "تاریخ یمن وصنعا" جلد ۲ صـ ۳۵۵ میں ۱۸۷۵ء کی مردم شماری (۱۰۷۵۲۱۵۰) نفوس بتائی ہے لیکن یہ تعداد قطعی قیاس پر مبنی معلوم ہوتی ہے

(ترجمہ) محمد نجم الغنی قریشی

دارالترجمہ حیدرآباد۔ دکن

تاریخ عرب

یہ لاجواب کتاب لاکھوں مطبوعہ اوراق اور سیکڑوں قلمی نسخوں کی مدد سے فرانس کے مشہور عالم و مؤرخ موسیو سیدیو نے ۱۸۷۷ء میں شایع کی تھی اور اب اُسکا ترجمہ ہندوستان میں پہلی بار شایع کیا جا رہا ہے۔ یہ صرف ملک عرب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ در اصل عرب قوم کی تاریخ ہے جسمیں اُنکا ملکی جغرافیہ نسلی خصائص، قومی شمائل، معاشرتی آئین، اخلاقی نظام، عادات و اطوار، جنگی کارنامے، فتوحات ممالک، طریق حکمرانی، کمالات ذہنی، علوم و فنون صنعت و حرفت اور تجارت، ایجادات و اختراعات اور ہر قسم کی تمدنی ترقیات کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عرب کے خشک بیگیانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں بسنے والوں نے جو وحشت و بربریت کا مجسمہ تھے، حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اسلامی تعلیم حاصل کر کے چند صدیوں کے اندر دنیا میں تہذیب و شائستگی کے کیسے کیسے قصر رفیع بنا کر کھڑے کر دیے۔ یہ مشہور کتاب تمدن عرب سے بھی پہلے کی تصنیف ہے اور عرب قوم کے عروج و زوال کی مکمل تاریخ کو ایک مرقع میں پیش کرتی ہے اور اس قابل ہے کہ تمام دردمند مسلمانوں کے مطالعہ سے گذرے کہ آ
خصوصاً عربوں کی جو
حالت ہے اُسکو سمجھنے نیز اُسکو بدلنے کے لیے جتنی کوششیں کیجائیں گ
کے کامیابی محال ہے۔
مجم ۲۰۷ صفحے تقطیع کلاں طباعت و کتابت دیدہ زیب جلد خوشنما
ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ